انما انا قاسم واللہ یعطی

سلسلۂ اشاعۃ العلوم

بیادگار خطاب "سلطان العلوم" اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ

اشاعت اسلام

المعروف بہ

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا

۱۳۵۱ھ

از خامہ

فخر الہند حضرت مولانا محمد حبیب الرحمن صاحب ناظم دار العلوم دیوبند

باہتمام

حضرت مولانا قاری محمد طیب و مولانا قاری محمد طاہر صاحبان مالکان مطبع قاسمی

مطبع قاسمی حلیۂ الطباع پوشیدہ

بار دوم — ۱۰۰۰ — طبع شد

فہرست مضامین اشاعت اسلام

تقریظ

جانشین شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب

مہاجر مدنی دامت برکاتہم استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

مذہب اسلام کی صداقت اور اسکے اصول کی حقانیت کچھ ایسی نہ تھی کہ قلوب عالم اور ارواح عامہ انسانیہ میں مثل غذا و صالح خود بخود منجذب ہوکر نہ پہنچتی، اس کی تعلیمات صحیحہ کی چمکتی ہوئی روشنی بھی کچھ ایسی کمزور نہ تھی کہ کفر و بطلان کی آنکھوں کو خیرہ اور چکاچوند نہ کر دیتی۔ ہاں ہاں اس کے سچے اصول اور محکم قواعد نے نہ صرف حکماء زمانہ کے دماغوں کو منور اور درخشندہ کیا، بلکہ اقوام عالم کے دور افتادہ اور گوشہ نشین عناصر کے عقول و اذہان کو بھی اپنی تیز و تند شعاعوں سے جگمگا، اس کی روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاحات نے بھی نہ فقط حلقہ بگوشان ادیان سابقہ کو اپنا گرویدہ بنایا، بلکہ ریگستانوں میں بادیہ پیمائی کرنے والوں اور پہاڑوں میں، حشیانہ زندگی بسر کرنے والوں کو بھی اپنا رام کر لیا، یہی وجہ ہے کہ نہایت تھوڑی سی مدت میں "بحر اٹلانٹک" کے سواحل سے لیکر "بحر پاسفک" کے کناروں تک اور "بحر منجمد شمالی" کے برفستان سے لیکر صحرائے کبیر افریقہ کی انتہائی اور گرم حدود تک ہزار ہا میل کی مسافت میں لا الٰہ الا اللہ کا ڈنکا بجنے لگا، تلوار ولہ میں یہ قوت کہاں ہے، اور ہتھیاروں میں یہ عالمگیریت کس طرح آسکتی ہے!

کہاں ہیں شپرہ چشم اشخاص حقیقی روشنی سے بے بہرہ ہونے والے سچائی اور حقانیت سے بے فیض، معاندین اور ہٹ دھرمیوں سے دھوکے کھانے والے آئیں اور دیدۂ بصیرت کھولیں، تاریخ اسلام کے سنہرے اوراق کا مطالعہ کریں، نور اور ظلمت میں تمیز کریں، کھرے اور کھوٹے کو پرکھیں، اسلام کی دلربائی اور اس کی محبوبیت کا نظارہ کریں اور علم حقیقی اور واقعی روشنی سے اپنے دل و دماغ کو منور کریں، زیادہ توفیق نہ ہو تو حضرت مولانا الاستاذ العلامۃ المحقق **مولانا حبیب الرحمن صاحب** مد اللہ ظلہ العالی کے اس مضمون **(دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا)** کو جو کہ مولانا دامت برکاتہم کے شیریں بحار تحقیق کا ایک قطرہ اور ان کی سچی تاریخی واقفیت کا ایک نقطہ ہے بغور ملاحظہ کریں تاکہ متعصب پادریوں اور نادان وہٹ دھرم آریوں کی دروغ گوئی، ابلہ فریبی کا پول کھلے اور اسلام کی جہانگیر صداقت کا پتہ چلے، جزاہم اللہ تعالیٰ فی الدارین احسن الجزاء، آمین

کتبہ احقر الطلبہ
حسین احمد غفرلہ
الشیخ آبادی ثم المدنی الدیوبندی

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا

الحمدللہ و المنۃ کہ فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند کا مشہور و معروف مضمون "اشاعت الاسلام" المعروف بہ دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" زیور طبع سے آراستہ ہو کر آسمان اشاعت کا آفتاب بن گیا۔

اب مشتاق نظروں کی طرف تطرح کر دہ دار المؤلفین کی اس خدمت کی کہاں تک قدر کرتے ہوئے اسکے استقبالی جذبات کو کامیاب بنانیکی سعی کرینگی۔

اس مبارک خدمت پر حضرت حکیم الامت مولانا الشاہ محمد اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے جن متبرک خیالات کا اظہار فرمایا ہے حق تعالیٰ انکو درجہ قبولیت سے نوازے ہماری بڑی کامیابی یہی ہے کہ حضرات اکابرین کی خوشنودی اور دعاؤں کا شمول ہماری رہبری کرتا رہے۔

حضرت اقدس نے اس کتاب پر جو ایک مضمون بصورت تقریظ ارسال فرمایا ہے اس کو تیمناً و تبرکاً شائع کرتے ہوئے درگاہ واہب العطیات میں دست بدعا ہیں کہ بار الٰہا تو نے ہی ہمارے قلوب میں صادق جذبات پیدا فرمائے ہیں اور تو ہی ہم کو ساحل مراد تک پہنچائیگا۔ آمین"

(ارکان دار المؤلفین دیوبند)

تقریظ حکیم الامۃ محی السنۃ حضرت مولانا الشاہ محمد اشرف علی صاحب سرپرست دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم

موقع الحسام من اشاعۃ الاسلام

یعنی

تقریظ بر رسالہ اشاعت الاسلام مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی دام فیضہم

بعد الحمد و الصلوٰۃ مخالفین اسلام کے اس شبہ کا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے اُصولی جواب تو خود اسلام کے قانون سے ظاہر ہے جس کے بعض ضروری دفعات یہ ہیں (۱) قتال میں عورت اور اپاہج اور شیخ فانی اور اندھے کا قتل باوجود انکے بقاء علی الکفر کے جائز نہیں اگر سیف اکراہ علی الاسلام کیلئے ہوتی تو اُن کو اُنکی حالت پر کیسے چھوڑا جاتا۔

(۲) جزیہ مشروع کیا گیا اگر سیف جزاء کفر ہوتی تو باوجود بقاء علی الکفر کے جزیہ کیسے مشروع ہوتا ہے (۳) پھر جزیہ
بھی سب کفار پر نہیں چنانچہ عورت پر نہیں اپاہج اور نابینا پر نہیں رہبان پر نہیں - اس سے معلوم ہوا کہ مثل سیف کے جزیہ
جزائے کفر نہیں - ورنہ سب کفار کو عام ہوتا جب جزیہ کہ سیف سے اخف ہے جزائے کفر نہیں تو سیف
جو کہ اشد ہے کیسے جزائے کفر ہوگی (۴) اگر کسی وقت مسلمانوں کی مصلحت ہو تو کفار سے صلح بلا شرط مالی بھی
جائز ہے (۵) اگر حالات وقتیہ مقتضی ہوں تو خود مال دیکر بھی صلح جائز ہے ان اجزاء کی دونوں دفعات سے معلوم
ہوا کہ جزیہ جس طرح جزائے کفر نہیں جیسا دفعہ ۳ سے معلوم ہوا اسی طرح وہ مقصود بالذات بھی نہیں ورنہ صلح بلا مال
یا یہ بذل مال جائز نہ ہوتی پس جب سیف یا جزیہ نہ جزائے کفر ہیں نہ مقصود بالذات ورنہ دفعات مذکور مشروع ہوتے
تو ضرور اس کی کوئی ایسی علت ہے جو ان دفعات کی ساتھ جمع ہو سکتی ہے اور وہ حسب تصریح حکمائے امت (کما
فی الہدایہ وغیرہا) سیف کی غرض اعزاز دین و دفع فساد ہے اور جزیہ کی غرض یہ ہے کہ جب ہم ہر طرح اُن کی حفاظت کرتے
ہیں اور اس حفاظت میں اپنی جان و مال صرف کرتے ہیں تو اس کا صلہ یہ تھا کہ وہ بھی حاجت کیوقت ہماری
نصرت بالنفس ہی کرتے مگر ہم نے اُن کو قانوناً اس سے بھی سبکدوش کردیا اسلئے کم از کم ان کو کچھ مختصر ٹکس مالی
ادا کرنا چاہئے تاکہ یہ نصرت بالمال اُس نصرت بالنفس کا من وجہ بدل ہو جاوے یہ اغراض ہیں سیف اور جزیہ
کے اور یہی وجہ ہے کہ جب اعدائے دین سے احتمال فساد کا نہیں رہتا تو سیف مرتفع ہو جاتی ہے جسکے تحقق کی ایک
صورت قبول جزیہ ہے ایک صورت صلح ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ نصرت بالنفس پر جو کہ اُنپر عقلاً واجب تھی
قادر نہیں اُنسے نصرت بالمال بھی معاف کردی گئی ہے البتہ چونکہ احتمال فساد کا موثوق بانتفا عادۃً موقوف ہے حکومت
و سلطنت پر چنانچہ تمام ملوک و سلاطین گو وہ اہل ملل بھی نہوں یہ اجماعی مسئلہ ہے اسلئے ایسی کسی صورت کو بحالت اختیار
گوارا نہیں کیا گیا جسمیں اسلام کی قوت و شوکت کو صدمہ پہنچے اس مختصر تقریر سے اُصولی طور پر شبہ مذکورہ کا بالکلیہ قلع قمع
ہو جاتا ہے اور اس کا وسوسہ بھی باقی نہیں رہتا کہ شمشیر اشاعت اسلام کیلئے وضع کیگئی ہے الحمد للہ کہ اس اعتراض کا
بالکلیہ استیصال ہو گیا - رہا مرتد کا قتل اسلام کی طرف عود نہ کرنے کی حالت میں سو اسکی حقیقت اکراہ علی قبول الاسلام
نہیں ہے بلکہ اکراہ علی ابقاء الاسلام بعد قبولہ ہے سو وہ ایک مستقل مسئلہ ہے جو مسئلہ مبحوث عنہا سے بالکل مغایر ہے اور
اسکی بناء بھی وہی دفع فساد ہے جو اصل مسئلہ سیف کی بناء ہے اتنا فرق ہے کہ کفر قبل الاسلام کا شر اور ضرر اخف ہے

اس لئے اس کا تدارک جزیہ یا صلح سے جائز رکھا گیا ہی اور کفر بعد الاسلام یعنی ارتداد کا شر اور ضرر اغلظ ہی کہ ایسا شخص طبعاً بھی زیادہ مخالف و محارب ہوتا ہی اور دوسروں کو اسکی حالت دیکھ کر حق میں تذبذب و تردد بھی ہوجاتا ہی۔ نیز اس میں ملت کی ہتک حرمت بھی ہی اس لئے اس کا تدارک صرف سیف سے تجویز کیا گیا اور مرتدہ چونکہ عادۃً محارب نہیں ہوتی صرف تذبذب و ہتک کا ضرر اسکے حبس دائم سے دفع کردیا گیا ہی کہ عقوبت میں فطرۃً خاصہ زجر کا ہی۔

بہرحال قانون اسلام کا دفع و رفع تمامی شبہات کے اعتراض اشاعتِ اسلام بالسیف کیلئے دافع ہونا ظاہر ہوگیا جو کہ حقیقت شناسان اہلِ انصاف کی شفا کیلئے کافی ہے۔ مگر چونکہ اس وقت عام طور سے مادیت اخبار کا اکثر طبائع پر رنگ غالب ہی۔ اس لئے اس شبہ کے جواب میں سخت ضرورت اسکی بھی تھی کہ خود شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے نائبان ذوی الاحترام یعنی ذمہ داران اسلام کے واقعات جزئیہ بھی ان اصول مذکورہ کی تائید و موافقت میں دکھلائے جاویں چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کرکے متعدد حضرات نے اس موضوع پر توجہ کی ہے لیکن علوم دینیہ میں مہارت نہونے کے سبب اکثر کے کلام میں خود وہ اصول و حدود جس کی تائید مقصود تھی متروک و فائت ہوگئے ہیں جس سے وہ تائید بالکل اس مثل کی مصداق ہوگئی ہے "یکے بر سر شاخ و بُن مے برید" تو اس طرح سے وہ ضرورت پھر باقی کی باقی رہی حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرماوے مکرمی معظمی نبراس العلماء راس الفضلاء تاج الادباء سراج البلغاء حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب ناظم مدرسہ دار العلوم دیوبند دام و دامت بالفیوض و البرکات والمواہب کو جنہوں نے اپنے رسالے اشاعت اسلام ملقب بہ "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" میں جس کے چند اجزا اس وقت میرے سامنے ہیں اس ضرورت کا حق بوجہ اکمل ادا فرمایا جس میں اوّلاً تمہید میں بقدر ضرورت اصول کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہی اور ثانیاً واقعات صحیحہ کو ایسی خوبی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے کہ دلالت علی المقصود کی ساتھ انطباق علی الاصول کا پورا لحاظ رکھا ہے جس سے شائقان فروع عاشقان اصول دونوں کو مستفید کرتا ہوا اس شعر کا مصداق ہوگیا ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد	برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

یہ تو اسکے معنون اور معنی کی کیفیت ہی۔ پھر عنوان اور الفاظ میں سادگی اور حسن کو ایسے طور پر جمع کیا ہی کہ عبارت میں

[illegible] ... الذین آمنوا ... من حجۃ اللہ البالغہ ۱۲

نہ فرسودہ قدامت ہے نہ تکلف آمیز جدت جس سے وہ اس شعر کا مصداق ہو گیا ہے

	دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند		دلبرِ ماست کہ با حسن خداداد آمد	

چونکہ میں ثنا سے زیادہ دعا کو اپنا وظیفہ سمجھتا ہوں اسلئے بجائے ثنا کے اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اے اللہ اس رسالہ کو نافع فرما اور شبہات کیلئے دافع فرما۔ اسیوقت ختم پر مجھکو یاد آیا کہ القاسم دورجدید کے کسی پرچہ پر مولانا اعزاز علی صاحب مدرس مدرسہ موصوفہ نے ایک مضمون شروع کیا تھا جس کا عنوان ہے اسلام سے لوگوں کو کس کس طرح روکا گیا مناسبت تقابل کے سبب (جسکی مسلمہ خاصیت ہے وبضدھا تتبین الاشیاء) اس مقام پر اس کا ذکر کرنے کو بھی دل چاہا اس کو تلاش کر رہا تھا کہ القاسم بابتہ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ میں وہ بھی مل گیا اور اسی دوران میں القاسم ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ میں ایک اور مضمون مولانا ہی کا بعنوان اشاعۃ الاسلام کا تاریخی سلسلہ ملا جس میں مضمون بالا یعنی مانعیت عن الاسلام کی تکمیل کا وعدہ اور ساتھ ہی "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" کی تتمیم کا وعدہ ذکر فرمایا ہے۔ اس کے دیکھنے سے میرے سامنے تین نور جمع ہوگئے یعنی ۱۔ مولانا الممدوح سابقا کا اصل مضمون ۲۔ مولانا الممدوح لاحقہ کا مضمون اشاعۃ جس کو اصل مضمون کا تتمہ کہنا مناسب ہے ۳۔ ان ہی مولانا کا مضمون مانعیت جس کو اصل مضمون کا ضمیمہ کہنا مناسب ہے اور ہر نور نے ایک سرور پیدا کر کے یہ شعر صادق کر دیا ہے

	سرور فی سرور فی سرور		و نور فوق نور فوق نور	

اور درحقیقت یہ مضمون مانعیت کا اصل مضمون کی شوکت وصولت کا جلی اور قوی کرنیوالا ہے جسکی تعبیر یہ ہے کہ اسلام میں وہ دلکشی ہے کہ باوجود مخالفین کے اتنے مکائد و شدائد کے اسکے اثر میں کمی نہیں ہوئی پس اصل مضمون سے اسلام کی شان حبیبی (یعنی محبوبیت) نمایاں ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ وہ اسی شان کے مظہر یعنی حبیب العلماء کے قلم سے شروع ہوا اور مضمون مانعیت سے اسلام کی شان اعزازی (یعنی عظمت) کہ اتنے مخالفین کو مغلوب کرتا رہا روشن ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ وہ اسی شان کے مظہر یعنی اعزاز الفضلاء کے قلم سے شروع ہوا اگر یہ مضمون بھی مثل اصل مضمون کے ایک معتد بہ مقدار میں مدون ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس موضوع میں کوئی حالت منتظرہ باقی نہ رہیگی اب مولانا المدرس دام فیضہم کی نہ مشغولی و تو جہ ... کے ایفاء کی ... و اللہ تعالیٰ سے انکی تکمیل میں اعانت کی دعا کر کے دوبارہ مضمون کو ختم کرتا ہوں والسلام

کتبہ اشرف علی التھانوی ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاعت اسلام

ملقب بہ

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا

حصّہ اوّل

مذہب اسلام نے وجود میں قدم رکھتے ہی جس سُرعت اور تیزی کے ساتھ عالم میں اپنی ق
کا سکہ بٹھلایا اُس کی نظیر دوسرا کوئی مذہب پیش نہیں کرسکتا۔ ہمارے سامنے دو سلسلے موجود ہیں۔
ایک ملکی فتوحات کا۔ دوسرا مذہب کی اشاعت کا۔ دونوں پر نظر ڈالتے ہیں تو حقانیت اسلام
کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ فتوحات ملکی نے چند ہی سالوں میں سیلاب عظیم کی
طرح قدیم اور زبردست سلسلوں کو تہ و بالا کر کے تہذیب و تمدن کا نیا دور دنیا میں پھیلا دیا۔
شیوع مذہب کو خیال کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نور آفتاب کی طرح ایک دم اُس نے تمام
عالم کو منور کردیا۔ حقانیت اسلام کا اثر بجلی کی رَو کی طرح سرایت کرتا چلا گیا۔ اور سخت سے سخت
معاندوں سے جو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اوّل درجہ کا بغض رکھتے تھے یہ کہلا دیا
کہ ”دنیا میں کوئی شخص آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا۔ مگر آپ سے زیادہ کوئی محبوب بھی نہیں ہے۔“

بہت سے ناواقف یا متعصب و معاند دونوں سلسلوں کو ایک سمجھ کر اشاعت اسلام کو
فتوحات ملکی و محاربات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اسلام دنیا میں بزور شمشیر پھیلایا
گیا ہے اُن کا دعویٰ ہے کہ اسلام نے اپنی خوبیوں اور ذاتی محاسن سے لوگوں کو مسلمان نہیں بنایا

بلکہ ایک جابرانہ قوت نے جبر و اکراہ سے منوایا ہے اور اسی جبر و اکراہ نے امتداد زمانہ کیساتھ رضا و رغبت کا لباس پہن لیا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ سچائی اور راستبازی سے خالی۔ انصاف و حق پرستی سے بالکل بعید ہے اس دعوے کے مدعیوں نے دیدہ و دانستہ واقعیت پر پردہ ڈالنا چاہا ہے۔

ہم جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں اُس سے انشاء اللہ تعالیٰ اس خیال کا بالکل قلع قمع ہو جائیگا ساتھ ہی اسلامی جماعتوں کو جو اشاعت و حفاظت اسلام کی کوششوں میں سرگرم ہیں یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ اسلام کی خدمت و اعانت کرنیکے واسطے مسلمانوں کو کن اوصاف سے متصف ہونیکی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کو طویل معرکہ آرائیوں سے سابقہ پڑا ہے۔ اُنکے یہ محاربات جنگ جارحانہ ہوں یا مدافعانہ۔ فتوحات ملکی کیلئے ہوں یا اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اس جگہ ہم کو اسکی تحقیق کرنا مدنظر نہیں ہے۔ موقع ہوا تو دوسرے وقت اسکی بھی تحقیق کر دیجائیگی اس وقت ہمکو صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ان محاربات و فتوحات کا مقصد اور حاصل یہ نہ تھا کہ کسی کو بزور مسلمان بنایا جائے۔

میں بہت زور کے ساتھ دعویٰ کرنیکو تیار ہوں کہ اسلام نے محض اپنے ذاتی محاسن سے عالم میں رسوخ و مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور جس سرعت کیساتھ قلوب کو مسخر کیا ہے اُس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ میرے اس دعوے کی تائید کیلئے شریعت اسلام کے اُصول۔ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و حالات۔ اخلاق و طریقہ تعلیم مسلمانوں کا طرز عمل اور اسلام کی حقیقی خوبیوں سے آراستہ ہونا۔ کتب سابقہ کی پیشین گوئیاں۔ علمائے اہلِ کتاب کی تصدیقیں موجود ہیں۔

شریعت اسلام نے بزور و تخویف کسی کو مسلمان بنانیکی سخت ممانعت کی ہے کلام اللہ میں صاف ارشاد ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (یعنی دین میں کسی پر جبر نہیں) ایک اور جگہ ارشاد ہے اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (اے محمد کیا تم لوگوں پر جبر کرتے ہو کہ وہ ایمان لے آویں۔ نجران کے عیسائی جب مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے اور مصالحت کر کے جزیہ دینا قبول کیا تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد نامہ لکھ کر اُن کو دیا اُس میں مسلمانوں کی جانب سے یہ اقرار تھا کہ نصاریٰ نجران کو کسی طرح تبدیل مذہب پر مجبور نہ کیا جائیگا اور نہ اُن سے عشر لیا جائیگا۔ عہد نامے کے یہ الفاظ تھے وَجَعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَعَهْدَهٗ اَنْ لَا يُفْتَنُوْا عَنْ دِيْنِهِمْ وَلَا يُعْشَرُوْا۔

یہ ہے شریعت کا حکم اور یہ ہے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا ان اُصول مقررہ وسلمہ کے بعد بھی کسی مسلمان کو یہ گنجایش رہتی ہے کہ جبراً مسلمان بنانیکا مرتکب ہوتا اگر کوئی ایسا کرتا تو کیا اُس کا یہ فعل شریعت اسلام کے مطابق ہوتا۔ یا ایسا ہی سمجھا جائے جیسے دوسرے احکام شریعت کی خلاف ورزی۔

اسمیں کچھ تردد نہیں ہو کہ مسلمانوں نے اس حکم کی پوری پابندی کی۔ یہی وجہ ہے کہ گو اسلام نے سرزمین عرب سے باہر قدم رکھتے ہی جلد جلد ممالک روم وشام ومصر وعراق کی کایا پلٹ دی اور اُنکو تہذیب وتمدن کے اُصولوں کی تعلیم دے کر اسلام کے محاسن کا گرویدہ بنادیا مگر کسی ایک جگہ کے واسطے اس کا ثبوت ملنا مشکل ہو کہ وہاں کے باشندوں کو اسلام لانے پر مجبور کیا گیا یا اُس کے لئے طمع دلانیکے ایسے سامان کئے گئے ہوں جنسے وہ لوگ اپنے مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام قبول کریں۔

اسلام اور سلاطین اسلام نے اس بارہ میں جس استغنا سے کام لیا ہی اُس کے ثبوت کیواسطے یہی کافی ہے کہ اشاعت اسلام کیلئے مشن قائم نہیں کئے گئے نہ منادو واعظ مقرر کئے گئے سلطنت نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ یہود ونصاریٰ اُسی آزادی کے ساتھ مذہبی رسوم ادا کرتے تھے جیسے مسلمان۔ اُن کو ممالک اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جو خود مسلمانوں کو۔ اُن کی جان ومال کی وہی قدر وقیمت تھی جو مسلمانوں کی۔ ایک معاہد وذمّی کے بدلے میں مسلمان کو قتل کردینا اسلام کا خاص مسئلہ ہے۔

اس میں شبہ کرنے کی گنجایش نہیں ہے کہ اشاعت اسلام کیلئے اگر اس قسم کی تدبیریں کیجاتیں جو عیسائیت کیلئے ہوئیں یا ہورہی ہیں تو بلاد اسلامیہ میں کسی غیر مذہب کا وجود بھی باقی نہ رہتا اسلام کی ذاتی خوبیوں اور سادہ تعلیم کے ساتھ اگر سامانِ رغبت بھی جمع کردیا جاتا تو کیا ایک

متنفس بھی ایسا رہتا جو اسلام کو نہ قبول کرلیتا۔ اور کیا جس طرح اُندلس جیسا وسیع ملک جہاں
کروڑوں مسلمان آباد تھے۔ جہاں سات آٹھ صدیوں تک اسلامی جھنڈا لہراتا رہا ایک دم
اسلام کے نام لینے والوں سے خالی ہوگیا۔ روم و شام مصر و عراق۔ ہندوسندھ وغیرہ اور
خود اُندلس کا یہی حال نہوتا۔ کہ سوائے اسلام کے دوسرے مذاہب کا نام و نشان مٹ چکا ہوتا
لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اسلام نے مساوات اور آزادی کے وہ اُصول قائم کئے جن کی وجہ
سے سلطنت کے شباب اور زور کے زمانہ میں یہود۔ نصاریٰ مجوس پہلو بہ پہلو رہتے اور بڑے بڑے
عہدے حاصل کرنے میں مسلمانوں سے مزاحمت کرتے تھے۔

خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں تیسری اور چوتھی صدی کے اندر ابراہیم بن ہلال صابی بہت
بڑا ادیب و عالم گذرا ہے۔ ابراہیم پہلے خلیفہ کا میر منشی رہا۔ اُس کے بعد عزالدولہ ابن بویہ دیلمی کا
میر منشی ہوا اور پھر ترقی کرکے درجہ وزارت تک پہنچ گیا۔ عزالدولہ کی جانب سے جو خطوط اُس کے بھائی
عضدالدولہ کے نام لکھا کرتا تھا اُن میں عضدالدولہ کی نسبت تہتک آمیز اور رنجدہ الفاظ استعمال
کرتا تھا عزالدولہ کے بعد جب عضدالدولہ بادشاہ ہوا تو اُس نے ابراہیم کو قید کرکے ارادہ قتل کیا
مگر ابراہیم کے فضل و کمال کی قدردانی اس درجہ تھی کہ عضدالدولہ جیسے زبردست اور بارُعب
بادشاہ کے دربار میں بڑے بڑے درجہ کے مسلمان سفارشی کھڑے ہوگئے۔ عضدالدولہ نے
قصور معاف کرکے سلطنت دیلمیہ کی تاریخ لکھنے کا عظیم الشان اور مہتم بالشان کام اُس کے سپرد کیا۔

ابراہیم کا انتقال ہوا تو مقبرۂ شونیزی[1] میں مدفون ہوا اور شریف رضی جیسے شخص نے اُسکے
مرثیہ میں پرزور قصیدہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ارأیت ابن خبا ضیاء النادی	ارأیت من حملوا علی الاعوام
تجھکو معلوم بھی ہے کہ مجلس کی روشنی کہاں چھپ گئی	تجھکو خبر بھی ہے کہ لوگ جنازے پر کس کو اٹھائے لئے جاتے ہیں

ابراہیم قرآن مجید کا حافظ تھا مسلمانوں کے ساتھ رمضان شریف کے روزے برابر رکھتا تھا

[1] بغداد کا مشہور و معروف مقبرہ۔ ۱۲

مگر مرتے دم تک اپنے قدیم مذہب پر قایم رہا اور باوجود عز الدولہ بادشاہ کی رغبت و خواہش کے جو محض ہمدردانہ تھی اسلام نہ لایا۔

ابراہیم کا پوتا ہلال بن محسن بھی بڑا فاضل و عالم ادیب و کاتب تھا ابو علی فارسی جیسے امام فن کا شاگرد تھا خطیب بغدادی جیسے حافظ و محدث نے اُس کی شاگردی کی تھی۔ ہلال کی بھی ساری عمر قدیم مذہب کی پابندی میں گذری کسی قسم کا دباؤ یا رغبت اُس کو اسلام لانے کا باعث نہ ہوئی البتہ آخر عمر میں توفیق الٰہی شامل حال ہوئی تو خود بخود مسلمان ہو گیا۔

ابن التلمیذ نصرانی جس درجہ کا عالم و فاضل تھا اُس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ عماد اصبہانی جیسے زبردست عالم اُسکو سلطان الحکما کے لقب سے یاد کرکے اپنی کتاب خریدہ میں جن الفاظ سے اُسکی تعریف کرتے ہیں اُسکے اندازہ کیلئے ذیل کے فقرات ملاحظہ کر لئے جائیں۔

ھو مقصد العالم فی علم الطب بقراط عصرہ و جالینوس زمانہ ختم بہ ھذا العلم ولم یکن فی الماضین من بلغ مداہ فی الطب عمر طویلا و عاش نبیلا و جلیلا و رأیتہ وھو شیخ بھی المنظر حسن الرواء عذب المجتلی والمجتنی لطیف الروح ظریف الشخص بعید الھم عالی الھمۃ ذکی الخاطر مصیب الفکر حازم الرای شیخ النصاری وقسیسھم و رأسھم و رئیسھم۔

ترجمہ۔ وہ علم طب میں عالم کا مقصود ہے اپنے زمانہ کا بقراط و جالینوس ہے۔ گذشتہ لوگوں میں بھی کوئی علم طب کے اندر اس درجہ کو نہیں پہنچا۔ بڑی عمر پائی اور جلالت و اقتدار کیساتھ عمر بسر کی میں نے اُسکو اس حالت میں دیکھا کہ وہ ایک بوڑھا روشن چہرہ والا۔ تازہ اور شیریں ہیئیت و صورت والا میٹھی گفتگو والا روح اُسکی لطیف اور جسم اُس کا ظریف ارادہ اور ہمت بلند طبیعت ذکی فکر صائب رائے عمدہ تھی۔ نصاریٰ کا شیخ اور عالم تھا۔ اور اُن کا سردار اور افسر تھا۔

انصاف سے عماد اصبہانی کے ان الفاظ کو دیکھنا چاہیئے کہ ایک مسلمان عالم کیسے کھلے دل سے ایک عیسائی کے فضل و کمال کا اعتراف کرتا ہے۔

ابن تلمیذ مذکور باوجودیکہ ایوان خلافت میں دخیل اور کامل رسوخ یافتہ تھا خلیفہ کی ہمنشینی اور منادمت کا فخر اُس کو حاصل تھا۔ ذمہ داریوں کے عہدوں پر فائز تھا۔ مگر اپنے مذہب پر برابر

قائم رہا کوئی امر اُسکو ترک مذہب کیلئے داعی نہوا۔ عماد اصبہانی فرماتے ہیں کہ مجھکو ابن تلمیذ کا مال دیکھکر سخت تعجب ہوتا تھا کہ باوجود کمال علم و فہم کے اسلام جیسی دولت سے کیونکر محروم رہا ہدایت و ضلالت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

شریعت اسلام کے مقررہ اُصول کیساتھ اہل اسلام اور سلاطین اسلام کا برتاؤ دوسرے مذاہب کے متبعین سے یہ ہے جس کا نمونہ ہم نے ان دو مثالوں میں دکھلایا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی اشاعت میں جبر و زبردستی یا کسی قسم کی نا ملائم و مبتذل تدبیروں کو ہرگز دخل نہ تھا۔ پھر باایں ہمہ ایسی سُرعت کیساتھ اسلام کا دُنیا میں پھیل جانا اور بڑے بڑے منکروں کا اسلام کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جانا اس کی وجہ صرف وہی ہے جس کی طرف ہمنے اشارہ کیا ہے کہ اسلام کے اُصول فطرت اور عقل کیموافق۔ صداقت اور راستبازی کو ساتھ لئے ہوئے شرک فی العقیدہ والعمل سے بالکل پاک تھے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اوصاف اخلاق حمیدہ اور خالق و مخلوق کے ساتھ کمال رابطہ۔ خالق کی درگاہ میں کامل عجز و نیاز کے ساتھ مخلوق کی بے انتہا ہمدردی و دلسوزی۔ طریقۂ تعلیم واخلاقیت نہایت دلفریب و موثر یہ اُمور تھے کہ بسا اوقات زبانی تعلیم کی نوبت بھی نہ آتی تھی۔ آپکے چہرۂ مبارک پر نظر ڈالتے ہی اسلام کی حقانیت کا یقین ہو جاتا تھا مسلمانوں کا اسلامی اُصول اور احکام پر مضبوطی سے قائم ہونا صدق و یقین و اخلاص کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونا۔ عبادات و معاملات میں بے انتہا صفائی کے ساتھ چست و چالاک ہونا۔ حق کے مقابلہ میں مخلوق کی پروا نہ کرنا یہ وہ باتیں تھیں جو بہیئت مجموعی خود بخود ہدایت و ارشاد کا کام دیتی تھیں۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں اور اُن کے شبانہ روز کے طرز عمل کو دیکھ لینا کافی اور اشاعت اسلام کے دوسرے طریقوں سے مستغنی کرنیوالا تھا اہل کتاب کے علماء کو پہلے سے طلوع آفتاب اسلام کا علم تھا اور وہ اُس کے منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔

مگر ہم اپنے دعویٰ کو دلائل مذکورہ سے ثابت کرنے پر قناعت کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُسکو واقعات اور حالات کی زبردست شہادت سے مضبوط اور دلنشین کرنا چاہتے ہیں ہم اسلامی تصویر کے

واقعات میں سے چند منتخب حالات کا بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جس سے ہمارا یہ دعویٰ اس طرح دلنشین ہو جائے کہ کسی کو گنجائش انکار باقی نہ رہے۔

ہم اسلام کی تیرہ صدیوں کو چار حصوں پر منقسم کر کے ہر ایک حصے کے متعلق سیر و تواریخ کے ہزار ہا حالات میں سے چند ایک کو بیان کرتے ہیں جن سے ثابت ہو جائے کہ اشاعت اسلام کیلئے جو من گھڑت اسباب پیدا کئے گئے ہیں وہ واقعیت سے بالکل دور ہٹ دھرمی تعصب اور عناد کا نتیجہ ہیں۔ پہلا حصہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل از ہجرت دوسرا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد از ہجرت تیسرا حصہ قرن صحابہ رضی اللہ عنہم چوتھا حصہ زمانہ مابعد صحابہ رضی اللہ عنہم۔

زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از بعثت تا ہجرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی نازل ہونیکے بعد تیرہ سال مکہ معظمہ میں مقیم رہے اس زمانہ میں آپ کو کسی سے جھگڑنے منازعت کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی بلکہ صبر کرنے اور تکالیف جھیلنے کا حکم تھا۔ کفار مکہ طرح طرح کی اذیت پہنچاتے تھے کوئی دقیقہ تکلیف دہی کا اٹھا نہ رکھتے تھے۔ مگر آپکی طرف سے بجز صبر و تحمل یا دعائے ہدایت کچھ جواب نہ ہوتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی شخص اسلام لانیکی جرأت نہ کر سکتا تھا اور جو چند آدمی مسلمان ہو گئے تھے تو ظاہر نہ ہو سکتے تھے اور اگر ظاہر ہوتے تو اُن پر وہ عذاب اور مصیبتیں نازل ہوتی تھیں جن کو جھیلنا تو درکنار دیکھنا بھی دشوار تھا لیکن اس سخت اندیشہ اور مصیبت کیوقت بھی اسلام کی جلوہ افروزی بڑھتی جاتی تھی۔ اسلام اندر ہی اندر ترقی کر رہا تھا اُس کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ تھوڑے سے غور و تامل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ترقی اور اشاعت کی بنیاد ایسے وقت مستحکم ہوئی جبکہ مسلمانوں پر طرح طرح سے جور و ستم کئے جاتے تھے اور اُن کو دین سے ہٹا دینے کی کوئی ممکن تدبیر بھی اٹھائی نہ جاتی تھی۔ اسلام اپنے سچے اور سادہ اُصول کا سکہ بٹھلا رہا تھا اور قریش مکہ کے بڑے بڑے گھروں میں اسلام کی شعاعیں پہنچ رہی تھیں۔ اسلام کی قوت و شوکت کا جن پر زیادہ مدار ہے اور جو لوگ خلافت راشدہ کے درجہ پر پہنچے جن کے علم و عمل سے اسلام کو رونق ہوئی

وہ اسی سخت خوف و روپوشی کے زمانہ میں مسلمان ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے کا واقعہ کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے۔ گھر سے تلوار لیکر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر کے چلے تھے راستہ میں ایک شخص نے پوچھا کہ اس طرح تلوار لئے ہوئے کہاں جاتے ہو۔ کہا اُس شخص کے قتل کیلئے جاتا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا۔ اُن کے دین کی علی الاعلان مذمت کی۔ اُس شخص نے کہا کہ اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہارے بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سُن کر غصہ میں بھرے بہن کے گھر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور حضرت خبابؓ دونوں کو کلام الٰہی کی تعلیم دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے خبابؓ کی آواز سُن لی۔ دروازہ کھلوایا اور پوچھا کہ تم دونوں کیا پڑھتے تھے۔ دونوں نے انکار کیا کہ کچھ نہیں۔ کہا نہیں میں نے سُنا ہے کہ تم مسلمان ہو گئے ہو۔ یہ کہکر بہنوئی کو مارنے کھڑے ہو گئے۔ بہن نے چھڑانا چاہا تو اُن کو بھی زخمی کر دیا۔ بہن نے کہا بیشک ہم مسلمان ہو چکے ہیں۔ تم جو چاہو کرو۔ حضرت عمرؓ بہن کو خون آلودہ دیکھ کر نرم ہوئے اور کہا کہ یہ کاغذ جو تم پڑھتے تھے مجھے دو۔ اُنھوں نے کہا کہ تم مشرک نجس ہو اور کلام الٰہی کو نجس ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور سورۂ طٰہٰ کو جو اُس میں لکھی ہوئی تھی پڑھ کر کہا کہ یہ کیسا اچھا کلام ہے۔ خبابؓ جو اندر چھپے ہوئے بیٹھے تھے حضرت عمرؓ سے یہ الفاظ سُن کر باہر نکلے اور کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تمہارے بارے میں قبول فرمائی آپ نے کل دعا کی تھی کہ "الٰہی دین اسلام کو دو شخصوں میں سے ایک کے مسلمان ہونے سے تقویت پہنچا۔ ابوجہل بن ہشام یا عمر بن خطاب ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے" حضرت عمرؓ نے خبابؓ سے کہا کہ مجھے آپ کی خدمت میں لے چلو کہ مسلمان ہو جاؤں وہاں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔

جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے کفار کی تکلیف دہی سے جب بالکل تنگ آ گئے اور کوئی صورت یہاں رہنے۔ زندگی بسر کرنے۔ ارکان اسلام ادا کرنے کی نہ رہی۔ تو رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے جائیں۔ اور نجاشی بادشاہ کی

امن وحفاظت میں رہیں۔ نجاشی نصرانی تھا اور وہاں کے باشندوں کا مذہب عیسائی تھا۔ نجاشی کو غائبانہ بیٹھے ہوئے آپ کے حالات سُنکر اور مہاجرین کے طریق و انداز سے اسلام کی سچائی کا یقین ہو گیا۔

قریش مکہ یہ دیکھ کر کہ مسلمان تو حبشہ میں جا کر مطمئن ہو گئے اور آزادی سے ارکان اسلام ادا کرنے لگے۔ نجاشی نے اُنکی بہت مدارات کی۔ بہت گھبرائے اور مشورہ کرکے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی اُمیہ کو نجاشی اور اُس کے درباری لوگوں کے واسطے قیمتی ہدایا دیکر بھیجا حبشہ کے بڑے بڑے سرداروں سے ملکر کہا کہ ہمارے یہاں کے چند نادان قدیمی مذہب کو چھوڑ کر ایک جدید مذہب کے تابع ہو گئے ہیں۔ ہم اس لئے آئے ہیں کہ بادشاہ سے کہکر اُن کو ہمارے سپرد کرادو بادشاہ کو اُن سے بلاواسطہ گفتگو کرنے کی نوبت نہ آئے ورنہ ہمارے سپرد نہ کئے جائیں گے۔ سرداروں نے وعدہ کر لیا کہ ہم اس بارہ میں پوری تائید کرینگے ان لوگوں نے نجاشی سے ملکر اپنا مدعا بیان کیا۔ اعیان دربار نے اس کی تائید کی کہ بیشک اُن لوگوں کو اُنکے سپرد کر دینا چاہیئے۔ نجاشی نے غصہ ہو کر کہا کہ جو میری امن میں آ کر رہے ہیں۔ ہر گز ان کو سپرد نہ کرونگا تاوقتیکہ گفتگو نہ کر لوں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا۔

مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ آخر نجاشی عیسائی ہے۔ اگر ہم نے اسلام کے عقائد توحید وغیرہ کو صاف بیان کیا تو وہ بھی برہم ہو گا۔ مگر مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ بات سچّی اور صاف کہیں گے کسی کو بری معلوم ہو یا بھلی۔

یہ تھا کمال ایمانی کہ جان بچانے کیواسطے وطن کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے مگر اسکی پروا نہ کی کہ نجاشی ہمکو یہاں رہنے دیگا یا اُن لوگوں کو جو لینے آئے ہیں سپرد کر دے گا اور سچ اور صاف کہنے پر آمادہ ہو گئے۔ سب میں سے حضرت جعفرؓ گفتگو کرنے کیلئے منتخب ہوئے۔ نجاشی نے پوچھا کہ وہ دین کونسا ہے جسکی وجہ سے تم نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا اور ہمارے مذہب (عیسائیت) میں بھی داخل نہوئے اور نہ کسی اور مذہب میں۔ حضرت جعفرؓ نے بیان کرنا شروع کیا کہ "ہم بت پرست

لوگ تھے اور ہر قسم کی بُرائیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضل فرمایا ہماری طرف ایک رسول کو بھیجا جن کے نسب و حسب صدق و دیانت امانت و پاکدامنی کو ہم خوب جانتے ہیں۔ اُنہوں نے ہم کو توحید کی تعلیم دی شرک سے بچایا۔ بتوں کی عبادت کو چھڑایا سچ بولنے۔ ادائے امانت۔ صلہ رحم ہمسایوں کے ساتھ سلوک۔ حرام باتوں سے بچنے۔ لوگوں کی جان کی حفاظت اور بدکاری کے ترک کا حکم دیا۔ نماز و روزے کی تعلیم دی" اسی طرح جملہ احکام اسلام بیان کردیے ہم اُس رسول پر ایمان لائے۔ اُن کا اتباع کیا۔ ہماری قوم نے ہم کو طرح طرح کے عذاب دے کر یہ چاہا کہ ہم کو اس دین سے چھیڑیں جب ہم پر بے انتہا ظلم ہوئے تو ہم مجبور ہو کر بادشاہ کی پناہ میں آئے اور بادشاہ کی ہمسائگی کو سب پر ترجیح دی اور یہ امید کر کے آئے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی نے کہا کہ "تم کو اُس کلام میں سے کچھ یاد ہے جو تمہارے نبی لائے ہیں"۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں جنکو سُن کر نجاشی اور سب اہل دربار رونے لگے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور جس کو حضرت عیسیٰؑ لائے تھے ایک ہی جگہ سے نازل ہوئے ہیں۔ اور قریش سے کہا کہ تم جاؤ میں ہرگز مسلمانوں کو تمہارے سپرد نہ کرونگا۔ دربار سے نکل کر عمرو بن العاص نے کہا کہ میں کل کو ایسی بات نجاشی سے کہونگا جس سے وہ ان کو بالکل نیست و نابود کردیگا۔ اگلے روز عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ یہ لوگ (یعنی مسلمان) حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سخت بات کہتے ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہم وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبیؐ نے فرمایا ہے" حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور اسکی روح اور کلمہ ہیں جنکو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی طرف ڈالا ہے نجاشی نے سُن کر کہا حضرت عیسیٰؑ نے بھی یہی کہا ہے جو تم کہتے ہو یہ سُن کر درباری لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی اور کچھ بڑبڑائے نجاشی نے کہا کہ اگرچہ تم کو ناگوار ہو مگر بات یہی ہے۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم امن سے رہو میں ایک سونے کے پہاڑ کی عوض میں بھی تم میں سے کسی ایک کو ستانا پسند نہیں کرتا۔ قریش کے ہدایا واپس کردیے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھکو یہ ملک بغیر رشوت کے دیا ہے میں تم سے رشوت لیکر کس طرح ان لوگوں کو نکال دوں۔

نجاشی کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ملک مجھکو بغیر رشوت کے دیا ہے ایک خاص واقعہ کی

طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ہم اس جگہ مناسب سمجھتے ہیں نجاشی اپنے باپ کا تنہا ایک ہی بیٹا تھا کوئی بھائی نہ تھا۔ اور اُسکے چچا کے بارہ بیٹے تھے۔ اہل حبشہ سے مشورہ کیا کہ نجاشی کے باپ کو قتل کر کے اُس کے بھائی کو بادشاہ بنانا چاہیے کیونکہ اُسکی اولاد بہت ہے چنانچہ اُس کو قتل کر کے اُس کے بھائی یعنی نجاشی کے چچا کو بادشاہ بنا دیا۔ نجاشی اپنے چچا کی تربیت میں آگیا۔ چونکہ عاقل اور مدبر تھا۔ چچا کے یہاں اُسکی بات بہت بڑھ گئی۔

اہل حبشہ کو خوف ہوا کہ اگر نجاشی کا یہی اقتدار رہا تو ہم سے اپنے باپ کا بدلہ ضرور لیگا انہوں نے مشورہ کر کے بادشاہ سے کہا کہ نجاشی کو قتل کر دو یا جلا وطن۔ بادشاہ نے مجبوراً جلا وطن کرنیکو منظور کیا۔ یہ لوگ نجاشی کو بازار میں لیگئے اور ایک تاجر کے ہاتھ چھ سو درہم کے بدلے فروخت کر دیا۔ تاجر نجاشی کو لیکر کشتی میں سوار ہو گیا رات کو بادشاہ پر بجلی گری اور وہ مر گیا۔ اولاد میں کوئی کسی قابل نہ تھا اُس وقت لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اگر ملک کی بھلائی منظور ہے تو نجاشی کو لا کر تخت پر بٹھلاؤ لوگ گئے اور نجاشی کو تاجر کے پاس سے واپس لا کر تخت نشین کیا۔

نجاشی نے اس قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مجھکو تختِ سلطنت عطا فرمایا تو کیا میں رشوت لیکر ناحق کا ارتکاب کروں۔

الحاصل کفار قریش بے نیل و مرام واپس ہوئے مسلمان نہایت آرام کے ساتھ حبشہ میں رہے اور جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے آئے اُس وقت یہ لوگ بھی حبشہ سے مدینہ واپس آئے۔ آخر کار نجاشی بھی مسلمان ہو گیا۔ یہ اسلام کی پرزور تاثیر تھی اُس وقت جبکہ مسلمانوں کو دنیا میں امن سے رہنا بھی دشوار تھا۔ چہ جائیکہ کسی سے مقابلہ کرتے۔

اسلام کی ترقی اور اشاعت شوکت و قوت کا اصلی زمانہ ہجرت کے بعد کا ہے انصار مدینہ نے اپنے جان و مال آپ پر فدا کئے۔ مہاجرین کو اپنے گھروں میں ٹھیرایا۔ اپنی جائدادمیں گھر بار میں انکو حصہ دیا۔ اسلام کیلئے اپنی جانیں قربان کر دیں اور جو کچھ ہوا تاریخیں اُن کے حالات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن انصار میں اسلام کب اور کیونکر شائع ہوا؟ یہ بھی اُسی وقت جبکہ اسلام کا لفظ زبان پر

آنا اوّل درجہ کا جرم تھا۔ اُن کے جان و مال مباح سمجھے جاتے تھے۔

موسم حج میں آپ کی عادت شریفہ تھی کہ جو قبائل حج کو آتے تھے اُن سے مل کر اسلام کی حقیقت اور اُس کی خوبیاں بیان فرماتے تھے۔ ایک سال مدینہ کے چند لوگوں کو دعوتِ اسلام دی۔ یہ لوگ یہود سے سُنا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبیؐ عرب میں مبعوث ہونے والے ہیں۔ اُنہوں نے سُن کر آپس میں کہا کہ یہی نبیؐ مبعوث ہیں۔ مدینہ لوٹ کر گئے اور وہاں جاکر ذکر کیا تو گھر گھر آپ کا ذکر پھیل گیا۔ اگلے سال بارہ آدمی مدینے سے اور آئے اور عقبہ پر آپ سے ملے اور اسلام لے آئے۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اُن کے ساتھ کیا کہ اُن کو تعلیم قرآن دیں دین کے احکام سکھلائیں۔

مصعب بن عمیرؓ مدینے میں پہنچکر اسعد بن ضرارہؓ کے یہاں ٹھہرے۔ وہاں مسلمان اُن کے پاس جمع ہو گئے۔ سعد بن معاذؓ اور اُسید بن حضیرؓ دونوں سردار تھے اُن کو خبر ہوئی تو سعدؓ نے اُسیدؓ سے کہا کہ تم جاکر اُن لوگوں کو روکو۔ اُسیدؓ گئے اور غصہ سے حضرت مصعبؓ کو خطاب کر کے کہا کہ تم کیوں ہمارے نوجوانوں کو بہکانے آئے ہو یہاں سے چلے جاؤ۔ مصعبؓ نے کہا کہ یا ایسا ہو کہ آپ بیٹھ کر ہماری بات سُن لیں۔ اگر پسند ہو تو آپ بھی قبول کریں۔ اُسیدؓ نے کہا۔ اچھا مصعبؓ نے اسلام کے احکام بیان کئے۔ اُسیدؓ نے سُن کر کہا کہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اور اُسی وقت مسلمان ہو گئے اور کہا کہ ایک شخص اور ہیں (یعنی سعدؓ بن معاذؓ) اگر وہ مسلمان ہو گئے تو پھر کوئی باقی نہ رہیگا۔ یہ کہکر اُسیدؓ لوٹے سعدؓ نے دور سے دیکھ کر کہا کہ اُسیدؓ اس حال پر نہیں آئے جس پر گئے تھے یعنی مسلمان ہو گئے ہیں اُسیدؓ نے آکر کہا کہ اُن کی بات میں تو کچھ حرج نہیں ہے۔ سعدؓ خود وہاں گئے اُن کو بھی یہی پیش آیا کہ مصعبؓ نے اُن کے سامنے احکامِ اسلام بیان کئے اور وہ بھی مسلمان ہو گئے۔

سعدؓ مسلمان ہو کر لوٹے تو اُسید کو اپنے ہمراہ لیکر اپنی قوم کے پاس گئے اور کہا کہ تم مجھکو کیسا سمجھتے ہو؟ سب نے کہا کہ تم ہمارے سردار اور سب سے افضل ہو۔ سعدؓ نے کہا کہ تو مجھ پر اُس وقت تک تمہارے مرد اور عورت سے گفتگو کرنا حرام ہے جبتک کہ تم سب مسلمان نہو جاؤ۔ شام تک سعدؓ کی

قوم یعنی بنی عبدالاشہل میں ایک بھی باقی نہ رہا جو کہ مسلمان نہ ہو گیا ہو۔ اس کے بعد مصعب رضؓ تلقین اسلام میں مصروف رہے اور انصار کے اکثر قبائل میں اسلام پھیل گیا۔

دوسرے سال مدینے سے ستر مسلمان کفار کے ساتھ ملے جُلے ہوئے آئے اور اپنے ارادے کو مخفی رکھا۔ مکہ میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقبہ میں ملاقات کی اور سب نے آپ کے ہاتھ پر بدیں مضمون بیعت کی کہ ہم آپ کی ایسی حفاظت کریں گے جیسی اپنے بچوں اور عورتوں کی کرتے ہیں۔ یہ بیعت ذی الحجہ میں ہوئی اس کے ۲ ماہ بعد ربیع الاوّل میں آپ نے مدینے کو ہجرت فرمائی۔

کفار مکہ کو جب یہ خبر ہوئی کہ مدینے کے لوگ مسلمان ہو گئے اور آپ وہاں جانیوالے ہیں تو اُنھوں نے مسلمانوں پر بہت ہی سختی شروع کر دی۔ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ مدینے کو ہجرت کریں۔ چنانچہ مسلمان رفتہ رفتہ ہجرت کرنے لگے۔

یہ صورت ہے انصار کے مسلمان ہونے اور مدینے میں اسلام پھیلنے کی۔ انصار ہی کے اسلام لانے سے اسلام کی ترقی واشاعت۔ شوکت وحشمت کا دور شروع ہوا ہے۔

یہ چند واقعات اسلام کی اشاعت کے ہجرت سے پہلے کے ہیں۔ جس وقت جبر واکراہ تو بجائے خود رہا۔ قتل وقتال لڑائی جھگڑے تک کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اسلام اصولی طور پر پورا مستحکم ہو چکا تھا۔

ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں اسلام لانا نہ جان بچانیکی وجہ سے تھا نہ طمع جاہ ومال کی وجہ سے۔ بلکہ اسلام لاکر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ ان ہی خطرات اور مصائب کے مقابلے کی وجہ سے مہاجرین فضیلت میں اوّل درجے پر ہیں۔ انصار بھی اسی درجہ میں ہوتے لیکن اس وجہ سے کہ انصار کو وہ تکالیف جھیلنی نہیں پڑیں جو مہاجرین کو پڑی تھیں اس لئے دوسرے درجہ میں آ گئے۔ ورنہ اسلام لانے کی شان دونوں کی مساوی ہے اور پھر اسلام کی حقیقی ترقی اور استحکام اُسی وقت ہوا۔ اور اُس کے تمام آیندہ عروج کی بنیاد

اُسی وقت پڑی تو صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کے ذاتی محاسن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسخیرِ اخلاق مسلمانوں کا طرزِ عمل اسلام کی اصل اشاعت کے اسباب ہیں۔

ہجرت سے اسلام کی اصلی شوکت و عظمت کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اور حقیقت میں اسلام کی ترقی کا زمانہ اسی وقت سے شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی ابتداء ہجرت سے کیگئی لیکن ہمارے سابق بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی اسلام اصولاً مستحکم و مضبوط ہو چکا تھا۔ مکّہ معظمہ کے سب بڑے بڑے خاندانوں میں باوجود سخت سے سخت مزاحمتوں کے اسلام اپنا رنگ جما چکا تھا۔ یہاں تک کہ مکّہ معظمہ سے متجاوز ہو کر حبشہ تک اور ادھر مدینہ منورہ تک اسلام کا اثر پہنچ گیا تھا۔ مدینہ کے قبیلہ اوس و خزرج کے لوگ (جو بعد میں انصار کے معزز اور قابل فخر خطاب سے ملقب ہوئے) اُس وقت مسلمان ہوئے۔ جبکہ اہلِ مکہ کے نزدیک اسلام سے بڑھ کر کوئی جرم نہ تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلان کے ساتھ کسی کو تلقین نہ فرما سکتے تھے۔ اہلِ مدینہ نے عقبہ پر بیعت ضرور کی لیکن اس طرح اخفا اور رازداری کے ساتھ کہ نہ اہلِ مکہ کو خبر ہوئی اور نہ اُن کے رفقار کو جو مدینے سے بقصد حج اُن کے ساتھ مکہ میں آئے تھے۔ مدینہ کے دونوں قبیلے جو صدیوں سے باہمی جنگ و جدل میں مبتلا تھے آپکی زبانِ مبارک سے اسلام کے احکام اور محاسن سُنکر اس فریفتگی کے ساتھ مسلمان ہوئے کہ قبل از ہجرت ہی گویا عملاً تمام مدینہ مسلمان ہو چکا تھا۔ مدینے کے چند ہی لوگوں نے جمالِ مبارک کی زیارت کی تھی اور اُن میں بھی کسی کو آپکی خدمت میں رہنے اور فیض صحبت اُٹھانے کی نوبت نہ آئی تھی لیکن وہ کیسا قوی اور دیرپا اثر تھا کہ چند منٹ میں ایسے رنگے گئے کہ سارے مدینے کو اُسی رنگ میں رنگدیا۔ مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پھیل گیا اور وہاں کے مرد و عورت بچے بوڑھے اسلام پر فریفتہ محبتِ خدا و رسول میں سرشار ہو گئے اور نہایت اشتیاق کے ساتھ آپکی تشریف آوری کے دن گننے لگے اور جس وقت مدینے میں یہ اطلاع پہنچی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم مکّہ معظمہ سے بقصد مدینہ روانہ ہو چکے ہیں تو مدینے میں عجب طرح کی خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ روزمرہ انصار مدینہ آپکے استقبال کیلئے حرہ[1] تک نکلتے تھے

[1] حرّہ مدینہ کے باہر ایک ... کا نام ہے۔

اور جب ٹھیک دوپہر ہو جاتا تھا لوٹ آتے تھے جس روز آپ مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے اُس روز بھی ایسا ہی ہوا کہ انصار صبح سے دوپہر تک منتظر بیٹھے رہے۔ اور جب ٹھیک دوپہر ہو گیا واپس ہو گئے۔ سب سے اوّل ایک یہودی نے آپکو دیکھا اور انصار کو باواز بلند پکار کر اطلاع دی۔ انصار آواز سنتے ہی نکلے اور آپکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت برار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ مدینہ کبھی کسی چیز سے اس قدر خوش نہ ہوئے جس قدر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے خوش ہوئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے میں داخل ہوئے اُس کی ہر چیز روشن ہو گئی۔ پردہ نشین عورتیں۔ کنواری لڑکیاں خوشی کی وجہ سے جمالِ مبارک کی زیارت کیلئے چھتوں پر چڑھ گئیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے منورہ میں داخل ہوئے عورتیں اور بچّے یہ شعر پڑھتے تھے ؎

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
چودھویں رات کے چاند نے	ثنیات وداع[1] کی طرف سے ہم پر طلوع کیا
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
ہم پر شکر واجب ہے	جبتک اللہ تعالیٰ کو کوئی پکارنیوالا پکارے (قیامت تک)
اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا	جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ
اے ہم میں بھیجے گئے نبیؐ	تم ایسے امر کو لیکر آئے ہو جسکی طاعت واجب ہے

انصار کے قبیلۂ بنی نجار کی چند لڑکیاں یہ شعر گاتی تھیں

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ	يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارِ
ہم چند لڑکیاں ہیں بنی نجار کی	محمد صلے اللہ علیہ آلہ وسلم کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لڑکیوں سے فرمایا کہ اللہ جانتا ہے کہ میرے

[1] ثنیۃ الوداع مدینۂ منورہ کے قریب ایک گھاٹی کو کہتے ہیں۔ جہاں تک اہلِ مدینہ مسافروں کو رخصت کرنے جاتے ہیں ۱۲

دل میں بھی تمہاری محبت ہے۔

اہلِ مدینہ میں یہ جوش۔ یہ ولولہ۔ یہ محبت۔ یہ عقیدت۔ یہ فریفتگی۔ یہ شیفتگی۔ یہ جان نثاری۔ یہ غمخواری۔ کب اور کیونکر پیدا ہوئی۔ یہ باتیں اُس وقت پیدا ہو چکی تھیں۔ جبکہ کسی پر جبر و اکراہ تو کیا مکہ معظمہ میں مسلمانوں کو اپنی جان بچانی بھی بھاری ہو رہی تھی۔ اہلِ مدینہ کا مکہ معظمہ میں جانا اور مسلمان ہونا نہ کسی دباؤ کی وجہ سے ہوا اور نہ کسی دنیاوی غرض اور فائدے کے لئے بلکہ اسلام قبول کر کے تمام دنیا کو اپنا مقابل و مخالف بنا لیا اور اپنی جان و مال وعزت و آبرو کو خطرہ و ہلاکی میں ڈالا۔

دوسری مرتبہ بیعت عقبہ کیلئے جب انصار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جمع ہوئے تو عباس بن نضلہ انصاری نے پختہ کرنے کی غرض سے انصار کو خطاب کر کے کہا کہ اے جماعت انصار دیکھ تو لو تم کس بات پر اس شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو۔ تم دُنیا کی مخالفت اور اسود و احمر کے مقابلے کے لئے بیعت کرتے ہو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ جب تمہارے اشراف قتل ہو جائیں تمہارے مال ہلاک ہو جائیں تو تم ان کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفار مکہ کے سپرد کر دو گے تو ابھی سے اس قصے کو چھوڑ بیٹھو کیونکہ اس صورت میں دنیا و آخرت کی رسوائی ہے۔ اور اگر تم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ پوری طرح وفاداری کرو گے تو اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔ سب نے کہا کہ ہم اسی بات پر بیعت کرتے ہیں کہ مال ہلاک ہو جائیں۔ ہمارے سردار قتل ہو جائیں مگر ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔

مدینہ منورہ میں اسلام کا جمنا گویا تمام عالم میں اسلام کے پھیلنے کا پیش خیمہ تھا جس کی بنیاد مکہ معظمہ میں عقبہ اولیٰ و ثانیہ کی بیعت سے پڑی اور ہجرت سے اسکی عملی کارروائی شروع ہوئی۔ اس وقت اگرچہ کفار کی ایذا رسانی حد سے گذر جانے اور مسلمانوں کی مظلومیت ناقابل برداشت درجہ پر پہنچ جانے کی وجہ سے آپ کو محاربات کی اجازت مل چکی تھی اور یہ آیت جس سے اجازت محاربات کی ابتدا ہوتی ہے نازل ہو چکی تھی۔

اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا۔

(لڑائی کی اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن سے کفار جنگ کرتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ مظلوم ہیں۔

اور ہجرت کے بعد اہلِ اسلام اور کفار میں متعدد مقابلہ بھی ہوئے جن میں سے بہت سی جگہ آپ کو بہ نفس نفیس تشریف لیجانا ہوا۔ مگر جن واقعات کو ہم یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں اُن سے بخوبی ثابت ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کی چال اب بھی ویسی ہی تھی جو قبل از ہجرت نہایت مظلومی اور بے بسی کے زمانے میں تھی۔ اسلام جس قدر پھیلا اپنی خوبیوں اور آپ کے حسنِ اخلاق اور برگزیدہ تعلیم کی وجہ سے پھیلا جس نے اسلام قبول کیا بطوع و رغبت قبول کیا غالباً کوئی مخالف بھی کسی ایک تاریخی صحیح واقعہ کے حوالہ سے ثابت نہ کرسکیگا کہ کسی ایک شخص کو بھی بزور مسلمان بنایا گیا۔

حضرت عبداللہ بن سلام کا مسلمان ہونا تاریخ شاہد ہے اور غالباً کسی کو بھی اس میں انکار نہ ہوگا کہ جس عداوت اور دشمنی کا اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یہود کی طرف سے ہوا مشرکین کے بعد کسی قوم کی طرف سے نہیں ہوا۔ کلام اللہ میں بھی صاف لفظوں میں یہ ارشاد ہے لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَہُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا

(بلاشبہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ دشمن تم یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤگے)

یہود کو یقینی طور پر آپ کی نبوت و رسالت کا علم تھا اور وہ آپ کے منتظر تھے قبیلہ اوس و خزرج کو اسی بناپر دھمکایا کرتے تھے کہ نبی آخر الزمان مبعوث ہونے والے ہیں۔ اُسوقت ہم اُن کے ساتھ ہوکر تم کو قتل کریں گے۔ مگر حب ریاست۔ نفسانیت و عناد اُن کو ایمان لانے اور اتباع کرنے سے مانع آئے۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جاہل سمجھانے کے بعد راہِ راست پر آجاتے ہیں مگر جان بوجھ کر خلاف کرنیوالوں سے کبھی توقع نہیں ہوسکتی۔

عبداللہ بن سلام بھی انہیں یہود مدینہ میں سے تھے اور تورات کے بڑے عالم تھے عبداللہ بن سلام اُسی وقت مسلمان ہوگئے تھے جبکہ آپ قبا میں فروکش ہوئے ہیں اور خاص مدینے میں ابھی تک داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔ اُنھوں نے خود اپنے اسلام لانے کا قصہ اس طرح بیان

کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اور صفت سے واقف تھا اور اُس
زمانے کو بھی جانتا تھا جس میں آپکے ظہور کا انتظار کیا جاتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم قبا میں فروکش ہوئے تو میں ایک کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا۔ ایک شخص نے
آپ کے تشریف لانے کی خبر دی میں نے سُن کر درخت کے اوپر ہی سے مارے خوشی کے
زور سے اللہ اکبر کہا میری پھوپی نیچے بیٹھی تھیں۔ اُنھوں نے کہا کہ خدا تجھکو کھودے تو
اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے کی خبر بھی سُنتا تو اس سے زیادہ اظہار مسرت
نہ کرتا میں نے کہا اے پھوپی خدا کی قسم یہ موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں اور وہی طریقہ لائے
ہیں۔ پھوپی نے کہا کیا یہ وہی نبی ہیں جن کے مبعوث ہونے کی خبر ہم کو دی گئی تھی اُنھوں نے
سُن کر کہا کہ تو خیر عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ سب گھر والوں کو اطلاع کی وہ بھی مسلمان ہو گئے
لیکن میں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا اور ایک روز آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا
کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ یہود بہتان لگانیوالی قوم ہے میں چاہتا ہوں کہ مجھکو
کسی مکان میں بٹھلا کر قبل اس کے کہ میرے اسلام لانے کا اُن کو علم ہو یہود سے میرا حال دریافت
فرمالیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ یہود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے مجھ کو علیحدہ مکان
میں بٹھلا کر اُن سے دریافت فرمایا کہ حصین بن سلام (اصل نام حصین تھا بعد میں عبداللہ ہو گیا)
تم میں کیسا شخص ہے سب نے کہا کہ ہمارا سردار اور سردار کا بیٹا بڑا عالم اور دانا ہے جب
وہ کہہ چکے تو میں نے باہر نکل کر کہا کہ اے جماعتِ یہود تم جانتے ہو کہ آپ رسول اللہ ہیں۔
تمہارے یہاں توراۃ میں آپ کا نام اور صفت درج ہے خدا سے ڈرو اور ایمان لے آؤ۔
میں تو شہادت دیتا ہوں اور آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ یہود یہ سُنتے ہی بدل گئے اور مجھپر بہتان
لگانے لگے اور میری عیب جوئی شروع کر دی۔ میں نے کہا کہ یارسول اللہ میں اول ہی کہتا تھا
کہ یہود جھوٹے اور کذاب ہیں اس لئے میں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ میری پھوپی بھی

اچھی اور پکی مسلمان ہوگئیں۔

حضرت سلمان فارسی کا مسلمان ہونا

عبداللہ بن سلامؓ کے اسلام سے زیادہ دلچسپ واقعہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام کا ہے۔ حضرت سلمانؓ فارس کے ایک شہر رامہرمز کے رہنے والے تھے۔ بادشاہانِ فارس کی اولاد میں سے تھے۔ اصل نام اُن کا اسلام سے پہلے مابہ تھا۔ باپ کا نام بودخشاں تھا۔ باپ اپنی جگہ کا چودھری سردار اور زمیندار تھا۔ حضرت سلمان کی عمر بہت زیادہ ہوئی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اُنہوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دیکھا اور بعض کا قول ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے کسی وصی کو دیکھا ہے۔ بعض کے نزدیک اُن کی عمر ساڑھے تین سو برس کی ہوئی ہے۔ لیکن اس پر تو گویا اتفاق اور اجماع ہے کہ دو سو پچاس برس کی عمر ہوئی۔ مذہباً مجوس تھے اور یہ اور اُن کا باپ آتش کدہ کے محافظ اور خازن تھے۔ لیکن مسلمان ہونے کی شرافت اور بزرگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض صحبت سے مستفیض اور جمال مبارک کی زیارت سے مشرف ہونیکی سعادت فیاض ازل نے اُنکی قسمت میں لکھی تھی مشیت ازلی نے غلامی کی ذلت میں پھنساکر لازوال سلطنت تک پہنچا دیا۔ دس سے اوپر مالکوں کی غلامی میں رہنے کے بعد مدینے کے ایک یہودی کی غلامی میں پہنچے اور وہاں اُس شقی ازلی۔ اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن کے گھر اور زیر اثر رہ کر اسلام کی دولت سے مالامال ہوئے۔

حضرت سلمان نے اپنے مسلمان ہونیکا حال اس طرح بیان فرمایا ہے کہ میرا باپ اپنے شہر کا سردار تھا۔ میں سب سے زیادہ اُس کو محبوب تھا۔ مجھکو باہر نہ جانے دیتا تھا۔ لڑکیوں کی طرح میری حفاظت کرتا تھا۔ میں ہمیشہ آتشکدہ میں رہتا تھا اور مذہب مجوس کو خوب کوشش کر کے حاصل کیا تھا۔ اتفاق سے میرا باپ ایک مکان بنوانے میں مصروف ہوگیا۔ مجھ سے کہا کہ تو جاکر زمین کو دیکھ آ مجھ کو فرصت نہیں مگر دیر نہ کرنا ورنہ تیری جُدائی کا فکر سب کاموں سے بڑھ جائیگا میں گھر سے نکل کر راستہ میں نصارٰی کے کنیسہ پر گذرا وہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے میں بھی وہاں

چلا گیا اور مجھکو اُن کی حالت نہایت پسند آئی میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ دین ہمارے دین سے بہتر ہی۔ شام تک اُنہیں کے پاس رہا۔ نہ زمین تک گیا نہ گھر لوٹا۔ دیر ہوگئی تو باپ نے تلاش میں آدمی بھیجے میں نے نصارٰی سے پوچھا کہ اس دین نصرانیت کی اصل کہاں ہی اُن لوگوں نے جوابدیا کہ ملک شام میں آخر کار رات ہونے پر گھر لوٹا۔ باپ سخت انتظار میں تھا میں نے باپ سے کنیسہ میں جانیکا قصہ بیان کرکے کہا کہ اُن کا دین ہمارے دین سے بہتر ہی باپنے کہا بیٹے! تیرا اور تیرے باپ دادا کا دین بہتر ہے۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ باپنے مجھکو قید میں ڈالدیا۔ بیڑیاں پیروں میں ڈال دیں۔ میں نے نصارا سے کہلا بھیجا کہ جب کوئی قافلہ شام کو جائے تو مجھکو مطلع کرنا۔ اُنہوں نے مجھے مطلع کیا۔ میں نے بیڑیاں پیروں سے نکال کر پھینک دیں اور قافلے کے ساتھ ملک شام میں پہنچا۔ وہاں جاکر اُن لوگوں سے پوچھا کہ بڑا عالم کون ہے۔ اُنہوں نے بڑے پادری کا نام بتلایا۔ میں نے اُسکے پاس جاکر کہا کہ میں تمہارے پاس رہنا خدمت کرنا اور تمہارے ساتھ عبادت کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے کہا بہتر ہے۔ میں اُس کے پاس رہا۔ مگر وہ بڑا بد دین آدمی تھا۔ لوگوں کو صدقے کے واسطے حکم کرتا تھا اور صدقے لیکر خود جمع کرلیتا تھا۔ یہاں تک کہ سونے چاندی کے سات مٹکے اُس کے پاس جمع ہوگئے تھے۔ وہ مرگیا تو نصارٰی سے میں نے اُسکے حال کی اطلاع کی اُن لوگوں نے بوجہ حسنِ عقیدت مجھکو جھڑک دیا میں نے اُن کو وہ مٹکے دکھلائے تب تو اُنہوں نے اُسکی لاش کو دفن بھی نہ کیا۔ ملکہ لٹکا کر سنگسار کردیا۔ اُس کی جگہ ایک نہایت اچھا عالم فاضل زاہد بٹھلایا گیا مجھکو اُس سے بہت محبت ہوگئی۔ جب اُسکی وفات کا وقت آیا تو میں نے کہا کہ مجھ کو کچھ وصیت کرو کہا موصل[1] میں ایک شخص ہے تم وہاں چلے جاؤ میں وہاں گیا اور اُن کی خدمت میں رہا۔ یہ بھی ایسے ہی عالم زاہد صالح تھے۔ اُن کی وفات کا وقت آیا تو میں نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ کہا کہ اس طریقہ پر اب کوئی شخص نہیں ہی البتہ عمودیہ میں ایک

---

[1] موصل ملک شام میں ایک بڑا شہر ہے ۱۲۔

شخص ہے وہاں چلے جاؤ میں نے وہاں جا کر اپنا سب حال بیان کیا اُنہوں نے مجھکو ٹھیرنیکا حکم دیا میرے پاس وہاں کچھ بکریاں اور گائیں جمع ہو گئیں جب اُن کی وفات کا وقت آیا۔ تو میں نے عرض کیا کہ اب کس کے پاس جاؤں۔ فرمایا کہ اب دنیا میں کوئی شخص اس برگزیدہ طریقے پر معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ ایک نبی کا زمانہ قریب آگیا ہے جو دین ابراہیمی لے کر آئیں گے وہ ایسی جگہ ہجرت کر کے جائیں گے جہاں کھجور کے درخت ہیں۔ اُن کی خاص علامتیں ہیں۔ مونڈھوں کے درمیان میں خاتم نبوت ہے۔ صدقے کی چیز نہ کھائیں گے۔ ہدیہ کو قبول کریں گے۔ اگر تم سے ممکن ہو تو اُن کے پاس چلے جانا۔ اتفاق سے عرب کا ایک قافلہ وہاں کو گذرا میں نے اُن لوگوں سے کہا کہ مجھ کو اپنے ساتھ لے چلو۔ میں اپنی بکریاں اور گائیں تمکو دیدوں گا۔ وہ وادی القریٰ تک مجھ کو لے گئے۔ مگر وہاں ایک یہودی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ وہاں میں کھجور کے درخت دیکھ کر سمجھا کہ یہی وہ جگہ ہے۔ میرے مالک کے یہاں بنی قریظہ کا ایک یہودی مہمان ہوا وہ مجھ کو خرید کر اپنے ساتھ مدینے میں لے آیا میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی جگہ ہے۔ میں اپنے مالک کے یہاں درختوں کا کام کرتا رہا اور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے قصے کو بھول گیا۔ اسی اثنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے منورہ میں تشریف لا کر قبا میں قیام پذیر ہوئے میں ایک روز اپنے مالک کے درختوں میں کام کر رہا تھا کہ اُس کے چچا کے بیٹے نے آکر کہا کہ خدا تعالیٰ بنی قیلہ (یعنی انصار) کو قتل کرے ایک شخص کے گرد جمع ہو رہے ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ یہ سنتے ہی میرے بدن میں لرزہ پیدا ہو گیا قریب تھا کہ درخت پر سے گر پڑوں جلدی سے اُتر آیا اور پوچھا کیا بات ہے آقا نے زور سے ایک مکا مارا اور کہا تو اپنا کام کر تجھکو اس قصے سے کیا تعلق مجبور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن شام کو کچھ کھانیکی چیز اپنے ساتھ لیکر آپکی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ صدقہ ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں آپنے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور ساتھیوں سے فرمایا کہ تم کھاؤ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ اُن علامتوں میں سے ایک ہے۔ دوسرے

روز پھر کھجور لے گیا اور عرض کیا یہ ہدیہ ہے - آپ نے خود بھی اس میں سے کچھ کھایا - میں نے کہا یہ دوسری علامت ہے - ایک روز خدمت میں حاضر ہوا تو آپ جنازے کے ساتھ تشریف لئے جاتے تھے - میں نے سلام کیا اور آپکے پیچھے اس غرض سے ہولیا کہ خاتم نبوت کو دیکھوں آپ کو میرے اس قصد کی اطلاع ہو گئی - آپ نے چادر مبارک کو مونڈھوں سے نیچے گرا دیا - میں نے خاتم نبوت کو دیکھا اُس پر بوسہ دیا اور رو پڑا آپ نے مجھ کو اپنے سامنے بٹھلایا - ... اپنا سارا قصہ ابتدا سے بیان کیا - مگر بوجہ خدمت آقا آپ کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک ... پ نے فرمایا تم اپنے آقا سے کتابت[1] کرلو - میں نے اصرار کرکے آقا سے اس بات پر کتابت کرلی کہ تین سو پودے کھجور کے لگا دوں جنپر پھل آجائے اور چالیس اوقیہ سونا ادا کردوں آپ نے لوگوں کو ترغیب دی - سب نے دو دو چار چار پودے جمع کردیے - اور آپ نے دستِ مبارک سے اُنکو لگا دیا جو اُسی سال پھل لے آئے - اور اُسی طرح مال کتابت آپ نے ادا کردیا - اور میں آزاد ہو کر غزوہ خندق و احزاب میں شریک ہوا -

غزوۂ خندق و احزاب اُس واقعہ کا نام ہے جس میں کفار مکہ بسرداری ابوسفیان دس ہزار لشکر کے ساتھ اور تین ہزار دوسرے قبائل کے لوگوں کے ساتھ مدینہ منورہ پر چڑھ کر آئے تھے اور مدینے کا محاصرہ کیا تھا - اُس وقت حضرت سلمان رضی اللہ نے مدینے کے گرداگرد خندق کھودنے کی رائے دی تھی - حضرت سلمانؓ بہت قوت و جفاکشی سے خندق کھودنے میں شریک ہوئے تھے - اُنکی مستعدی جفاکشی اور اخلاص کو دیکھ کر مہاجرین و انصار میں جھگڑا ہوا مہاجرین کہتے تھے سلمانؓ ہم میں سے ہیں - انصار[2] کہتے تھے ہم میں سے ہیں دونوں کا فرمانا بجائے خود صحیح تھا - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختلاف کو سُن کر فرمایا کہ سلمان

---

[1] کتابت اُس کو کہتے ہیں کہ غلام اپنے آقا سے ٹھہرا لے کہ اس قدر معاوضہ ادا کردوں تو آزاد ہو جاؤں گا ۱۲

[2] کیونکہ ہجرت کرکے اور اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے اور عرصہ دراز سے مدینہ منورہ میں قیام تھا - جہاں کے مسلمان انصار کہلاتے ہیں -

اہل بیت میں سے ہیں۔ اس لئے سلمان مولٰی[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہلائے جاتے ہیں۔ حضرت سلمان کو سلمان الخیر بھی کہتے ہیں۔ اور وہ خود اپنے آپ کو سلمان ابن الاسلام فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما جس طرح مسلمان ہوئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو دعوت اسلام دینے کی نوبت بھی نہیں آئی بلکہ یہ پہلے ہی سے منتظر تھے۔ خبر سنتے ہی آکر مسلمان ہو گئے۔ حضرت عبداللہ خود عالم تھے۔ کتب سابقہ کے دیکھنے سے اُن کو ذاتی طور پر علم تھا۔ اور حضرت سلمان کو بڑے مقدس اور عالم نصرانی نے ہدایت کی تھی۔

مدینۂ منورہ میں منافق مدینۂ منورہ کے دو قبیلے اوس و خزرج اگرچہ اکثر مسلمان ہو گئے تھے مگر انمیں ایک جماعت منافقین کی بھی تھی جو ظاہر میں اسلام قبول کر چکے تھے مسلمانوں کے ساتھ ارکان اسلام ادا کرنے میں شریک رہتے تھے۔ مگر فی الحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں کے ساتھ لڑائیوں میں بھی شریک ہوتی تھی لیکن ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو ستانے اور تکلیف پہنچانے میں دریغ نہ کرتی تھی۔ مسلمانوں کی عیب جوئی ہر ہر بات پر اعتراض مسلمانوں میں تفریق ڈالنا انکا کام تھا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایذا دہی اور دشمن اسلام کے ٹھہرانے اور چھپانے کے واسطے ایک مسجد بھی بنائی تھی جسکا ذکر کلام اللہ میں مسجد ضرار کے نام سے کیا گیا ہے۔ ایسے مار آستین اور چھپے دشمن سے جیسے نقصانات پہنچتے ہیں اُس سے غالباً دنیا کا کوئی مدبّر اور ذی عقل بےخبر نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعۂ وحی نام بنام اُن کا علم تھا۔ مسلمان خود بھی اُنکو خوب جانتے تھے خصوصاً انصار کیونکہ یہ لوگ اُنہیں کی قوم میں سے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنکے بارہ میں جائز تشدد اور سختی کو بھی اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ اسلام کی اشاعت کو اُس کی حقانیت اور صداقت کے سپرد کر کے منافقین کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور جس قدر نرمی

[1] آزاد کردہ ۱۲

درگذر و ملاطفت ممکن تھی کی گئی۔

ایک دفعہ سفر میں دو شخصوں کے درمیان جن میں ایک مہاجرین کے ساتھ تھا۔ دوسرا انصار کے ساتھ۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ پہلے شخص نے مہاجرین کو دوسرے نے انصار کو اپنی اعانت کے لئے پکارا۔ منافقوں کا سردار عبداللہ بن اُبی اپنی قوم کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے یہ آواز سُن کر کہا کہ کیا یہاں تک نوبت آگئی۔ مہاجرین ایسا کرنے لگے۔ اب کی دفعہ مدینے لوٹ کر جاویں گے تو ہم میں جو عزت والا ہے ذلیلوں کو نکال دے گا۔ اور جو لوگ اُس کے پاس بیٹھے تھے اُن سے کہا یہ تم نے اپنے ہاتھ سے ایسا کیا ہے۔ اگر تم لوگ اب بھی اُن کی امداد نہ کرو تو یہ لوگ مدینے کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جاویں۔ زید بن ارقم نے یہ گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ عباد بن بشر کو حکم دیجئے وہ اس منافق کو قتل کر دیں گے ارشاد فرمایا۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں۔ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں لیکن آپ نے اس قصہ کو فرو کرنے کے لئے اُسی وقت قافلے کو کوچ کا حکم دیدیا۔ اُسید بن حضیرؓ نے جو سرداران انصار میں سے تھے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج بے وقت کوچ کا حکم کیوں دیا گیا۔ ارشاد فرمایا کیا تم نے عبداللہ بن اُبی کا مقولہ نہیں سُنا وہ کہتا ہے کہ مدینے پہنچکر عزت والے ذلیلوں کو نکال دیں گے۔ اُسید بن حضیرؓ نے عرض کیا کہ بس تو یا رسول اللہ آپ اُن کو نکال دیں گے۔ عبداللہ بن اُبی کو معلوم ہوا کہ یہ قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ گیا تو اُس نے آکر جھوٹی قسمیں کھائیں کہ میں نے ہرگز نہیں کہا۔ حاضرین نے بھی کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن ارقم لڑکے ہیں۔ شاید اُن سے غلطی ہو گئی ہو۔ لیکن اُس کے بعد ہی سورۂ منافقون نازل ہو گئی اور آپؐ نے زید بن ارقم کے کان کو پکڑ کر فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُس کے کان کی تصدیق فرمائی ہے۔

عبداللہ بن اُبی کے بیٹے جن کا نام بھی عبداللہ تھا۔ سچے مسلمان تھے اُن کو یہ سارا واقعہ معلوم ہوا تو حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا قصد میرے باپ کو قتل کرنیکا ہے اگر ایسا ہے تو آپ مجھے اجازت دیجیے میں خود اُس کا سر اُتار کر حاضر خدمت کرونگا۔ فرمایا نہیں ہم اُس کے ساتھ نرمی کریں گے۔ اور جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ حق صحبت ادا کریں گے۔ اس قصہ کے بعد یہ حال ہو گیا کہ جب عبداللہ بن اُبی کوئی ایسا ویسا کلمہ زبان سے نکالتا تھا۔ خود اُس کی قوم کے لوگ اُس کو ڈانٹ دیتے اور دھمکا دیتے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی صداقت اور دنیا کے تمام مذاہب پر غالب آجانے اور دنیا کے اس کونہ سے اُس کونہ تک پھیل جانے کا کامل یقین اور وعدہائے خداوند جلّ وعلا پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ان سخت مخالفوں اور اندرونی دشمنوں کی عداوت کو جو ہر وقت مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے سدراہ نہ سمجھا اور ایسے مجرموں کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمایا جن کیساتھ نرمی کرنیکو کسی سلطنت دنیوی کا قانون بھی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن انجام وہی ہوا۔ اسلام پوری قوت کیساتھ پھیلا اور مدینہ منورہ منافقوں کے وجود سے خود بخود پاک و صاف ہو گیا۔

صلح حدیبیہ ہجرت سے تیسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا قصد فرمایا ایک ہزار چار سو مسلمان ہمرکاب تھے۔ راستہ میں چلتے چلتے آپ کی ناقہ جس کا نام قصوا تھا بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ قصوا تھک گئی۔ آپ نے فرمایا کہ تھکی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے رُکی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اہل مکہ جو بات مجھ سے ایسی طلب کرینگے جس میں بیت اللہ کی حرمت ثابت ہوتی ہو قبول کرونگا۔ پھر ناقہ کو اشارہ فرمایا وہ کھڑی ہو کر چلنے لگی اور آپ مکہ معظمہ کے قریب حدیبیہ[1] میں مقیم ہوئے۔ کفار مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس میں نامہ و پیام شروع ہوا۔ کفار نے سخت سے سخت شرطیں پیش کیں آپ نے سب کو مانا اور نہایت

[1] حدیبیہ مکہ کے قریب ایک جگہ ہے جس کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے۔ ۱۲

دب کر مصالحت کرلی گئی۔ عہد نامہ میں یہ شرائط تھیں۔ دس سال تک باہم فریقین میں کوئی لڑائی نہو۔ جو شخص آپ کے پاس مسلمان ہوکر بغیر اجازت اپنے وارثوں کے آئے آپ اس کو واپس کردیں۔ جو شخص مسلمانوں میں سے قریش کے پاس آئیگا اُس کو نہ لوٹائیں گے اس سال آپ اسی طرح بغیر عمرہ کئے واپس جائیں۔ سال آیندہ اگر عمرہ کریں۔ صرف تین دن مکہ میں ٹھیریں۔ ہتیار میانوں میں بندھے ہوئے ہوں۔ عہد نامہ مرتب ہونیکے بعد آپ نے قربانیوں کو وہیں ذبح کرکے احرام کھولدیئے۔ مسلمان بربنا اس خواب کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا اس توقع میں تھے کہ فتح عظیم نصیب ہوگی مگر معاملہ برعکس ظاہر ہوا تو اُنکے صدمہ کی انتہا باقی نہ رہی۔ قریب تھا کہ رنج وکوفت کی وجہ سے ہلاک ہوجاتے حضرت عمرؓ بے انتہا صدمہ میں قابو سے باہر تھے مضطرب پھرتے تھے۔ آپکی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم حق پر ہیں تو کیوں اس ذلت کو گوارا کریں۔ مگر جواب ملا کہ اے عمر میں اللہ کا رسول ہوں وہ کبھی مجھے ضائع اور ذلیل نہ کریگا۔ اسی اضطراب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس گئے۔ وہاں سے بھی یہی جواب ملا تو خاموش ہوکر بیٹھ رہے۔ حدیبیہ سے واپس ہوکر راستہ میں سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں ارشاد ہے۔

انا فتحنا لک فتحا مبینا (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمنے تم کو کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی)

اس طرح دب کر صلح کرلینے کو فتح مبین سمجھ لینا انسانی عقل سے بالاتر بات تھی صحابہؓ بہت ہی زیادہ متعجب ہوئے کہ یہ فتح کیسی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس آیت شریفہ کو زبان مبارک سے سُن کر عرض کیا اَوَ فَتْحٌ ھُوَ (یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے) فرمایا کہ ہاں فتح ہے۔

درحقیقت یہ بڑی فتح تھی۔ اس سے قبل اسلام میں ایسی بڑی فتح نہیں ہوئی تھی۔ قبائل عرب کے لوگ لڑائی سے مامون ومطمئن ہوکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صرف دو برس کے عرصے میں اسقدر مسلمان ہوئے جتنے کہ ابتدائے اسلام سے سولہ برس کے عرصہ میں ہوئے تھے۔ قبائل عرب میں اسلام کا چرچا ہوگیا۔

صلح حدیبیہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑنا جھگڑنا تو درکنار اپنے خیال سے زیادہ اپنی بات کو نیچا کرنا قبول فرمایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں اسلام کی عظمت وشوکت کو قیاس وگمان سے بڑھ کر ترقی عطا فرمائی۔ یہ تھا اسلام کی صداقت کا سکہ جس نے عالم کو اپنا مسخر بنایا۔ کوئی بڑا ہی نادان اس بات کے کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں کسی قسم کے زور وجبر کو دخل تھا۔

بادشاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام کے خطوط

تیسرے ہی سال آپ نے دنیا کے بڑے اور چھوٹے بادشاہوں کو اپنے قاصدوں کے ہاتھ اسلام کی دعوت دی۔ یہ وقت تھا کہ اسلام کی قوت خاص قبائل عرب میں بھی مستحکم نہ ہوئی تھی۔ اندرونی اور بیرونی دشمن پیچھے لگے ہوئے تھے۔ قریش مکہ برسرِ مقابلہ تھے۔ یہود پہلو میں اور منافق گھر کے اندر موجود تھے۔ اسلام میں یہ قوت نہ تھی کہ ان پر بھی اس کا کچھ اثر پڑتا۔ ایسی حالت میں زبردست بادشاہوں پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ کونسا عقل کا دشمن ہے جو یہ کہے کہ آپ نے بادشاہانِ دنیا سے قوت اور شوکت کی بنا پر مراسلت کی تھی۔ یا آپ کے پاس ایسا ظاہری سازوسامان تھا جس کو دیکھ کر کسی بادشاہ پر رعب پڑتا۔ نہیں بلکہ آپ کو حکم تھا کہ حق کا پیام سب کو پہنچا دو۔ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اور سب کے پاس قریب قریب ایک ہی مضمون کے خط بھیجے تھے۔ خطوط کا مضمون گو بالکل سادہ اور نہایت مختصر تھا۔ مگر اس کے اندر ایسی روحانی قوت مضمر تھی جس کی وجہ سے وہ قلوب جن کو حق ناحق کی تمیز اور صادق وکاذب کے ادراک کا مادہ تھا بغیر مرعوب ومتاثر ہوئے نہ رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جن سلاطین پر اس مضمر قوت کا اثر پہنچا انہوں نے گردن جھکا دی۔ اور جنہوں نے ظاہری قوت وشوکت کو صدق وکذب کا معیار ٹھیرایا تمرد ومقابلے سے پیش آئے خطوط اور قاصد دونوں کی توہین پر آمادہ ہو گئے۔

قیصر کے نام نامۂ مبارک

قیصر روم کے نام کا خط حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ لیکر گئے تھے قیصر نے نامۂ مبارک کی بہت تعظیم کی اور ایک شخص سے جو کتب سابقہ کا علم رکھتا تھا۔ اس خط کا

حال کہہ کر اصل حقیقت کو دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ نبی سچے ہیں۔ ہم سب اُن کے منتظر تھے۔ تم ضرور اتباع کرو۔ قیصر نے سرداروں کو جمع کیا۔ اور خود بالاخانے میں بیٹھ کر نامۂ مبارک کا حال بیان کیا اور کہا یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے آؤ ہم سب ان کا اتباع کریں۔ ہماری دین و دنیا درست ہو جائیں گے۔ سب سُن کر وحشیانہ انداز سے دروازے کی طرف بھاگے۔ دروازے بند تھے قیصر نے کہا میں تم کو آزماتا تھا کہ تم اپنے دین پر کس قدر مضبوط ہو۔ سو میں بہت خوش ہوا کہ تم میں خامی نہیں ہے۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد حضرت دحیہؓ سے کہا بیشک یہ نبی سچے ہیں۔ مگر میں ان لوگوں سے ڈرتا ہوں اگر خوف نہ ہوتا تو ضرور مسلمان ہو جاتا۔ لیکن تم روم کے اسقف اعظم (بڑے پادری) کے پاس جن کا نام صغاطر ہے جاؤ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حال انکو سناؤ۔ حضرت دحیہؓ تشریف لے گئے اور اسقف اعظم سے سب حال بیان کیا۔ اُس نے سُن کر کہا قسم اللہ کی یہ شخص نبی ہیں۔ ہم اپنی کتابوں میں اُن کا حال اور صفت لکھی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اور یہ کہکر اپنی لاٹھی ہاتھ میں لے کر گرجا میں گیا۔ اور لوگوں سے کہا ہمارے پاس احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خط آیا ہے۔ اور وہ ہم کو اسلام کی طرف بُلاتے ہیں۔ میں تو کلمہ پڑھتا ہوں اَنَّ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ عیسائیوں نے یہ سُنتے ہی فوراً اُن کو قتل کر دیا۔ حضرت دحیہؓ نے یہ سارا حال آکر قیصر سے بیان کیا قیصر نے کہا مجھکو بھی ان لوگوں سے یہی اندیشہ ہے۔

قیصر اور ابوسفیان کا مکالمہ اسکے بعد قیصر نے ابوسفیان کو جو ایک قافلے کے ساتھ بغرض تجارت آئے ہوئے تھے بُلایا۔ وہ مع قریش کے چند لوگوں کے حاضر ہوئے قیصر نے اُن کو عزت کیساتھ اپنے سامنے اور ساتھیوں کو اُن کے پیچھے بٹھلا کر کہا کہ میں ابوسفیان سے چند باتیں دریافت کرونگا اگر یہ جھوٹ بولیں تو تم سب ان کو جھٹلا دینا۔ عرب میں جھوٹ بولنا بہت مذموم سمجھا جاتا تھا ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھکو اس کا اندیشہ نہوتا کہ میں جھوٹا مشہور ہو جاؤں گا۔

تو اس موقعہ پر ضرور جھوٹ بولتا۔ مگر اتنا تو ضرور ہوا کہ قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوچھا تو میں نے بہت گھٹا کر بیان کیا۔ لیکن قیصر نے اُس کی طرف التفات نہیں کیا

قیصر اور ابوسفیان کے سوال و جواب کا خلاصہ یہ ہے۔

قیصر۔ اس شخص کا نسب تمہارے درمیان کیسا ہے۔

ابوسفیان۔ نسب کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کے ہیں۔

قیصر۔ اُن کے خاندان میں اُن سے پہلے بھی کوئی شخص ایسا گذرا ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو۔

ابوسفیان۔ کوئی نہیں۔

قیصر۔ کیا اُنکے خاندان میں کوئی ریاست یا بادشاہت تھی جس کو تم لوگوں نے چھین لیا ہو۔

ابوسفیان۔ نہیں تھی۔

قیصر۔ اُن کا اتباع کون لوگ کرتے ہیں۔

ابوسفیان۔ ضعیف اور مسکین اور نوعمر لوگ اتباع کرتے ہیں۔

قیصر۔ جو لوگ اتباع کرتے ہیں وہ اُن سے محبت رکھتے ہیں یا اُن سے بغض رکھتے ہیں اور جُدا ہو جاتے ہیں۔

ابوسفیان۔ اس وقت تک کوئی ایک شخص بھی اتباع کر کے اُن سے علیحدہ نہیں ہوا۔

قیصر۔ تمہارے اور اُن کے درمیان جو لڑائیاں ہوتی ہیں اُس میں فتح کس کو ہوتی ہے۔

ابوسفیان۔ کبھی اُن کو کبھی ہم کو فتح ہوتی ہے۔

قیصر۔ وہ کبھی غدر اور خلاف عہد کرتے ہیں۔

ابوسفیان۔ غدر کبھی نہیں کیا مگر آجکل ہمارے اُن کے درمیان معاہدہ ہو رہا ہے اسمیں ہم مامون نہیں ہیں کہ وہ کیا کریں گے۔

ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے کسی سوال کے جواب میں جھوٹ بولنے کا موقع نہ ملا البتہ

اس سوال کے جواب میں ذرا موقع ملا اس لئے میں نے یہی بات کہی۔

قیصر نے سب جوابات سُن کر کہا کہ میرے سوالوں کے جو جواب تم نے دیئے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک یہ نبی ہیں۔ انبیا ہمیشہ اعلیٰ و اشرف خاندان کے ہوتے ہیں اگر کسی نے پہلے اُن کے خاندان میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ انھوں نے بھی خاندانی بات کا اتباع کر کے دعویٰ کر دیا اگر ان کا خاندانی ملک چھینا گیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اپنا ملک واپس لینے کے واسطے دعویٰ کیا ہے۔ انبیا کے پیرو ہمیشہ ضعفاء و مساکین ہوتے ہیں۔ جس شخص کے دل میں حلاوت ایمان اثر کر جاتی ہے کبھی برگشتہ نہیں ہوتا۔ انبیاء کبھی غدر اور خلاف عہد نہیں کرتے۔

آخر میں ابوسفیان کو خطاب کر کے کہا اگر تم نے یہ باتیں سچ کہی ہیں تو اُن کے ملک و دین کا غلبہ اس جگہ تک جہاں میں بیٹھا ہوں ضرور ہو جائیگا۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں اُن کے پاس ہوتا اور اُنکے قدم دھو کر پیتا۔ قیصر روم جیسے عظیم الشان بادشاہ سے جو سلاطین دنیا میں اوّل درجہ اور ایشیا و یورپ کا حکمران تھا۔ ابوسفیان یہ گفتگو سُن کر حیران رہگئے اور وہاں سے افسوس و تعجب سے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارتے اور یہ کہتے ہوئے نکلے۔ اے لوگو ابن ابی کبشہ[۱] (یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کا کام تو نہایت مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔

ایک تھوڑی سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ قیصر کو نامۂ مبارک سے اندیشناک اور خوفزدہ ہونیکی کوئی وجہ نہ تھی نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قاصد حضرت دحیہ کوئی جرار لشکر ساتھ لیکر آئے تھے نہ آپ کا ملک وسیع تھا۔ نہ آپکے پاس لشکر اور ساز و سامان موجود تھا جس سے بادشاہان دُنیا مغلوب ہوتے اور اگر ہوتا بھی تو بادشاہ کب بغیر زور آزمائی کسی کے سامنے گردن جھکاتے ہیں نہ نامۂ مبارک میں فوج کشی کی دھمکی تھی۔ نامۂ مبارک کے نہایت سادہ الفاظ جن میں فوج کشی کا اشارہ تک نہ تھا یہ تھے۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ اِلٰی ہِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْہُدٰی اَسْلِمْ تَسْلَمْ

---

[۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پہلے ابو کبشہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا جو قریش کو بت پرستی سے منع کرتا تھا چونکہ حضور سرور عالم بھی بت پرستی سے روکتے تھے اسی علاقہ سے آپکو ابو کبشہ کا بیٹا کہدیا۔ یا اسلئے کہا کہ آپکے نانا صاحب ابو کبشہ مشہور تھے۔ ۲

اور ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپکی دایہ حلیمہ سعدیہ کے شوہر کو بھی ابو کبشہ کہتے تھے اسی رضاعت کے علاقہ سے آپکو اُنکا بیٹا کہا۔ ۳

يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ۔ وَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ اِثْمَ الْاَرِيْسِيِّيْنَ عَلَيْكَ۔ ترجمہ۔ یہ خط محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے ہرقل بادشاہِ روم کی طرف ہے جو شخص ہدایت کا اتباع کرے اُس پر سلام۔ اسلام لے آ تو سلامت رہیگا۔ اور تجھکو خدا تعالیٰ دو چند اجر دیگا۔ (اپنے اسلام لانے اور رعیت کے مسلمان ہونے کا) اور اگر تم نے اعراض کیا تو رعیت کا گناہ بھی تمہارے اوپر ہے۔

پھر کیا وجہ تھی کہ قیصرِ روم دل سے متبع ہوگیا۔ صرف یہی کہ قیصر کو کتب سابقہ سے آپکی بعثت کا علم تھا۔ اور جو علامتیں کتابوں میں لکھی ہوئی تھیں وہ سب آپ پر منطبق ہوتی تھیں نامۂ مبارک کے سادہ الفاظ نے دل پر ایسا گہرا اثر ڈالا کہ اس کو تصدیق میں تامل نہ رہا۔ مگر افسوس سلطنت کی طمع اور جان کے خوف نے اتباع کی دولت سے محروم رکھا۔

نجاشی کے نام نامۂ مبارک حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام جس وقت نامہ مبارک پہنچا پڑھ کر حضرت جعفر بن ابی طالب کے ہاتھ پر ایمان لے آئے اور اپنے بیٹے کو اہلِ حبشہ کے ساتھ آپکی خدمت میں بھیجدیا۔ لیکن یہ سب لوگ دریا میں ڈوب گئے اور آپ کی خدمت میں نہ پہنچ سکے۔

کسریٰ بادشاہِ فارس کے نام نامۂ مبارک دُنیا میں دو ہی زبردست بادشاہ تھے قیصرؔ اور کسریٰؔ۔ قیصر کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ کسریٰ کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ خود ملکِ عرب کے اکثر حصے کسریٰ کے زیرِ نگین تھے یمن وغیرہ بڑے بڑے صوبوں میں کسریٰ کے گورنر تھے اس اعتبار سے تقریبًا کل عرب پر کسریٰ کی حکومت تھی حضرت عبداللہ بن حذافہ نامۂ مبارک کسریٰ کے پاس لیکر گئے۔ نامہ مبارک کا مضمون تقریبًا اُسی قسم کا تھا جو قیصر کے خط کا تھا۔ البتہ الفاظ کچھ کم وبیش تھے کسریٰ نے خط کو پھاڑ ڈالا اور کہا۔

يَكْتُبُ اِلَيَّ بِهٰذَا وَهُوَ عَبْدِيْ۔

(مجھکو وہ ایسا خط لکھتے ہیں حالانکہ وہ میرے زیرِ اثر اور محکوم ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ کسریٰ کا ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کسریٰ نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا لکھا کہ دو مضبوط اور بہادر آدمیوں کو اس شخص (یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بھیجو کہ وہ اُنکو میرے پاس پکڑ لائیں۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام نابوہ اور دوسرے کا نام فرفرہ تھا آپ کی خدمت میں بھیجا اور لکھا کہ آپ کسریٰ کے یہاں تشریف لیجائیں۔ اور نابوہ سے یہ کہدیا کہ صحیح خبریں اور حالات لیکر آئیں۔ قریش کو جب یہ معلوم ہوا کہ کسریٰ نے باذان کو ایسا حکم بھیجا ہے تو اُن کے یہاں عید آگئی۔ خوش ہو کر کہتے تھے لو بھائیو تمہیں مبارک ہو بادشاہوں کا بادشاہ کسریٰ مسلمانوں کو تباہ کرنے کیواسطے آمادہ ہو گیا ہے جس کا مقابلہ وہ کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اب اس قصے کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا۔ ہم لوگ امن چین میں ہو جائیں گے۔

باذان کے بھیجے ہوئے دونوں شخص خدمت مبارک میں حاضر ہوئے۔ اور پیام پہنچاکر عرض کیا کہ اگر آپ تعمیل حکم کریں گے تو باذان آپکی سفارش کسریٰ کو لکھے گا اور اگر آپنے تعمیل نہ کی تو کسریٰ آپ کو اور آپ کی قوم کو ہلاک کر دیگا۔ آپ نے فرمایا کہ کل کو جواب دیا جائیگا۔ آپکو بذریعہ وحی اطلاع دی گئی کہ کسریٰ کو اُس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ اگلے روز یہ دونوں شخص حاضر خدمت ہوئے تو آپنے کسریٰ کے مقتول ہونے کی خبر دے کر فرمایا کہ میرا دین اور ملک کسریٰ کے ملک تک پہنچ جائیگا۔ دونوں نے واپس ہو کر باذان سے سب حال بیان کیا باذان نے کہا کہ یہ گفتگو بادشاہوں کی سی نہیں ہے وہ یقیناً نبی ہیں۔ ہم انتظار کریں گے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اُن کے نبی مرسل ہونے میں شک نہیں۔ چند ہی روز کے بعد کسریٰ کے قتل کی خبر باذان کو باضابطہ پہنچ گئی۔ باذان خود معہ سرداران فارس کے بصدق دل ایمان لے آیا۔

غسان کے بادشاہ کے نام نامہ مبارک

حارث ابن ابی شمر غسانی کے پاس نامۂ مبارک پہنچا تو اُس نے دیکھ کر کہا۔ ہم خود مدینے پر چڑھائی کریں گے۔ آپنے اُس کے کلمات کو سُن کر ارشاد فرمایا

کہ اُس کا ملک تباہ و برباد ہوا۔

بحرین کے حاکم کے نام نامہ مبارک اور اُس کا مسلمان ہونا۔

بحرین کا حاکم منذر بن سادی تھا حضرت عمرو بن اُمیتہ ضمیری نامہ مبارک لے کر اسکے پاس پہنچے تو وہ اور بحرین کے سب عرب بلا تامل مسلمان ہو گئے۔

باغی اور عادی مجرموں کا سزا دینا تمام دنیا کے قانون میں عین انصاف ہے بلکہ بسا اوقات ایسے لوگوں سے درگذر کرنا جو بوجہ عداوت وکینہ توزی یا خباثتِ نفس قتل و غارت ونقض عہد اور اسی قسم کے جرائم کا ارتکاب کر چکے ہوں درگذر کرنا دور اندیشی اور مصالح ملکی کے خلاف سمجھا جاتا ہے لیکن ہم چند واقعات کے ذریعے سے یہ بھی دکھلانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ دنیا میں کوئی شخص حلیم وکریم بُردبار و خوش خلق نرم خو سخت سے سخت جُرم سے درگذر کرنے والا اور خونریزی سے بچنے والا نہ تھا آپنے اُن لوگوں سے درگذر فرمایا جن کی ساری عمر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا دہی۔ آبرو ریزی۔ اسلام کی بربادی مسلمانوں کی تباہی میں کوشش کرتے گذری جن کے طفیل مسلمانوں کو ہزار ہا جانوں کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اگرچہ بقاعدہ سلطنت ومصالحہ ملکی ایسے لوگوں کو امن دیکر مار آستین پالنا جن کیلئے عداوت بمنزلہ طبیعت ثانیہ کے بن گئی تھی جن کا نشوونما بچپن سے آپکی عداوت پر ہوا تھا کسی قدر دور اندیشی سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ کو اسلام کی صداقت اور روحانی قوت اور تمام عالم میں پھیل جانے کا اس قدر کامل یقین اور خداوند تعالیٰ کے وعدوں پر ایسا بھروسہ تھا کہ ہرگز ان احتمالات سے اندیشہ ناک نہیں ہوتے تھے۔

فتح مکہ اور معافی کا اعلان

مکہ معظمہ بوجہ بیت اللہ کے اسلام کا اصلی منبع اور سرچشمہ اور مرکز تھا اور کفار قریش کا متوطن اور دارالسلطنت بھی وہی تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مسلمانوں کو قریش کے ہاتھ سے قسم قسم کی تکلیفیں پہنچی تھیں۔ ہر حیثیت سے مکہ معظمہ کا فتح ہونا خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت اور مسلمانوں کے لئے انتہا سے زیادہ خوشی اور فرحت وتبختر کا موقع تھا۔ کفار مکہ کی دولت

وقوت کے خاتمے اور مسلمانوں کے عرب پر انتہائے عروج کا یہی وقت تھا۔ فتح مکہ نے اسلام اور
مسلمانوں کی حالت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کے تعلقات فتح مکہ سے پہلے بہت ہی
محدود تھے۔ اہل عرب قریش کے انجام کو دیکھتے تھے اکثر قبائل توقف و تردد کی حالت میں تھے۔
مکہ معظمہ فتح ہونے اور قریش کے مسلمان ہوجانیکے بعد یکلخت قبائل عرب مسلمان ہو گئے۔

اس حالت کے بدلنے سے مسلمانوں کی ایک دوسری حالت میں بھی انقلاب ہوگیا۔ ایمان لانے
راہ خدا میں خرچ کرنیکا اجر و ثواب جو فتح مکہ سے پہلے تھا بعد میں کم ہوگیا۔ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ
أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ
(ترجمہ) تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے مال خرچ کیا ہے اور خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے وہ اور فتح کے
بعد خرچ کرنیوالے اور کوشش کرنیوالے برابر نہیں بلکہ فتح مکہ سے پہلے خرچ کرنیوالے بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں نسبت
پیچھے خرچ کرنے اور کوشش کرنیوالوں سے۔

مکہ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک مامون و محفوظ رکھا گیا تھا کسی کو اہل مکہ سے لڑائی
اور حرم محترم پر چڑھائی کی کسی حال میں اجازت نہ تھی اور نہ سلاطین دنیا میں سے کسی کا یہ حوصلہ
ہوا تھا عرب جیسے جنگ جو ملک میں جہاں قافلے لٹتے تھے۔ راستے غیر محفوظ تھے اور ہر شخص بجائے
خود خائف اور غیر مطمئن رہتا تھا۔ حرم مکہ معظمہ ہی ایسی جگہ تھی جہاں آکر سب محفوظ ہوجاتے تھے اور وہ
قبائل جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے حج کے ایام میں جمع ہو کر شیر و شکر بن جاتے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے زمانہ میں البتہ بادشاہ حبشہ کا نائب
ابرھہ یمن سے لشکر لیکر مع بہت سے ہاتھیوں کے اس غرض سے چڑھ کر آیا تھا کہ بیت اللہ
کو گرا دے۔ قریش مکہ میں یہ طاقت کہاں تھی کہ مقابلہ کرتے۔ ابرھہ نے اول ایک سردار
جس کا نام اسود بن مقصود تھا۔ مکہ معظمہ کو بھیجا وہ سب اہل مکہ کے اونٹ بکریاں پکڑ لایا۔ ان
میں دو سو اونٹ عبد المطلب کے بھی تھے۔ اس کے بعد ابرھہ نے دوسرے سردار کو بھیجا
اور کہا کہ سردار قریش سے ملکر کہدینا کہ ہمکو تم سے لڑنا مقصود نہیں صرف بیت اللہ کا گرانا ہی

اگر تم نے مقابلہ نہ کیا تو ہم بھی تم سے نہ لڑیں گے ۔
اُس وقت عبد المطلب تمام قریش کے سردار مانے جاتے تھے اُس شخص نے یہ پیام
اُن کو پہنچا دیا۔ عبد المطلب نے سُن کر کہا کہ ہم بھی ابرھہ سے لڑنا نہیں چاہتے یہ اللہ کا گھر ہے
اور ابراہیم خلیل اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت کریگا۔
اگر وہ اپنے گھر کی حفاظت نکریگا تو ہم میں طاقت مقابلہ نہیں عبد المطلب اُس سردار کے
ساتھ ابرھہ کے پاس گئے چونکہ عبد المطلب نہایت شاندار اور خوبصورت وباوقعت
شخص تھے ابرھہ اُن کو دیکھتے ہی تخت سے نیچے اُتر کر فرش پر اُن کی برابر بیٹھ گیا عبدالمطلب
نے کہا میرے دوسو اونٹ لوٹا دیے جائیں۔ ابرھہ نے کہا میں تم کو بڑے درجے کا شخص
سمجھتا تھا مگر تمنے مجھ سے اونٹوں کے بارے میں سوال کیا اور بیت اللہ کی نسبت جو تمہارا
اور تمہارے اجداد کا قبلہ ہے کچھ نہ کہا۔ عبد المطلب نے کہا میں اونٹوں کا مالک ہوں اسلیے
میں نے اُنکے بارے میں کہا ہے اور بیت اللہ کا مالک اللہ ہے وہ اُس کی حفاظت خود
کریگا۔ عبد المطلب نے ابرہہ کے پاس سے واپس آکر قریش سے سب حال بیان کیا اور
تمام قبائل مکہ کو لیکر پہاڑوں میں جا چھپے اور چلتے وقت بیت اللہ کے دروازے کا حلقہ پکڑکر
اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور یہ شعر پڑھے ؎

یَا رَبِّ لَا اَرْجُوْ لَهُمْ سِوَاكَا ۞ یَا رَبِّ فَامْنَعْ مِنْهُمْ حِمَاكَا
اے رب تیرے سوا انکے مقابلے کیلئے کسی سے امید نہیں رکھتا ۞ اے رب اُن سے اپنے حرم کو محفوظ رکھ

اِنَّ عَدُوَّ الْبَیْتِ مَنْ عَادَاكَا ۞ اِمْنَعْهُمْ اَنْ یُّخْرِبُوْا فِنَاكَا
تحقیق بیت اللہ کے دشمن وہی ہیں جو تیرے دشمن ہیں ۞ انکو باز رکھ اس بات سے کہ تیرے گھر کو ویران کریں

ابرہہ نے میدان خالی دیکھ کر مکہ میں داخل ہونا چاہا۔ اور سب سے بڑے ہاتھی کو جس کا نام محمود تھا
آگے بڑھایا۔ مگر وہ زمین پر گر گیا اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ اِدھر اللہ تعالیٰ نے لشکر پر طیراً
ابابیل کو مسلط فرمایا جس سے تقریباً سب ہلاک ہوئے۔ اور جو بچے وہ بھاگ گئے۔ خود ابرہہ کا

یہ حال ہوا کہ اُس کے بدن کا ایک ایک عضو گل کر گر گیا اور وہ مثل کبوتر کے بچّے کے مضغۂ گوشت رہگیا۔ اسی طرح اُسکو اُٹھا کر صنعاء لیگئے وہاں جاکر وہ بھی مر گیا۔ اس واقعہ نے عرب کے دلوں میں حرم محترم کی عظمت و محبت و عقیدت و ارادت اور بھی اضعاف مضاعف بڑھا دی۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ آپکو مکہ معظمہ پر لشکر کشی اور قتل و قتال کی تھوڑی دیر کیلئے اجازت مل گئی تھی۔ آپ نے خود ارشاد فرمایا۔ انھا لم تحل لاحدٍ من قبلی ولا بعدی وانما احلت لی ساعۃ من النہار (مکہ معظمہ آجتک کسی کیلئے حلال نہیں ہوا۔ نہ مجھ سے پہلے نہ میرے بعد۔ صرف میرے لئے کچھ دیر کیلئے حلال ہوا ہے)

لیکن بایں ہمہ آپ عزم مصمم فرما کر روانہ ہوتے تھے کہ جہانتک ہوگا اہل مکہ کو معافی دی جاویگی۔ اُن کے جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کی جاویگی۔ حرمت بیت اللہ کو ملحوظ رکھا جائیگا اور اپنی طرف سے لڑائی میں پیش قدمی نہ کی جائے گی۔ فتح مکہ کے متعلق چند واقعات بیان کر دینا چاہتے ہیں جن سے ہر ذی عقل کو عیاناً ہمارے تمام دعاوی کی تصدیق ہو جاوے۔

ہم صلح حدیبیہ کا ذکر کر چکے ہیں کہ قریش سے دس سال کیلئے صلح ہو چکی تھی۔ اس صلح کے بعد مسلمانوں کی طرف سے ایک فعل بھی ایسا نہیں ہوا جو عہد نامہ کیخلاف سمجھا جاتا۔ مگر اس عہد نامہ کو توڑنے کی ابتدا قریش کی طرف سے ہوئی اس بنا پر آپنے فتح مکہ کا قصد فرمایا اور اور یہ دُعا کی کہ الٰہی کسی ذریعہ سے بھی اُن کو ہمارے ارادے اور روانگی کی اطلاع نہ ہو۔ حق تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور آپ مکہ کے قریب پہنچ گئے۔ مگر اہل مکہ بالکل غافل تھے۔ اس دُعا کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر اُن کو اوّل ہی اطلاع ہو جاتی۔ تو وہ ضرور پورے سامان کے ساتھ مقابلہ کے لئے آمادہ ہوتے اور پھر خواہ مخواہ خونریزی ہوتی جس سے آپ بالکل بچنا چاہتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ہجرت کر کے مدینۂ منورہ کو جاتے تھے۔ رستہ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپنے ارشاد فرمایا کہ تم مہاجرین میں سب سے آخر ہو۔ اور میں

انبیاء میں سب سے آخر ہوں اور یہ حکم دیا کہ سامان کو مدینہ منورہ بھیجدو اور تم ہمارے ساتھ رہو۔

آپکے چچا حارث بن عبد المطلب کے بیٹے ابو سفیان[1] اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی مسلمانوں کی ایذا دہی میں کوئی کسر نہ رکھی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذمت اور ہجو کرنا اُنکا روزمرہ کا کام تھا۔ بارہا مقابلے پر آچکے تھے ابو سفیان بھی معہ اپنی بیوی کے راستہ میں ملے اور خدمت مبارک میں حاضر ہونا چاہا حضرت امہ سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی سفارش فرمائی مگر اجازت نہ ملی۔ ابو سفیان نے کہا اگر ہم کو اجازت حاضری نہ ملی تو بیوی بچوں کو لیکر کہیں نکل جاؤں گا۔ اور بھوکا پیاسا مر جاؤنگا۔ یہ سُن کر دریائے رحمت جوش میں آیا۔ حاضری کی اجازت مل گئی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ مگر شدت حیا سے آپکے سامنے گردن نہ اُٹھا سکتے تھے۔ اپنے سابق جرائم اور ناملائم حرکات کی معذرت میں یہ اشعار پڑھتے تھے۔ ؎

لَعَمْرُكَ إِنِّي يَوْمَ أَحْمِلُ رَايَةً	لِتَغْلِبَ خَيْلُ اللَّاتِ خَيْلَ مُحَمَّدِ
لَكَالْمُدْلِجِ الْحَيْرَانِ أَظْلَمَ لَيْلُهُ	فَهَذَا أَوَانِي حِينَ أُهْدَى وَاهْتَدِي
ترجمہ۔ قسم ہے تیری جان کی جس دن کہ میں اس غرض سے	جھنڈا اُٹھاتا تھا کہ لات کا لشکر محمد صلے اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے لشکر پر غالب آجائے	تو میری مثال اُس شخص کی تھی جو رات کے
اندھیرے میں حیران بھٹکتا پھرتا ہو	اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں ہدایت کیا جاؤں اور ہدایت پاؤں

ابو سفیان مسلمان ہو گئے اور نہایت پختہ مسلمان حُنین کی لڑائی میں کفار کے اچانک حملے سے طلقاء[2] مکہ کے قدم اُکھڑ گئے تو ابو سفیان اُن جان نثار لوگوں میں تھے جو برابر آپ کیساتھ قدم جمائے رہے۔

ابو سفیان ابن حرب کو جس قدر عداوت اور بغض اسلام اور مسلمانوں اور ذات مقدس

---

[1] حضرت معاویہ کے والد دوسرے صحابی ہیں چنانچہ اُنکے مشرف باسلام ہونیکا حال عنقریب بیان ہوگا۔

[2] طلقاء وہ نومسلم جن کو فتح مکہ کے دن معافی دیکر آزادی دیگئی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ظاہر ہے۔ کفار مکہ کے افسرِ اعلےٰ اُن کے حل وعقد کے مالک یہی تھے۔ اکثر لڑائیاں جو قریش نے مسلمانوں سے کیں اُنکے باعث ومحرک یہی ہوتے تھے جنگ اُحد میں قریش کی کمان انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ اُنہوں ہی نے جنگ اُحد میں قریش مکہ کے عارضی غلبہ اور مسلمانوں کے قدم اُکھڑ جانے کو فتح سمجھ کر بآواز بلند کہا تھا اُعْلُ ھُبَلْ (اے ہبل تو سربلند رہ) اور یَوْمٌ بِیَوْمِ بَدْرٍ کہکر دل کو تسلی دی تھی اور پندرہ سولہ ہزار کی جمعیت سے مدینۂ منورہ پر چڑھکر آئے تھے اور عرصہ تک مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اُس وقت مدینۂ منورہ کے گرد خندق کھودی گئی تھی اور یہ لڑائی غزوۂ خندق وغزوۂ احزاب کے نام سے موسوم ہوئی تھی۔

لیکن اِن تمام حالات کے بعد جس سہولت سے بلا کسی سرزنش کے معافی دی گئی اور اُن کا اسلام قبول کر لیا گیا۔ اُس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسلمانوں کے لشکر اور اُن کی حالت کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ اگر آپ نے لڑائی کے ساتھ مکہ کو فتح کیا تو قریش کی خیر نہیں۔ اگر کسی ذریعے سے اہلِ مکہ کو اطلاع ہو جائے اور وہ آکر امن میں داخل ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اسی فکر میں نکلا تھا کہ چند آدمیوں کی آواز سُنی جن میں سے ابوسفیان کو پہچانا۔ یہ لوگ بغرض تجسس نکلے تھے ابوسفیان نے مجھ سے لشکر کا حال پوچھا میں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ کہا پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا حاضر دربار مبارک ہو کر امن حاصل کرو میں اُن کو اپنی سواری پر بٹھلا کرلے چلا۔ راستے میں حضرت عمرؓ مل گئے۔ اُنہوں نے دیکھتے ہی کہا الحمد للہ آج ابوسفیان بلا کسی معاہدے کے قابو میں آ گئے۔ مگر میں نے بہت جلدی کے ساتھ اُن کو خدمت اقدس میں پہنچایا۔ پیچھے پیچھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہنچے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجازت دیجئے ابوسفیان کی گردن ماروں مگر آپ نے اُن کو امن عطا فرمایا۔ دوسرے روز وہ پھر حاضر

ہبل ایک مشہور بت کا نام ہے ۱۲ ؎ یعنی جیسے بدر میں مسلمانوں کو غلبہ ہوا تھا آج ہم لوگوں کو غلبہ ہے ۱۲۔

ہوئے اور مسلمان ہوگئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام قبول فرمانے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس ارشاد سے اُنکی عزت افزائی بھی فرمائی مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِی سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ (جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امن میں آگیا۔

مسلمانوں کے دل میں فتح مکہ کی اُمنگیں بھری ہوئی تھیں وہ اس دن کے منتظر بیٹھے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ انصاری کو جھنڈا عنایت فرماکر حکم دیا کہ کُدی کی جانب سے لشکر کو لیکر داخل مکہ ہوں تو وہ خوشی کے ساتھ یہ شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھے ؎

الیوم یوم الملحمہ	الیوم تستحل الحرمہ
آج کا دن لڑائی کا دن ہے	آج بیت اللہ کی حرمت اُٹھادیجائیگی

مگر آپ کو ان کلمات کی اطلاع پہنچی تو اُسی وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھیجکر جھنڈا اُن سے واپس لیلیا اور فرمایا کہ سعد رض غلط کہتے ہیں ۔ اَلْیَوْمُ یَوْمُ الْمَرْحَمَہ (آج کا دن رحمت اور معافی کا دن ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لشکر کے سرداروں کو ارشاد فرمایا تھا کہ سوا اُس شخص کے جو اُن پر حملہ کرے کسی کو قتل نہ کریں۔ اسی وجہ سے مسلمان بلا کسی لڑائی کے داخل مکہ ہوگئے۔ البتہ خالد بن ولید جس جانب سے لشکر کو لیکر داخل ہوتے تھے وہاں عکرمہ بن ابی جہل اور اُن کے ہمراہیوں نے مقابلہ کیا اور خفیف سی لڑائی ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اور لشکر اسلام کے داخل ہونے سے پہلے مکہ میں اعلان معافی کی منادی کرادی تھی اور امن حاصل کرنیکی ایسی مختلف اور سہل صورتیں تجویز فرمادی تھیں جن سے کوئی بھی محروم نہ رہے ۔ اعلان معافی کے الفاظ یہ تھے۔ مَنْ کَفَّ یَدَہٗ وَاَغْلَقَ بَابَہٗ فَھُوَ اٰمِنٌ۔ مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِی سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ۔ مَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَھُوَ اٰمِنٌ مَنْ اَلْقَی السِّلَاحَ فَھُوَ اٰمِنٌ۔ مَنْ اَغْلَقَ بَابَہٗ فَھُوَ اٰمِنٌ۔ مَنْ دَخَلَ دَارَ حَکِیْمِ بْنِ حِزَامٍ فَھُوَ اٰمِنٌ

مَنْ دَخَلَ تَحْتَ لِوَاءِ اَبِیْ رُوَیْحَةَ فَهُوَ اٰمِنٌ (ترجمہ) جو شخص مقابلے سے ہاتھ روکے اور اپنا گھر بند کرلے امن میں ہے۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے امن میں ہے۔ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے امن میں ہے۔ جو شخص ہتھیار ڈال دے امن میں ہے۔ جو شخص گھر میں گھس کر دروازہ بند کرلے امن میں ہے۔ جو شخص حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے امن میں ہے۔ جو شخص ابورویحہ کے جھنڈے کے نیچے آجائے امن میں ہے۔)

امن حاصل کرنے کی یہ اتنی صورتیں تھیں کہ کوئی ہی بدقسمت ہوگا جو ان سے نفع نہ اٹھا سکے۔

آپ نے اہل مکہ کی اصلی حالت اور قلبی لوؤں اور مسلمانوں سے نفرت اور علیحدگی یا بےخبری یا نادانی کو خیال فرما کر امن دینے کی انتہائی صورتیں ظاہر فرما دیں یعنی اگر کوئی نادانی و بےخبری کی وجہ سے سامنے ہی آجائے تو ہتھیار ڈال دینے سے امن میں داخل ہو جائیگا۔ مسلمان کئی سمت سے داخل مکہ معظمہ ہو چکے تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داخلے کا وقت آیا۔ ممکن تھا کہ اس عظیم الشان فتح کے وقت شکریہ حق تعالی کے ساتھ مسرت اور نشاط کے آثار چہرۂ مبارک پر ظاہر ہوتے اور یہ امر بقاعدہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ محمود اور پسندیدہ ہوتا۔ مگر نہیں حق تعالی کی قدرت کاملہ کا سماں آپ کے پیش نظر تھا۔ ہیبت و جلال خداوندی سے قلب مبارک معمور تھا۔ حق تعالے کے شکر کے ساتھ اعلی درجہ کی تواضع و انکسار کے آثار نمایاں تھے آپ اس وقت مجسم تواضع بنے ہوئے تھے۔ داخل مکہ ہونے کیوقت ناقہ پر سوار تھے اور تواضع کیوجہ سے گردن مبارک اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ ریش مبارک کجاوہ کی لکڑی سے مس کرتی تھی۔

ایک وہ وقت تھا کہ عمرۃ القضا میں جبکہ قریش مکہ کا یہ خیال تھا کہ مسلمان مدینہ منورہ کی آب و ہوا، تنگی و مفلسی کی وجہ سے بہت ضعیف و ناتوان ہو گئے ہیں آپ نے حکم دیا تھا کہ قریش کو اپنی بہادری اور قوت و چستی دکھلاؤ۔ چنانچہ طواف کی حالت میں مسلمانوں کا رمل (اکڑ کر چلنا) دیکھ کر قریش کو اپنے خیال کی غلطی معلوم ہو گئی۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ مسلمانوں کو غایت نرمی و تواضع کا حکم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر حال میں خدا تعالی کی رضا اور اسلام کے برکات و محاسن کا اظہار پیش نظر رہتا تھا۔

آپ مسلمانوں کی کثرت وشوکت اور عزت کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ (اے اللہ عیش وآرام تو آخرۃ ہی کا کار آمد ہی)

عام اہل مکہ کو معافی دیدی گئی۔ البتہ آٹھ مرد اور چار عورتیں اس معافی سے مستثنیٰ رکھے گئے۔ اُنکے بارے میں حکم تھا کہ جس جگہ مل جائیں قتل کر دیے جائیں۔ مگر ان میں سوائے چند کے بالآخر سبکو معافی مل گئی اور وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ منجملہ آٹھ مردوں کے ابوجہل کے بیٹے عکرمہ بھی تھے عکرمہ ذاتِ مقدس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ عداوت رکھنے تکلیف پہنچانے میں اپنے باپ ابوجہل کے مشابہ تھے۔ اُس وقت بھی وہ مقابلے پر آئے تھے اسی وجہ سے روپوش ہو کر بھاگ گئے۔ مگر اُن کی بیوی اُم حکیم مسلمان ہو گئیں اور اپنے خاوند کیلئے امن حاصل کر کے اُنکی تلاش میں نکلیں اور ایسے وقت جا کر ملیں کہ وہ جہاز میں سوار ہونے کو تھے۔ ام حکیم نے اُن سے کہا "جِئْتُكَ مِنْ عِنْدِ اَحْلَمِ النَّاسِ وَاَوْصَلِھِمْ وَاَکْرَمِھِمْ (میں ایسے شخص کے پاس سے آئی ہوں جو دنیا بھر سے زیادہ حلیم اور کریم اور صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔ اور اُنھوں نے تم کو امن دیا ہے) عکرمہ حاضر خدمت ہوئے اور اسلام لے آئے۔ آپ بھی اُن کے اسلام سے نہایت مسرور ہوئے۔

انہیں میں صفوان ابن اُمیہ تھے۔ یہ بھی بہت سخت دشمن ذاتِ مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تھے۔ فتح مکہ کیوقت خوف کیوجہ سے جدہ بھاگ گئے۔ عمیر بن وہبؓ نے اُنکے بارے میں عرض کیا آپ نے اُنکو امن عطا فرمایا اور علامتِ امن کیلئے وہ عمامۂ مبارک جو فتح مکہ کے روز آپ باندھے ہوئے تھے۔ عمیر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔ عمیرؓ نے جدہ جا کر صفوان سے امن دیے جانیکی اطلاع دی اور کہا۔ اَنَّہٗ اَحْلَمُ النَّاسِ وَاَوْصَلُھُمْ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا بھر سے زیادہ حلیم اور صلہ رحمی کرنے والے ہیں) صفوان خدمت مبارک میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ آپ مجھے دو مہینے کا اختیار عطا فرمائے۔ میں اپنے بارے میں غور کر لوں۔ ارشاد فرمایا۔ تم کو چار ماہ تک اختیار ہے وہ اپنی اسی حالتِ کفر میں آپ کیساتھ حنین وطائف کے غزوات میں موجود رہے۔ بالآخر مسلمان ہوئے اور بہت پختہ مسلمان ہوئے۔

جس کے دل میں انصاف اور سر میں عقل ہے ایک ہی واقعہ کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ اشاعت اسلام میں کس قدر نرمی اور درگذر اختیار کیا گیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی ساری عمر اسلام کی مخالفت میں گزری جس کا شعار یہ تھا کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر حملہ کرے۔ اشعار کے ذریعے سے آپکی مذمت پھیلائے اور انہیں عادات و افعال شنیعہ کی وجہ سے اعلان معافی کی رحمت عامہ سے محروم رہکر واجب القتل ہو چکا ہو ایسے شخص کے لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امن کی علامت کیواسطے اپنا خاص عمامہ بھیجتے ہیں اور وہ حاضر خدمت ہوکر غور و فکر کیلئے دو ماہ کی مہلت مانگتا ہے اور آپ بجائے دو ماہ کے چار ماہ کی مہلت عطا فرماتے ہیں اور اس مہلت عطا فرمانے کا یہ مطلب نہ تھا کہ چار ماہ بعد ایمان نہ لایا تو قتل کر دیا جائیگا بلکہ اُس کو امن کیساتھ جس جگہ سے آیا تھا وہاں جانیکی اجازت دی جائیگی ایسے کھلے اور روشن واقعات کے بعد بھی یہ الزام لگانا کہ اشاعت اسلام کے بارے میں کسی قسم کے جبر کو دخل دیا گیا ہے کسی ذی عقل اور سمجھ دار کا کام نہیں ہے ہاں تعصب اور ہٹ دھرمی نے جس کو مسلوب الحواس بنا دیا ہو۔ نیک و بد کی تمیز اُس کو باقی نہ رہی ہو اب جو چاہے کہے۔ اسی واقعے سے یہ بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی سچی تعلیم میں عہد میثاق کا پورا کرنا ایسا لازمی اور ضروری ہے کہ کسی وقت اُس کو نہیں چھوڑ سکتے۔

جو لوگ معافی سے مستثنٰی تھے اُنہیں میں عبداللہ بن ابی سرح بھی تھے جن کا جرم کسی طرح قابل معافی نہ تھا۔ اسلام لائے آپکی خدمت میں حاضر رہے۔ کتابت وحی کی خدمت سپرد تھی مگر خباثت نفس سے الفاظ میں تغیر و تبدل کر دیتے تھے۔ پھر مرتد ہو گئے اور کفار مکہ سے کہا کہ تمہارا دین بہتر ہے مگر باوجود ان جرائم کے اور باوجود اسکے کہ فتح مکہ کے دن اُن کے قتل کا حکم دیا گیا تھا حضرت عثمان اُن کو لیکر حاضر ہوئے اور امن طلب کیا۔ آپ نے امن عطا فرمایا اور وہ دوبارہ مسلمان ہو گئے۔

انہیں میں عبداللہ بن زبعری بھی تھے۔ یہ شخص بہت زیادہ ہجو و مذمت کرنیوالا تھا۔ بھاگ کر نجران چلے گئے

لیکن وہاں سے لوٹ کر حاضر خدمت ہوئے اسلام لے آئے اور معذرت میں بہت سے اشعار پڑھے جن میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

یَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ اِنَّ لِسَانِیْ	رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ اِذْ اَنَا بُوْرٌ
اے رسول خدا میری زبان	اُس نقصان کو جبر کرنیوالی ہے جو میں نے اپنی ہلاکت کے زمانہ میں پہنچایا تھا
اٰمَنَ اللَّحْمُ وَالْعِظَامُ بِرَبِّیْ	ثُمَّ نَفْسِیْ الشَّهِيْدُ اَنْتَ النَّذِيْرُ
میرا گوشت اور ہڈیاں اللہ تعالیٰ پر ایمان لائی ہیں	اور میرا نفس گواہی دیتا ہے کہ آپ نذیر ہیں

انہیں آٹھ میں وحشی بن حرب ہیں۔ یہ شخص وہ ہیں کہ جنہوں نے احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ فتح مکہ کے دن یہ بھی خوف کیوجہ سے طائف بھاگ گئے تھے۔ مگر بعد میں کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے اُن کا اسلام قبول فرمایا اور اُن سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کی کیفیت دریافت فرمائی جس کو سُن کر آپ پر گریہ غالب ہوگیا اور وحشی سے فرمایا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔ وحشی نے حضرت حمزہؓ کے قتل کی مکافات اس طرح کی کہ مسیلمہ کذاب کو اُسی آلہ سے اُسی طرح قتل کیا جس طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔

ابوسفیان کی زوجہ ہندہ بنت عتبہ کی عداوت اور بغض کا یہ حال تھا کہ جنگِ اُحد میں جب حضرت حمزہ رضؓ شہید ہوگئے تھے تو اُن کا جگر نکال کر چبایا۔ فتح مکہ تک اُنکی یہی کیفیت تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو حکم دیا کہ ہمارے داخلے سے پہلے قریش کو لشکر اسلام کی اطلاع کردو۔ اور معافی کا اعلان سُنا دو تو ابوسفیان نے بیت اللہ میں کھڑے ہو کر للکارا اور کہا کہ لشکر اسلام آگیا جس کا تم مقابلہ نہیں کرسکتے قریش نے کہا پھر کیا کریں۔ اُنہوں نے معافی کا اعلان سُنا دیا۔ تو ہندہ نے آکر ابوسفیان کی ڈاڑھی پکڑلی اور کہا۔ لوگو! اس احمق بوڑھے کو قتل کردو۔ یہ کیا کہتا ہے۔ ابوسفیان نے کہا گھر میں جا کر بیٹھ رہ ورنہ گردن اُڑا دی جائے گی۔ ہندہ بھی اُن چار عورتوں میں تھیں جنکے قتل کا حکم تھا

مگر ہندہ نے اوّل اپنے گھر کے سب بتوں کو توڑا۔ اور کہا کہ ہم تمہاری وجہ سے بڑے دھوکہ میں تھے اور چند عورتوں میں ملکر پوشیدہ طور سے حاضر خدمت ہوئیں اور اسلام لائیں اور دو بکری کے بچے نذر کئے اور عذر کیا کہ میری بکریاں بچے کم دیتی ہیں۔ آپنے برکت کی دعا فرمائی۔ اسکے بعد بکریاں بہت ہو گئیں وہ کہا کرتی تھیں کہ یہ آپ کی دُعا کی برکت ہی۔ خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمکو اسلام کی ہدایت کی۔

یہ حالات آپکی رحمدلی۔ درگزر عفو اور چشم پوشی اور حسن اخلاق اور غایت نرمی کے ہیں۔ جن کا ظہور فتح مکہ معظمہ کے موقعہ پر ہوا ہے۔ اب ہم یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد قبائل عرب میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی۔

سنۃ الوفود قریش کا ادب و احترام عرب میں مُسلّم تھا تمام عرب قریش کو اپنا امام جانتے اور اُن کے افعال کو قابل اقتدا مانتے تھے۔ قبائل عرب اسوقت بھی قریش کے انجام کو دیکھ رہے تھے جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش سب کے سب مسلمان ہو گئے تو اب قبائل عرب کیلئے اسلام لانیکا راستہ صاف ہو گیا۔ بڑی بڑی قوموں نے وفد کی صورت میں اپنے قائم مقام خدمتِ مبارک میں بھیجے اور مسلمان ہو گئے۔ فتح مکہ کے بعد ایک سال کے اندر اندر قریب قریب کل عرب کے وفد حاضر خدمت ہو کر مع اپنی قوم کے اصالتاً و وکالتاً مسلمان ہو گئے اسی وجہ سے یہ سال سنۃ الوفود کہلاتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ عرب پر اسلام کا سکّہ بیٹھ چکا تھا۔ اور گویا مقابلہ سرکشی اور لڑائی کا سلسلہ اہلِ عرب کی طرف سے منقطع ہو چکا۔ کسی شخص میں یہ طاقت نہ تھی کہ برسرِ مقابلہ آئے۔ اکثر قبائل برضا و رغبت مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر بایں ہمہ بہت سے اکھڑ اور سخت مزاج قبائل جن کے اندر بدویت کے ساتھ ریاست اور حکومت کا نشہ بھی موجود تھا خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر بھی اصل فطرت سے باز نہ آئے اور اپنے اکھڑ پنے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف پہنچائی۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود اس شوکت وقوت کے اُنکی سختیاں برداشت کیں۔ اُن پر کسی قسم کا تشدد یا جبر جائز نہ رکھا۔

بلکہ جس پہلو پر اسلام کی حقانیت کو سمجھنا چاہتے تھے سمجھایا۔

قبیلۂ تمیم کا وفد بڑی جمیعت کیساتھ حاضر خدمت ہوا۔ اُن میں منتخب سردار شاعر اور خطیب موجود تھے۔ ان لوگوں نے مسجد نبوی میں آکر باواز بلند للکارا "اے محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر آؤ" آپ کو اُن کے للکارنے اور غیر مہذب طریق سے سخت تکلیف پہنچی مگر کچھ نہیں فرمایا۔ بلکہ باہر تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے کہا ہم آپ سے مفاخرہ یعنی فخر میں مقابلہ کرنے آئے ہیں۔ آپ ہمارے خطیب یعنی لکچرار کو اجازت دیجیے۔ اللہ اکبر کسقدر نرمی اور حسن اخلاق و درگذر تھا۔ بجائے اسکے کہ آپ اُن کو فرماتے کہ اسلام کی حقانیت واضح ہو چکی ہے اسلام لے آؤ۔ اُن کو اس امر کا موقع عطا فرمایا کہ جس اصطلاح میں حقانیت اسلام سمجھنا چاہتے ہیں سمجھ لیں۔ آپ نے اُن کے خطیب کو اجازت دی اُس نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنی قوم کی خوبیاں اور فضائل بیان کیے۔ وہ بیان کر چکا تو آپ نے ثابت بن قیس کو ارشاد فرمایا کہ تم جواب دو۔ ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک زور کی تقریر میں خدا تعالیٰ کے احسانات اسلام کی خوبیاں اور احکام و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف بیان کیے۔ اس کے بعد اُن کا شاعر کھڑا ہوا اور اُس نے اپنی قوم کی افضلیت میں بہت سے اشعار پڑھے جن میں کا ایک شعر بطور نمونہ ذکر کیا جاتا ہے ؎

نَحْنُ الْكِرَامُ فَلَا حَيٌّ يُعَادِلُنَا . مِنَّا الْمُلُوكُ وَفِينَا تُنْصَبُ الْبِيَعُ

اُن کا شاعر بیٹھ گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا حضرت حسانؓ پہلے سے تیار نہ تھے مگر فی البدیہ ایسے زوردار اشعار پڑھے کہ سب حیران رہ گئے۔ سرداران تمیم نے سُن کر کہا کہ بیشک آپ نبیؐ اور مؤید من اللہ ہیں۔ آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے بڑھا ہوا ہے اور شاعر ہمارے شاعر سے اور پھر سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ انہیں لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ٥ جو لوگ حجروں سے باہر کھڑے ہو کر آپ کو پکارتے ہیں اُن میں سے

اکثر ناواقف ہیں۔

بنی اسد کا وفد اسلام لانے کی غرض سے حاضر خدمت مبارک ہوا اور اپنی اُس سادگی اور بدویت کی وجہ سے بے تکلف اپنے آنے کا احسان جتلانے لگے اور کہا۔ جِئْنَاكَ قَبْلَ اِنْ تَرْسَلَ اِلَيْنَا (ہم قبل اسکے کہ آپ کوئی قاصد بھیجتے آپ خود ہی آگئے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غایت حلم وکرم کی وجہ سے کچھ بھی نہیں فرمایا۔ البتہ اُن کی فہمایش کیواسطے کلام اللہ میں یہ آیت نازل ہوئی يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ۔

(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لوگ اپنے اسلام کا تم پر احسان جتلاتے ہیں۔ کہہ دیجئے ایسا نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ تم کو ایمان کی ہدایت کی) یہاں سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ ایمان ایسی دولت نہیں جو زبردستی کسی کو دی جائے۔

اسی سال حمیر کے بادشاہوں کے خطوط اور قاصد خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ سب لوگ بہ طیب خاطر اسلام لا چکے ہیں۔ نجران کے عرب جو بت پرست تھے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔ اور حضرت خالد رض نے اُن کو احکام اسلام کی پوری تلقین کردی۔ نجران میں اسلام نے مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے۔ مگر نجران کے نصاریٰ باوجود اسلام کی قوت وشوکت کے اپنے مذہب پر قائم رہے۔ کوئی خوف و اندیشہ ان کو نہ ترکِ مذہب کیلئے محرک ہوا نہ ترکِ وطن کیلئے۔ بلکہ برعکس اسکے کیا تو یہ کیا کہ اپنے وفد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا کہ آپ سے مباہلہ کرلے +

مباہلہ اس کو کہتے ہیں کہ دو فریق جو کسی ایک معاملہ میں جھگڑتے اور باہم مخالفت کرتے ہوں اپنی اولاد اور اہل وعیال سمیت ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں اور خدا تعالیٰ کی درگاہ میں نہایت عجز و الحاح کے ساتھ دعا کریں کہ جو ناحق پر ہے وہ ہلاک اور تباہ ہوجائے۔

نصاریٰ نجران نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مباہلہ کرنا چاہا اور آپ نے اُن پر

کسی سختی و سرزنش کو روا نہ رکھا۔ بلکہ حق وضح کرنے اور دنیا پر حقیقت لامر منکشف کرنے کے واسطے مباہلہ پر آمادہ ہو گئے اور حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو ہمراہ لے کر مباہلے کی غرض سے تشریف لائے۔ نصاریٰ نجران آخر اہل کتاب تھے وہ علم کے درجے میں سب کچھ جانتے تھے۔ آپ کو اور اس مقدس اور پاک جماعت کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ اگر ہم نے مباہلہ کیا تو نہ صرف ہمارا بلکہ دنیا کے نصرانیوں کا استیصال ہو جائیگا۔ آپ کی بددعا ایسی نہیں ہے کہ پھر دنیا میں کوئی نصرانی باقی رہ جائے۔ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ چہرے ایسے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ پر پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہلا دینے کی قسم کھا بیٹھیں تو وہ ضرور پورا کرے۔ اس طرح وضوح حق اور سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے بعد بھی ایمان نہ لائے۔ بلکہ مصالحت کی درخواست کی اور آپنے بطیب خاطر اُن سے مصالحت کرلی اور مصالحت بھی اس شرط کے ساتھ جس کو ہم اس مضمون کی تمہید میں بیان کر چکے ہیں یعنی نہ اُن کو مذہب بدلنے پر مجبور کیا جائیگا۔ نہ اس کی کوئی تدبیر کیجائے گی۔

ایک تھوڑی سی عقل والا بھی انصاف کرے کہ کیا اس سے زیادہ نرمی ممکن ہے اور کیا کوئی عقل کا دشمن اب بھی یہ کہے گا کہ اسلام کی اشاعت میں کسی قسم کے جبر و زبردستی کو دخل دیا گیا ہے۔

فتح مکہ کے بعد بعض قبائل کی طرف آپنے اپنے صحابہ کو دعوت اسلام کے لئے بھیجا۔ اور اُن کو ہدایت فرمادی کہ کسی سے مقاتلہ و مقابلہ نہ کریں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بنی خذیمہ کی طرف بھیجا اور انہوں نے غلط فہمی سے کچھ لوگوں کو قتل کر دیا جس کی خبر پہنچتے ہی آپ نے ارشاد فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَءُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ (اے اللہ میں خالد کے اس فعل سے بری ہوں)

حضرت خالد کو یمن وغیرہ کی طرف بھیجا تھا۔ لیکن وہ لوگ اسلام نہ لائے اور حضرت خالد نے بعض لوگوں کے ساتھ کچھ سختی کی۔ اُس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھیجا اور ارشاد فرمایا کہ خالد رضی اللہ عنہ کی وجہ سے جو نقصان پہنچا اُس کا تاوان دیں اور نرمی کی ہدایت کریں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لے گئے اور اہل یمن کو نامۂ مبارک سنایا۔ قبیلۂ ہمدان جو بہت بڑا قبیلہ تھا ایک ہی روز میں سب کا سب مسلمان ہو گیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسکی اطلاع خدمت مبارک میں بھیجی تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ اَلسَّلَامُ عَلٰی هَمْدَانِ (ہمدانیوں پر سلام ہو) اس کے بعد یمن کے قبائل یکے بعد دیگرے مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یمن کے مسلمان ہونے کی اطلاع پہنچی تو سجدۂ شکر ادا کیا۔

قبیلہ ہمدان کو اُسی وقت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ بعد کے اختلافات و محاربات میں قبیلۂ ہمدان برابر حضرت علیؓ کا جان نثار رہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُن کے بارے میں فرمایا کرتے تھے ؎

فَلَوْ كُنْتُ بَوَّابًا عَلٰى بَابِ جَنَّةٍ ۔۔۔ لَقُلْتُ لِهَمْدَانَ ادْخُلُوْا بِسَلَامٍ

اگر میں جنت کے دروازے کا دربان ہوں ۔۔۔ تو قبیلۂ ہمدان سے کہوں کہ سلامتی کیساتھ داخل ہو جاؤ

سخاوت میں ضرب المثل حاتم طائی کے بیٹے عدی قبیلۂ طے کے سردار اور بادشاہ تھے۔ نصرانی ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس غرض سے بھیجا کہ قبیلۂ طے کے بت کو جس کا نام علس تھا گرا دیں۔ اُس وقت عدی تو شام کی طرف بھاگ گئے البتہ اُن کی بہن کو حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا۔ اُنکی بہن نے خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بھائی کے واسطے امن حاصل کر کے بھائی کو لینے کے لئے ملک شام میں پہنچیں۔ حضرت عدی فرماتے ہیں۔ میں نے خدمتِ مُبارک میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ آپ مجھکو اپنے ہمراہ مکان میں لے چلے۔ راستے میں ایک بوڑھی عورت مل گئیں اور دیر تک راستے میں کھڑا کر کے اپنے متعلق کچھ کہتی رہیں میں نے اپنے دل میں کہا بیشک یہ نبی ہیں بادشاہ نہیں ہیں۔ مکان میں تشریف لیگئے تو فرش پر مجھے بٹھلایا اور خود زمین پر تشریف فرما ہوئے۔ میں نے دل میں کہا بیشک آپ نبی ہیں بادشاہ نہیں ہیں۔ اسکے بعد مجھے خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔ اے عدی شاید تم مسلمانوں کی تنگدستی اور مفلسی اور اُن کے دشمنوں کی کثرت دیکھ کر اسلام لانے سے رُکتے ہو

قسم ہے اللہ پاک کی مسلمانوں کے پاس اس کثرت سے مال آئیگا کہ اُسکو کوئی قبول بھی نکریگا
اور ایسا امن وامان قائم ہوجائے گا کہ ایک تنہا عورت قادسیہ سے بیت اللہ کی زیارت کو
آئے گی اور اُسکو سوائے اللہ کے کسی سے بھی خوف نہو گا اور تم سن لوگے کہ بابل کے سفید
محل فتح ہوگئے ہیں حضرت عدی فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہوگیا اور میں نے دیکھ لیا کہ بابل
کے قصور ابیض فتح ہوگئے ہیں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ تنہا عورت حج کو چلی آتی ہے اور قسم ہے اللہ
پاک کی تیسری بات بھی ہوکر رہیگی۔ یعنی مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ اُسکو کوئی قبول کرنیوالا نہو گا

یہ واقعہ بھی سنۃ الوفود کا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم
کا مقصد دین حق کو پھیلانے کے ساتھ امن وامان کا قائم کرنا تھا جس کو آپ نے پورا فرمایا اور
یہ کہ آپ کو اسلام کی اشاعت اور خداوند تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے کا ایسا وثوق تھا کہ
ظاہری بے سروسامانی اور دنیا بھر کی مخالفت بھی اس میں تردد پیدا نہ کرسکتی تھی۔ اور یہ کہ وثوق
ظاہری ساز وسامان پر نہ تھا۔ ورنہ اس موقع پر حضرت عدی کے سامنے اسلام کی شوکت وقوت کو
ظاہر فرماتے نہ کہ ضعف وحاجت کو اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مال ودولت ترقی کے اسباب نہیں ہیں۔
مسلمانوں نے اُس وقت ترقی کی جبکہ وہ روزمرہ کی ضروریات کو بھی بآسانی پورا نہ کرسکتے تھے۔ اور
جبکہ مال کی کثرت ہوئی اور دولت کے آثار نمایاں ہوگئے مسلمانوں کے اخلاص اور جوش ایمانی
میں کمی آتی گئی اپنی حالت سے گرتے گئے۔

اسی سال وفد عامر بھی حاضر خدمت ہوا۔ اس وفد میں عامر بن طفیل اور اربد بن قیس بھی
تھے۔ عامر سے اُن کی قوم نے کہا کہ قبائل عرب مسلمان ہوگئے تم بھی مسلمان ہوجاؤ۔ عامر نے کہا میں
اس شخص کا اتباع نہ کروں گا۔ عامر کی غرض بھی اس وقت آنے سے یہ تھی کہ کسی قسم کی تدبیر اور دھوکہ
سے آپ پر حملہ کرے چنانچہ اربد سے کہا کہ میں اُن کو باتوں میں لگاؤں گا۔ تم پیچھے کھڑے ہوکر تلوار
سے حملہ کرنا۔ ایسا ہی ہوا۔ عامر نے آپ کو باتوں میں مشغول کیا اور اس کا متوقع رہا کہ اربد حسب
وعدہ تلوار چلائیگا۔ مگر اربد نے کچھ بھی نہ کیا۔ اثناء گفتگو میں عامر نے دھمکانے کے طور پر یہ بھی

کہا کہ میں اسقدر پیادے اور سوار لیکر چڑھائی کروں گا کہ مدینے کو بھر دوں گا۔

خیال کرنے کی بات ہی کہ سنت الوفود جس میں تمام عرب کے قبائل خود بخود برضا و رغبت آکر مسلمان ہو گئے۔ ملوک حمیر وغیرہ نے خطوط کے ذریعے سے اسلام اور اطاعت کا اظہار کر دیا جبکہ قبیلہ طے کے سردار اور بادشاہ عدی بن طائی مسلمان ہو گئے اور ملک عرب میں سوار شاذ و نادر اسلام کا کوئی مخالف باقی نہ رہا۔ عامل بن طفیل دس آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح بے باکی اور جرأت سے گفتگو کرنے پر کفایت نہیں کرتا بلکہ دھمکی بھی دیتا ہے کیا یہ غایت حلم کرم عفو اور درگذر نہ تھا۔ کہ آپنے عامر کی گفتگو سُن کر اس کو کچھ بھی سخت جواب نہ دیا بلکہ فرمایا اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ عَامِرًا (یعنی اے اللہ عامر کے شر سے محفوظ رکھ) عامر یہ گفتگو کر کے واپس ہوا تو اربد کو سرزنش کی کہ ایسا موقع ملنے پر بھی تو نے کچھ نہ کیا آج سب قصہ طے ہی ہو جاتا۔ اربد نے جواب دیا کہ میں نے تو چند بار تلوار سے حملہ کرنا چاہا مگر ہر دفعہ تو میرے سامنے آجاتا تھا کیا میں تجھ کو قتل کر دیتا۔

ایک عاقل منصف کو سمجھنے کا موقع ہے کہ جب آپکو ہر چھوٹے بڑے معاملہ کی بذریعے وحی اطلاع دی جاتی تھی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عامر کے بدارادہ کی اطلاع نہ ہوتی مگر سبحان اللہ کیسی مرحمت تھی کہ حقانیت اسلام اور اپنے مرسل من اللہ ہونے کو ہر پہلو سے ظاہر فرما دیا۔ آپنے عامر اور اربد کو یہ موقعہ دیا کہ دل کی ہوس پوری کریں اور دیکھ لیں کہ اللہ تعالی اپنے سچے نبی کی کیسی تائید فرماتا ہے۔

اگر عامر اور اُسکے رفقاء کو جمال مبارک کو دیکھنے اور سچی اور مؤثر گفتگو کو سُننے سے اثر نہوا تھا۔ تو ایسی کھلی اور روشن دلیل صداقت کو دیکھنے کے بعد تو دل میں اسلام راسخ ہو جاتا۔ مگر افسوس شقاوت ازلی نے فہم و ادراک عقل و تمیز سب کو مسخ کر دیا تھا۔ وہ دولتِ ایمان سے مشرف نہوا اور آپکی تیر ہدف دعا کا نشانہ بن کر رہا۔ عامر کو راستہ ہی میں موت آئی اور کس بیکسی کے ساتھ کہ بے یار و مددگار اہلِ وطن سے دور طاعون کی گلٹی نمودار ہوئی اور قبیلۂ سلول کی ایک عورت کے گھر میں پڑ کر جان

دیدی۔ عامر جیسے متکبر اور بانخوت شخص کیلئے جس نے تمام عرب کے خلاف دربار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی گردن نہ جھکائی تھی اور اپنی سرداری اور قوت کے گھمنڈ میں تہدید آمیز گفتگو کی تھی۔ یہ بہت ننگ و عار کی بات تھی کہ مسافرانہ حالت کے اندر ایک غریب عورت کے گھر مرنے کیلئے پڑا تھا وہ نہایت حسرت کیساتھ یہ کہتا ہوا مرگیا اَغُدَّۃٌ کَغُدَّۃِ البعیر وموت فی بیت سلولیت (کیا میری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ اونٹ کی طرح طاعونی غدود نکلے اور سلولی عورت کے گھر میں پڑ کر مروں) اربد پر بھی راستہ ہی میں بجلی گری اور وہ بھی ہلاک ہوگیا۔

یہ وہ روشن واقعات ہیں جن سے ایک طرف اسلام کی کامل حقانیت کا ثبوت ملتا ہے اور دوسری جانب یہ ثابت ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام کیلئے نرم سے نرم صورتیں اختیار کی گئیں اور اُس میں جائز اور واجبی تشدد کو بھی دخل دینے سے احتراز کیا گیا۔

فروہ بن عمرو جذامی روم کے نصرانی بادشاہ کی طرف سے عرب کے بعض قبائل پر عامل تھے۔ سنۃ الوفود میں اُنہوں نے بھی ایک قاصد خدمت مبارک میں بھیجکر اپنے مسلمان ہونیکی اطلاع دی۔ روم کے بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اُس نے اُن کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور اُسکے بعد سولی پر چڑھا کر گردن ماردی لیکن فروہ میں ایمان ایسا سرایت کرچکا تھا کہ اُنہوں نے جان کی کچھ پروا نہیں کی۔ خوشی سے راہ خدا میں جان دی اور یہ کہتے ہوئے قفس عنصری کو الوداع کہا۔

بَلِّغْ سراۃ المسلمین باننی سِلْمٌ لربی اعظمی ومقامی

مسلمانوں کے سرداروں کو پہنچادو کہ میری ہڈیاں اور میری جگہ سب پروردگار کے مطیع ہیں

خیال کرنے کی بات ہے کہ فروہ نہ خود حاضر خدمت مبارک ہوئے۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کسی کو بھیجا بلکہ غائبانہ مسلمان ہوئے اور مسلمان بھی کیسے پکے کہ جان تک قربان کردی اور یہ بھی خیال کرلینا چاہیئے کہ نصاریٰ کی طرف سے ایک شخص کے ساتھ جو برغبت وشوق مسلمان ہوا تھا کیسا معاملہ کیا گیا۔

اسی سال قبیلۂ سعد بن بکر نے اپنی طرف سے ضمام بن ثعلبہ کو امیر وفد بنا کر بھیجا ضمام نے

حاضر ہوکر اسلام کے احکام دریافت کئے اور مسلمان ہو گئے۔ ضمام اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو سب لوگ گرداگرد جمع ہو کر پوچھنے لگے۔ ضمام نے سب سے پہلے گفتگو یہ کی کہ لات و عزیٰ بہت بُرے ہیں۔ لوگوں نے کہا اُنکی بُرائی نہ کرو۔ برص اور جذام میں مبتلا ہو جاؤ گے ضمام نے کہا تم پر افسوس ہے۔ یہ دونوں تو نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ضرر۔ اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا اُن پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ میں تو مسلمان ہو گیا ہوں۔ ضمام کی تقریر ایسی موثر اور دل نشین تھی کہ جو لوگ ابھی ابھی لات و عزیٰ کو نافع و ضار سمجھتے اور اُس کی گستاخی پر مبروص و مجذوم اور مجنوں ہو جانیکی دھمکی دیتے تھے بصدق دل مسلمان ہو گئے اور اُس بستی میں ایک مرد و عورت بھی شرک کی حالت میں باقی نہ رہا۔

ضمام ابن ثعلبہ کو خدمت مبارک میں حاضر رہنے کا بہت تھوڑا سا وقت ملا تھا یعنی ایک دو یوم آپنے اُن کے ہمراہ کوئی فوجی دستہ نہیں بھیجا تھا جس کے خوف سے قبیلہ کا قبیلہ مسلمان ہو جاتا۔ ضمام کے اندر اس تھوڑے سے فیض صحبت سے وہ قوت جاذبہ پیدا ہو گئی جس نے تمام قبیلہ کو جن کے رگ و ریشہ میں مشرکانہ عقاید سمائے ہوئے تھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ تھی اسلام کی اصلی قوت اور کرامت جس کے طفیل سے اسلام پھیلا اور جس نے جسموں سے پہلے دلوں کو مسخر کر لیا۔ جس نے دلوں پر محبوبانہ قبضہ کیا نہ کہ قیدیوں کی طرح پیروں کو جبر کی زنجیروں میں باندھا اور دل متنفر و آبی[۱] رہے۔ اور یہ تھا اسلام کا حقیقی جلوہ کہ جس کے اندر ایک ذرہ بھی سرایت کر گیا وہ دوسروں کو بھی اپنی قوت قلبی اور موثر بیان سے اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

یہ ایسے لوگوں کا حال ہے جن کو بہت قلیل مدت یعنی ساعت و ساعت کا فیض صحبت یا دیدار جمال مبارک حاصل ہوا تھا۔ جن حضرات کی عمریں جان نثاری میں گذریں سفر و حضر میں ہمرکاب حضور اقدس رہے۔ جن کو ایک گھڑی کی جدائی شاق تھی۔ اُن کے رسوخ ایمانی تاثیر قلبی اور قوت جاذبہ کا اسی سے قیاس ہو سکتا ہے۔

---

[۱] انکار کرنے والے۔ ۱۲

فتح مکہ ہجرت سے آٹھویں سال رمضان المبارک کے مہینے میں ہوئی اور اس کے بعد سوا سال کے اندر عرب کے وفود حاضر ہوئے۔ جوق جوق لوگ مسلمان ہوگئے۔ اور حق تعالیٰ نے اپنے سچے نبی کو سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ نازل فرما کر جتلا دیا کہ تمہاری بعثت کی غرض پوری ہو چکی اور اسلام کی حقانیت کا سکہ جو عالم کے قلوب میں بیٹھ چکا ہے مٹ نہیں سکتا اور نہ اسکی اشاعت کسی طرح رُک سکتی ہے۔

حجۃ الوداع نویں سال آپ نے حج کیا۔ اس حج کو اس وجہ سے کہ عالم حیات میں آپ ہمیشہ کیلئے بیت اللہ سے رخصت ہوگئے حجۃ الوداع کہتے ہیں اور اس وجہ سے کہ آپ نے تمام مسلمانوں کو احکام حج خصوصاً اور احکام اسلام عموماً پہنچا دئیے اسی حجۃ البلاغ بھی کہتے ہیں۔ چونکہ لاکھوں مسلمان جمع تھے اس لئے ضرورت اسکی ہوئی کہ جو کچھ آپ ارشاد فرمائیں وہ سب کو پہنچا دیا جائے۔ اس کام کے لئے اُمیہ بن خلف کے بیٹے حضرت ربیعہؓ منتخب ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو تم میری بات سن لو شاید اسکے بعد میں تم کو اس جگہ کبھی نہ دیکھوں۔ اس طویل خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا۔

اِنَّ دماءکم واموالکم حرامٌ کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا	تمہارے جان و مال ایک دوسرے پر حرام ہیں جیسے آج کے دن کی بے حرمتی اس مہینے اور اس جگہ کے اندر تم پر حرام ہے

اہلِ عرب برابر سود لیتے اور دیتے تھے اور ربوٰ (یعنی سود) کی حرمت قرآن مجید میں نازل ہو چکی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بکرات ومرات بیان فرما چکے تھے لیکن اس موقع پر حرمت دماء کے ساتھ حرمت ربو کو بھی ارشاد فرمایا اور ان دونوں کے متعلق اس قدر وضاحت اور فرمادی کہ زمانہ جاہلیت میں جس نے کسی کا خون کیا اب اس کا بدلہ لینا حرام ہے۔ اور سب سے پہلے میں اپنے چچا کے بیٹے ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون چھوڑتا ہوں علیٰ ہذا زمانہ جاہلیت میں جس کا سود کسی کے ذمے تھا وہ اب سب موقوف ہے کسی کو لینا دینا نہ چاہیے۔ البتہ ان کا راس المال ملے گا اور میں اپنے چچا عباسؓ کا اصل اور سود دونوں چھوڑتا ہوں۔

اس خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اے لوگو شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ عرب کی

سرزمین میں اسکی پرستش کی جائے یعنی اب ملکِ عرب میں بت پرستی بالکل نہو گی۔ البتہ سوائے بت پرستی اور گناہوں کے ارتکاب میں شیطان کا اتباع کیا جائیگا۔ یہ آپ کا ارشاد کس قدر صحیح تھا۔ کہ ملکِ عرب سے بت پرستی کا نام ونشان مٹ گیا اور اگرچہ اعمال کے درجہ میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں مگر سارا ملک عرب اس وقت تک شرک وبت پرستی سے بالکل پاک وصاف ہے۔

ان ارشادات سے ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ آپ دنیا میں ہدایت پھیلانے امن وامان قائم فرمانے اور جان ومال کی حفاظت کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ اسی وجہ سے حج کے آخری خطبہ میں نہایت اہتمام سے ان امور کو بیان کیا کہ اسلام کی اشاعت کو ایسے ذرائع سے بالکل علیحدہ رکھا گیا جن کی وجہ سے کوئی شخص بلا رضا مجبور ہو کر اسلام کو قبول کرے۔

ہم نے بعد ہجرت کے ہزارہا طویل حالات میں سے چند واقعات کو یہاں بیان کیا ہے جن کے مطالعہ سے ایک فہیم منصف بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کی اشاعت کسطرح ہوئی اور یہ کہ اس کے اصلی اسباب کیا تھے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے تھوڑے سے حالات بیان کرنیکے بعد ہم چاہتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے ہزارہا حالات وواقعات میں سے بھی چند ایک کا ذکر کیا جائے جس سے ثابت ہو جائے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اُسی نقش قدم پر چلے اور یہ کہ انکے اندر اسلام کے اصلی محاسن اور اُس کے جذبات پوری قوت کے ساتھ موجود تھے جن کو دیکھ کر بے اختیار اسلام کی طرف رغبت ہوتی تھی اور صحابہ کرام کے ان ہی حالات ومعاملات کے ذریعہ سے اسلام نے دنیا پر اپنا تسلط جمایا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا

حصۂ دوم

زمانہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین

بعض قبائل کا مرتد ہو جانا
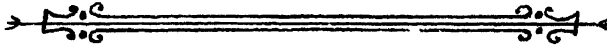
فتح مکہ اور وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تقریباً ڈیڑھ سال کا زمانہ ہے اِس عرصہ میں جیسا کہ ہم پچھلے حصہ میں بیان کر چکے ہیں سارے ملکِ عرب میں اسلام پھیل گیا اور غالباً قبائل عرب میں کوئی قبیلہ بھی ظاہراً اسلام سے منحرف نہ رہا لیکن ان نومسلموں میں بہت سے ایسے تھے جو فی الواقع مسلمان نہ ہوئے تھے۔ بلکہ اپنی قوم کی دیکھا دیکھی احکامِ اسلام ادا کرنے لگے اور زمرہ مسلمانان میں داخل ہو گئے تھے۔

عنیبہ بن حصن نے اپنی زبان سے اقرار کیا کہ میں ایک منٹ کیلئے بھی مسلمان نہ ہوا تھا اُنہوں نے طلیحہ اسدی کا ساتھ دیا تھا۔ جنکے مرتد ہونے اور مسلمان ہونیکا ذکر ابھی آتا ہے بعد میں عنیبہ گرفتار ہو کر جب مدینہ منورہ لائے گئے تو وہاں کے لڑکے بھی اُنکی حالت دیکھکر سخت متعجب ہوتے تھے وہ جانتے تھے کہ ایمان لاکر تو کوئی پھر نہیں سکتا۔ ایمان ایسی چیز نہیں کہ ایک دفعہ اسکی لذت سے آشنا ہونیکے بعد کوئی اس سے منحرف ہو جائے۔ وہ تعجب اور حیرت کیساتھ عنیبہ سے کہتے تھے کہ اے خدا کے دشمن کیا ایمان لانیکے بعد تو کافر ہو گیا۔ مگر عنیبہ نے وہی جواب دیا کہ میں ایک آن کیلئے بھی مسلمان نہوا تھا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شکر اسکی تصدیق فرمائی اور سزائے مرتدین سے معافی دیکر اُن کو

امن دیا اسکے بعد عنیہ صدق دل سے مسلمان ہوئے تو ویسے ہی ہو گئے جیسے کہ دوسرے پختہ مسلمان تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے کہ گو اس وقت اپنے ارادہ اور اختیار سے اسلام لائے مگر ایمان اُن کے اندر راسخ اور متمکن نہ ہوا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت کلام مجید میں ارشاد ہے قالت الاعراب اٰمنّا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (اعرابی کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے کہدو کہ تم ابھی ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے۔ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں جاگزین نہیں ہوا)۔

ان لوگوں کے اندر ایمان راسخ ہونے پایا تھا۔ وہ اسلام کی برکات کا ذائقہ چکھنے نہ پائے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کا سانحہ پیش آگیا۔ گروہ اول تو اسلام سے محض کورا تھا اور گروہ ثانی راسخ الایمان نہ ہوئے تھے۔ انہیں جب ریاست و خودسری موجود تھی۔ اسلئے دونوں گروہونمیں فوراً ایک تحریک پیدا ہو گئی اور ارتداد کی ایسی تند و تیز ہوا چلی کہ اکثر قبائل اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اسکے ساتھ ہی دعویٰ نبوت نے جلتی آگ پر تیل ڈالدیا۔ جگہ جگہ مدعیان نبوت کھڑے ہو گئے اور اُنکے حامی کار اور طرفداروں نے ہلچل ڈالدی اور جیسا کہ ابن الاثیر نے کہا ہے تضرمت الارض ناراً (عرب کی زمین میں آگ لگ گئی) مسیلمہ کذاب۔ اسود عنسی طلیحہ اسدی نے مردوں میں سے اور سجاح نے عورتوں میں سے دعویٰ نبوت کیا اور انمیں سے ہر ایک کیساتھ متعدد قبائل عرب ہو گئے تھے جنمیں اکثر وہ تھے جو حقیقۃً مسلمان نہوئے تھے اور بہت سے ایسے تھے جو مسلمان ہوئے تھے مگر ایمان راسخ نہوا تھا حُبِّ جاہ و ریاست و نخوت انمیں موجود تھی دوسرونکے بہکانیسے ساتھ ہو لئے عنیہ بن حصین نے (جنکے گرفتار ہو کر مدینہ میں آنے اور مسلمان ہونیکے اقرار کا ذکر ہم ابھی اوپر کر چکے ہیں) قبیلۂ اسد و غطفانکو طلیحہ کا ساتھ دینے اور اسکی نبوت کو تسلیم کرنیکے واسطے بایں الفاظ سمجھایا بنی من الحلیفین (یعنی اسد و غطفان) احب الینا من نبی من قریش (اسد و غطفان کا نبی ہمارے نزدیک قریش کے نبی سے زیادہ محبوب ہی)۔

مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل صحیح تھا کہ ملک عرب میں بت پرستی سے شیطان بالکل مایوس ہو چکا ہے مرتدین نے ایک دفعہ تو ملک بھر میں ہلچل ڈالدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ فرمودہ عامل جہاں جہاں تھے اُن کو سخت وقت کا سامنا ہوا۔ مگر ارتداد کی جڑ مضبوط نہ تھی بعض

باطنی اور حقیقی دشمنانِ اسلام کے ساتھ بہت سے ناواقف اور سادہ مزاج بھی شریک ہو گئے تھے مگر صحابہؓ کی حسن تدبیر اور بروقت مستعدی اور پورے تدارک نے اس فتنہ کا اسی سرعت کیساتھ انسداد فرمایا جس صورت سے پھیلا تھا۔ مدعیانِ نبوت میں سے اسود عنسی کا خاتمہ تو آپکی حیات ہی میں ہو گیا جس روز آپ کی وفات ہوئی اُس سے پہلے اسکی خبر مدینہ منورہ میں پہنچ گئی تھی۔ مسیلمہ کذاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اُس نے بذریعہ خط کے آپ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے اپنا شریک حال بنا لیا جائے اور نصف ملک کی حکومت میرے سپرد ہو اور نصف کی قریش کے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے جواب میں تحریر فرما دیا تھا ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین (تمام زمین کا مالک خدا تعالیٰ ہے وہ بندوں میں سے جس کو چاہے دے اور مبارک انجام متقیوں کیلئے ہے)

مسیلمہ جس غرض اور مطلب کیواسطے مدعی نبوت بنا تھا اسکا حال اسی خواہش سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسیلمہ کا فتنہ زیادہ بڑھا۔ اُسکے ساتھ گو مجمع کثیر تھا بہت سے قبائل اُسکے پیرو تھے۔ مگر اسکی نبوت کا یقین کرنیوالے بہت کم تھے خود اسکا مؤذن اذان میں یہ الفاظ کہتا تھا اشہد ان مسیلمۃ یزعم انہ رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ اپنے آپکو خدا کا رسول سمجھتا ہے) یہ اشارہ مسیلمہ سے بھی مخفی نہ رہا۔ ایک روز اذان سنکر کہنے لگا۔ افصح یا حجیر فما فی المحجمۃ خیر (اے حجیر صاف صاف اقرار کر کیونکہ ایسی گول مول بات سے کچھ نفع نہیں)

بہت لوگ مسیلمہ کی حقیقت سے واقف تھے مگر اسکو بناتے تھے۔ ایک شخص نہار الرجال نام مرتد ہو کر اسکے یہاں پہنچا اور لوگوں سے یہ کہدیا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے میرے سامنے کہا کہ مسیلمہ کو میرا شریک رسالت میں بنایا گیا ہے۔

ایک دفعہ اسی شخص نے مسیلمہ سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بچوں کے سروں پر برکت کیلئے ہاتھ پھیرتے تھے اور تحنیک (یعنی خرما چبا کر تالو میں لگا دینا) کرتے تھے۔ تم بھی ایسا کرو۔ کذاب کی برکت دیکھئے اُس نے ایسا کیا تو جس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ گنجا ہو گیا اور جس کو تحنیک کی اسکی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ ایک عورت نے آکر کہا کہ ہمارے باغوں اور کنوؤں کیلئے دعا کرو کہ خوب پھل لانے لگیں اور اچھی طرح پانی دینے لگیں مسیلمہ نے نہار سے بُلا کر پوچھا اُس نے کہا بیشک

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی اور کنوؤں میں پانی کی کلی بھی کی تھی جس سے درخت اچھی طرح پھل لانے لگے تھے اور کنوؤں میں بکثرت پانی ہوگیا تھا مسیلمہ نے ایسا کیا تو درخت سوکھ گئے اور رہا سہا پانی بھی خشک ہوگیا۔

اُسکے اکثر متبعین بھی خوب جانتے تھے کہ کذاب ہے مگر تعصب قومی نے اُنکو ساتھ دینے پر مجبور کیا۔ چنانچہ طلحہ نمری نے مسیلمہ سے پوچھا تو اُس نے اپنے اوپر وحی آنیکا حال بیان کیا کہ اندھیرے میں ایک شخص آکر مجھکو تلقین کرتا ہے طلحہ نے کہا کہ اشهد انك كاذب وان محمداً صادق ولكن كذاب ربيعة احب الينا من صادق مضر (میں گواہی دیتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں مگر ہم ربیعہ کے جھوٹے کو ہم مضر کے صادق سے زیادہ پسند کرتے ہیں) ایسے مدعی نبوت کا جو انجام ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔

یمامہ پر مسیلمہ سے مسلمانوں کا ایک سخت مقابلہ ہوا جس میں مسلمان بھی بہت زیادہ شہید ہوئے اور اس کا اختتام مسیلمہ کے قتل پر ہوا۔ یمامہ کے معرکہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لشکر میں ایک شخص براء بن مالک تھے اُنکو لڑائی کے موقعہ پر کبھی یہ بات پیش آتی تھی کہ تمام بدن میں اس قدر لرزہ پیدا ہوتا تھا کہ لوگ اُن کو دبا کر بیٹھتے تھے اسکے بعد اُن کو پیشاب آتا تھا۔ پیشاب آنیکے بعد شیر کی طرح جوش میں بھر جاتے تھے جب مسیلمہ مسلمانوں کے مقابلہ سے بھاگ کر معہ اپنے لشکر کے قلعہ حدیقہ میں پناہ گزین ہوا تو براء کو یہ کیفیت پیش آئی پیشاب کرنیکے بعد جوش میں بھرے تو مسلمانوں سے کہا کہ مجھے دیوار پر چڑھا کر قلعہ کے اندر ڈالدو۔ لوگوں نے کہا کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے اُنہوں نے اصرار کیا اور قسم کھا بیٹھے تب مجبور ہوکر سب نے اُن کو دیوار پر چڑھا دیا اور وہ تن تنہا قلعہ کے اندر کود گئے اور بہت دیر لڑائی کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا مسلمان مظفر ومنصور قلعہ میں داخل ہوگئے اور قلعہ کے اندر مسیلمہ مقتول ہوا۔ بجز اُن مرتدین کے جو کسی معرکہ میں قتل ہوگئے تھے اکثروں کو اسلام کی کشش نے دوبارہ اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ بصدق دل مسلمان ہوکر آخر وقت اسلام اور مسلمانوں کے سچے جان نثار رہے۔

سجاح کا دعوٰی نبوت اور پھر مسلمان ہوجانا خود سری اور ہوس خام کا مرض اتنا بڑھا کہ عورتیں بھی دعوٰی نبوت

کر بیٹھیں۔ سجاح قبیلہ تمیم کی عورت تھی اپنی ننھیال یعنی بنی تغلب میں رہتی تھی۔ دعوئی نبوت کے بعد بڑی شان و شوکت اور آن بان کے ساتھ بہت سا لشکر لیے ہوئے اپنی قوم یعنی بنی تمیم کی طرف آئی بنی تغلب عیسائی تھے اُن کا سردار ہذیل بن عمران اپنا مذہب چھوڑ کر بنی تغلب کو ساتھ لیکر سجاح کے ساتھ ہو گیا۔ بنی تمیم کی حالت خود بخود مخدوش تھی بہت سے اسلام پر پختگی سے قائم تھے اور بعض بعض تذبذب میں تھے وہ آپس کے قضیہ میں مشغول تھے کہ سجاح مدعی نبوت بن کر آئی۔ بنی تمیم کو سخت آفت کا سامنا ہو گیا۔ بعض نے تو سجاح کا ساتھ دیا اور بہت سے علیحدہ رہے۔ سجاح کا قصد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لڑنے کا تھا۔ لیکن اُس نے پہلے مسیلمہ سے نبٹ لینے کو مقدم سمجھ کر یمامہ کا قصد کیا۔ مسیلمہ کو سخت فکر ہوا کہ اگر سجاح کیساتھ لڑائی میں مشغول ہوا تو مسلمان یمامہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اس لئے اُس نے ایک تدبیر سے سجاح کیساتھ مصالحت کی ٹھہرائی۔ اُس سے یہ کہا کہ نصف زمین ہمارے لئے تھی اور نصف قریش کیلئے۔ لیکن قریش نے بوجہ ناانصافی نصف پر قناعت نہ کی اب وہ نصف تجکو دیجاتی ہے اور اس کے بعد نکاح کا پیام دیدیا۔ سجاح رضامند ہو گئی۔ نکاح ہو گیا۔ سجاح کے متبعین کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے کہا کہ مسیلمہ نے تجکو مہر میں کچھ نہیں دیا اُس سے مہر کا مطالبہ کر۔ سجاح نے مطالبہ کیا تو مسیلمہ نے کہا کہ میں تمہارے مہر میں منجملہ پانچ نمازوں کے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرض کی تھیں دو نمازیں صبح اور عشا کی معاف کرتا ہوں۔

یہاں چھوٹے مدعیان نبوت کی حقیقت تھی سجاح کے ساتھی بھی خوب سمجھ گئے وہ سخت پشیمان تھے اُن کا بڑا سردار عطارد بن حاجب نہایت پشیمانی میں کہتا ہے۔ شعر

امست نبیتنا انثیٰ نطوف بھا　　واصبحت انبیاء الناس ذکرانا

اور لوگوں کے نبی تو مرد ہیں مگر ہمارا نبی ایک عورت ہی جس کو ہم لئے پھرتے ہیں۔

لیکن یہ ایک فوری جوش تھا جس کے اندر نادانستگی سے لوگ سجاح کے ساتھ ہو گئے تھے تھوڑے دنوں میں سب منتشر ہو گئے اور سجاح اپنی ننھیال بنی تغلب میں جا کر مقیم ہو گئی اور ایک عرصہ کے بعد سچی اور پکی مسلمان ہو گئی۔

طلیحہ اسدی کا دعویٰ نبوت اور پھر مسلمان ہونا۔

طلیحہ اسدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں دعویٰ نبوت کیا تھا۔ آپ نے ضرار بن الازور کو بنی اسد پر عامل مقرر فرما کر بھیجا اور مرتدین کی فہمایش و مقابلہ کا کام بھی اُن کے سپرد فرمایا۔ حضرت ضرارؓ کے وہاں پہنچتے ہی مدعی کا قصہ درہم برہم ہوگیا۔ طلیحہ تنہا رہ گیا۔ اس کو پکڑ کر قتل کرنا چاہا مگر اتفاقاً تلوار کارگر نہوئی۔ لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ اُس پر کوئی ہتیار اثر نہیں کرتا۔ اس خیال کی شہرت ہونے پر طلیحہ کے متبعین کی جمعیت پھر زیادہ بڑھ گئی۔ اسی اثنار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واقعہ پیش آیا بہت سے عرب قومی عصبیت میں اُسکے ساتھی ہوگئے۔ طلیحہ مقفیٰ عبارتیں بنا کر لوگوں کو سناتا اور کہتا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس وحی لاتے ہیں۔ اُس نے منجملہ احکام کے نماز کے اندر سے سجدہ موقوف کردیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اللہ کو تمہارے چہروں کے خاک آلودہ ہونے اوندھے گرنے سے کیا فائدہ۔ طلیحہ کو اپنی قوت پر یہاں تک بھروسہ ہوا کہ اپنے لشکر کے دو حصّے کر کے ایک حصّہ پر اپنے بھائی کو جس کا نام حبال تھا سردار بنایا اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا حکم دیا۔ حبال نے مدینہ منورہ کا قصد کیا اور اپنے قاصدوں کو پیام دیکر حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں بھیجا۔ قاصدوں نے آکر بیان کیا کہ مدینہ میں مسلمانوں کی جمعیت کم ہے۔ اس پر اُن کی ہمت بڑھ گئی۔ رات کو ڈاکہ مارا مگر ہٹا دیے گئے اور دوسرے روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بنفس نفیس لشکر کو باقاعدہ میمنہ و میسرہ و ساقہ سے مرتب کر کے تشریف لیگئے اور اچانک اُن پر حملہ کر کے شکست دی اور اسکے بعد طلیحہ کے مقابلہ کیلئے حضرت خالد بن الولید کو مامور فرمایا مقام مراحہ پر سخت مقابلہ ہوا عیینہ بن حصن بھی سات سواروں سمیت طلیحہ کے ساتھ تھا۔ اس سخت معرکہ کیوقت عیینہ بار بار طلیحہ کے پاس آکر پوچھتا تھا کہ آیا لڑائی یا فتح و شکست کے بارہ میں کوئی وحی آئی۔ وہ ہر دفعہ کہتا تھا کہ کچھ نہیں آخر ایک دفعہ آکر پوچھا تو اُس نے کہا کہ ہاں آئی ہے۔ اور ایک مقفیٰ فقرہ جس کا مطلب مقصود کچھ واضح نہ تھا سُنا دیا۔ عیینہ سمجھ گیا اُس نے اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا انصرفوا یا بنی فزارہ فانہ کذاب (اے بنی فزارہ لوٹ چلو۔ یہ بالکل جھوٹا ہے) ان کا لوٹنا تھا کہ لوگوں میں بھگی پڑ گئی اور مدعی

نبوت نہارہ گئے اُس نے بھی پہلے سے اس وقت کیواسطے سواری تیار کر رکھی تھی۔ سوار ہوتے ہی شام کی طرف بھاگ گیا اور اسکی نبوت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

لیکن ان سب حالات کے بعد طلیحہ مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونیکے بعد عمرہ کرنیکے لیئے مکہ معظمہ آئے اور مدینہ منورہ کے قریب کو گذر ہوا تو لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ طلیحہ مدینہ کے قریب جارہے ہیں۔ آپنے جواب دیا کہ پھر کیا کروں وہ تو مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بعیت کی حضرت عمرؓ نے فرمایا تم عکاشہ اور ثابت کے قاتل ہو یہ دونوں جلیل القدر صحابی طلیحہ کے مقابل میں شہید ہوئے تھے تم مجھے محبوب نہیں ہو سکتے طلیحہ نے جوابدیا کہ امیر المومنین آپ کو ایسے دو شخصوں کا کیا رنج ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ سے درجہ شہادت تک پہنچایا۔ اور مجھے اُن کے ہاتھ سے ذلیل نہیں کیا کہ میں حالتِ کفر پر مرتا۔

عمرو بن معدی کرب بھی عرب کے مشہور بہادروں اور شہسواروں میں تھے۔ یہ بھی مرتد ہو کر پھر مسلمان ہوئے۔

طلیحہ اور عمرو بن معدی کرب نے مرتد ہو کر مسلمان ہونیکے بعد اسلام میں جو نمایاں خدمتیں کی ہیں تاریخیں اُن سے معمور ہیں۔ عراق کی فتوحات میں یہ دونوں صاحب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے۔

قادسیہ[1] کا معرکہ جو اہل اسلام اور فارس میں ہوا منجملہ اُن واقعات کے ہے جس نے زمانہ کے صفحات پر مسلمانوں کے اوصاف حمیدہ اور اسلامی اخلاق کو جلی حرفوں میں لکھدیا اس معرکہ میں طلیحہ اور عمرو بن معدی کرب نے بہت زیادہ حصہ لیا۔ معرکہ قادسیہ میں تین دن متواتر نہایت سخت مقابلہ ہوا۔ یہ تین دن یوم ارماث، یوم اغواث، یوم عماس کے نام سے موسوم ہیں

---

[1] قادسیہ کوفہ کے قریب ایک شہر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا وہاں گذر ہوا تو ایک بڑھیا نے اُن کا سر اور کپڑے دھو کر صاف کئے جو سفر کی وجہ سے میلے ہو گئے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ قدست من ارض (خدا اس زمین کو پاک کرے) اُسی وقت سے قادسیہ نام مشہور ہو گیا۔ ۱۲

ان تینوں دنوں میں دونوں نے بڑے شاندار کام کئے لیکن ان تین دن کی لڑائی کے بعد جو بہت زیادہ سخت رات آئی جسکو "لیلۃ الہریر" کہتے ہیں جس کی صبح کو فارس کا سپہ سالار اعظم رستم مقتول ہوا اور مسلمانوں کو کامل فتح نصیب ہوئی۔ اس رات میں ان دونوں کو حضرت سعدؓ نے خاص موقع پر بھیجا تھا کہ ادھر سے دشمن مسلمانوں پر حملہ نہ کرسکیں لیکن اُنھوں نے حفاظت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ تنہا تنہا ہر ایک نے ایک ایک جانب سے اہلِ فارس پر حملہ کیا جس کو مسلمان تعجب کی نظر سے دیکھتے تھے۔

طلیحہ اور عمرو کی دونوں حالتوں کا موازنہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دل سے مسلمان نہوئے تھے (جیسا کہ ہم عنیبہ بن حصن کا مقولہ اوپر نقل کر چکے ہیں) یا اسلام کے ذائقے سے واقف نہوئے تھے۔ اور اسلام اُن کے اندر راسخ نہ ہوا تھا۔ لیکن جب ایمان راسخ ہوگیا تو صدق و اخلاص کے وہی آثار اُن سے ظاہر ہوئے جو سچے اور پکّے مسلمانوں سے ہونے چاہئیں۔

قادسیہ کے مشہور معرکہ کا ذکر آگیا تو ایک ایسے واقعہ کا ذکر کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے مسلمانوں کی اخلاقی جرأت، صدق نیت، اخلاص اور کمال ایمانی کا ثبوت ملتا ہے۔

اس سخت معرکہ کیوقت اتفاق سے سپہ سالار اعظم حضرت سعد بن ابی وقاص کو ایسی سخت تکلیف تھی کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے تھے۔ بلکہ سینے کے نیچے تکیہ رکھ کر اُس کے اوپر بیٹھے رہتے تھے اس معذوری کیوجہ سے نہ گھوڑے پر سوار ہوسکے نہ میدان کارزار میں تشریف لیجا سکے افسرانِ فوج کو لڑائی کے متعلق یہیں سے ہدایتیں فرماتے تھے کسی کو اس معذوری کا حال تو معلوم نہ تھا لشکر میں اس کا چرچا ہوا اور حضرت سعدؓ کی جانب سے ایک قسم کی بدظنی پھیل گئی یہاں تک کہ زبانوں پر آگیا۔ معرکہ کے پہلے دن یوم ارماث میں واپس ہونیکے وقت ایک مسلمان نے نہایت جرأت کیساتھ اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا ؎

نقاتل حتی انزل اللہ نصرہ ۔۔۔ وسعدٌ بباب القادسیۃ معصم

لہ چونکہ سردی اور تکلیف کیوجہ سے لوگونکو بات کرنا مشکل ہوتا تھا اسلئے اُس رات کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ۱۲

ہم لڑتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ امداد نازل فرماتا ہے — مگر سعد قادسیہ کے دروازہ پر پناہ میں ہیں

فأبنا وقد امت نساء كثيرة — ونسوة سعد ليس فيهن ايم

ہم تو اس حالت میں لوٹے کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں — لیکن سعد کی عورتوں میں ایک بھی بیوہ نہ تھی

یہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی جرأت تھی جو اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھا قائل کے مقبول اور باخلاص ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر اوّل تو اُن کا یہ کہنا بوجہ لاعلمی تھا۔ ادھر سپہ سالار اعظم کی نسبت حق گوئی کرنے میں ایک قسم کے حظ نفس کو بھی دخل ہونا ممکن تھا اور جتنا کوئی اعلیٰ درجہ کا مقبول ہوتا ہے اسکی ادنیٰ لغزش بھی قابل گرفت ہوتی ہے۔

حضرت سعدؓ معمولی درجہ کے شخص نہ تھے آپ عشرہ مبشرہ میں سے ایک فرد اور اس پایہ کے افراد میں سے تھے جن پر مسلمانوں کا ناز کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ آپ کو ان اشعار کی اطلاع پہنچی۔ تو فرمایا اللّٰھم ان کان ھذا کاذبا وقال الذی قال ریاء وسمعة فاقطع عنی لسانه (الٰہی اگر اُس نے غلط کہا ہے درنام آوری وشہرت کی غرض سے کہا ہے تو اس کی زبان بند کردے) حضرت سعدؓ کی دعا مقبول ہوئی۔ یہ شخص صف میں کھڑے ہوئے تھے کہ ایک تیر سیدھا مُنہ میں آکر لگا جس سے زبان بھی بند ہو گئی اور شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بوجہ قبولیت اُن کو درجہ شہادت سے سرفراز فرمایا اور حضرت کی دعا حقیقتاً اور بظاہر صورت دونوں طور سے قبول فرمائی۔

اہل بحرین کا مرتد ہونا مسلمانوں کی غیبی تائید کا عجیب واقعہ

منذر بن ساوی جو کسریٰ کی طرف سے بحرین کے حاکم تھے اُن کے مسلمان ہو جانے کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ جارود بن معلی بحرین کے ایک مقتدر رئیس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور احکام اسلام خوب سیکھ کر واپس ہوئے اور اپنے قبیلہ عبد القیس کو تعلیم احکام اسلام دینے میں مشغول ہوئے اسی اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حادثہ درپیش آگیا۔ منذر بن ساوی بھی بیمار تھے اُن کا انتقال بھی کچھ ہی دنوں بعد ہو گیا۔ اور اہل بحرین میں مرتد ہونیکی بھی ہوا جو قبائل عرب میں چل رہی تھی اثر کر گئی۔ بحرین کے دو زبردست قبیلوں میں سے بنی بکر تو مرتد ہو گئے۔ اور انہوں نے

نعمان بن المنذر کی قدیم سلطنت کو دوبارہ قائم کرکے منذر بن النعمان کو جس کا لقب غرور تھا۔ بادشاہ بنانا چاہا۔ قبیلہ عبدالقیس جو بحرین میں تھے انکو یہ خیال تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی ہوتے تو انکی وفات نہوتی۔ جارود بن معلیٰ نے ان لوگوں کو جمع کرکے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے تھے سب نے کہا بھیجے تھے۔ جارود نے کہا پھر وہ کہاں گئے؟ سب نے کہا وفات پا گئے۔ جارود نے کہا کہ بس تو آپکی بھی وفات ہو گئی جس طرح اور انبیاء کی ہوئی تھی۔ وانا اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ۔ جارود کی اس تقریر کے بعد قبیلہ عبدالقیس تو اسلام پر پختگی سے قائم رہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ غلط فہمی کو رفع کر دینا آسان ہے لیکن تعصب اور ہٹ دھرمی کا علاج زبان سے نہیں ہو سکتا۔

قبیلہ بنی بکر نے مرتد ہو کر سب مسلمانوں کو جو بحرین میں تھے محصور کر لیا۔ اس سخت محاصرے اور بھوک و پیاس کی تکلیف برداشت کرنے کی حالت میں عبداللہ بن حذف نے ان اشعار کے ذریعہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں فریاد بھیجی۔

الا ابلغ ابا بکر رسولاً	وفتیان المدینۃ اجمعینا
ابوبکرؓ کو ہمارا پیام پہنچا دو	اور مدینہ کے تمام بہادر نوجوانوں کو
فھل لکم الی قوم کرام	قعود فی جواثا محصرین
کہ تمہیں ایسے شریف لوگوں کی امداد کا بھی خیال ہے	جو جواثا[ل] میں محصور ہوئے بیٹھے ہیں۔
توکلنا علی الرحمٰن انا	وجدنا النصر للمتوکلینا
ہم تو اپنے خدا پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں	کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امداد غیبی متوکلوں کیواسطے ہے

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے علاء بن الحضرمی کو اہل بحرین کے مقابلہ اور مسلمانوں کے چھڑانے کیواسطے مامور فرمایا۔ انکو بہت سے قبائل جو مرتد ہو گئے تھے آکر ملے اور ساتھ ہو لئے۔ علاء اس جمعیت کیساتھ رات کو ایک میدان میں اُترے قافلہ پوری طرح اُترنے بھی نہ پایا تھا۔ اُنٹوں سے اسباب اور

[ل] جواثا بحرین میں ایک شہر کا نام ہے ۱۲۔

پانی کے مشکیزے اُتارے بھی نہ تھے کہ دفعۃً اونٹوں میں ایسی وحشت پیدا ہوئی کہ جسکی وجہ سے سب کے سب بھاگ گئے اور کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے مسلمان پریشان رہگئے۔ کوئی سامان پاس نہ تھا دُور دُور تک پانی کا پتہ نہ تھا۔ سب کو بھوک پیاس سے اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ یہ اندیشہ علاوہ برّیں تھا کہ ایسی حالت مجبوری میں دشمن آپہنچے تو کچھ بھی نہ کر سکیں گے مسلمانوں پر غم و فکر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اُن کو اپنی ہلاکت سی زیادہ اسلام کو ضعف پہنچنے کا اندیشہ اور رنج تھا حضرت علاؓ نے مسلمانوں کو اس غم و فکر کی حالت میں دیکھ کر فرمایا۔ تم لوگ اتنے پریشان اور تائید غیبی سے مایوس کیوں ہو لوگوں نے کہا کہ ہماری پریشانی کی وجہ ظاہر ہے۔ کل کو دھوپ تیز ہو گی کہ ہم ہلاک ہو جائیں گے حضرت علاؓ نے فرمایا کہ قسم ہے خدا تعالیٰ کی تم ہلاک نہیں ہو سکتے تم مسلمان ہو۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں دین کی امداد کے لئے نکلے ہو تم بالکل مطمئن رہو۔ صبح کی نماز پڑھ کر حضرت علاؓ نے سب کے ساتھ ملکر دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ قریب ہی پانی چمکتا ہوا نظر آیا سب نے خوش خوش خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے خوب پانی پیا اور جو برتن پاس تھے سب کو بھر لیا۔ اور ابھی دن چڑھنے نہ پایا تھا کہ بھاگے ہوئے اونٹ بھی سب کے سب مع اسباب آموجود ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے یہ کرشمہ تائید آسمانی دکھلا کر مسلمانوں کو سمجھا دیا کہ اپنے دین کی اشاعت واسطے کام ہم خود کرتے ہیں۔ تمہاری تدابیر و جفاکشی پر کوئی امر موقوف نہیں ہے تمکو تمہاری سعی و اخلاص کا ثواب دینا منظور ہے اور یہ بھی اُن کو بتلا دیا کہ اگر تم سچے دل سے اسلام کی خدمت گزاری کرو گے تو تائید غیبی تمہارے ساتھ رہیگی۔ اِن تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم (اگر تم اللہ تعالیٰ کی تائید میں کھڑے ہو گے تو اللہ تمہاری مدد کریگا اور تمکو ثابت قدمی عطا فرمائیگا)

حضرت ابو ہریرہؓ بھی اس لشکر میں تھے اُنہوں نے پانی کا برتن بھر کر اُس جگہ رکھدیا اور یہاں سے روانہ ہونیکے بعد منجاب بن راشد سے کہا کہ تم اُس جگہ کو جانتے ہو۔ جہاں پانی تھا اُنہوں نے کہا کہ خوب جانتا ہوں جا کر دیکھا تو وہ برتن پانی کا بھرا ہوا رکھا تھا منجاب نے کہا آج سے پہلے اس موقع پر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ میں نے اس وجہ سے برتن بھر کر رکھ دیا تھا کہ اس کو آکر دیکھوں گا۔ اگر یہ پانی کی جگہ ہے یا کوئی چشمہ ہے تو معلوم ہو جائیگا اور اگر خدا کی طرف سے تائید ہے

اور جس طرح من وسلویٰ بنی اسرائیل پر آسمان سے نازل ہوئی تھی ہمارے لئے بھی من ہے تو معلوم ہو جائیگا۔ اب معلوم ہو گیا کہ یہ من تھا اور خدا تعالیٰ نے غیب سے امداد فرمائی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

مالک بن نویرہ کا مرتد ہو کر مسلمان ہونا

مالک بن نویرہ نے بھی سجاح کی موافقت کی تھی مگر ساتھ ہی اسکو اس سے روکا تھا کہ مدینہ منورہ پر چڑھکر جائے یا مسلمانوں سے مقابلہ کرے۔ جب سجاح کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ اپنی ننھیال بنی تغلب میں بھاگ کر چلی گئی تو مالک بھی اپنی حرکت پر سخت پشیمان اور نادم تھے۔ وہ حیران تھے کہ کیا کریں۔ اُدھر وکیع اور اسماعہ جنہوں نے سجاح کا ساتھ دیا تھا اپنے فعل پر نادم تھے۔ یہ دونوں اپنی قوم کے صدقات جمع کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لیکئے اور اطاعت قبول کرلی۔ مالک بن نویرہ نے اپنی قوم بنی یربوع سے کہا کہ ہم کو پہلے ہی اطاعت کی طرف بلایا گیا تھا مگر ہمنے دیر کی جس کا نتیجہ ہمارے لئے اچھا نہوا۔ اب تم نے اور ہم نے دیکھ لیا ہے کہ مسلمانوں کے کام بغیر ظاہری تدابیر اور انتظام کے درست ہوتے جاتے ہیں اور تائید غیبی ان کے شامل حال ہے۔ ایسی قوم سے عداوت و مقابلہ کرنا جن کے کام خدا تعالیٰ کی تائید سے چلتے ہیں عقل کا کام نہیں ہے۔ یہ بات سب کے ذہن نشین ہو گئی لیکن ابھی ان لوگوں نے حضرت خالد کی خدمت میں اظہار اطاعت نہ کیا تھا کہ حضرت خالدؓ کا لشکر آگیا اور مالک بن نویرہ اور اُن کے ہمراہیوں کو پکڑ لائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ جس جگہ لشکر اسلام پہنچے اذان دیں۔ اگر وہاں کے لوگوں نے اذان دی تو اُن سے درگذر کریں۔ مالک بن نویرہ پکڑے ہوئے آئے تو اس بارہ میں اختلاف ہوا کہ اُنہوں نے اذان دی اور نماز پڑھی یا نہیں بعض نے انکار کیا۔ اور حضرت ابو قتادہؓ نے شہادت دی کہ اُن لوگوں نے اذان دی اور نماز پڑھی۔ مگر چونکہ اختلاف تھا حضرت خالدؓ نے حکم دیا کہ انکو بالفعل نظر بند کر دیا جائے۔ رات کو سردی زیادہ تھی حضرت خالدؓ نے منادی کرا دی۔ (ادفئوا اسراکم) اپنے قیدیوں کو سردی سے بچاؤ۔ بعض قبائل کی زبان میں اس لفظ کے معنے قتل کر دینے کے تھے۔ لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ قتل کا حکم دیا گیا۔ قیدیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مالک بن نویرہ بھی مقتول ہو گئے حضرت خالدؓ آواز سُن کر تشریف لائے۔ تو اُن کا کام تمام ہو چکا تھا۔

دیکھ کر فرمایا اذا اراداللہ امرا اصابہ (جو اللہ چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے)۔

مالک بن نویرہ بےشبہ مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر ایک غلط فہمی سے مقتول ہوئے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ حضرت خالد سے ناخوش ہوئے اور گو حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت خالد کی معذرت قبول فرمائی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی۔

یہ چند واقعات بعض قبائل عرب کے مرتد ہونے اور مرتدین کے انجام کے متعلق ہمنے مختصر طور پر بیان کئے ہیں۔ ہماری غرض ان واقعات اور اُن کے انجام کو اس موقع پر بیان کرنے سے یہ تھی کہ شاید کوتاہ عقل یا ہٹ دھرم نادان مرتد ہونیکے واقعات کو دیکھ کر یہ کہے کہ اگر قبائل عرب بزور مسلمان نہیں بنائے گئے تھے تو اُن کے بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد ہونے کی کیا وجہ تھی۔ ہمنے مرتد ہونیکے اسباب کو بالاجمال اوپر بیان کردیا ہے۔ لیکن اب ہم پھر ذرا تفصیل سے اُن کو دُہرانا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے مرتد ہونیکی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ بزور مسلمان بنائے گئے تھے اور موقع پاکر اصلی حالت پر رجوع کر گئے۔ بلکہ اُسکے اصلی اسباب یہ تھے۔ عرب کی اصل فطرت میں اطاعت و انقیاد کا مادہ بہت کم تھا اور پھر صدیوں کی آزادی اور خانہ جنگیوں نے اُن میں ریاست اور حکومت کا مضمون اسقدر بڑھا دیا تھا کہ ہر قبیلہ کا امیر جس کو بجائے خود بادشاہ کہنا چاہیے علیحدہ ہوتا تھا۔ یہی آزادی تھی جس نے ایسے بے سروسامان ملک کو کسریٰ جیسے عظیم الشان بادشاہ سے آمادہ کارزار بنادیا اور کسریٰ باوجود اس سازوسامان کے عہدہ برآ نہو سکا۔ اس حب ریاست اور خیال خام سلطنت کی وجہ سے بہتوں کو، باوجود اس امر کے تیقن کے کہ آپ سچے نبی ہیں اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام لانے سے روکا۔ جیسا کہ ہم مسیلمہ کا حال ابھی بیان کر چکے ہیں۔ بنی حنیفہ اتنی بڑی قوم تھی کہ اس میں لاکھوں بہادر جنگجو نبرد آزما موجود تھے۔ مسیلمہ کو سلطنت کا خبط سمایا اور اُس نے اوّل اپنی حماقت سے یہ سمجھ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی طالب ریاست و سلطنت ہونگے اسی بات پر صلح کرلینی چاہیے کہ ہم اور آپ ملکر ساری دُنیا کو فتح کریں اور نصف ملک قریش کے

حصے میں آجائے اور نصف ہمارے لیکن یہاں تو دین حق کی تبلیغ منظور تھی اسکو صاف جواب دیدیا گیا۔

باذان عامل کسریٰ جس کے مسلمان ہونیکا مفصل حال بیان ہوچکا ہی اور اہلِ یمن کے مسلمان ہونیکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذان کو کل یمن کا امیر و عامل مقرر فرما دیا۔ اور باذان کے انتقال کے بعد یمن کے مختلف حصوں پر مختلف نائب اور امیر مقرر فرمائے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو سب عاملوں کے اوپر نگران مقرر فرما دیا۔ اسود عنسی جسکا حال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اسکے دماغ میں حکومت کا خبط سمایا اور اُس نے دعویٰ نبوت کر کے شعبدہ بازی کے ذریعے سے لوگوں کو گرویدہ کر کے عاملان یمن کے مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ مسیلہ اور اسود دونوں کسی حال اور کسی طرح سے بھی دائرۂ اسلام میں داخل نہوئے تھے۔ ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں دعویٰ کیا تھا۔

مدینہ منورہ منافقوں کے وجود سے بالکل پاک نہوا تھا ان میں کے کچھ آدمی اور اُنکے خیالات باقی تھے۔ وہ ہر وقت مسلمانوں کی ایذادہی اور بیخکنی کیلئے آمادہ تھے۔ اسلام کے سب سے بڑے مخالف اور دشمن یہود تھے۔ اُن کی جڑ ابھی موجود تھی۔ عیسائیت کے رگ و ریشے ملک عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ عیسائیت کو قیصر کی عظیم الشان سلطنت سے تقویت حاصل تھی اسلئے اس کا اثر عرب اور اہلِ عرب پر زیادہ تھا خود عرب کے بہت سی قبائل عیسائی بن چکے تھے۔

عرب کے بہت سے قبائل نے خوشی اور رضا سے اسلام قبول کیا تھا۔ مگر وہ اسلام کی خوبیوں اور برکات سے واقف نہونے پائے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن کو حاضری دربار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور فیض صحبت اُٹھانیکی نوبت نہ آئی تھی جبکہ دور ہی بیٹھے حلقہ انقیاد دین داخل ہوئے تھے۔ بعض لوگ زمرۂ اہل اسلام میں کسی مصلحت سے داخل ہوئے تھے مگر حقیقۃً مسلمان نہ ہوئے تھے۔ یہ بھی قاعدہ ہی کہ کوئی شخص کسی طریقہ کو پسند کرنیکے بعد چھوڑ دیتا ہے تو ناواقفوں پر اُس شخص کا قول دربارہ عیب جوئی زیادہ باوقعت ہوتا ہے اور اکثر مواقع پر خیالات کو سُست اور ضعیف کرنے اور موافقوں کو توڑنے کیواسطے یہ تدبیر کی جاتی ہے۔ یہی وہ

زبردست چال تھی جو یہود نے سب طرف سے مایوس ہو کر مسلمانوں کو تذبذب کرنے کیواسطے اختیار کی تھی اپنے لوگوں میں سے بعض سے یہ کہا کہ تم مسلمان ہو کر پھر جاؤ بعض خام مسلمان بھی تذبذب میں پڑ جاویں گے۔ اس تدبیر کا کلام مجید کی ان آیات میں ذکر فرمایا ہے وقالت طائفۃ من اهل الکتاب امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا وجه النهار واکفروا اخره لعلهم یرجعون (اہل کتاب کی ایک جماعت نے آپس میں کہا کہ تم مسلمانوں کے مذہب اور قرآن پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو اُس سے پھر جاؤ۔ اس تدبیر سے شاید مسلمان بھی اپنے مذہب سے پھر جائیں۔

یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ حیلہ ساز اور رابلہ فریب دوست نما دشمنوں کے اغوا سے بہت سے بھولے بھالے بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔ عرب میں عصبیت اور حمایت کا مادہ موجود تھا ان مدعیان ریاست اور دشمنان اسلام کا جادو چل گیا اور اسلام کی بڑھتی ہوئی ترقی میں ایک قسم کی رکاوٹ پیدا ہونیکا سامان ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں چاروں طرف سے دشمنوں نے سر اُبھارا لیکن وفات کے بعد تو مسلمانوں کو سخت وقت پیش آگیا اور مسلمان دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت کو دیکھ کر سخت پریشان تھے لیکن فی الحقیقت اسلام کا قدم مضبوطی سے جم چکا تھا اُس نے لاکھوں دلوں پر اس طرح سکہ جما لیا تھا کہ وہ کسی حال میں متزلزل نہ ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ الیوم اکملت لکم دینکم (آج ہم نے تمہارے دین کو کامل کر دیا) سچا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ "شیطان ملک عرب میں بت پرستی سے بالکل مایوس ہو چکا ہے" صحیح تھا۔ مخالفت اور عداوت کی جڑ مضبوط نہ تھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے استقلال حسن تدبیر۔ توکل اور اخلاص اور اعتماد علی اللہ نے سب کی ہمتوں کو بلند اور ارادوں کو چست کر دیا بعض صحابہ کے قلوب میں جو پریشانی تھی اُسکو زائل کر دیا۔

اکثر صحابہ کا یہ خیال تھا کہ اگر قبائل عرب مدعی اسلام ہو کر زکوٰۃ دینے سے انکار کریں تو ہم اُن سے لڑائی نہ کریں ہم اپنی جان کی حفاظت مخالفان اسلام کی مدافعت کیلئے لڑائی کے قصے میں مبتلا نہوں بلکہ صبر کئے ہوئے بیٹھے رہیں اور اللہ کی عبادت میں زندگی کے دن پورے کر دیں

بیشک صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی قلبی کیفیت یہی تھی۔ اُن کا دل محبت خداوندی سے اسقدر لبریز اور کسی کی محبت اور عداوت اور تمام اخلاق ذمیمہ سے ایسا پاک و صاف تھا کہ وہ ایک آن بھی کسی دوسرے مشغلہ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر یہ وقت تھا جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا حق تعالیٰ کو اظہار منظور تھا۔ آپ سمجھ چکے تھے کہ اسوقت ہمارا مدافعت نکرنا اور سکوت کرکے اپنے حال پر بیٹھ رہنا اسلام کے نیست و نابود ہونیکا پیش خیمہ ہی قانون عقل اور واقعات عام کی بنا پر یہ کھُلی ہوئی بات تھی کہ مسلمان اس فتنہ کے زمانہ میں خاموش بیٹھ کر ہرگز اپنی ہستی اور اسلام کے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوراً اُس کے تدارک کی تدبیریں فرمائیں اور ارشاد فرمایا کہ جو لوگ زکوٰۃ دینے سے انکار کرینگے میں اُن سے بھی مقابلہ کرونگا سب صحابہ نے نہایت ادب سے اپنے واجب التعظیم خلیفہ اور امیر المومنین کا حکم مانا اور جس سرعت سے یہ فتنہ پھیلا تھا اُسی سُرعت سے دبا دیا گیا۔ اسلام کی اسی حالت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی انہیں تدابیر کی طرف اشارہ کرکے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاماً کدنا نھلک فیہ لولا ان اللہ اعاننا بابی بکر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم پر ایسا وقت آگیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوبکر سے ہماری امداد نہ فرماتا تو ہم بالکل غارت ہو جاتے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ارشاد و عمل سے ہمکو اس نتیجہ پر پہنچنا دشوار نہیں ہے کہ دین کے معاملہ میں مداہنت کرنیسے اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور یہ کہ اسلام کے کسی رکن کا انکار کرنیکا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو کل ارکان کے انکار کا اور یہ کہ اگر کوئی قوم متفق ہوکر کسی رکن کو چھوڑ بیٹھے تو امام وقت کو فہمایش کیلئے اُن سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔

اس واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات سے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں وقتاً فوقتاً پیش آئے ایک نہایت اہم فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ رحمدلی اور نرمی استقلال رائے پختگی اور صلابت دینی کے منافی نہیں ہے امور دینی کے بارہ میں سختی اور شدت جسکو ہم تصلب

فی الدین سے تعبیر کرتے ہیں۔ نرمی۔ رحمدلی۔ فروتنی۔ خاکساری اور مصلحت اندیشی کی ضد نہیں۔
ایک کامل مکمل شخص میں دونوں قسم کے اوصاف بدرجہ کمال جمع ہو سکتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضؓ
کے بارہ میں ارشاد ہے ارحم امتی بامتی ابو بکر (میری امت پر سب سے زیادہ مہربان ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں)
لیکن باوجود اسقدر رحم دلی اور نرم خوئی کے وہ معاملات دینی میں ایسے سخت اور پختہ رائے ہیں کہ تمام
صحابہ ایک جانب ملکر کوئی رائے قائم فرماتے ہیں اور خلیفہ اول تن تنہا سب کی مخالفت پر تلے ہوئے
کسی قسم کی مداہنت اور ظاہری مصلحت اندیشی کو دخل دینا گوارا نہیں فرماتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے وفات سے چند روز قبل حضرت اسامہ بن زید کو ایک لشکر کا سردار بنا کر روانگی کا حکم دیا۔
انہوں نے تیار ہو کر شہر سے باہر ڈیرہ ڈالدیا۔ مگر آپکی علالت شروع ہو جانے کیوجہ سے روانگی کو
ملتوی رکھا اور اسی اثنا میں وفات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثہ عظیم پیش آگیا اور فوراً
عرب میں چاروں طرف اختلاف کی آگ بھڑک اٹھی۔ تمام صحابہ کی رائے متفق تھی کہ ایسے وقت جبکہ
مسلمان نہایت پریشان اور بے سر و سامان ہیں چاروں طرف کی مخالفت کے اندر گھرے ہوئے ہیں اس
لشکر کا جسمیں جلیل القدر صحابہ مہاجرین و انصار ہیں مدینہ منورہ سے دور چلے جانا دور اندیشی کیخلاف
اور خاص اہل مدینہ کیلئے نہایت خوفناک صورت ہے۔ خود حضرت اسامہؓ کی بھی رائے تھی کہ منتخب اور
بڑے درجے کے مسلمان میرے ساتھ ہیں میں مطمئن نہیں ہوں کہ اس لشکر کی روانگی کے بعد خلیفہ اور امہات
المومنین اور مسلمانوں کے اہل و عیال کو کن فتنوں کا سامنا ہو۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے خود جاکر امیر
لشکر اور مسلمانوں کے خیال کا اظہار کیا۔ مگر خلیفہ اول نے ایک نہ سنی اور فرمایا لو خطفتنی الکلاب
والذئاب لانفذته کما امر به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا ارد قضاءً اقضی به
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولو لم یبق فی ھذہ القری غیری لانفذته (اگر کتے اور بھیڑیئے
بھی مجھکو اچک لیجائیں تب بھی اس لشکر کو روانہ کرونگا اور جو فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں اسکو رد نہ کرونگا
اور اگر ان بستیوں میں میرے سوا کوئی بھی نہ ہے تب بھی اس لشکر کو روانہ کرونگا) آخر حضرت اسامہ تشریف لیگئے اور
خلیفہ اول کا یہ عزم و استقلال تدبیر ظاہری کی صورت میں ظاہر ہو کر مخالفت کے بڑے حصہ کو دبانے کیواسطے

کافی ہو گیا۔ بہت سے لوگ یہ سمجھ کر کہ اگر مسلمانوں کے پاس کافی قوت اور بڑی جمعیت نہوتی تو اُن کا اتنا بڑا لشکر دار الخلافت کو غیر محفوظ چھوڑ کر نہ نکلتا۔ مخالفت سے رُک گئے۔

بہت سے صحابہ حضرت اُسامہ کی نوعمری کو دیکھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے بڑے لشکر کی سرداری جسمیں خود حضرت عمرؓ کے درجے کے صحابہ داخل تھے کسی معمر اور تجربہ کار کے سپرد کی جائے تو اچھا ہی حضرت عمرؓ نے انصار کا یہ خیال حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمتمیں ظاہر فرمایا جسکو سُن کر آپ غصہ میں کھڑے ہوگئے اور جھنجھلا کر فرمایا ثکلتك امك یا ابن الخطاب استعملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتامرنی ان اعزلہ اے خطاب کے بیٹے تمہاری ماں تمکو گم کرے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حاکم بنایا تھا اور تم کہتے ہو کہ میں معزول کردوں۔ دوسری جانب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت ارشاد ہی واشدھم فی امر اللہ عمرؓ احکام خداوندی کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ کے معاملات دینی میں تشدد سخت گیری اور تصلب کی یہ کیفیت تھی کہ ادنیٰ بات خلاف شرع اور خلاف ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جائز نہ رکھتے تھے۔ اپنے صاحبزادے پر حد شرعی جاری کرنےمیں کوئی خیال مانع نہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو چند عورتیں بطور نوحہ گری گریہ وزاری میں مشغول تھیں حضرت عمرؓ نے منع فرمایا مگر وہ نہ رُکیں بالآخر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بہن کو بُلا کر دُرّہ سے دھمکایا تب سب عورتیں متفرق ہوگئیں اور نوحہ کا سلسلہ منقطع ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب لوگونکو کسی بات کی ممانعت کرتے تھے تو اپنے خاندان کے آدمیونکو جمع کرکے فرمادیا کرتے کہ دیکھو میں نے اس امر کی ممانعت کی ہی۔ اگر تم میں سے کوئی اُس کا مرتکب ہوا تو اُسکو دو چند سزا دیجائیگی۔ مگر اس شدت و صلابت دینی کیساتھ رحمدلی بھی اعلےٰ درجہ کی تھی حضرت عمرؓ کے خادم اسلم فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حسب معمول رات کیوقت حرّہ واقم دجگہ کا نام ہی) کی طرف تشریف لیگئے میں بھی ساتھ تھا۔ دور سے آگ جلتی دیکھی آپ نے وہاں جاکر سلام کیا اور دیکھا کہ ایک عورت نے ہنڈیا کو چولھے پر چڑھا رکھا ہے اور چند بچے اُسکے پاس چلا رہے ہیں۔ آپ نے اُس عورت سے اُس جگہ اترنے آگ جلانے اور بچوں کے رونے کا سبب دریافت فرمایا۔ عورت نے جواب دیا کہ رات ہوگئی تھی اس لئے

یہاں اُتر پڑی اور سردی سے بچنے کیلئے آگ جلائی ہی بچے بھوک کیوجہ سے رو رہے ہیں۔ آپنے پوچھا ہنڈیا میں کیا پکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ان کو بہلانے کیلئے خالی ہنڈیا چڑھا دی ہے حضرت عمرؓ دوڑتے ہوئے واپس ہوئے اور ایک بورے میں بہت سا آٹا اور کچھ کھجوریں بھر کر خود اپنے کاندھے پر اُٹھا کر وہاں لائے اور اپنے ہاتھ سے اوّل ہنڈیا پکائی اور اس عورت سے فرمایا کہ میں روٹی پکاتا ہوں تم ان کو کھلاتی رہو۔ اسلم کہتے ہیں کہ میں دیکھتا تھا کہ حضرت عمرؓ جب آگ میں پھونک مارتے تھے۔ تو دھواں اُن کی ڈاڑھی میں کو نکلتا تھا۔ یہ غایت رحمدلی تھی کہ اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلایا بچے یا تو رو رہے تھے یا ہنسنے کھیلنے لگے۔ حضرت عمرؓ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے واپس ہوئے۔

فتنہ ارتداد کی غامض حکمتیں

قبائل عرب کا یکلخت مرتد ہو جانا اور ملک عرب میں فتنہ کی آگ کا بھڑک اُٹھنا بظاہر نہایت ہی ہولناک قصہ ہے جس سے ایک طرف تو ظاہر بینوں اور کوتاہ اندیشوں کو یہ خلجان پیش آتے تھے کہ اگر قبائل عرب بزور مسلمان نہ بنائے گئے تو اُنکے مرتد ہونے کی کیا وجہ تھی۔ اس خلجان کی تردید بحمد اللہ مذکورۂ بالا بیان سے بخوبی ہو چکی دوسری جانب خود صحابہ کو اپنی حالت کو سنبھالنا اور حفاظت کرنا دشوار ہو رہا تھا صحابہؓ کی خطرناک حالت کا اندازہ ذیل کے الفاظ سے ہو سکتا ہے[1]

وارتدت العرب اما عامة او خاصة من کل قبیلة وظهر النفاق واشرأبت الیهودیة والنصرانیة وبقی المسلمون کالغنم فی اللیلة المطیرة لفقد نبیهم وقلتهم وکثرة عدوهم۔ عرب کے قبائل مرتد ہو گئے یا تو قبیلہ کا قبیلہ یا ہر ایک قبیلہ میں سے خاص لوگ اور منافق جن کا وجود ابھی باقی تھا ظاہر ہو گئے یہودیت اور نصرانیت نے سر اُبھارا اور مسلمان اپنے نبی کی وفات پانے اور اپنی قلت اور دشمنوں کی کثرت کیوجہ سے بے یار و مددگار رہ گئے جیسے بکریوں کا ریوڑ اندھیرے اور بارش کی رات میں بغیر چرواہے کے رہجاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عزم و استقلال دوربینی صحابہؓ کی برقت مستعدی اور تندہی سے یہ فتنہ جیسی سُرعت کیساتھ پھیلا تھا اسی سُرعت کے ساتھ فرو ہو گیا۔

لیکن ارتداد عرب کا قضیہ جیسا کہ ناگوار رنجدہ اور بغایت مشوش تھا ویسے ہی اُسمیں بہت سی حکمتیں بھی مکنوں تھیں۔

[1] ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۹ ۱۲

مسلمانوں کے اکثر کام تائید غیبی سے بنتے اور درست ہوتے تھے اُنکی ہر تدبیر اسی وجہ سے مفید ہوتی تھی کہ تائید الٰہی اُن کے شامل حال تھی عرب کے جاہل اور بگڑے ہوئے بدو بھی جو فوری جوش میں برسر مقابلہ آگئے تھے آخرکار اس نکتہ کو سمجھ گئے اور زبان سے بول اُٹھے کہ ایسے لوگوں سے کیونکر مقابلہ ہوسکتا ہے جنکے کام بغیر تدبیر کے بنتے ہیں۔

واقعہ ارتداد میں بھی فی الحقیقت بہت بڑی غیبی امداد اور تائید تھی ایک فہمیدہ اور غائر نظر تھوڑے سے تامل سے معلوم کرسکتا ہے کہ مذہب اسلام فقط اہل عرب ہی کیواسطے مخصوص نہ تھا بلکہ دنیا بھر کا مذہب تھا اور مسلمان مامور تھے کہ ہر ایک ملک والوں کو دعوت اسلام پہنچائیں مسلمانوں کو سرزمین عرب سے قدم نکال کر سب اہل مذاہب کو مذہب کی خوبیوں سے واقف کرنا لازمی امر تھا اور اس صورت میں ضروری تھا کہ اپنی اندرونی حالت سے بیفکر اور مطمئن ہوکر پوری قوت کیساتھ قدم نکالیں تاکہ معرکہ آرائی کے موقع پر اُس قوت سے کام لے سکیں۔

لیکن عرب کی یہ حالت تھی کہ اُن میں بہت سے گو بظاہر مسلمانوں میں داخل ہوگئے تھے مگر حقیقتاً مسلمان نہ تھے اور وہ کسی موقعہ کے منتظر تھے اور بہت سے لوگ گو مسلمان تو ہوگئے تھے مگر حقیقی اسلام کے ذائقہ سے واقف نہوئے تھے فیض صحبت اُٹھایا نہ تھا حب جاہ و ریاست دلمیں موجود تھی آزادی اور مطلق العنانی کے لطف کو بھولے نہ تھے احکام شرعیہ کی تقلید اور محاصل شرعی کی قیود سے خوگر نہوئے تھے منافق موجود تھے یہود جو سب سے زیادہ مسلمانوں کے دشمن تھے اُنکی جڑیں قائم تھیں اس حالت میں قبائل عرب کو بگڑنے اور مخالفت کرنیکے واسطے ایک بہانہ کی ضرورت تھی۔ اور جو مادہ خلاف اور عداوت حب جاہ و ریاست یا طلب آزادی و مطلق العنانی کا اُنمیں مخفی تھا اُسکا ظاہر ہونا ضروری تھا۔ ایسی مخدوش حالت میں کہ اہل عرب میں یہ فاسد مادہ اندر ہی اندر پکتا ہو مسلمان سرزمین عرب سے باہر قدم نکالتے تو اُن کیلئے چند دقتوں کا سامنا تھا۔ اول تو خود اُنکی جماعت میں ایسی قلت ہوتی کہ کسی قوم کے سامنے اُن کے پیام و سلام کا کچھ بھی اثر نہوتا اور در صورت مقابلہ اُنکو عہدہ برآ ہونے اور اپنی محافظت کی کوئی صورت نہوتی تو دوسرے اُنکے باہر نکلتے ہی عرب کی اندرونی مخالفت ظہور پذیر ہوتی اور خلیفہ وقت دار الخلافت اور مسلمانوں کے اہل و عیال سب دشمنوں کے نرغے میں

ٹھلتے۔ اور وہ ایسی بے اطمینانی کی حالت میں کچھ بھی نہ کرسکتے بلکہ خود اندرونی اور بیرونی دشمنوں میں محصور ہو کر فنا ہو جاتے۔

ارتداد کے قصے نے ان سب خطروں کا قلع قمع کر دیا۔ عرب قبائل نے مخالفت کرکے دل کی ہوس نکال لی اور صحابہ کے ساتھ اختلاط ہونے اور اُنکے احوال کے مشاہدے سے اُنکو محقق ہو گیا کہ دین اسلام حق ہے اُس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا اور جنہوں نے مقابلہ کیا وہ فنا ہو گئے۔ سرزمین عرب سارے موجودہ اور متوہم فتنوں سے پاک صاف ہو گئی اور وہی لوگ جو مخالفت پر آمادہ اور مسلمانوں کی بیخکنی کو اپنا پہلا فرض سمجھتے تھے۔ اسلام کی حمایت کرنے اور داد شجاعت دینے کیواسطے وطن کو چھوڑ کر لشکر اسلام کے ساتھ ہوئے اور وہ کام کر دکھائے جس سے تاریخ عالم کے صفحات بھرے پڑے ہیں طلیحہ اسدی عمرو بن معدی کرب اور ان جیسے ہزاروں شجاعان اسلام کے نام تاریخوں میں ملیں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو مرتد ہو کر مسلمانوں سے برسرپیکار ہوئے تھے پھر ایسے اطمینان سے اشاعت اسلام میں مشغول ہوئے کہ اُنکی طویل غیبت میں ایک ناگوار واقعہ بھی کسی اندرونی مخالفت کا سارے ملک عرب میں پیش نہ آیا۔

ارتداد کی اس حکمت بالغہ کو سمجھ لینے کے بعد ہر شخص بجائے اسکے کہ اس میں کچھ شبہ یا خلجان پیدا کرے یہ سمجھ لیگا کہ اس واقعہ کا پیش آنا سراسر مصلحت اور اشاعت اسلام کیلئے ضروری امر تھا۔

صحابہ کا اشاعت و تبلیغ اسلام میں مشغول ہونا

فتنۂ ارتداد سے فارغ اور مطمئن ہو جانیکے بعد صحابہ تبلیغ اسلام میں مشغول ہوئے اور سرزمین عرب سے باہر قدم نکال کر بہت تھوڑے عرصہ میں اسلام کی برکات سے دُنیا کو بھر دیا اسمیں شک نہیں کہ اسلام ایک سچا اور صاف مذہب تھا۔ اسکی ذاتی خوبیاں پرزور تاثیر و قوت جاذبہ ایسی تھیں جنکی بنا پر جب کوئی شخص صاف دلی سے اُسکی طرف متوجہ ہوتا بغیر متاثر ہوئے اور اُسکی حقانیت کو تسلیم کئے نہ رہتا مگر اسلام کے اسقدر جلد پھیلنے اور اقلیموں کے ساتھ دلوں کو مسخر کر لینے میں زیادہ تر صحابہ کے اوصاف اور محاسن اخلاق کو دخل تھا صحابہ اسلام کا نمونہ بنکر نکلے تھے۔ اُنہوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے اُن میں وہ قوت پیدا ہو گئی ہے جس سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ اور اسلام کا سچا فرمانبردار بنا سکتے ہیں اگر اُن کے اندر یہ خوبیاں نہ ہوتیں یا کسی قسم کا نقص ہوتا تو اسلام کی واقعی خوبیاں بھی

دل پر اثر نہ کریں اسلام کے سچے عقائد اور پاک تعلیمات کے بعد جب صحابہؓ کے حالات کو دیکھا جاتا تھا تو ہر شخص خود بخود اُس کا حلقہ بگوش بنجاتا تھا۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ زبانی تعلیم سے فیض صحبت کی تاثیر قوی اور مستحکم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ ایک گھڑی کے فیض صحبت کی بدولت تمام دنیا اور ہر طبقہ کے مسلمانوں سے افضل و اعلیٰ ہوگئے۔ اور بعد کے مسلمان گو علم و زہد۔ حالات و معاملات میں کسی مرتبہ کو پہنچ جائیں مگر صحابہ کی ہمسری نہیں کرسکتے۔

صحابہ کی کیفیت یہ تھی کہ اُن کے تمام اقوال و افعال احوال و معاملات کو دیکھنے سے اول نظر میں معلوم ہوجاتا تھا کہ اُن کو دُنیا سے کوئی لگاؤ اور اُسکی نعمتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ انکو سوائے رضاء خداوندی واتباع احکام شریعت کوئی امر مطلوب نہیں صحابہ دنیا کے تمام معاملات کرتے تھے۔ تجارت۔ زراعت صنعت و حرفت میں مشغول تھے۔ تعلقات خانہ داری و معاشرت احباب و اخوان کے حقوق پوری طرح سے ادا کرتے تھے۔ مگر اُن کے قلب میں سوا محبت خدا و رسول اور کوئی امر نہ تھا۔ اُنکی یہ حالت تھی کہ دن میں مثل دوسرے لوگوں کے کاروبار میں مشغول دیکھے جاتے تھے مگر کسی کو دنیا طلبی کا گمان اُن پر نہ ہوتا تھا۔ جنگ اُحد میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں کی جماعت کو ایک معین جگہ پر مامور فرما کر ارشاد فرمادیا کہ تم اپنی جگہ سے نہ ٹلنا۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی کفار مکہ شکست کھا کر بھاگے تو اسلامی لشکر مال غنیمت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس جماعت نے یہ سمجھ کر کہ فتح تو ہو ہی چکی اب یہاں کھڑے رہنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ جگہ چھوڑدی اور مال غنیمت میں حصہ لینے کیواسطے چلے گئے مال غنیمت میں حصہ لینا شرعاً منع نہ تھا بلکہ اُس کی اجازت تھی مگر اس جماعت پر محض اس وجہ سے کہ بلا اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جگہ چھوڑدی عتاب ہوا اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ (تم میں سے بعض ایسے ہیں جو دنیا کو طلب کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو آخرت کو طلب کرتے ہیں)

اس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ما علمت ان احداً من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید الدنیا حتی نزلت الآیۃ (اس آیت کے نزول سے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بھی کوئی دنیا کا طالب ہے)

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی دنیا میں تھے۔ ضروریات زندگی کو پورا کرتے تھے اپنے سوا دوسرے صحابہ کو بیع و شرا اور ہر قسم کے دنیوی کاموں میں مشغول اور تمام معاشرتی و تمدنی ضروریات کی تدبیریں کرتے دیکھتے تھے۔ پھر باوجود اسکے انمیں سے کسی کیطرف طلب دنیا کا گمان نہونیکی کیا وجہ تھی۔ صرف یہی کہ دل میں سوا اللہ تعالیٰ اور رسول صلعم کے کسی چیز کی محبت نہ تھی۔ انکے رگ ریشہ میں خون کیطرح اطاعت خدا و رسول سرایت کئے ہوئے تھی دنیا کے کاروبار جو کچھ بھی تھے ضروریات زندگی پورا کرنیکی غرض سے تھے یہی وہ بات ہی جو دیندار کو دنیا دار سے جدا کرتی ہے صحابہ باوجود ہر قسم کے کاروبار دنیا میں مشغول اور بے انتہا ثروت و غنا حاصل ہونیکے طالب دنیا کیوں نہ کہلائے اور ایک معمولی حیثیت کا شخص جو پیٹ پالنے کی فکر میں لگا ہوا اور اُس کی تدبیروں میں منہمک ہی مگر اسکو صحابہؓ کے غنا کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں سگ دنیا اور طالب دنیا کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہی۔ اسی مضمون کو عارف روم نے یوں ادا فرمایا ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

رہی یہ بات کہ اس آیت میں بعض صحابہ کو طالب دنیا فرمایا گیا ہی۔ سو اس میں کوئی خلجان کی بات نہیں۔ لغزش اور زلۃ تو بڑوں سے بھی ہوئی۔ بعض صحابہ کا یہ فعل رائے کی غلطی سے صادر ہوا انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب یہاں کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں ہی۔ اگر وہاں کھڑے رہنے کی ضرورت کو محسوس کرنیکے ساتھ مال غنیمت کیطرف متوجہ ہوتے تو بیشک دین کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینا ہوتا لیکن فی الواقع ایسا نہ تھا۔ ہاں صورتاً طلب دنیا تھا اسلئے انکو اس زلۃ پر تنبیہ کیلئے آیت مذکورہ نازل ہوئی خواص کو تھوڑی سی غلطی پر بھی سخت تنبیہ کیجاتی ہے۔

یہ واقعہ اُساریٰ بدر کے واقعہ کے مشابہ ہی۔ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سردار قید کر لئے گئے تو انکے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ فرمایا کہ آیا انکو قتل کرنا چاہئے یا فدیہ یعنی مال لے کر چھوڑ دینا چاہئے حضرت ابوبکر صدیق اور اکثر صحابہ کی رائے اس جانب تھی کہ فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے اسلئے کہ شاید یہ لوگ جو قید ہوئے ہیں دوسرے وقت خود بخود مسلمان ہو جائیں اور سردست زر فدیہ کے

حاصل ہونیسے مسلمانوں کو بمقابلہ کفار کے اپنی حالت درست کرنیکا موقع ملے اور اسلام کو تقویت پہنچے۔

مگر حضرت عمرؓ اس جانب تھے کہ ہم کو انکے بارہ میں نرمی نکرنی چاہئے ہر شخص اپنے عزیز کو قتل کرے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ اسلام پر کس قدر پختہ ہیں ہمکو خدا و رسول کے مقابلہ میں اپنے عزیزونکی بھی پرواہ نہیں ہے۔

رسول اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کی یہ سخت رائے پسند نہ آئی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ کی رائے کیموافق قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا گیا اور جن وجوہ پر یہ رائے اختیار کر لیگئی تھی اُسکے عمدہ ثمرات ظاہر ہوئے مگر کلام الٰہی میں ایک خاص حیثیت سے حضرت عمرؓ کی تائید نازل ہوئی اور جس رائے پر عملدرآمد ہوا تھا اُسکی نسبت ارشاد ہوا۔ تریدون عرض الدنیا (تم متاع دنیا کو طلب کرتے ہو)

ظاہر ہے کہ فدیہ لینا اور قیدیوں کا رہا کر دینا اسلام ہی کے مصالح پر مبنی تھا مال کی طرف رغبت اور میلان ہوا بھی تو صرف اسلام کی تقویت کیلئے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو رہا بھی کیا تو اسلام ہی کی مصلحت سمجھ کر دنیا کی طمع اور لالچ کو ہمیں ذرا بھی دخل نہ تھا مگر چونکہ بصورت ظاہری مال کیطرف رغبت تھی اسلئے یہ رائے قابل عتاب ہو گئی اور ایک خاص وجہ سے یہ نرمی جو فی الحقیقت محمود تھی اور اُسپر وہی ثمرات مرتب بھی ہوئے جنکی توقع کیگئی تھی بمقابلہ رائے حضرت عمرؓ کے پسند نہ کیگئی

الغرض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اسلام کے سچے اور مجسم نمونہ بنکر اشاعت اسلام کیلئے اُٹھے صحابہ کے حالات و معاملات اسلام کے پاکیزہ عقائد کیلئے بمنزلہ دلیل کے تھے اسلامی عقائد و احکام سُننے کے بعد جب صحابہ کو دیکھا جاتا تھا تو دعویٰ حقانیت اسلام دلائل قویہ ظاہرہ سے ثابت و مستحکم ہوتا جاتا تھا اور ہر شخص اُسکو حق سمجھنے پر مجبور ہوتا تھا۔ قرن صحابہ میں اسلام کی حیرت انگیز ترقی اور سریع اشاعت کا اصلی راز یہی ہے۔ اگرچہ صحابہ کی معرکہ آرائیوں اور شجاعت و تدبیر جرب کے افسانے بھی ایسے ہیں کہ دنیا کی کوئی تاریخ اُسکی نظیر یا اُسکے مشابہ حالات کو پیش نہیں کر سکی۔ مگر ہم اس موقع پر اُن حالات کو درج نکرینگے اور نہ فتوحات کے وسیع میدانوں کی سیر کراوینگے بلکہ یہ دکھاوینگے کہ دنیا کی قومیں اسلام کے دائرہ میں کیونکر داخل ہوئیں اُنکے واسطے وہ کون سے اسباب تھے

جن کیوجہ سے برضا و رغبت اسلام قبول کرلینے پر مجبور ہوئے

ناظرین صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات اور تائید غیبی کے واقعات اس کثرت سے ہیں کہ اُن تمام کا جمع کرنا ایک ایسے مختصر رسالہ میں سخت دشوار ہی نہیں بلکہ غیر مناسب بھی ہی۔ مگر تاہم حسب قدر چیدہ چیدہ حالات ہم لکھیں گے اُن سے ہمارا دعویٰ خوب محقق و مبرہن ہوجاویگا۔

دارین کا فتح ہونا اور سمندر کا خشک ہوجانا

اہل بحرین کے مرتد ہونے اور حضرت علاء بن الحضرمی کا اُنکے مقابلہ کیلئے مامور ہونے اور مسلمانوں کی غیبی تائید کا عجیب واقعہ پہلے مذکور ہوچکا ہے مرتدین کو اس جگہ کامل شکست ہوئی اکثر تو اُن میں کے مقتول ہوئے اور جو بچے کچھ تو دوسری جانب کو بھاگ گئے اور بہت سے خلیج دارین میں پناہ گزین ہوئے۔ دارین ایک بستی ہے جو سمندر کے کنارہ سے جہاز پر سفر کرنیوالوں کیواسطے ایک رات دن کی مسافت پر واقع ہو وہاں پہلے سے بھی دشمنان اسلام کا اجتماع تھا اور اب شکست خوردہ مرتدین کی جماعت پہنچ گئی تو ایک خوفناک قوت کا اجتماع ہوگیا حضرت علاء صورت حال کو دیکھکر متردد و متفکر تھے اگر دارین پر حملہ کرتے ہیں تو یہ اندیشہ ہے کہ دشمن عقب سے آکر اہل بحرین پر حملہ کردیں اور اگر دارین کو اسی حال پر چھوڑتے ہیں تو یہ قوت دن بدن ترقی پاکر زیادہ خوفناک ہوجائیگی اس لئے آپنے اول تو اُن قبائل کو جو فتنۂ ارتداد میں شریک نہوئے تھے لکھا کہ مرتدین اور منہزمین کے راستوں کو روک دیں اُن میں سے کوئی بحرین کی طرف آنے نہ پائے اُن لوگوں نے اس کا کامل بندوبست کرکے جواب لکھا اور حضرت علاء کو اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو دارین کا قصد فرمایا۔

دارین پر حملہ کرنے کیواسطے جہازوں اور کشتیوں کی ضرورت تھی اور مسلمانوں کے پاس اس قسم کا سامان بالکل نہ تھا۔ مگر حضرت علاء ایسے شخص نہ تھے جنکو سمندر کی ہیبتناک صورت ڈرادیتی آپنے لشکر اسلام کو جمع کرکے خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ دشمنوں کی جماعتیں اور مفرورین کے گروہ اس خلیج دارین میں جمع ہوگئے ہیں تم لوگ خشک میدان میں خداتعالیٰ کی تائید و امداد کو بھی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو تم کو اُسی قسم کی امداد اور تائید کی توقع دریا میں بھی رکھنی چاہیئے تم سب دریا میں داخل ہوجاؤ اور دشمن پر حملہ کرو مسلمانوں نے جواب دیا کہ دہنا[1] میں جو تائید غیبی کا کرشمہ ہم دیکھ چکے ہیں اُسکے بعد ہم کسی چیز سے نہ ڈرینگے

[1] دہنا وہی مقام ہے جہاں لشکر اسلام کیلئے غیب سے پانی موجود ہوگیا تھا۔ ۱۲

اس گفتگو کے بعد حضرت علاءؓ مع لشکر کے سمندر کے کنارے پر پہنچ گئے اور آپ مع لشکر کے یہ دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے سمندر میں داخل ہو گئے۔ یا ارحم الراحمین یا کریم۔ یا حلیم۔ یا احد یا صمد یا حی یا محی الموتی یا حی یا قیوم لا الہ الا انت یا ربنا۔ کوئی اونٹ پر سوار تھا اور کوئی گھوڑے پر۔ کوئی خچر پر کوئی گدھے پر۔ اور بہت سے پیادہ پا تھے سمندر کا پانی خشک ہو کر اس قدر رہ گیا کہ اونٹ اور گھوڑے کے صرف سُم بھیگتے تھے اسلامی لشکر ایسے راحت و آرام سے ہولناک دریا کو طے کر رہا تھا گویا بھیگے ہوئے ریتے پر چل رہا ہے (جس پر چلنا نہایت ہی سہل ہوتا ہے)۔

دارین میں کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مسلمان بغیر جہازوں اور کشتیوں کے اس طرح دریا کو پاپیادہ طے کر کے آ پہنچیں گے۔ وہ غافل تھے مسلمان وہاں پہنچ گئے اور دارین مسخر ہو گیا۔

خدا تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی دعا کو قبول فرمایا اور دریا میں اُن کیلئے سہل اور نہایت آرام دہ راستہ بنا دیا۔ ابھی بے آب و گیاہ میدانوں میں غیبی تائید کا خاص کرشمہ دیکھ لیا تھا اُس سے بڑھکر سمندر کو پایاب کر کے دکھلا دیا کہ دین اسلام کے ساتھ تائید الٰہی شامل ہے اُسکی اشاعت نہ ظاہری تدابیر پر موقوف ہے نہ کسی قسم کے جبر و اکراہ کو اُس میں دخل ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنکو کیسا ہی سنگدل اور حق سے منحرف شخص بھی جب دیکھے گا ناممکن ہے کہ اسلام کی حقانیت اُسکے قلب میں راسخ نہ ہو جائے اور گو وہ اپنے قدیم مذہب پر کتنا ہی ہٹ اور ضد کے ساتھ قائم رہنا چاہے لیکن دین اسلام کی کشش کبھی اُسکو اپنے اصرار اور ہٹ دھرمی پر قائم رہنے نہیں دے سکتی یہی وجہ ہے کہ موضع ہجر کا ایک عیسائی راہب اسلامی لشکر کیساتھ تھا جس نے بر و بحر دونوں جگہ تائید آسمانی کی جلوہ گری دیکھی تھی اسلام قبول کر لینے پر مجبور ہوا۔ کسی نے اُس سے پوچھا کہ تیرے مسلمان ہونیکی کیا وجہ تھی۔ اُس نے جواب میں کہا ثلاثۃ اشیاء خشیت ان یمسخنی اللہ بعدھا ان انا لم افعل۔ فیضٌ فی الرمال و تمہید اثباج البحر و دعا سمعتہ فی عسکرھم فی الھواء سحراً (تین چیزیں ایسی دیکھیں کہ اُن کے بعد بھی مسلمان نہوتا۔ تو مجھ کو مسخ ہونے کا اندیشہ تھا۔ اوّل تو بے آب و گیاہ میدان میں پانی کا ظاہر ہو جانا دوسرے سمندر میں راستہ ہو جانا تیسرے ایک دعا جو میں نے مسلمانوں کے لشکر میں صبح کیوقت آسمان کی طرف سے سُنی)

لوگوں نے کہا وہ دعا کیا تھی۔ کہا وہ دعا یہ ہے۔

اللّٰھم انت الرحمٰن الرحیم۔ لا الٰہ غیرک والبدیع لیس قبلک شئی والدائم غیر الغافل والحی الذی لا یموت۔ وخالق مایری ومالا یری وکل یوم انت فی شان وعلمت اللھم کل شئی بغیر تعلم۔

میں ان حالات کو دیکھکر سمجھ گیا کہ مسلمانوں کی اعانت و تائید میں ملائکہ کی شرکت اسی وجہ سے ہوئی کہ وہ حق پر ہیں۔

ہر شخص جس کے دل میں تھوڑا سا بھی انصاف اور سر میں عقل ہے سمجھ لیگا کہ مسلمانوں کی فتوحات اور معرکہ آرائی اور شجاعت و دلیری کے چشم دید واقعات نے ایسے عیسائی کو جو اپنے مذہب کا عالم اور راہب تھا مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا نہ مسلمانوں کی طرف سے اسکی تحریک ہوئی کہ وہ اسلام کو قبول کرے۔ وہ نہایت اطمینان قلب کیساتھ اسلامی لشکر کے ہمراہ رہکر اپنے مذہب پر مضبوطی سے قایم رہا مسلمان ہوا تو صحابہ کے حالات اور تائید آسمانی کے واقعات دیکھ کر۔ کیا اس کے بعد بھی کسی میں ہمت ہے جو یہ کہہ سکے کہ اشاعتِ اسلام بزور ہوئی ہے۔

مسلمانوں اور بالخصوص صحابہ کو اسلام کی حقانیت اور تائید آسمانی پر ایسا یقین تھا کہ اُسکے لئے کسی دلیل کیضرورت نہ تھی اُنکے دلمیں یہ مضمون راسخ تھا کہ ہم حق پر ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی تائید ہمارے ساتھ ہی مگر تاہم یقین قلبی کیساتھ مشاہدہ عینی ملجاتا ہی تو اُسی یقین کو ترقی حاصل ہوکر اور بھی زیادہ قوت ہو جاتی ہی جضرت ابراہیم علیہ السلام کا حق تعالیٰ سے احیاء موتیٰ کی کیفیت دکھانیکی درخواست کرنا اور وہاں سے استفسار ہونے پر اَوَلَمۡ تُؤۡمِن (کیا تم احیاء موتیٰ پر ایمان نہیں لائے) یہ عرض کرنا بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی (ایمان ضرور لایا ہوں لیکن میرا سوال اطمینان کے اس خاص درجہ حاصل ہونیکے واسطے ہی ہے) ہمارے مدعا کا شاہد ہے

مسلمانوں پر اس چشم دید تائید آسمانی کا خاص اثر تھا عفیف ابن المنذر خدا تعالیٰ کے اس احسان عظیم اور نعمت عظمیٰ کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

الم تر ان اللّٰہ ذکل بجرہ   وانزل بالکفار احدی الجلائل

دعونا الذی شق البحار فجاءنا　　　باعجب من فلق البحار الاوائل

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے دریا کو مسخر کر دیا اور کفار پر بڑی مصیبت نازل فرمائی ہم نے اُس ذاتِ پاک سے دعا کی جس نے دریاؤں کو شق کیا تھا تو ہمارے لئے اُس سے بھی عجیب امر ظاہر ہوا جو پہلوں کیواسطے ظاہر ہوا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کیلئے دریا میں راستہ ہو گیا تھا ہمارے لئے اُس سے بھی عجیب امر ظہور پذیر ہوا۔

حضرت خالد کا ملک عراق میں داخل ہونا

مرتدین کے قصہ سے مطمئن ہو جانے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن الولید اور عیاض بن غنمؓ کو مامور فرمایا کہ عراق میں داخل ہوں خالد بن الولید عراق کی اسفل جانب سے اور عیاض اعلیٰ جانب سے اور دونوں حیرہ پر جا کر مل جاویں اور دونوں میں سے حیرہ پر جو پہلے پہنچیں وہی لشکر کے امیر ہونگے۔ آپ نے دونوں صاحبوں کو یہ بھی فرما دیا کہ تمہارے لشکر میں سے جو لوگ واپس ہونا چاہیں اُن کو اجازت دیدینا۔ اس اجازت کی بنا پر لشکر کا ایک حصہ واپس ہو گیا تو دونوں صاحبوں نے آپکی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری امداد کیلئے کچھ لشکر بھیجا جائے آپنے حضرت خالد کی امداد کیواسطے تنہا قعقاع بن عمرو تمیمی کو بھیجا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت خالد کے لشکر میں قلت ہے اور آپ تنہا ایک شخص کو اُنکی امداد کیواسطے بھیجتے ہیں۔ آپنے ارشاد فرمایا کہ جس لشکر میں قعقاع جیسا ایک شخص بھی ہو وہ کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اور عیاض بن غنمؓ کی امداد کیلئے عبد بن غوث حمیری کو بھیجا۔ یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فراست تھی اور یہ مسلمانونکی افراد کا ایمان کامل تھا۔

حیرہ کا بطور صلح فتح ہونا

ملک عراق میں داخل ہونے کیلئے حیرہ بطور دروازہ کے تھا۔ بادشاہان فارس کی طرف سے حیرہ پر بڑا حاکم رہتا تھا اور حیرہ کے انجام پر تمام گرد و نواح کے شہروں اور قصبات کا مدار تھا۔ اکثر اطراف کے چودھری اسی انتظار میں تھے کہ حیرہ کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے اہل حیرہ نے صلح کر لینی چاہی اور گفتگوئے مصالحت کیواسطے ایاس بن قبیصہ اور عمرو بن عبد المسیح (عیسائی) حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے عمرو بن عبد المسیح کی عمر کئی سو سال کی تھی اور اُس کا لقب ابن بقیلہ تھا عربی میں سبزی اور ترکاری کو بقل کہتے ہیں بقیلہ اُسکی تصغیر ہے عبد المسیح ایک موقعہ

سبز چادریں اوڑھے ہوئے آیا تھا لوگ اُس کو ابن بقیلہ کہنے لگے)

عمرو بن عبد المسیح جب حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا تمہاری عمر کتنی ہے کہا کئی سو سال کی۔ آپ نے فرمایا تم نے سب سے زیادہ عجیب بات کیا دیکھی۔ کہا حیرہ اور دمشق کے درمیان متصل آبادی تھی۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے ملا ہوا تھا۔ ایک تنہا عورت سفر کرتی تھی ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے ملا ہوا تھا۔ ایک تنہا عورت سفر کرتی تھی اور اُسکو ایک روٹی کے سوا کسی قسم کے توشہ اور زاد راہ کی ضرورت نہ ہوتی تھی حضرت خالد نے ہنس کر اُس کے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم ایک ایسے بوڑھے شخص کے ذریعہ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو جس کی عقل و حواس درست نہیں ہے وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ کہاں سے آیا ہے۔ بقیلہ نے سُن کر حضرت خالد سے گفتگو کی اور اُنکے ہر سوال کا معقول جواب دیا جس پر آپکو یقین ہو گیا کہ اس کے حواس بالکل درست ہیں اور یہ جو کچھ اپنی عمر اور تجربہ کے متعلق کہتا ہے صحیح ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ القوم اعلم بما فیھم (قوم اپنے اندرونی حال کو زیادہ جانتی ہے)

عمرو بن عبد المسیح کے خادم کے ساتھ ایک تھیلی میں زہر تھا حضرت خالد رضی اللہ نے پوچھا یہ کیا ہے اور کیوں ساتھ لیا ہے اُس نے جواب دیا کہ یہ سم ساعۃ (فی الفور ہلاک کرنیوالا زہر) ہے اور یہ اسلئے ساتھ لایا تھا کہ اگر بس تم لوگوں کے حالات ایسے نہ دیکھتا جواب دیکھ رہا ہوں تو میں اپنی قوم کیواسطے کسی مکروہ بات کا واسطہ اور ذریعہ نہ بنتا بلکہ زہر کھا کر ہلاک ہو جاتا حضرت خالدؓ نے زہر کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر فرمایا کہ کوئی شخص اجل معین سے پہلے نہیں مرتا اور نہ کوئی چیز بلا حکم خدا اثر کرتی ہے اور یہ کہکر آپ نے یہ دعا پڑھی بسم اللہ خیر الاسماء و رب الارض والسماء الذی لا یضر مع اسمہ داء الرحمن الرحیم اور زہر نگل لیا۔

ابن بقیلہ نے گو ایک حیرت انگیز اور تعجب خیز بات دیکھی تھی مگر وہ خود عالم اور تجربہ کار تھا اُس نے حضرت خالدؓ سے کہا کہ واللہ لتبلغن ما اردتم ما دام احدٌ منکم ھکذا (قسم ہے خدا کی تم میں ایک بھی جبتک ایسا رہیگا تم اپنی مراد کو پہنچتے رہو گے)

اور پھر اُس نے اہل حیرہ کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے آجتک کوئی ایسی واضح اور روشن بات نہیں دیکھی۔ اسکے بعد ابن بقیلہ نے حضرت خالد سے ایک سالانہ محصول معین کر کے صلح کر لی کہ اہلِ حیرہ کی جان و مال کی محافظت مثل مسلمانوں کے کیجاویگی۔

اہلِ حیرہ کیساتھ صلح ہونا تھا کہ تمام گرد و نواح کے چودھریوں اور نمبرداروں نے اپنے اپنے علاقہ کی طرف سے صلح کر لی۔

عمرو بن عبد المسیح خود اہل کتاب میں کا بڑا عالم تھا اور صدہا سال کے تجربہ نے اُسکو کامل و مکمل بنا دیا تھا۔ اُسکو حضرت خالد کی گفتگو سُننے اور مسلمانوں کے حالات بچشم خود دیکھنے سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ قوم حق پر ہے اُن کا غلبہ ضرور ہو گا اور حضرت خالد کے اس قوت ایمانی اور توکل نے کہ بلا اندیشہ ایسے سخت زہر کو نگل لیا اور اُس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہوا اُسکے علم کو درجہ عین الیقین تک پہنچا دیا اُس نے بلا تامل صلح کر کے اپنے آپکو اور اپنی قوم کو ہر قسم کی آفات اور مصیبتوں سے بچا لیا۔ لیکن باینہمہ مسلمانوں کی طرف سے ادنی تحریک بھی اس امر کی نہ ہوئی کہ جب تم کو ہماری حقانیت کا یقین ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے اس معاملہ میں اُنکو اُن کے اختیار پر چھوڑا۔ ہدایت وضلالت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اہل حیرہ مسلمان نہ ہوئے بلکہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس صلح کو خود توڑا مگر حضرت مثنیٰ نے دوبارہ اُن سے صلح کر لی لیکن اُنھوں نے مکرر اُس صلح کو توڑ دیا جس پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے محصول کی مقدار بڑھا کر پھر صلح کر لی اور لشکر اسلام نے باوجود تکرر نقض عہد کے اپنی طرف سے کوئی زیادتی نہ کی

اجنادین کا عجیب واقعہ اجنادین ملک شام میں بہت بڑا شہر ہے اس جگہ مسلمانوں اور رومیوں میں بڑا معرکہ ہوا۔ ہرقل کا حقیقی بھائی لشکر روم کا سپہ سالار تھا مسلمانوں کا لشکر یہاں جمع ہو گیا۔ تو سپہ سالار روم نے ایک عربی شخص کو اس غرض کیلئے بھیجا کہ مسلمانوں کے لشکر میں رہکر اُنکی اصلی حالت کی خبر لاوے یہ شخص چونکہ خود عربی تھا مسلمانوں میں آملا۔ اور ایک دن رہکر اُن کے شب و روز کے حالات دیکھے راتوں کو تہجد گذاری اور تلاوت کلام الٰہی کرتے دیکھا۔ ہر شخص کو دیکھا کہ بلا تصنع و تکلف عبادت میں مشغول ہے۔ ایک دوسرے کیا باہمی معاملات میں نہایت صفائی سے برتاؤ ہے۔ ہر شخص امر کے

حکم کا دل و جان سے مطیع و فرمانبردار ہے یہ حالات دیکھ کر واپس ہوا سپہ سالار روم نے پوچھا کہو کیا دیکھا۔ اُس نے کہا بالليل رهبان وبالنهار فرسان - ولو سرق ابنُ ملكهم قطعوه ولو زنیٰ رُجموه فاقامة الحق فيهم یہ لوگ رات کو راہب اور عابد ہیں اور دن میں بہادر شہسوار اگر اُنکے بادشاہ کا بیٹا بھی چوری کرلے تو ہاتھ کاٹ ڈالیں اور اگر زنا کرے تو رجم کردیں۔ حق کے جاری کرنے میں کسی کی رعایت نہیں ہے

سپہ سالار نے سُن کر کہا ان کنت صدقتنی لبطن الارض خیر من لقاء هولاء

(اگر تو نے سچ بیان کیا ہے تو زمین کے اندر اُتر جانا اس سے بہتر ہے کہ ان لوگوں سے مقابلہ کیا جائے۔

صحابہ کے یہی حالات تھے جن کو دیکھ کر ہر مخالف شخص بھی متاثر اور اسلام کی حقانیت کا قائل ہو جاتا تھا۔ ہزار عقلی دلائل کا یہ اثر نہیں ہو سکتا تھا نہ معرکہ آرائیوں میں داد شجاعت دینے سے صداقت اسلام کا ایسا سکہ بیٹھ سکتا تھا۔ اور یہی ہمارا دعویٰ تھا کہ اسلام کی اشاعت کا سبب صحابہ رضی اللہ عنہم کے فیض صحبت اور اُن کے اخلاق و عبادات و معاملات کا مشاہدہ تھا۔ مگر باوجود ان واضح دلائل کے دیکھنے اور اسلام کی صداقت کا یقین قلبی حاصل ہونیکے سپہ سالار مسلمان نہوا کیونکہ توفیق الٰہی شامل حال نہ تھی +

میدان یرموک میں جرجہ کا مسلمان ہونا

اور میدان یرموک میں عین معرکہ کیوقت جرجہ جو رومی لشکر کے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار تھا خود بخود آکر مسلمان ہو گیا۔ یرموک کے میدان میں جب فریقین کی جانب سے پوری طرح صف آرائی ہو چکی تو جرجہ اپنی صف سے نکل کر درمیان میں آیا اور حضرت خالد بن الولید سپہ سالار لشکر اسلام کو آواز دی حضرت خالد تشریف لائے اور جرجہ کے متصل ایسی طرح کھڑے ہوگئے کہ دونوں کے گھوڑوں کی گردنیں ملگئیں۔ ایک نے دوسرے کو امن دیدیا۔ جرجہ نے گفتگو شروع کی اور کہا کہ میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں مجھ کو سچا جواب بلا کسی قسم کے دھوکہ کے عنایت فرمائیے کیونکہ شریف آدمی جھوٹ نہیں بولتا حضرت خالدؓ نے فرمایا دریافت کرو میں جواب دوں گا۔ جرجہ۔ کیا اللہ نے تمہارے نبی پر کوئی تلوار نازل فرمائی ہے اور نبی نے وہ تلوار تم کو دی ہے کہ جب اُس سے دشمن پر حملہ کرتے ہو اُن کو ہزیمت ہوجاتی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ

کو سیف اللہ (یعنی خدا کی تلوار) لقب عطا فرمایا تھا۔

حضرت خالدؓ۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی تلوار نازل نہیں فرمائی۔

جرجہ۔ پھر آپ کا نام سیف اللہ کیوں ہوا۔

خالدؓ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے نبی کو ہماری طرف بھیجا اول تو ہم سب اُن سے علیحدہ رہے اور پھر بعض نے اُن کی تصدیق کی اور بعض نے تکذیب کی ہیں بھی اُنہیں جھٹلانیوالوں اور مخالفوں میں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے دلوں کو پھیر دیا اور ہدایت کی۔ میں ایمان لے آیا۔ آپنے مجھے سیف اللہ کا خطاب عطا فرمایا اور میرے لئے نصرت و کامیابی کی دعا فرمائی اُس روز سے میرا نام سیف اللہ ہو گیا۔

جرجہ۔ یہ تو آپنے صحیح صحیح تبلادیا۔ اب یہ فرمائیے کہ تم ہمیں کس چیز کی طرف بلاتے ہو اور کس بات کی دعوت دیتے ہو۔

خالدؓ۔ ہم اس بات کی طرف بلاتے ہیں کہ کلمۂ شہادت پڑھو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو احکام لائے ہیں ان کو تسلیم کرو۔

جرجہ۔ لیکن اگر کوئی اس بات کو نہ مانے۔

خالدؓ۔ تو وہ محصول ادا کرے اور مسلمانوں کے امن میں آ جائے مسلمان اُس کے جان و مال کی ایسی ہی حفاظت کرینگے جیسی اپنی کرتے ہیں۔

جرجہ۔ اگر وہ اس کو بھی نہ مانے

خالدؓ۔ تو ہم اول اُسکو مخالفت اور لڑائی کی اطلاع کرینگے اور اسکے بعد اُس سے لڑائی کرینگے۔

جرجہ۔ اگر کوئی تمہارے کہنے کو مان لے اور اسلام قبول کرے۔

خالدؓ۔ ایسا شخص ہمارے مساوی ہو جاتا ہے اُسکے حقوق ہمارے حقوق کی برابر ہیں اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں اُن میں اوّل و آخر ادنیٰ و اعلیٰ شریف غیر شریف سب برابر ہیں۔

جرجہ۔ یہ بات تو مستبعد ہے کہ وہ شخص تمہارے برابر ہو جائے تم لوگ مقدم اور اسلام کی طرف سبقت کرنیوالے ہو۔

خالد۔ یہ صحیح ہے کہ ہم سابق ہیں۔ مگر ہمنے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھا فیض صحبت اُٹھایا معجزات دیکھے آپکی خدمت میں تمام اُمور کا مشاہدہ کیا۔ ایسے اُمور دیکھ کر ہمارا اسلمان ہو جانا کچھ زیادہ فضلیت کی بات نہیں۔ جو شخص بھی ایسے حالات کا مشاہدہ کریگا۔ وہ بصدق دل ایمان لے آویگا۔ ہاں جن لوگوں نے نہ یہ حالات دیکھے نہ فیض صحبت اُٹھایا اور نہ اُن عجائب اُمور کا مشاہدہ کیا وہ سچے دل سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونگے تو ہم سے افضل ہونگے۔

جرجہ۔ بیشک آپ نے صحیح فرمایا۔

اس صاف اور بے لوث گفتگو نے جرجہ کو مسخر کرلیا اور وہ بجائے اسکے کہ مقابلہ کرتے حضرت خالدؓ سے اس امر کے خواہشمند ہوئے کہ مجھکو اسلام کی تلقین کی جائے حضرت خالد اُنکو اپنے خیمہ میں لیگئے اور غسل کے بعد دو رکعتیں پڑھوائیں وہی قلب جو اسلام کے بغض سے پُر تھا مسخر ہوکر محبت خدا و رسول سے مالامال ہوگیا جرجہ اسی وقت پچھلے پیروں میدان کارزار میں واپس ہوکر شہید ہو گئے۔

حضرت خالدؓ کی گفتگو اسلامی احکام کا سچا فوٹو تھا۔ فی الحقیقت اسلام کے احکام ایسے ہی صاف اور بے لوث ہیں اُن میں جبر و اکراہ تو کجا۔ عدل و انصاف اور سیاست و تمدن کے قوانین میں حاکم رعیت فاتح مفتوح مسلم غیر مسلم سب برابر ہیں اسلام یا مسلمانوں پر یہ الزام لگانا کہ اسلام کی اشاعت میں سوا اُسکی صداقت اور حقانیت کے کسی دوسرے سبب سے کام لیا گیا ہے سراسر ظلم و ناانصافی ہے۔

بہرہ سیر اور مدائن کا فتح ہونا لشکر اسلام کا دجلہ کو بحالت طغیانی عبور کرنا	حضرت سعد بن ابی وقاص عراق کو فتح کرکے قادسیہ کے عظیم الشان معرکہ سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو چکے تو دار السلطنت فارس یعنی مدائن کا قصد فرمایا۔

مدائن درحقیقت تو چند بستیوں کا نام تھا جو بادشاہان فارس نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے نام سے آباد کی تھیں مگر اسوقت مدائن انہیں سے خاص بستی کا نام ہوگیا جسکی فتح پر بوجہ اُسکے دار السلطنت ہونیکے فارس کے انجام کا مدار تھا۔ اُس میں وہ قصر ابیض بھی تھا جسکے مفتوح ہونیکی بشارت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے۔ باقی بستیوں کے نام جُدا جُدا تھے انہیں میں سے ایک کا نام بہرہ سیر بھی تھا

دجلہ کی جانب شرق میں مدائن واقع تھا جسکو مدائن قصوی بھی کہتے تھے اور جانب غرب میں بہرہ سیر تھا جس کو مدائن دنیا کہتے تھے۔ دنیا کے معنی قریب تر کے ہیں چونکہ مسلمان دجلہ کی جانب غرب سے آرہے تھے اس لئے اوّل اُنکے رستہ میں بہرسیر پڑتا تھا اور اسی وجہ سے اُسکو مدائن دنیا کا لقب دیا گیا اور مدائن دوسرے کنارے پر تھا اس لئے اُسکو مدائن قصوی (یعنی بعید) کے نام سے نامزد کیا گیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ دجلہ کی جانب کو فتح کرتے ہوئے بہرسیر تک پہنچگئے اور دجلہ کی جانب غرب میں سرزمین عرب تک جس قدر ملک فارس کا تھا سب مسلمانوں کی اطاعت میں داخل ہوگیا صرف بہرسیر رہگیا۔ جس کا محاصرہ دو ماہ تک کرنا پڑا۔ محصورین نے محاصرہ کی سختیوں سے تنگ آکر حضرت سعدؓ کی خدمتمیں پیام صلح بھیجا کہ جس قدر ملک فتح ہوچکا ہے وہ مسلمانوں کے قبضہ میں رہے اور جو فتح نہیں ہوا وہ ہمارے لئے چھوڑ دیا جائے۔ قاصد نے یہ پیام سُنایا لیکن حضرت سعد جواب دینے نہ پائے تھے کہ ایک مسلمان نے بڑھکر کچھ جواب دیا۔ حضرت سعد نے اُس سے پوچھا کہ تم نے کیا جواب دیا اُس شخص نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ بے اختیاری طور پر میری زبان سے کچھ الفاظ نکلے جن کو میں بھی نہیں سمجھا۔ مگر قاصد کی زبانی یہ جواب سُنکر گورنر نے بہرسیر کو خالی کردیا۔ بہرسیر میں صرف ایک شخص رہگیا جس نے آکر شہر کے خالی ہونے کی اطلاع دی اُس سے پوچھا گیا کہ کس وجہ سے شہر خالی کردیا گیا۔ کہا کہ پیام صُلح کے جواب میں ایک مسلمان نے یہ جواب دیا کہ ہم ہرگز صلح نکرینگے جبتک افریدوں کے شہد کو کوثی کے لیموں کیساتھ نہ کھالیں گے۔ اس جواب کو سُن کر بہرسیر کے گورنر نے کہا کہ ان لوگوں کی طرف سے تو فرشتے جواب دیتے ہیں ان سے مقابلہ کی کیا صورت ہے۔

لشکر اسلام جس درجہ اپنے امیر کا مطیع تھا اُسکی نظیر کسی قوم میں ملنا دشوار ہے۔ ناممکن تھا کہ سپہ سالار سے پیش قدمی کرکے کوئی معمولی سپاہی جواب دیسکتا۔ پھر یہ تائید آسمانی نہیں تھی تو کیا تھی کہ ایک مسلمان کی زبان سے بلا سمجھے بوجھے کچھ الفاظ نکلتے ہیں اور اُن کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ذمہ دار والئے ملک شہر کو مسلمانوں کے حوالہ کرکے چلا جاتا ہے۔

گورنر بہرہ سیر مع رعایا اور لشکر کے مدائن چلا گیا۔ اور اب مسلمانوں کو مدائن کی فکر ہوئی اہل فارس نے

ساحلِ دجلہ پر سے کشتیاں وغیرہ سب اُٹھا دیں اور عبور دجلہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

کثرتِ باراں کیوجہ سے امسال عموماً دریاؤں میں طغیانی زیادہ تھی۔ حضرت سعدؓ اسی فکر میں تھے کہ دجلہ میں طغیانی اور زیادہ آگئی اور اُسکے پھیلاؤ اور زور شور کا انتہا نہ رہا۔

مسلمان یہ حالت دیکھ کر حیران تھے اسی اثنا میں حضرت سعدؓ نے خواب دیکھا کہ مسلمان دجلہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس خواب نے آپ کو اس جانب متوجہ کر دیا۔ اور آپنے لشکر کو جمع کر کے فرمایا دشمن نے دریا کی طغیانی میں پناہ لے رکھی ہے۔ تم اُسپر حملہ نہیں کر سکتے اور وہ جب چاہے حملہ کر سکتا ہے میری رائے یہ ہے کہ اس سے قبل کہ دنیا تم پر غالب آجائے اور اُس میں ملوث ہونے سے تمہارے حالات بدل جائیں صدق و اخلاص میں کمی آجائے۔ اللہ کیواسطے کچھ کام کرلو۔ میں تو عزم مصمم کر چکا ہوں کہ اللہ کے بھروسہ پر گھوڑوں کو دریا میں ڈالدوں اور اسی حالت میں عبور کروں" آپ کا لشکر کل سوار تھا پیادہ یا اُن میں کوئی نہ تھا سب نے یہ طیب خاطر جواب دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ آپکے عزم میں برکت عطا فرمائے ہم سب مطیع اور تیار ہیں۔

آپنے فرمایا کہ کچھ سوار ہم سے آگے جاکر پہلے کنارہ پر قابض ہو جائیں عاصم بن عمرو ذوالباس چھ سو سواروں کو لیکر دجلہ میں داخل ہوئے کنارہ کے قریب اہل فارس نے کچھ مزاحمت کی مگر وہ ہٹا دیئے گئے اور کنارہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت سعد نے حکم دیا کہ کل لشکر دریا میں داخل ہو جائے اور یہ کلمات دعائیہ ورد زبان رکھے نستعین باللہ ونتوکل علیہ حسبنا اللہ و نعم الوکیل واللہ لینصرن اللہ ولیہ ولیظہر دینہ ولیہزمن عدوہ ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم (ہم اللہ سے مدد چاہتے اور اُسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ کافی ہے اور وہ اچھا وکیل ہے قسم ہے خدا کی اللہ اپنے دوست کو فتح دیگا اور اپنے دین کو غالب کریگا اور دشمن کو ہزیمت دیگا سوا اللہ کی مدد کے کسی میں قوت نہیں۔

عبور کرتے وقت لشکر کی ترتیب اس طرح دی گئی تھی کہ دو دو مسلمان باہم ملے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے جائیں حضرت سعد کے رفیق حضرت سلمان فارسی تھے۔ حضرت سعدؓ بار بار فرماتے جاتے تھے

واللہ لینصرنّ اللہ ولیہ ولیظہرنّ دینہ ولیہزمنّ عدوہ مالم یکن فی الجیش بغی او ذنوب تغلب الحسنات (قسم ہے خدا کی اللہ اپنے دوست کی مدد کریگا اور اپنے دین کو غالب کریگا اور دشمن کو مغلوب کریگا۔ جبتک کہ لشکر میں ظلم و گناہوں کی کثرت نہو)

حضرت سلمان نے فرمایا کہ اسلامی لشکر جس طرح داخل ہوا ہے اُسی طرح صحیح وسالم پار ہوگا۔ ایسا ہی ہوا کہ ساٹھ ہزار اسلامی شہسوار دجلہ پر پھیلے ہوئے اس طرح بے تکلف باتیں کرتے جاتے تھے گویا باغ کی روشوں پر تفریح کیلئے چہل قدمی کر رہے ہیں نہ کوئی شخص ڈوبا نہ کسی کی کوئی چیز ضائع ہوئی۔ البتہ ایک شخص جرقدہ نام گھوڑے سے پانی میں گرے مگر اُن کے رفیق قعقاع نے فوراً نکال لیا۔ ایک سوار کا پیالہ دریا میں گر گیا۔ چونکہ بجز اُنکے کسی کی چیز ضائع نہوئی تھی اُن پر ایک قسم کے طعن کا موقع تھا) اُنکے رفیق نے بطور طعن اور مذاق کے کہا اصابہ القدر فطاح (تقدیر نے اُسکو اُڑا دیا) اُس شخص نے کہا واللہ انی لعلی حالۃ ما کان اللہ یسلبنی قدحی من بین اھل العسکر (قسم ہے خدا کی میں ایسے حال میں ہوں کہ لشکر بھر میں صرف میرا پیالہ کبھی سلب نہ کیا جائیگا۔

اللہ اکبر اس شخص کا صدق واخلاص کس درجہ پر تھا کہ پیالہ تو دریا میں گر گیا موج اُس کو بہا کر لیگئی مگر اس اللہ کے بندے کے اطمینان میں فرق نہیں آتا وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ میرا پیالہ کبھی ضائع نہوگا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ لشکر دریا پار ہو چکا تو موج نے اُس پیالہ کو کنارہ پر پہنچا دیا۔ ایک شخص نے اُٹھا لیا اور مالک نے پہچان کر لے لیا۔

دجلہ کی ایسی طغیانی کیحالت میں ساٹھ ہزار سواروں کا اطمینان وسکون کیساتھ باہم گفتگو کرتے ہوئے طے کر لینا اور کسی کی جان و مال کا نقصان نہونا کچھ کم عجیب بات نہ تھی بیشک اسلام کی کھلی کرامت اور اُسکے دین آسمانی ہونیکی پوری شہادت تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت میں ڈالنے والی یہ بات تھی کہ دریا کے زور شور میں تیرتے ہوئے جو گھوڑا تھک جاتا اُس کے آرام کرنیکے لئے اُسی جگہ پانی میں ٹیلہ نظر آ جاتا تھا جس پر کھڑے ہو کر گھوڑا سستا لیتا اور تھکن اُتار لیتا تھا۔ قریب قریب تمام گھوڑوں کو ایسا ہی اتفاق ہوا اسیوجہ سے اس دن کا نام تواریخ عرب میں یوم الماء اور یوم الجراثیم رکھا گیا۔

اگرچہ گھوڑے دریا میں تیر سکتے ہیں مگر اتنے گہرے دریا کو جس میں معمولی حالت میں جہاز چلتے ہوں بے انتہا جوش و طغیانی کی حالت میں اور جبکہ اُس کا عرض میلوں کا ہو رہا ہو طے کر لینا گھوڑوں کی طاقت سے بالکل خارج اور عادت کے بالکل خلاف تھا۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں گنگا جمنا اور دریاء سندھ وغیرہ دریاؤں کو برسات کی طغیانی میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے وقت اُن کو گھوڑوں یا ہاتھیوں کے ذریعے سے عبور کرنا ممکن نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ اہلِ مدائن نے اس خارج از عقل و قیاس حالت کو دیکھا تو شہر خالی کر کے چلدیئے گو ممکن ہے کہ کوئی ہٹ دھرم اب بھی کج بحثی کر کے اس روشن کرامت اور واضح دلیل کو مٹانا چاہے لیکن اس امر کو کہ جہاں حضرت سعدؓ ہوئے دریا میں ٹیلا ظاہر ہو گیا اور گھوڑے زمین پر کھڑے آرام کرنے لگے کسی سبب ظاہری سے متعلق نہیں کر سکتا اور اُسکو بجز اقرار کرامتِ اسلام و تائید آسمانی کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس عجیب و غریب تائید آسمانی کو نافع بن الاسود ان اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

وامللنا على المدائن خیلاً — بحرها من برهن اریضا

فانتثلنا خزائن المرء كسرى — يوم ولوا وحاص منا جريضا

(ہم نے مدائن پر گھوڑوں کو جھکا دیا کہ مدائن کا دریا اُنکے واسطے میدان کی طرح خوشنما تفریح کی جگہ تھی)

(پھر ہمنے کسریٰ کے خزانوں کو نکال لیا جب کہ اُن لوگوں نے پشت پھیری اور کسریٰ محروم ہو کر ہمسے بھاگا)

مال غنیمت کی فراہمی

مدائن سے جس قدر مال غنیمت حاصل ہوا اُس سے قبل کسی معرکہ میں نہوا تھا کروڑوں روپے کے اسباب کو اور خاص اُس سونے اور چاندی اور جواہرات سے بنے ہوئے فرش کو جو کسریٰ کے لئے مخصوص درباروں اور دوسرے طرب و نشاط کے جلسوں میں بچھایا جاتا تھا جس کو حضرت سعدؓ نے لشکر سے اجازت لیکر امیر المؤمنین کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجدیا تھا اور جس کے ایک بالشت مربع ٹکڑے کی قیمت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیس ہزار ملی تھی) مستثنیٰ کر کے ساٹھ ہزار سواروں کو فی کس بارہ ہزار حصہ ملا تھا اہل فارس نہایت بدحواسی کے ساتھ بھاگے تھے اُنکے بیش قیمت مال و متاع کو جا بجا جنگلوں۔ راستوں اور متفرق مقامات سے جمع کیا گیا بہت سا مال تعاقب کی حالت میں ہاتھ آیا۔ عمرو بن مقرن صاحب[1] اقباض مقرر کئے گئے۔ جس کو جہاں سے کوئی چیز ملتی تھی صاحب اقباض

[1] صاحب اقباض کا کام مال غنیمت کو یکجا محفوظ کرنا اور اُسکی فہرستیں مرتب کرنا تھا ۱۲

کے حوالے کرتا تھا ایسی حالت میں کسی چیز کا ضائع ہونا یا کسی میں کچھ تصرف کا ہو جانا مستبعد نہ تھا مگر نہ کوئی چیز ضائع ہوئی نہ کسی میں کچھ تصرف ہوا۔

نہروان کے پل پر چند اہل فارس کو دیکھا کہ ایک خچر کو جس پر دو صندوق لدے ہوئے تھے تیزی کیساتھ دھکیلتے ہوئے لئے جاتے تھے مسلمان سمجھ گئے کہ ضرور اسمیں کچھ قیمتی سامان ہے ان کو چھین کر صاحب اقباض کے حوالے کیا۔ دیکھا تو اُن میں کسریٰ کا وہ نہایت قیمتی تاج تھا جو کسی عظیم الشان دربار کے موقع پر زیب سر ہوتا تھا۔ ایک شخص نے بڑا ڈبہ جواہرات کا صاحب اقباض کے حوالہ کیا جسکو دیکھ کر اُنھوں نے اور اُنکے عملہ نے فرمایا کہ ہمنے ابتک ایسی یا اسکے لگ بھگ کوئی چیز نہیں دیکھی اور جو مال اسوقت تک فراہم ہو چکا ہے وہ سب ملکر اسکے برابر نہیں ہے صاحب اقباض نے اُس شخص سے پوچھا کہ تمنے اُس میں سے کچھ لیا ہے۔ اُنھوں نے قسم کھا کر کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا خوف نہوتا تو میں اس ڈبہ کو تمہارے پاس تک نہ لاتا۔ صاحب اقباض نے دریافت کیا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ جوابدیا میں تم کو اپنا نام بھی نہ بتلاؤں گا کہ تم خواہ مخواہ میری شکرگذاری اور تعریف کرو میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اُسی سے ثواب کا متوقع ہوں کہ اُس نے مجھے توفیق دی۔ یہ کہکر وہ شخص چلا گیا۔ صاحب اقباض نے اُسکے پیچھے ایک آدمی کو بھیجا کہ لوگوں سے دریافت کرے یہ کون شخص ہے۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ انکا نام عامر بن قیس ہے۔ حضرت سعدؓ کو اس سارے واقعہ کی خبر ہوئی تو آپنے مسرت کیساتھ فرمایا "واللہ ان الجیش لذو امانۃ ولولا ما سبق لاھل بدر رضی اللہ عنھم لقلت انھم علی فضل اھل بدر" (خدا کی قسم یہ لشکر نہایت امین ہے اور اگر اہل بدر کی فضیلت ثابت نہو چکتی تو میں کہتا کہ یہ بھی اُنکی برابر ہیں)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ والذی لا الٰہ الا ھو ما اطلعنا علی احد من اھل القادسیۃ انہ یرید الدنیا مع الاخرۃ فلقد اتھمنا ثلاثۃ نفر فما راینا کاماتھمنا وزھدھم وھم طلیحۃ وعمرو بن معدیکرب وقیس بن المکشوح (قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہمنے قادسیہ کے لشکر میں کسی ایک کو بھی یہ نہ سمجھا کہ وہ آخرت کیساتھ دنیا کا طالب ہے تین شخصوں کی نسبت گمان تھا مگر تحقیق کے بعد اُن کا سا زہد و امانت ہمنے کسی میں نہ دیکھا۔ وہ تین شخص طلیحہ اور عمرو بن معدیکرب اور قیس بن المکشوح تھے)

یہ تینوں صاحب وہی تھے جو فوری جوش میں مرتدین کے ساتھ مل گئے تھے مگر پھر مسلمان ہوگئے اُنپر بدگمانی بے موقع نہ تھی۔ مگر ایمان چونکہ اُنکے اندر قدم جما چکا تھا۔ اس لئے اُن کے اندر بھی وہی اوصاف پائے گئے جو دوسرے راسخ الایمان حضرات میں تھے۔

مدائن کا فاتح وہی لشکر ہے جو ابھی حضرت سعدؓ کی ماتحتی میں قادسیہ میں داد شجاعت دیکر اور جوہر ایمانی دکھلاکر رستم کا خاتمہ کرکے آیا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت جابر اس لشکر کو اہلِ قادسیہ سے تعبیر فرماتے ہیں ساٹھ ہزار لشکر اور ایسا بے انتہا مالِ غنیمت کہ خمس نکالنے اور قیمتی اسباب علیحدہ کرنیکے بعد فی کس بارہ ہزار درہم نقد حصہ ملا۔ اور یہ بے تعداد دولت بازاروں جنگلوں۔ بھاگتے ہوئے لوگوں سے جمع کیگئی اور اُس میں سے ایک شے میں بھی نہ خیانت ہوئی نہ کوئی چیز گم ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے پاک افراد کے اجتماع کی جن کو بمقابلہ ثواب آخرت دنیا کی طمع ذرہ بھر بھی نہ تھی کیا کسی جگہ نظیر مل سکتی ہے۔ اس سے زیادہ اُنکی بے لوثی اور دنیا سے بے لاگ ہونے کی دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ حضرت جابر حلف شدید کے ساتھ اُن کے طالب دنیا ہونے کی نفی فرماتے ہیں اور حضرت سعد اُن کو اہل بدر کے برابر کرنے کیواسطے مستعد ہیں منصفو! ذرا انصاف کرو اور دیکھو کہ اسلام کی اشاعت کن اُصول پر کیسے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ یہ وہی پاک نفوس ہیں جنکی صورت دیکھ کر ہی حقانیت اسلام دلنشین ہو جاتی تھی چہ جائیکہ اُنکے حالات و اخلاق۔ عادات۔ عبادات و معاملات کا مشاہدہ۔

اگر دنیا کی کوئی تاریخ کسی قوم کے ایسے حالات پیش کرسکتی ہے تو کرے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ساٹھ ہزار لشکر میں کل صحابہ ہی نہ تھے۔ یرموک کے عظیم الشان معرکہ میں جہاں خالد بن الولید اور امین الامت ابوعبیدہ بن الجراح سپہ سالار تھے صحابہ ایک ہزار سے زیادہ نہ تھے اسی قیاس پر کہہ سکتے ہیں کہ قادسیہ کے معرکہ میں اگر بہت ہونگے تو دو تین ہزار صحابہ ہونگے باقی کل وہی حضرات تھے جن کو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا دیدار مبارک نصیب نہیں ہوا تھا بلکہ صحابہ کے فیض صحبت نے اُنکو کندن بناکر اس درجہ میں پہنچا دیا تھا کہ اُن میں اور صحابہ میں فرق کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ صحابہ کے موثر قوی اور اُستاد کامل ہونیکی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ صحابہ کی شان تو جیسی کچھ ارفع تھی

اظہر من الشمس ہے اُنکے شاگردوں کے دامن کو بھی دنیا چھو کر نہ گئی تھی فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ہاں ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ اسلام حقیقی مذہب ہے اُس میں طمع سازی نہیں ہے اُسکی تمام کامیابی کا مدار صداقت اور سچی اطاعت و پیروی پر ہے اسلام کو شرق سے غرب اور زمین کے کونے کونے تک پہنچا دینے کا مستحکم وعدہ خداوند عالم فرما چکے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد واجب الاذعان صادر ہو چکا تھا

لا یبقی علی ظہر الارض بیت مدر و لا وبر الا ادخل اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز او ذل ذلیل (زمین پر کوئی گھر مٹی یا اون کا ایسا باقی نہ رہیگا جس میں اسلام داخل نہو یا عزت والے کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کیساتھ)

اسلام کی اشاعت میں زید و عمرو کی خصوصیت نہ تھی کلام اللہ میں صحابہ کو ارشاد فرما دیا گیا تھا۔

اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (اگر تم روگردانی کروگے تو تمہاری جگہ دوسری قوم بدل دی جاویگی اور وہ تم جیسے نہوں گے)

اس لئے اسلام پھیلا اور اُنہیں ہاتھوں سے پھیلا جنہوں نے اسلام کی سچی تعلیم پر عمل کیا اُسکے رنگ و بو اُن میں سما گئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا ارشاد بالکل صحیح تھا کہ دنیا میں ٹوٹ ہونیسے پہلے کچھ کام کر لو۔

جس وقت مسلمانوں کی حالت میں تغیر آیا۔ اسلام کے کسی حکم سے منحرف ہوئے خود انہیں کو نقصان پہنچا۔ نفس اسلام پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ نہ اُسکی رفتار ترقی میں فرق پڑا۔

ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمنے اسلام کی صداقت اور تائید آسمانی کے دلچسپ حالات سے مردہ دلوں میں تازہ روح پھونکی ہے۔ اسی طرح اُنکی اسلامی سچائی اور برگزیدگی کا دوسرا پہلو بھی دکھلادیں کہ مسلمانوں نے جب کبھی احکام اسلام کو پس پشت ڈالا اُن پر کیا کیا آفتیں نازل ہوئیں لیکن حقیقی اسلام اُسی ترقی پر رہا۔ ایک قوم اگر اپنے ہاتھوں سے برباد ہوئی تو دوسری قوم اسلام کی سچی فرمانبردار ہو کر ترقی کا علم اُٹھاتے ہوئے سامنے آگئی۔ ایک راستہ اگر بند ہو گیا تو اسلام کیلئے دوسرا راستہ کھل گیا۔

جزیرہ سردانیہ کی فتح اور مسلمانوں کا غرق آب ہونا

بحر روم میں جزیرہ صقلیہ اور کریٹ کے بعد سردانیہ سب سے بڑا جزیرہ ہے موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس نے ایک لشکر اس جزیرہ کی فتح کیواسطے جہازوں پر سوار کر کے روانہ کیا۔ جزیرہ فتح ہو گیا۔ عیسائیوں نے سونے چاندی کے برتن اور اس قسم کے دوسرے اموال کو بندرگاہ کے اندر پانی میں ڈالدیا اور بہت سے مال کو ایک گرجا میں چھت کے اندر رکھدیا۔ مسلمانوں کو بے انتہا مال غنیمت میں ملا لیکن اُس میں غلول یعنی خیانت بھی بہت ہوئی اُنکو خیانت کا ایک طرح سے موقع بھی مل گیا۔

ایک مسلمان نہانے کیواسطے دریا میں اُترا تو اُس کے پیر کو کوئی چیز لگی۔ نکالکر دیکھا تو چاندی کی رکابی تھی۔ پس اس سے پتہ چلا تو جس کے جو چیز ہاتھ لگی سب نکال لی۔ علیٰ ہذا ایک شخص اُس گرجا میں داخل ہوا۔ چھت میں ایک کبوتر بیٹھا ہوا دیکھا اُس نے تیر مارا کبوتر تو بچ گیا مگر پتھر کا ٹکڑا ٹوٹ کر نیچے گرا اور اُسکے ساتھ کچھ ونانیر بھی گرے جنکو اُس نے اُٹھالیا اس طرح وہ سارا مال بھی ہاتھوں ہاتھ سب لیگئے اور مال غنیمت میں بے انتہا چوری ہوئی۔ چوری کیلئے بہت سے حیلے اختیار کئے گئے۔ بلی کو مار کر اندرونی آلایش سے صاف کر کے اُسمیں دینار بھر کر سی دیا اور رسّی باندھکر راستہ میں پھینکدیا اور جب گذر ہوا تو کہیں پھینک دینے کے بہانے سے کھینچتے ہوئے لیگئے۔

فتح جزیرہ سے فارغ ہو کر اور مال غنیمت میں اس طرح خیانت کر کے واپسی کیواسطے جہاز میں سوار ہوئے تو غیب سے ایک آواز سُنائی دی اللّٰھُمَّ غرّقھم اے اللہ ان کو دریا میں غرق کر دے۔ سب کے سب بالکل غرق ہو گئے ایک بھی نہ بچا۔

یہ لشکر اسلام کی اہم خدمت انجام دیکر مظفر و منصور واپس ہو رہا تھا مگر احکام اسلام کی طاعت نکرنیکا نتیجہ اُن لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ بھگتنا پڑا اور سب فنا ہو گئے لیکن اسلام اپنی رفتار پر ترقی کرتا گیا اُنکے ہاتھ نہ سہی دوسرے لوگوں کے ہاتھ سے سہی۔

اسلام اپنی ترقی میں کسی کا محتاج نہیں ہے مسلمان جبتک اُسکے احکام کے پورے فرمانبردار رہے دنیا کی نیکنامی کے ساتھ ثواب آخرت جمع کرتے رہے اور جب کسی جماعت نے اُس سے انحراف کیا

خود تباہ و برباد ہوئے۔ اسلام نے اپنی ترقی کیواسطے دوسری راہ نکالی۔

روم کے بادشاہ کا خط

اسی ذیل میں ہم ایک اور تاریخی واقعہ لکھدینا مُناسب سمجھتے ہیں جس سے ہمارے سابق بیان پر اور زیادہ روشنی پڑجائے اور معلوم ہوجائے کہ علمائے اسلام اسبارہ میں خود کیا فرما گئے ہیں اور اسلام کی اس ترقی کے لم کو نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلمان بھی بخوبی سمجھتے تھے۔

چوتھی صدی ہجری میں قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ نے عربی زبان میں ایک منظوم خط جو باعتبار زبان بھی زوردار اور فصیح تھا خلیفہ عباسی کے نام لکھا جس میں ممالک اسلام کے فتح کرنے اور اپنی بیشمار مفاخر اور اولوالعزمیوں کو ظاہر کرنیکے ساتھ مسلمانوں اور خلیفہ کو خوب تہدید اور وعدہ وعید لکھے تھے۔ اُس قصیدہ کا پہلا شعر یہ تھا۔

من الملك الطهر المسيحي رسالة ‏ ‏ إلى قائم بالملك من آل هاشم

(یہ خط مسیحی پاک بادشاہ کی طرف سے ‏ ‏ خلیفہ ہاشمی کے نام)

اس خط میں بہت کچھ لکھتے لکھتے لکھا ہے۔

الا شمروا يا اهل بغداد ويلكم ‏ ‏ فملككم مستضعف غير دائم

(اے اہل بغداد تمہارے لئے ہلاکی ہو تم بھاگنے کے واسطے مستعد ہوجاؤ کیونکہ تمہارا ملک ضعیف اور ناپائیدار ہے)

رضيتم بان الديلمي خليفة ‏ ‏ فصرتم عبيد اللعبيد الديالم

(تم ویلمی کے خلیفہ ہونے پر راضی ہوگئے ‏ ‏ اور تم ویلمی غلاموں کے غلام بن گئے)

یہ اشارہ ہے کہ ملوک ویلم جو نائب خلیفہ تھے اُن کا اثر خلیفہ پر بڑھ گیا۔

فعودوا الى ارض الحجاز اذلة ‏ ‏ وخلوا بلاد الروم اهل المكارم

(تم ذلیل ہوکر سرزمین حجاز کی طرف لوٹ جاؤ۔ اور ذی عزت اہل روم کے ممالک کو خالی کردو)

اس قصیدہ کے آخر میں لکھا ہے۔

ملكنا عليكم حين جار قويكم ‏ ‏ وعاملتم بالمنكرات العظائم

(ہم تمہارے اوپر اُسوقت غالب آئے جب تمہارے قوی نے ضعیف پر ظلم کیا اور تم بڑے شنیع فعل کرنے لگے)

قضاتکم باعوا جہاراً قضاءھم کبیع ابن یعقوب بنجس دراھم

(تمہارے جج اس طرح کھلم کھلا فیصلوں کو فروخت کرنے لگے جس طرح یوسف علیہ السلام تھوڑے دراہم میں بیچ دیے گئے)

اس قصیدہ کے آخری اشعار کا ایک شعر یہ ہے

سافتح ارض الشرق طراً ومغرباً وانشر دین الصلب نشر العمائم

(عنقریب شرق اور غرب کے سب ممالک کو فتح کرونگا اور صلیب کے دین کو اسطرح پھیلاؤنگا جیسے عمامہ کو پھیلاتے ہیں۔)

ناظرین ان چند ہی اشعار سے قصیدہ کا لب لباب اور عیسائی بادشاہ کی نخوت وغرور خیالات اور ارادوں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

اس منظوم خط کا جواب اُس وقت کے مشہور و مستند عالم قفال مروزی نے تحریر فرمایا۔ جواب خط اپنی فصاحت برجستگی۔ جوابات کی معقولیت اور واقعی الزامات اور استنباط نتائج کے اعتبار سے اس پایہ کا تھا کہ مسیحی بادشاہ خلاف توقع اس بلند پایہ جواب کو دیکھ کر حیران رہ گیا وہ تعجب سے پوچھتا تھا کہ جواب لکھنے والا کون شخص ہے۔

قفال مروزی نے ہر بات کا فیصلہ کن اور قطعی جواب دیا ہے مگر ہماری غرض یہاں اُن جوابات کے نقل کرنیکی نہیں ہے البتہ بعض جوابات بطور نمونہ دکھلا کر اصل مقصود ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ فرماتے ہیں ؎

وقال مسیحی ولیس کذا کم اخو قسوة لایجتلای فعل راحم

(وہ اپنے آپ کو مسیحی کہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے سنگدل آدمی رحیم اور مہربان کا متبع نہیں کہلاتا)

یعنی مسیحی وہ ہی کہلا سکتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا متبع ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہایت رحیم مہربان اور اپنی امت کیواسطے نہایت نرم احکام لانے والے ہیں۔ ایسا سنگدل اور سخت اُن کا متبع کیونکر ہوسکتا ہے۔

ولیس مسیحیاً جعول مثلثاً یقول لعیسیٰ جل عن وصف ادم

(ایک ایسا شخص جو حضرت عیسیٰ کو خدا کہتا ہے کبھی مسیحی یعنی متبع مسیح نہیں ہوسکتا

وما الملک الطهر المسیحی غادر ولا فاجراً کانة للمظالم

(جو بادشاہ پاک اور متبع مسیح علیہ السلام ہو۔ کبھی عہد شکن اور ظلم کی طرف مائل نہیں ہوسکتا)

اس طرز جواب سے سمجھ لینا چاہئے کہ ہر ایک بات کا کیسا دنداں شکن جواب اس قصیدہ میں دیا گیا ہی یہ سارا قصیدہ اور اُس کا جواب اس قابل تھا کہ بحرفہ نقل کرکے اعتراض و جواب کا موازنہ کرتے مگر طول کا اندیشہ اور اصل مقصد سے دور پڑجانے کا خیال ہی اس لئے ہم تمام اعتراضات اور اُنکے جوابات کو نقل نہیں کرتے ہیں۔ اگر کسی وقت خواہش دیکھی گئی تو ممکن ہی کہ دونوں قصیدہ بلکہ تیسرا قصیدہ جو اسکے جواب میں ابن حزم نے لکھا ہی نقل کردیں لیکن جو سب سے بھاری اور چھپتا ہوا اعتراض عیسائی بادشاہ نے کیا تھا جس کے لکھنے کیوقت خود اُسکو بھی خبر نہ تھی کہ اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا اور وہ یہ نہ سمجھا تھا کہ گو میں دل سے حقانیت اسلام کا قائل نہیں ہوں مگر میرا اعتراض مجھی پر حجت ہو جائیگا اُس کا جواب جو قفالؒ نے دیا ہے نقل کرتے ہیں۔

وقلتم ملکنا کم لجور قضاتکم وبیعهم احکامهم بالدراهم

(تم کہتے ہو کہ ہم اس وجہ سے تم پر غالب ہوئے کہ تمہارے قاضیوں نے ظلم کیا اور اپنے فیصلوں کو روپے کے بدلے بیچ ڈالا)

وفی ذاك اقرار بصحة دیننا وانا ظلمنا فابتلینا بظالم

(لیکن اس میں تو ہمارے دین کی حقانیت کا اقرار ہے۔ کہ ہم نے ظلم کیا تو ہم پر ظالم مسلط کردیا گیا)

ان اعتراضات اور جوابات کے دیکھنے سے اتنی بات بخوبی واضح ہوگئی کہ مخالف و موافق دونوں کے نزدیک اسلام کی ترقی اور اشاعت کا مدار صرف اُسکے احکام کی خوبی اور مسلمانوں کے صدق و اخلاص پر تھا بادشاہ روم صاف اعتراض کرتا ہی جب تک تم مسلمان اپنی اصلی حالت پر رہے ہم مغلوب ہی ہوتے چلے گئے ہم اُس وقت غالب آئے جب تم نے اپنے سیدھے راستہ صدق و اخلاص دیانت و انصاف وغیرہ اوصاف حمیدہ کو چھوڑ کر ظلم اختیار کیا اور افعال شنیعہ کے مرتکب ہوئے۔

ممکن تھا کہ جواب میں ان اعتراضات کو دفع کرنے کی کوشش اس طرح کی جاتی کہ واقعات کی تغلیط کرتے اور اُن افعال کی تاویل۔ مگر نہیں مجیب نے ہٹ دھرمی اور تعصب سے کام نہیں لیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تو اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل ہی جب ہم نے ظلم کیا طریقہ حق کو چھوڑا تو فتح و نصرت تائید آسمانی نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑا۔ ہم پر دوسری قومیں مسلّط ہوگئیں۔ ہم ذلیل ہوئے اور

ملک کے ملک ہمارے قبضہ سے نکلتے چلے گئے۔

یہ دو واقعے ہم نے دوسرا پہلو دکھانیکی غرض سے درج کئے ہیں اب ہم پھر اصلی مقصد کی طرف عود کرتے ہیں۔

قیروان کی بنا ہزاروں بربر کا مسلمان ہونا

قیروان غربی افریقہ کے اُن مشہور شہروں میں ہے جو زمانہ دراز تک افریقہ کا دار السلطنت اور گورنر افریقہ کے قیامگاہ ہونیکی وجہ سے اسلامی عظمت و اقتدار اور شان و شوکت کی زندہ یادگار تھی۔ زمانہ دراز تک غربی افریقہ میں اس سے بڑا کوئی شہر نہ تھا۔ قیروان کی بنیاد ۵۰ھ ہجری میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اسلئے بھی یہ شہر مذہبی حیثیت سے مقدس سمجھا جاتا تھا۔ ہزاروں جلیل القدر علما اُسکی خاک سے ظاہر ہوئے اور وہیں آغوش لحد میں تا قیامت آرام سے گوشہ نشین ہوگئے۔

لیکن جیسا یہ شہر اپنے مقدس بانیوں اور اسلام اقتدار و عظمت کے مرجع نائبین سلطنت کے قیامگاہ ہونیکی وجہ سے نہایت مقتدر مانا جاتا تھا۔ ایسا ہی اُسکی بنیاد اور آبادی کا واقعہ بھی صفحات عالم پر یادگار رہنے والا۔ اور اسلام کی صداقت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوصاف اور ذاتی محاسن اور مقبولیت عام کا سکہ بٹھلانے والا تھا مبارک وقت تھا کہ ایک ہی وقت ہزاروں حق سے منحرف اور خدائے واحد کی توحید کی بجائے شرک و بت پرستی کو اختیار کرنیوالے سر بسجود ہوگئے اور اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کہکر سچے دل سے دین اسلام کے جان نثار بن گئے۔

حضرت عقبہ بن نافع فہری کو امیر معاویہؓ نے افریقہ کا عامل مقرر فرمایا اور حضرت عقبہ نے افریقہ کے اکثر حصہ کو فتح کر لیا۔ قوم بربر جو اصلی باشندے اس ملک کے تھے اُن میں سے بہت سے قبائل مسلمان ہوگئے تھے اور وہ بھی حضرت عقبہ کیساتھ ممالک افریقہ کی فتح میں شریک تھے۔

لیکن مسلمانوں کیلئے کوئی مستقل چھاونی نہ تھی جس جگہ اُن کا بالاستقلال قیام ہوتا اُسکا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جب امیر افریقہ وہاں سے فارغ ہو کر مصر کو واپس آتے تو نو مسلم بربری بھی مخالفوں کے

ساتھ کھڑے ہوکر سب عہد و پیمان توڑ ڈالتے اور جو مسلمان وہاں موجود ہوتے انکو تباہ کرنیمیں کچھ کسر نہ رکھتے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عقبہؓ نے ارادہ فرمایا کہ مناسب موقع پر مستقل چھاونی ڈالدیجائے جہاں ہر وقت عساکر اسلامیہ موجود رہیں اور اسطرح غربی افریقہ کو ایک مستقل صوبہ قرار دیدیا جائے۔

لیکن اس غرض کیلئے جس موقع کو پسند فرمایا وہاں اسقدر دلدل اور گنجان جنگل اور گھنے درخت تھے کہ آدمی یا بڑے جانور تو درکنار سانپوں کو بھی اُن درختوں میں سے ہوکر نکلنا دشوار تھا۔ یہ جنگل درندوں اور ہر قسم کے موذی اور زہریلے جانوروں کا مسکن تھا۔ ایسی سرزمین میں آدمی کی بود و باش تو کیا گذرنا بھی خطرناک امر تھا۔ مگر صحابہ رضوان اللہ علیہم کا ہر ایک ارادہ باذن اللہ ہوتا تھا انکے فعل میں مقبولیت کے آثار نمایاں ہوتے تھے وہ جو کچھ کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر کرتے تھے۔

مسلمانوں نے اس جگہ کو قیامگاہ بنانے میں جو خطرے تھے ان کو ظاہر کیا تو حضرت عقبہؓ نے اُن مصلحتوں کا اظہار فرمایا جو اس جگہ کو منتخب کرنے میں پیش نظر تھیں اہل اسلام کے نزدیک بھی یہ مصلحتیں قابل لحاظ ثابت ہوئیں اور حضرت عقبہؓ کی رائے اُنکو راجح معلوم ہوئی۔

اس لشکر میں اٹھارہ صحابی موجود تھے حضرت عقبہ امیر لشکر نے سب کو جمع فرماکر اُس میدان میں لیگئے اور حشرات و سباع کو خطاب کرکے فرمایا۔

ایتھا الحشرات والسباع نحن اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فارحلوا فانا نازلون فمن وجدناہ بعد قتلناہ (اے درندو اور موذی جانورو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس جگہ آباد ہونا اور قیام کرنا چاہتے ہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ اور قیام کرنا چھوڑدو اسکے بعد ہم جس کو دیکھینگے قتل کردیں گے۔)

اس آواز میں معلوم نہیں کیا تاثیر تھی کہ سب حشرات اور درندوں میں ہل چل پڑگئی وہ اُسی وقت جلاوطن ہونیکے واسطے تیار ہوگئے۔ جماعتیں کی جماعتیں وہاں سے نکلنی شروع ہوگئیں۔ شیر اپنے بچوں کو اُٹھائے ہوئے بھیڑیے اپنی اولاد کو لئے ہوئے سانپ اپنے سپولیوں کو کمر سے چمٹائے ہوئے نکلے چلے جاتے تھے یہ ایک عجیب ہیبتناک و تعجب انگیز منظر تھا جو نہ اس سے قبل کہیں دیکھا گیا تھا نہ کسی کے وہم و گمان میں تھا۔

یہ یقینی امر ہے کہ اس حالت میں جبکہ درندے اور سانپ وغیرہ اس طرح بکثرت پھیلے چلے جاتے ہوں کوئی شخص قریب کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ ہزاروں آدمی تماشائی اس حالت کو دیکھنے کیواسطے کھڑے ہوں۔ مگر سب جانتے تھے کہ اسوقت یہ کسی نہایت جابر اور قاہر حکم کے مسخر اور تابع ہوئے جاتے ہیں۔ دوسرے کو ان سے کیا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ انکو اپنی جان بچانی بھاری پڑ رہی ہے۔ اس لئے بے تکلف ہزاروں مخلوق تماشا دیکھ رہی تھی۔

قوم بربر جو اس ملک کے اصلی باشندے اور اس جنگل کی حالت اور خطرات سے بخوبی واقف تھے ان حالات کو اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ کیا یہ بات ممکن تھی کہ حقانیت اسلام کی ایسی روشن دلیل کو دیکھنے کے بعد بھی وہ باطل پرستی پر قائم رہتے اسی وقت ہزارہا بربری صدق دل سے ایمان لے آئے اور اسلام کے حلقہ بگوش غلام بن گئے۔

یہ ایک تاریخی صحیح واقعہ ہے جسکی تکذیب وہی شخص کرسکتا ہے جو اصول تاریخ اور مسلمانوں کے بے لوث اور آزاد طریقہ تاریخ نویسی سے ناواقف ہو اور جو تواریخ عالم پر بلا حجت و دلیل مکلجنت پانی پھیرنے کیواسطے تیار ہو جائے۔

دنیا بھر کے فلاسفر علم طبعیات اور طبقات الارض کے ماہر اسباب و مسببات کے تعلقات کی بحث کرنے والے اگر تمام ذہنی اور دماغی قوتیں صرف کر ڈالیں تو وہ ہرگز نہیں بتلا سکتے کہ عقبہ کی اس آواز میں کیا تاثیر تھی اور کیا سبب تھا کہ انکی آواز سنتے ہی ایسے وحشی اور موذی جانور اطاعت کیلئے آمادہ ہو گئے۔ اس کا سبب اگر بتلا سکتا ہے تو وہی شخص جو خالق و مخلوق کے ربط اور اس کی حقیقت سے واقف ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ تمام مخلوقات اور تمام اسباب و مسببات خالق کائنات کے اشارہ اور حکم پر چلتے اور اسکی مرضیات کے تابع ہوتے ہیں مملوک کو جو تعلق مالک کے ساتھ ہوتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر مخلوق کو خالق سے ہوتا ہے۔ مملوک مالک سے بے رخی کرسکتا ہے مگر مخلوق کبھی خالق سے سرتابی نہیں کرسکتا مخلوق ہر آن اپنے وجود میں خالق کا محتاج ہے۔ اسباب و علل سے بحث کرنے والے اور اسباب و علل ظاہرہ پر قناعت کر کے علۃ العلل کو فراموش کر دینے والے اس تعلق خالقی

ومخلوق کو بخوبی ملحوظ رکھیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم چونکہ بالکلیہ تمام خواہشات و ارادات نفسانی سے پاک و مبرا تھے اُنکی توجہ بجز بارگاہ حق تعالیٰ دوسری جانب نہ تھی وہ تمام مدارج فنا کے طے کئے ہوئے تھے۔ اس لئے اُن کا حکم بھی وہی اثر رکھتا تھا۔ جو خداوند عالم جل شانہ کا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

ان تعلقات کے ادراک و احساس کا کوئی آلہ آجتک ایجاد نہیں ہوا اُن کا اصلی علم اُنہیں لوگوں کو ہوتا ہی جو ایمان کیساتھ تہذیب نفس کے پرخطر عقبات کو طے کر چکے اور برد و سکینۂ قلب حاصل کرچکے ہوں یا تقلیدی علم اُس جماعت کو ہے جو اخلاص کیساتھ اُن کی متبع ہو۔

الغرض اسلام کی یہ خوبیاں اور مسلمانوں کے یہ اوصاف تھے جنہوں نے عالم پر اُسکی سچائی کو واضح کر دیا اور انہیں زبردست حالات نے دنیا پر اسلام کی حکومت جما دی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ حشرات و ہوام بھی بزور شمشیر قدیم مسکن و وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ یا جو ہزارہا مخلوق اس تائید آسمانی کو دیکھ کر اسلام لے آئے اُن پر مسلمانوں کی سطوت و جبروت کا کوئی اثر تھا۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں

قیروان میں جامع مسجد کی تعمیر اور سمت قبلہ کی تعیین

الغرض یہ سارا میدان ان موذی جانوروں سے بالکل پاک اور ایسا صاف ہو گیا کہ اس وسیع میدان اور آبادی میں چالیس سال تک سانپ وغیرہ کی صورت نہیں دکھلائی دی اور جب اسلامی لشکر کو ان خطرات کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو آبادی کا کام شروع ہوا سب سے اول دارالامارت کی بنیاد رکھی گئی اور اُسکے گرد اگرد مسلمانوں نے مکانات بنائے۔ اور اسکے ساتھ ہی حضرت عقبہ نے جامع مسجد کی بنیاد ڈالی لیکن حضرت عقبہ کو حقیقی سمت قبلہ کے تعیین اور دیوار قبلہ کے صحیح رُخ پر قائم کرنے کے بارہ میں بہت کچھ تردد تھا اگرچہ نماز کی ادا کیلئے یہ ضروری نہیں کہ سمت قبلہ بالکل صحیح اور حقیقی طور پر متعین ہو بلکہ استقبال جہت کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک صحابہ بطور تحری[۵] استقبال قبلہ کرتے اور نماز ادا کرتے رہے۔ لیکن اسلامی دارالحکومت میں جامع مسجد کی

[۵] ظن و تخمین ۱۲۔

تعمیر جو اعلیٰ درجہ کا مذہبی شعار ہے معمولی امر نہ تھا اُن کو یہ خیال تھا کہ اس وقت اگر سرسری نظر سے سمت قبلہ کو متعین کر کے دیوار قبلہ قائم کردی گئی تو ممکن ہے کہ کسی وقت اس میں کوئی غلطی محسوس ہو اور جامع مسجد کا منحرف عن القبلہ ہونا کوئی وسوسہ قلوب عوام میں پیدا کرے۔

ایک شب حضرت عقبہ اسی غم و تردد کی حالت میں تھے کہ یکایک کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ کل صبح تم جامع مسجد میں داخل ہونا تمکو تکبیر کی ایک آواز آویگی تم اُس آواز کی سمت میں چلنا جس جگہ اور جس موقع پر جاکر آواز موقوف ہو جائے وہی جگہ قبلہ کی ہی وہاں پر نشان لگا دینا اور قبلہ کی دیوار قائم کر دینا یہی وہ سمت قبلہ اور دیوار قبلہ ہو گی جس کو اللہ نے مسلمانوں کیواسطے ہمیشہ کیلئے پسند فرمایا۔

ایسا ہی ہوا صبح ہی جامع مسجد میں داخل ہوئے تو تکبیر کی آواز آئی اور جس طرف کو وہ آواز جاتی تھی اُسی طرف کو حضرت عقبہؓ جاتے تھے۔ یہانتک کہ ایک جگہ پہنچ کر وہ آواز منقطع ہو گئی۔ اُسی خط پر نشان لگا دیا اور اُسی سمت پر قیروان کی تمام مساجد بنائی گئیں۔

یہ غیبی تائیدات تھیں جو جزیرہ نما عرب اور تمام ایشیا سے متجاوز ہو کر افریقہ و یورپ میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ اور یہ وہ باتیں تھیں جنکی وجہ سے تمام بلاد و امصار میں خود بخود اسلام کیواسطے راستہ صاف ہوتا چلا گیا۔

ماء الفرس۔ یعنی گھوڑے کا چشمہ

مسلمانوں کیواسطے ہر ہر موقع پر اس طرح تائیدات آسمانی ظہور پذیر ہوتی تھیں کہ غیر مسلم اقوام اُن کو دیکھ کر متحیر رہ جاتے تھے۔ حضرت عقبہؓ کو ملک افریقہ کے مختلف سفروں میں ایک دفعہ ایسے مقام پر قیام کا اتفاق ہو گیا۔ جہاں پانی کا نام و نشان دور دور تک نہ تھا مسلمانوں کو پیاس کا غلبہ ہوا اور قریب تھا کہ سب کے سب ہلاک ہو جاویں حضرت عقبہ نے یہ حالت دیکھی تو سخت مضطرب ہوئے اور سب سے بہتر تدبیر یعنی رجوع الی اللہ کی طرف جو مسلمانوں کی اصلی علامت و خصوصیت ہے متوجہ ہو گئے دو رکعت نماز پڑھ کر بارگاہ خداوندی میں تضرع و زاری سے دعا شروع کی۔ آپ دعا سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ آپکے گھوڑے نے سُم سے زمین کو کُریدنا شروع کر دیا اور زمین کے اندر سے ایک صاف پتھر ظاہر ہوا جس میں سے فوراً پانی نکلنا شروع ہو گیا۔

حضرت عقبہؓ نے بآواز بلند اسکی اطلاع لشکر کو دی مسلمان چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور سب نے خوب سیر ہوکر پانی پیا اور گڈھے کھود کر پانی کو جمع کیا اُس روز سے یہ مقام ماء الفرس کے نام سے موسوم ہوگیا۔ کہنے کیلئے تو یہ معمولی بات ہی کہ گھوڑے کے پیر مارنیسے زمین کے اندر چشمہ ظاہر ہوگیا لیکن جو لوگ ایمان راسخ رکھتے ہیں اور مذہب کے آثار اور تاثیرات سے واقف ہیں جو اس بات پر ایمان لاچکے ہیں کہ اسباب کے احاطہ سے خارج بھی کوئی اور ایسی زبردست قوت ہی جسکے اشارہ پر اسباب حرکت کرتے ہیں۔

جو انبیاء علیہم السّلام کے ہاتھ پر معجزات اور خرق عادات کے ظہور کو ممکن الوقوع جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ واقعہ بالکل حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے معجزہ کے مشابہ ہی۔ فرق اتنا ہی۔ کہ اس کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ہاتھ سے ہوا اس لئے اس کو معجزہ کہتے ہیں اور اس کا ظہور حضرت عقبہؓ کی دعاء سے ہوا جو نبی نہیں ہیں۔ اسلئے اس کا نام کرامت ہوگیا۔

یوم الاباقر مسلمانوں کے تائیدی واقعات کے سلسلہ میں ذیل کا واقعہ بھی اتنا عجیب ہے جس کو سننے کے بعد اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کے مؤید من اللہ ہونیکی نسبت کسی سخت منکر اور پردہ پوش کو بھی انکار کی گنجایش نہیں رہتی۔

قادسیہ کے مشہور عالم تاریخی واقعہ سے پہلے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عاصم ابن عمرو کو میسان کی فتح کیلئے روانہ کیا۔ عاصم ابن عمرو وہاں پہنچے تو دشمن قلعہ میں داخل ہوکر محفوظ ہوگئے اور مسلمانوں کو رسد کے بہم پہنچانے میں بڑی دقت پیش آئی دودھ اور گوشت کا ملنا سخت دشوار ہوگیا۔ ایسی حالت میں جس قسم کی تکلیفیں پیش آنے کا احتمال ایک ایسے لشکر کے لئے جو دشمن کے ملک میں پیش قدمی کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور وہاں کے مقامات اور حالات سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتے ہو سکتا ہی اس کا اندازہ کچھ دشوار نہیں ہے۔

عاصم بن عمرو نے ہرچند کوشش کی مگر گائے بیل بکریاں کہیں سے دستیاب نہ ہوئیں اتفاق سے ایک بن کے کنارہ پر اہل فارس میں سے ایک شخص ملا جو فی الواقع چرواہا تھا اُس سے پوچھا کہ دودھ اور باربرداری کے مویشی کہاں ہیں اُس نے صاف جھوٹ بولا کہ مجھے

خبر نہیں ہے لیکن اسی وقت بن کے اندر سے ایک بیل نے بآواز بلند کہا:۔ کذب عدو اللہ ھا نحن (ترجمہ) دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے۔ ہم تو یہاں موجود ہیں۔

یہ آواز سُنتے ہی عاصم اُس بن میں داخل ہوئے اور سب گائے بیلوں کو ہانک لائے اور لشکر پر تقسیم کر دیا جس سے لشکر میں خوش حالی اور فراخی پھیل گئی دودھ گوشت کی کمی نہ رہی۔ یہ تائید ایسے وقت پہنچی جبکہ مسلمان رسد کے نہ ملنے سے سخت تنگی میں تھے۔ حجاج بن یوسف کو اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اُس نے چند ایسے حضرات سے جن کے سامنے یہ ماجرا تھا طلب کر کے تصدیق کرنا چاہا سب نے گواہی دی کہ ہم نے خود بیل کی آواز سُنی اور خود ان بیلوں کو دیکھا حجاج نے کہا تم غلط کہتے ہو۔ اُنہوں نے کہا تمہارا تکذیب کرنا اُس وقت ٹھیک ہوتا کہ ہم وہاں موجود نہوتے اور تم موجود ہوتے لیکن جبکہ ہم موجود تھے اور تم نہیں تھے تو یہ تکذیب کرنا بالکل بیجا اور ناجائز اور خلاف اُصول ہے۔ حجاج نے یہ سُن کر کہا کہ بیشک تم صحیح کہتے ہو۔ لیکن یہ تو بتلاؤ کہ لوگ اس واقعہ کو دیکھ کر کیا کہتے تھے۔ کہا لوگ اس واقعہ سے اس پر استدلال کرتے تھے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہے اور یہ کہ مسلمانوں کیساتھ تائید الٰہی شامل اور فتوحات ہمرکاب ہیں۔ حجاج نے کہا یہ تو جبھی ہو سکتا ہے کہ کل جماعت کے لوگ متقی اور ابرار ہوں۔ ان لوگوں نے کہا یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ اس لشکر کے دلوں کے اندر کیا بات پوشیدہ تھی اور وہ کن حالات کو اپنے اندر لئے ہوئے تھے اور کن مقامات کو پہنچے ہوئے تھے۔

فاما ما رأينا فما رأينا قط ازهد في دنيا منهم ولا اشد بغضا لها ليس فيهم جبان ولا غال ولا غدار۔	(لیکن ظاہر میں تو جو کچھ ہم نے دیکھا وہ یہ بات تھی کہ کوئی شخص ان سے زیادہ زاہد دنیا سے بے لاگ اور اس کو بغض ونفرت کی نگاہ سے دیکھنے والا نہ تھا۔ نہ اُن میں کوئی نامرد تھا اور نہ خیانت کرنیوالا اور عہد شکن تھا۔)

اس موقع پر اوصاف مذکورہ بالا کا ذکر کرنا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا اصلی راز یہی تھا اور یہی وہ اوصاف تھے جنکی وجہ سے وہ مؤید من اللہ تھے اور جنہوں نے اُن کیلئے

فتوحات کے راستے صاف کئے تھے اور یہ فتوحات صرف کھلے میدانوں یا سر بفلک پہاڑوں یا آباد اور معمور شہروں تک محدود نہ تھیں بلکہ اقلیموں اور ملکوں سے پہلے قلوب مسخر ہوتے تھے۔

لیکن میرے دوستو کیا تم تبلا سکتے ہو کہ یہ لاکھوں مسلمان سب کے سب زہد و تقویٰ نفرت دنیا اور اس قسم کے اعلیٰ و منتہار کمالات انسانی کے ساتھ متصف ہو کر ایک ہی رنگ میں کیونکر رنگے اور وہ کونسا قوی اثر تھا جس نے اُن میں سے تمام اخلاقی کمزوریوں کو نکال کر ملکی صفات بنا دیا تھا جس نے اُنکی نظروں میں دنیا کو مردار سے زیادہ حقیر بنا دیا۔ دنیا اُنکے قدموں سے لگی پھرتی تھی اور وہ منہ نہ لگاتے تھے

یہ سب کچھ سرور دنیا و دین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کے جمال مبارک کی زیارت کا اثر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی فیض صحبت کی تاثیر تھی۔ غیر ذوی العقول حیوانات جب مسلمانوں کی راحت اور رضا کیواسطے اپنی جانوں کو پیش کرنیکے لئے حاضر اور موجود تھے اور اُن کو بھی یہ احساس کرا دیا گیا تھا کہ مسلمان محض دین حق کی تائید اور رضاء الٰہی کی اتباع کے لئے نکلے ہوئے ہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اشرف مخلوقات انسان کو باوجود عقل کامل اور مشاہدات عینی کے اس کا تیقن نہوتا اور وہ صدق دل سے اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کے ان اوصاف و اخلاق حسنہ کے فریفتہ نہوتے۔ ان باتوں نے ہر ایک دل میں اسلام کی سچائی کو بٹھلا دیا تھا۔ توفیق الٰہی جنکے شامل حال معلوم ہوئی مسلمان ہو گئے۔ اور جن کی قسمت میں محرومی لکھی ہوئی تھی محروم رہے مسلمانوں کیطرف سے کسی پر جبر ہوا اور نہ کوئی اسکی تدبیر کیگئی۔ ہاں اُنھوں نے اسلامی کمالات کی روشن دلیلیں دکھلا کر حجت تمام کر دی۔ یہ ایسے کھلے واقعات ہیں جن کو سن کر حجاج بن یوسف جیسے سفاک اور سنگدل جیسے شخص کو بھی اعتراف ہی کرنا پڑا کہ ایسی تائیدات جبھی ہو سکتی ہیں جبکہ لشکری متقی اور ابرار ہوں۔

اس عجیب واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بہت آسان ہے کہ جو شخص خواہشات اور جملہ امراض نفسانی سے منسلخ ہو کر مرضیات خداوندی کا تابع محض ہو جاتا ہے اور ذات پاک خالق کائنات کے سوا کوئی مقصود اس کا نہیں رہتا تو ہر چیز اُسکی تابع ہو جاتی ہے ؎

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت　　چوں ز و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

یہ مبارک اور مسعود دن اسلامی تواریخ میں **یوم الاباقر** کے نام سے موسوم ہو گیا۔

یوم الاباقر اور بنا قیروان کا واقعہ ایک نوعیت کا معلوم ہوتا ہے مسلمانوں کی تائید کے لئے وہاں بھی حیوانات کی طرف سے اطاعت و فرمانبرداری کا ظہور ہوا تھا اور یہاں بھی لیکن باوجود ایک نوع ہونیکے ان دونوں میں کچھ فرق بھی ہے جس کو میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

بظاہر سرسری نظر میں قیروان کا واقعہ زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے کہ وحشی اور موذی جانور صحابہ کی ایک ہی آواز میں اپنے مانوس وطن کو چھوڑ کر چلے گئے اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور ادب کو اس درجہ ملحوظ رکھا کہ کوئی وحشیانہ حرکت اُن سے سرزد نہوئی اور غور کیا جائے تو یہ ایک قسم کا انقلاب ماہیت ہے جسکے نہایت مستبعد و محال ہونیمیں کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ بخلاف پالتو جانوروں کے کہ وہ اصل طبیعت سے انسان کیساتھ مانوس ہیں۔ اگر وہ آڑے وقت اُن کے کام آگئے تو کیا تعجب ہے لیکن میرے خیال میں یوم الاباقر کا واقعہ زیادہ اہمیت رکھتا اور ایثار اور حب فی اللہ کا زیادہ پتہ دیتا ہے۔

یوم قیروان میں درندے اور زہریلے جانور صحابہ کی آواز سنکر نکل پڑے جس میں دو ہی احتمال ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ برضا و رغبت تعمیل حکم کیلیے تیار ہو گئے۔ یا یہ کہ جان بچانے کو وہاں سے چلے گئے کیونکہ اُن کو دھمکی دیگئی تھی کہ اگر اسکے بعد کسی کو یہاں پاویں گے تو قتل کر دیں گے۔

اور یوم اباقر میں بلا کسی قسم کے ایما اور حکم کے محض مسلمانوں کی راحت اور رضائے خداوندی حاصل کرنے اور دین حق کی تائید کیلیے اپنی جانیں قربان کرنے کیلیے موجود ہو گئے۔ صورت اولیٰ میں اطاعت حکم ہے یا خوف جان اور صورت ثانیہ میں ایثار ہے اور اپنی جان کی قربانی اور ان دونوں صورتوں کا فرق ظاہر ہے خصوصاً جب یہ بھی دیکھا جائے کہ ان جانوروں نے اپنی موجودگی کو خود بیان کر دیا۔

ؔ اباقر جمع الجمع ہے بقر کی ۱۲

ہاں یہ ممکن ہے کہ اس روایت کی تسلیم میں کسی کو تامل ہو یا حیوانات کے کلام کرنے اور ایشیا کو خلاف عقل یا خلاف عرف و عادت سمجھ کر انکار کر نے بیٹھ جائے۔ سو امر اول میں تو اس وجہ سے کلام کرنیکی گنجائش نہیں کہ یہ روایت طبری اور ابن الاثیر جیسی معتبر اور مستند کتابوں کی ہے امام حافظ علامہ طبری کا پایہ تحقیق و تنقید میں جس درجہ پر ہے اس کو تمام اسلامی مصنفین و مورخین تسلیم کئے ہوئے ہیں اور اسلامی تواریخ میں اکثر کا ماخذ وہی ہے۔ علاوہ بریں یہ واقعہ قرون اولی میں اس درجہ مشہور اور بروایات معتبرہ منقول تھا کہ حجاج بن یوسف نے اپنے زمانہ میں یعنی صدی اول کے آخری حصہ میں اسکی تحقیق کرنا چاہا تو ایک جماعت نے اس واقعہ میں موجودگی کی شہادت دی اور حجاج کو تسلیم کرلینا پڑا۔

رہا امر ثانی سو اس میں اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے معجزات و خرق عادات کو صحیح اور واقع مانتے یا خلاف عقل نہیں جانتے اُن کو اولیاء کی کرامات اور صحابہ رضی اللہ عنہم کیلئے ایسے تائیدی واقعات کے ظہور پذیر ہونیسے انکار کی گنجایش نہیں ہے اگر کوئی خواہ مخواہ انکار ہی پر مصر ہو تو اُسکے سامنے بخاری و مسلم کی صحیح روایات کو پیش کردینا کافی سمجھتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال بینما رجل یسوق بقرۃ اذ اعییٰ فرکبھا فقالت انالم نخلق لھذا فقال الناس بقرۃ تتکلم فقال رسول اللہ فانی اٰومن بہ انا و ابوبکر و عمر وھما ثَمّ الی آخر الحدیث۔

(ترجمہ) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زمانہ ماسبق میں ایک شخص گائے کو لئے جاتا تھا جب وہ تھک گیا تو اُس گائے پر سوار ہو گیا۔ گائے نے کہا ہم سواری کیواسطے پیدا نہیں کئے گئے بلکہ کھیتی کے واسطے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس پر لوگوں نے تعجب کیا کہ گائے بولتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تو اس پر (یعنی واقعہ کی صحت اور گائے کے کلام کرنے پر) ایمان لاتا ہوں اور اسکی تصدیق کرتا ہوں اور ابوبکر و عمر بھی اسپر ایمان لاتے ہیں حالانکہ ابوبکر و عمر اس مجلس میں موجود نہ تھے (یعنی شیخین کے کمال ایمان پر آپکو اس درجہ اعتماد تھا کہ اُن کی غیبت میں

اُن کی طرف سے تصدیق فرمائی)

یہ حدیث صحیح ہے اور اُس کی صحت پر محدثین کو اعتماد و اتفاق ہے جس سے بعینہ یوم الاباقر کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن اس پر بھی تسلی نہ ہو تو ہم دوسری صحیح حدیث پیش کریں گے۔ جس سے یہ بات ثابت ہو جاوے گی کہ حیوانات جو ذی روح ہونے کیساتھ کچھ بولتے بھی ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کی بات کو سمجھتے بھی ہیں اگر انسانی زبان میں کلام کرنے لگیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے خدا تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ جمادات و نباتات میں علم و ادراک کو پیدا فرما دے۔

عن جابر قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب استند الی جذع نخلۃٍ من سواری المسجد فلما صنع لہ المنبر فاستوی علیہ صاحت النخلۃ التی کان یخطب عندھا حتی کادت ان تنشق فنزل النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی اخذھا فضمھا الیہ فجعلت تان انین الصبی الذی یسکت حتی استقرت قال بکت علی ما کانت تسمع من الذکر والقرآن رواہ البخاری

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ خطبہ کے وقت کھجور کے سوکھے ہوئے ستون سے سہارا لگا لیتے تھے لیکن جب آپ کے لئے ممبر تیار کر لیا گیا اور آپ اُس پر بیٹھ گئے تو وہ کھجور کا ستون جس پر سہارا لگا کر آپ خطبہ پڑھتے تھے اس قدر رویا اور چیخا کہ قریب تھا کہ پھٹ جائے یہ حالت دیکھ کر آپ ممبر سے نیچے تشریف لائے اور اس ستون کو چپٹا لیا تب وہ اس طرح سسک سسک کر رونے لگا جس طرح بچے کو چپکا کرتے ہیں اور وہ سسکیاں لے کر تھمتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ ستون کا رونا قرآن اور ذکر کی مفارقت پر تھا۔ روایت کیا اس کو بخاری نے ۱۲

اس روایت سے ثابت ہے کہ بالکل بے روح اور خشک لکڑی سے بہ برکت قرب ذات

بابرکات سرور کائنات علیہ الف الف صلوٰۃ وتسلیمات نہ صرف زندوں کیسے افعال وحرکات صادر ہوئے بلکہ جسم مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت اور ذکر الٰہی سے بعید ہوجانے کی وجہ سے وہ حالت طاری ہوگئی جو ایک عاشق زار پر ہوتی ہے جو ذکر الٰہی اور محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا فنا او رمستغرق ہوگیا ہو جس کو تمام لذتیں اور نعمتیں خاک سے زیادہ بے وقت معلوم ہوتی ہوں۔

مسلمانو! تم اُس حالت کی صورت کو اپنی آنکھوں کے سامنے قائم کرو تو ایک حیرت انگیز سماں تمہارے سامنے پھر جائیگا۔ خشک ستون آپ کی مفارقت میں بے تاب ہی اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے اور اُس کو گلے سے لگا کر پیار فرماتے ہیں اور اس طرح سسک سسک کر چپکا ہوتا ہی جیسا روتا ہوا بچہ اپنی نہایت مہربان ماں یا باپ کی گود میں پہنچکر چپ ہوتا ہی سبحان اللہ سبحان اللہ۔

یہ حال ایک بالکل بیجان اور بے حس وحرکت شے کا ہی جس کو آپ کے جسم مبارک سے چھونے نے اس درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جو اشرف مخلوقات اور خلاصۂ عالم ہونیکے ساتھ آپ کی خدمت میں دن رات حاضر ہوتے اور تمام معاملات دیکھتے اور ہر قسم کے فیوض سے مستفیض ہوتے تھے وہ کس درجہ عشق ومحبت میں پہنچے ہوئے ہوں گے۔ وہ کیوں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خلیفہ وجانشین ہونگے اور کیوں نہ جن وانس حیوانات ونباتات وجمادات اُن کی جان نثاری کے واسطے تیار رہوں گے۔

یہ واقعہ ایک صحیح حدیث سے ثابت ہی اور ایسے صریح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جن میں تاویل کی گنجایش نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی صاحب خدا تعالیٰ کی وسیع قدرت کو کسی قانون میں محدود کرکے محض اپنی عقل کے بھروسہ اس صحیح اور صریح روایت کو رد کرنے کیواسطے تیار ہوجائیں تو یہ دوسری بات ہی۔ مگر ایسے حضرات کو خداوند عالم کی غیر متناہی قدرت کا ضرور تصور کرلینا اور اس آیت شریفہ کو بغور سمجھ لینا چاہیئے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (ترجمہ) نہ پہچانا انہوں نے اللہ کو حق پہچاننے کا

وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○	اور زمین ساری اُس کی مٹھی میں ہے قیامت کے دن اور آسمان لپٹے ہوئے اُسکے داہنے ہاتھ میں۔ پاک اور برتر ہے وہ ذات اُس چیز سے کہ شریک کرتے ہیں ۔۱۲

معجزہ مذکورۂ بالا معجزہ **استوانہ حنانہ** کے نام سے معروف وموسوم ہے اور اس معجزہ کو عارف باللہ مولانا روم قدس سرہٗ مثنوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

اُستن حنانہ از ہجرِ رسول — نالہ میزد ہمچو اربابِ عقول
درمیانِ مجلسِ وعظ آں چناں — کز وے آگہ گشت ہم پیر و جواں
در تحیر ماندہ اصحابِ رسول — کز چہ می نالد ستوں باعرض و طول
گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستون — گفت جانم از فراقت گشتہ خون
از فراقِ تو مرا چوں سوخت جاں — چوں ننالم بے تو اے جانِ جہاں
مسندت من بودم از من تاختی — بر سرِ منبر تو مسند ساختی
پس رسولش گفت کاے نیکو درخت — اے شدہ با سرِ تو ہمراز بخت
گر ہمی خواہی ترا نخلے کنند — شرقی و غربی ز تو میوہ چنند
یا دراں عالم ترا سروی کند — تا تر و تازہ بمانی تا ابد
گفت آں خواہم کہ دائم شد بقاش — بشنو اے غافل کم از چوبے مباش
آں ستوں را دفن کرد اندر زمیں — تا چو مردم حشر گردد یوم دین

استوانہ حنانہ کے واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ ذکر الٰہی کی قوت اور لذت کی کیا کیفیت ہے خشک اور بیجان لکڑی میں اُسکی یہ تاثیر ہے تو انسان میں جو اشرف مخلوقات ہے اور محض اسی غرض کیلئے پیدا کیا گیا ہے کیسی کچھ ہوگی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ غفلت کے ظلمات میں نہ پڑے اور اپنے دل کو نفسانی آلائشوں سے پاک و صاف کرے

انسان اگر ایسا کرے اور کرنا چاہے تو اس کا مرتبہ تمام مخلوقات سے بالاتر ہے اور وہ مستحق خلافت خداوندی ہے ورنہ اُس کے اسفل سافلین کے اندر گرنے میں کیا کلام ہے۔

ذکر الٰہی او محبت خدا و رسول ہی میں یہ لذت ہی کہ کوئی لذت اُسکے ہمسر و ہم سنگ کیا پاسنگ بھی نہیں ہے دنیا و ما فیہا اُس کے سامنے ہیچ ہے اور یہی وہ دولت ہی کہ جس کا قلب اُس سے مالامال ہوگیا ہے سلاطین عالم اُس کے سامنے جبہ سائی کرتے اور اُسکے در کی خاکروبی کو اپنا فخر سمجھتے ہیں ہارون رشید جیسا جلال و جبروت والا خلیفہ حضرت فضیل بن عیاض کی خدمت میں شب کے وقت حاضر ہوتا ہے اور آپ اندھیرے میں مکان کے کونہ سے لگ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور ہارون رشید کا ہاتھ آپکے بدن سے لگتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ کیسا نرم ہاتھ ہی کاش دوزخ کے ہاتھ سے نجات پاجائے اور ہارون رشید زار زار روتا ہے۔

حضرت فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں۔

لَوْ اَنَّ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا عُرِضَتْ عَلَیَّ وَلَا اُحَاسَبُ بِهَا لَکُنْتُ اَتَقَذَّرُهَا کَمَا یَتَقَذَّرُ کُمُ الْجِیْفَةَ اِذَا مَرَّ بِهَا اَنْ تُصِیْبَ ثَوْبَهٗ

(اگر ساری دنیا مجھپر اس طرح پیش کی جائے کہ مجھ سے کسی قسم کا محاسبہ اسکے بارہ میں نہو تب بھی میں اُس سے ایسا ہی گھن کرونگا جیسا کہ تم مردار کے قریب گذرتے ہوئے گھن کرتے اور اپنے کپڑے کو اُسکی آلودگی سے بچاتے ہو)

یہ کیفیت حضرت فضیل کے قلب میں کیونکر راسخ ہوئی صرف ذکر الٰہی کی لذت سے اسی لذت سے آشنا ہونیکے بعد کوئی شے مرغوب و محبوب نہیں رہتی۔

حضرت شبلیؒ کے آخری وقت میں لوگ کلمہ کی تلقین کرتے تھے اور وہ اپنے رب کیطرف مخاطب ہو کر کہتے تھے۔

اِنَّ بَیْتًا اَنْتَ سَاکِنُهٗ ‎ غَیْرُ مُحْتَاجٍ اِلَی السُّرُجِ
جس گھر میں تیرا مسکن ہے ‎ چراغ کا محتاج نہیں ہے
وَجْهُكَ الْمَاْمُوْلُ حُجَّتُنَا ‎ یَوْمَ یَاْتِی النَّاسُ بِالْحُجَجِ
تیرا چہرہ جو اُمیدگاہ ہی ہماری حجت ہی ‎ جس دن لوگ حجتیں پیش کریں گے

حضرت شبلی کا دل کیوں منور ہوا اور کس چیز نے اُن کو محو و مستغرق بنا کر دنیا و مافیہا سے مستغنی کر دیا تھا۔ محض ذکر الٰہی اور اُس کی پر اسرار کیفیات نے۔

حضرت مولانا روم معجزہ مذکورہ بالا سے نتیجہ نکالتے ہیں۔

تا بدانی ہر کرا ایزد بخواند ۔۔۔ از ہمہ کار جہاں بے کار ماند
ہر کرا باشد ز یزداں کار و بار ۔۔۔ یافت بار آں جا و بیروں شد ز کار
واں کہ او را نبود از اسرار داد ۔۔۔ کے کند تصدیق او نالہ جماد
گوید آرے نے ز دل بہر وفاق[1] ۔۔۔ تا نگویندش کہ ہست اہل نفاق
گر نیندی واقفاں امر کن ۔۔۔ در جہاں رد گشتہ بودی ایں سخن
صد ہزاراں ز اہل تقلید و نشاں ۔۔۔ افگندشاں نیم وہمے در گماں
کہ بظن تقلید و استدلال شاں ۔۔۔ قائمست و جملہ پر و بال شاں
شبہ می انگیزد آں شیطان دون ۔۔۔ در فتند ایں جملہ کوراں سرنگوں
غیر آں قطب زماں دیدہ ور ۔۔۔ کز ثباتش کوہ گردد خیرہ سر

مضمون جب یہاں تک پہنچ گیا تو ہم اس جگہ ایک لطیف و عجیب نکتہ اور معجزہ احیاء موتیٰ اور معجزہ استوانہ حنانہ میں فرق بیان کرنا چاہتے ہیں ہم اُمید کرتے ہیں کہ اہل علم و عقل اُس پر لطف مضمون سے چند فائدے حاصل کریں گے۔ اوّل تو یہ کہ کمالات و معجزات نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے عجائب اسرار معلوم ہونے سے اُن کے ایمان میں تازگی پیدا ہوگی اور افضلیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایسی واضح و روشن ہو جاویگی کہ کسی تھوڑی سی عقل والے کو بھی اُس میں انکار و تامل کی گنجائش نہ رہیگی۔

دوسرے وہ خلجان رفع ہو جائے گا جو ممکن ہے کہ بعض نافہموں کے دلوں میں خطور کرے یا کسی نادان اور کم عقل کے قلم سے بھی نکل جائے کہ اہل اسلام کا دعویٰ ہے اور اُن کے ایسے

---

[1] یعنی دل سے نہیں بلکہ ظاہر داری کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ ۱۲

مسلمات میں ہے جن میں کسی ایک فرد کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء ورسل سے افضل ہیں اور تمام انبیاء ورسل آپ سے مستفیض ہیں مگر اہل اسلام ہی کی مسلمہ روایات کیموافق انبیاء سابقین کو جو معجزات دیے گئے وہ اپنی عظمت میں ایسے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اُس درجہ تک پہنچے ہوئے نہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بنگیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گارے کا پتلا بنایا اور وہ ذی روح ہوکر اُڑنے لگا آپ کے قم باذن اللہ کہنے سے مردہ زندہ ہوگیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو معجزات روایت کئے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی اس درجہ کا نہیں ہے۔ یہ لطیف وعجیب مضمون ایک ایسے قلم کا نکلا ہوا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس آخری زمانہ میں اسلام کی حفاظت اور حمایت کیلئے پیدا فرمایا جس نے اسلام کی حریم کو فلسفہ جدید اور دہریت کے حملوں سے محفوظ فرمایا جس نے ایک طرف علوم اسلامیہ کے تحفظ کیلئے ایک مضبوط حصار (مدرسہ اسلامیہ دیوبند) قائم کردیا اور دوسری جانب مخالفان اسلام کے جملہ مایہ ناز اعتراضات کے وہ دنداں شکن جواب دیے کہ اُن سے بہتر نہ کوئی دیسکتا ہے اور نہ اُن کے بعد کسی مخالف کو سر اُبھارنے کی گنجائش ہے جس نے اسلامی احکام کے اسرار اور اُن کے مطابق عقل سلیم ہونیکو ایسی وضاحت سے دلائل عقلیہ کیساتھ مدلل کرکے بیان فرمایا ہے جس کی فی الواقع اس زمانہ میں ضرورت تھی اور یہ وہ طرز استدلال اور طریق بیان ہے جو صرف اُنہیں کا حصہ تھا۔ میرا اشارہ حجۃ اللہ فی العالم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ہے آپکے پر عظمت نام اور مقدس ذات سے کون شخص ہے جو واقف نہیں ہے۔

مولانا قدس سرہٗ نے اپنی مفصل ومبسوط تقریر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات علمی وعملی میں یکتا اور افضل ہونیکو ثابت فرمایا ہے۔ کمالات علمی میں یکتا ہونیکے دلائل بیان فرمانے کے بعد تحریر فرمایا ہے۔

"پھر اعجاز علمی وہ بھی مقابلہ اولین وآخرین اگر آپ کی خاتمیت اور یکتائی پر دلالت نہیں کرتا تو اور کیا ہے ایسا شخص اگر خاتم النبیین نہیں تو اور کون ہوگا۔ اور ایسا شخص سردار اولین وآخرین نہیں

تو اور کون ہوگا۔ اہل فہم اور انصاف کیلئے تو یہی بس ہے۔ اور ناوان کو کافی نہیں۔ دفتر نہ رسالہ"

کمالات علمی میں یکتا ہونیکی تقریر سے فارغ ہوکر کمالات عملی کی یکتائی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"کمالات عملی میں بھی آپ یکتا ہیں اوران میں بھی کوئی آپ کا ہمتا نہیں۔ ہرچند بعد اعجاز مذکور (یعنی اعجاز قرآنی جو کمالات علمی کی تقریر میں بیان فرمایا) اُن کے ذکر کی حاجت نہیں۔ مگر چونکہ اعجاز اگر کسی کے کمال پر دلالت کرتا ہو تو بعد اطلاع وعلم دلالت کرتا ہے۔ سو جیسے جمال صورت آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے اور کمال آواز کانوں سے اس لئے ہر اعجاز کیلئے ایک جُدی حالت اور جُدا کمال کی حاجت ہے اور اس لئے کمال علمی کے ادراک اور علم کیلئے کمال عقل وفہم کی حاجت ہے جو آجکل بہ رنگ عنقا جہاں سے مفقود ہے اسلئے کمالات عملی بھی بطور مشتے نمونہ از خروارے ہزاروں میں سے دوچار عرض کرتا ہوں"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر چند معجزات کا ذکر فرمایا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا موازنہ انبیاء اولوالعزم کے معجزات سے کرکے آپکے معجزات کی برتری اور تفوق کو ثابت فرمایا ہے۔ مگر ہم اُس پوری تقریر کو نقل کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف اُستوانہ حنّانہ اور سنگریزوں کی تسبیح خوانی کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے اُسکو باختصار وتوضیح بعض مواقع لکھتے ہیں۔ مولینا رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے۔

"حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بن گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے مردہ زندہ ہوگیا۔ یا گارے سے ایک جانور کی شکل بناکر خدا کی قدرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُڑا دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک کے چھونے کی برکت سے کبھی کا سوکھا کھجور کی لکڑی کا ستون زندہ ہوکر آپ کے فراق میں اور خدا کے ذکر کی موقوفی کے صدمے سے چلّایا۔ اور ایسا رویا کہ پھٹنے کے قریب ہوگیا۔ علی ہذا القیاس پتھروں اور سنگریزوں کے سلام اور آپکی نبوت کی شہادت اور تسبیحات حاضرین نے سنیں۔ اہل فہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اعجاز ان اعجازوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بیشک زندہ ہوا لیکن اژدہے کی صورت میں آکر زندہ ہوا۔ اور وہی حرکات اُس سے سرزد ہوئیں جو اور سانپوں سے

ہوتی ہیں علیٰ ہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برکت سے گارے سے زندوں کی سی حرکات جیسی سرزد ہوئیں جب وہ گارا پرندکی شکل میں آلیا۔ آخر زندوں کی شکل زندگانی سے کچھ تو علاقہ او رمناسبت ہی جو زندگانی حیوانات کی شکلوں سے علیحدہ نہیں پائی جاتی۔ پتھر درخت وغیرہ میں کبھی زندگانی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اس بنا پر زندگانی کا زندوں کی شکل میں ظاہر ہونا اتنا مستبعد نہیں جتنا زندوں کی شکل سے پایا جانا مستبعد ہی اور اُس گارے کی شکل سے حرکات بھی سرزد ہوئیں جو تمام پرندوں سے سرزد ہوتی ہیں۔ مگر سوکھے ستون کی زندگانی اور سنگریزوں کی تسبیح خوانی میں نہ شکل و صورت کا لگاؤ ہے نہ کوئی ایسا برتاؤ ہے جس میں او ہمجنس شریک ہوں۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ جمادات بلکہ نباتات اور حیوانات تو کیا بنی آدم میں سے بھی کسی کسی کو یہ شرف میسر آتا ہی۔ سوکھے ستون کا فراق نبوی میں رونا یا موقوفی خطبہ خوانی سے جو اُس کے قرب و جوار میں ہوا کرتی تھی چلانا اُس محبت خدا و رسول پر دلالت کرتا ہی۔ جو مراحل معرفت طے کرنے کے بعد میسر آتی ہے۔ کیونکہ محبت کیلئے حق الیقین کی ضرورت ہی اگر علم الیقین یعنی اخبار معتبر او رمتواتر سے محبت پیدا ہوا کرتی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے آج لاکھوں عاشق ہوتے کیونکہ جو شہرہ اُن کے حسن و جمال کا اب ہی وہ اُس وقت کہاں تھا۔ علیٰ ہذا اگر عین الیقین یعنی مشاہدہ سے محبت ہوا کرتی تو کھانے کی چیزوں کی رغبت کیلئے چکھنے اور کھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ فقط مشاہدہ کافی ہوا کرتا۔ استعمال کرکے دیکھنا خود اسکی دلیل ہے کہ رغبت کیلئے حق الیقین چاہئے اور اسی نفع اٹھانے اور استعمال کرنے کو حق الیقین کہتے ہیں۔

ستون مذکور کا رونا اُس محبت خداوندی اور عشق نبوی پر دلالت کرتا ہے جو بے مرتبہ حق الیقین بہ نسبت ذات و صفات خداوندی و کمالات نبوی متصور نہیں اور ظاہر ہے کہ اس موقع خاص میں اس قسم کا یقین بجز کاملان معرفت اور کسی کو میسر نہیں آسکتا علیٰ ہذا القیاس سنگریزوں کی تسبیح و تہلیل میں اسی معرفت کی طرف اشارہ ہے جو سوائے خاصان خدا بے تعلیم ارشاد

ممکن الحصول نہیں اور ظاہر ہے کہ سنگریزوں کی تسبیح وتقدیس کو کسی کی تعلیم کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے"

یہ مولانا قدس سرہٗ کی تقریر کا اقتباس اور حاصل ہے جس سے صاف ثابت ہے کہ اُستونہ حنانہ کا معجزہ احیار موتیٰ۔ گارے سے جانور بنا کر اُڑا دینے سے بدرجہا فوقیت رکھتا ہے۔ وہاں زندگانی کا ظہور۔ زندوں کی صورت میں ہے اور یہاں حیات کا ظہور لکڑی کے سوکھے ستون میں وہاں صرف اُنہیں حرکات کا صادر ہونا ہے جو ہر جاندار حیوان سے صادر ہوتے ہیں۔ اور یہاں اس عشق و محبّت خدا و رسول کا اظہار ہے جو انسانوں میں بھی بجز اہل معرفت وحقیقت دوسروں کو نصیب نہیں ہوتے اور یہ ایسے کھلے ہوئے اور واضح فرق ہیں جن کو ملحوظ رکھنے کے بعد کسی کو بھی اس معجزے کے تفوق میں کلام نہیں ہوسکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ گو یہ مضمون جس کی ابتداء یوم الاباقر سے ہوئی تھی کسی قدر طویل ہوگیا۔ مگر اس سے ہمارے ناظرین بہت سے عجیب و غریب فوائد حاصل کریں گے۔ معجزہ کے متعلق ہم نے یہاں بہت ہی اختصار کے ساتھ اُسی قدر بیان کیا ہے جس کا اس موقع سے تعلق ہے ۔ ناظرین کرام کو انتظار کرنا چاہیئے۔ ہمارا ایک عرصہ سے خیال ہے کہ ہم معجزات کے متعلق خواہ نظم میں خواہ نثر میں مفصل ایک تبصرہ کریں جس میں معجزات کو علی الترتیب اس طرح بیان کیا جائے کہ معجزات علمی و عملی جُدا جدا نظر آئیں۔ فلسفہ جدیدہ سے جو اذہان و طبائع متاثر ہیں بشرط فہم سلیم انشاء اللہ اس تبصرہ سے اُن سب کا قلع قمع ہوجائیگا۔ اور ان کو معلوم ہوجائے گا۔ کہ جن تخیلات کی بنا پر نصوص قرآن و حدیث کو نہایت جرأت کے ساتھ رد کیا جاتا ہے۔ وہ چند موہوم اور مفروض و خود تراشیدہ قواعد پر مبنی ہیں۔

محاصرہ حمص مسلمانوں کے لئے تائیدات آسمانی کا ظہور کسی خاص نوعیت کیساتھ مخصوص نہ تھا۔ بلکہ جیسی ضرورت پیش آتی تھی اُسی کے موافق تائید ہوتی تھی اور یہی وہ بات تھی جس کا اعتراف اُن کے مخالفوں کو بھی تھا اور دل سے مسلمانوں کو حق پر سمجھے ہوئے تھے۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دمشق میں مصالحت کے معاملہ سے فارغ ہوئے تو حمص کی

جانب رُخ کیا۔ ہرقل کو اطلاع ہوئی تو اہل حمص کو بہت کچھ امداد کا وعدہ دے کر ہر طرح سے تسلی دی حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے حمص کا محاصرہ کر لیا۔ موسم سردی کا تھا۔ اہلِ حمص نے باہم مشورہ کر کے یہ بات طے کی کہ لڑنے کی کچھ ضرورت نہیں اہلِ اسلام کو محاصرہ کئے پڑے رہنے دینا چاہیئے۔ یہ لوگ سردی کا تحمل نہ کر سکیں گے۔ پیروں میں ان کے موزے بھی نہیں۔ جوتے بھی ہیں تو عربی وضع کے جو پیر کی کچھ بھی حفاظت نہیں کر سکتے اور نہ سردی سے بچا سکتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ شدت سردی سے اُن کے پیر پھٹ جائیں گے اور بالآخر برف کی وجہ سے انگلیاں گرنے لگیں گی اور یہ گھبرا کر لوٹ جائیں گے یا فنا ہو جائیں گے اور فی الواقع تھا بھی ایسا ہی۔ اہل عرب اس قسم کی سخت سردی اُٹھانے کے خوگر نہ تھے اور نہ اُن کے پاس محافظت کا سامان تھا۔ برخلاف اہل حمص کے کہ اوّل تو وہ اس ملک کے رہنے والے سردی کے متحمل دوسرے ہر قسم کا سامان موجود۔ مگر یہ ظاہری خیالات تھے تائیدِ الٰہی اسباب ظاہری پر موقوف نہیں ہے۔ غیب سے یہ صورت پیش آئی کہ اہلِ حمص کے پیر تو موزوں میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور مسلمانوں کے پیروں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ عربی چپلوں میں اچھے خاصے رہے کسی کی ایک انگلی بھی نہ گری

جب جاڑا گذر گیا اور اہلِ حمص کے خیالات پورے مسلمان اُسی طرح مستعدی سے صحیح وسالم رہے تو ایک تجربہ کار بوڑھے شخص نے اہلِ حمص سے کہا کہ مسلمانوں سے صلح کر لینا بہتر ہے ان لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص نے کہا کہ جاڑا تو گذر گیا اور تمہاری سب اُمیدیں خاک میں مل گئیں خیالات غلط ثابت ہوئے۔ اب کس بات کے منتظر ہو صلح کر لینی چاہیئے"۔ ان لوگوں نے جوابدیا کہ اب برسامؔ کے منتظر ہیں۔ برسام جاڑے میں نہیں رہتا گرمی میں ظہور پذیر ہوتا ہے اُس شخص نے کہا ان خیالات کو چھوڑو۔

اِنَّ ھٰؤُلَاءِ قَوْمٌ یُعَانُوْنَ وَلَانَ (یہ وہ قوم ہے جن کی غیب سے تائید و امداد ہوتی ہے)

ؔ برسام ایک مرض ہے جس سے جسم پر ورم اور ہذیان ہوتا ہے۔ ۱۲

فَاَتُوْهُمْ بِعَهْدٍ وَمِيْثَاقٍ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تُوْخَذُوْا عَنْوَةً اُجِيْبُوْنِيْ مَحْمُوْدِيْنَ قَبْلَ اَنْ تُجِيْبُوْنِيْ مَذْمُوْمِيْنَ فَقَالُوْا شَيْخٌ خَرِفٌ وَلَا عِلْمَ لَهٗ بِالْحَرْبِ

تمہارا اُن کے پاس عہد پیمان کے بعد جانا اس سے بہتر ہے کہ زبردستی پکڑے ہوئے جاؤ تم میری بات اس وقت مانو گے تو قابل تعریف قرار پاؤ گے بعد میں مجبور ہو کر مانو گے اور قابل مذمت ہو گے اُن لوگوں نے کہا کہ یہ تو بوڑھا ہو کر بہک گیا ہے اور اسکو لڑائی کا تجربہ بھی نہیں ہے۔

اسکے بعد ایک دفعہ مسلمانوں نے حملہ کیا اور باواز بلند تکبیر کہی تو حمص کے اندر زلزلہ آگیا۔ دیواریں گر پڑیں۔ یہ حالت دیکھی تو وہ گھبرائے اور ان تجربہ کار بوڑھوں کے پاس گئے جنہوں نے اوّل ہی صلح کی رائے دی تھی۔ اور کہا کہ اب کیا کریں۔ اُن لوگوں نے ٹال دیا اور خوب ذلیل کیا۔ دوبارہ جب پھر تکبیر کہنے پر زلزلہ آیا تو پھر اُنکے پاس گئے۔ تب اُنھوں نے کہا تم خود صلح کی خواہش کرو۔ چنانچہ اہل حمص نے قلعہ کی دیواروں پر کھڑے ہو کر صلح کی خواہش ظاہر کی۔ مسلمانوں کو خود بات معلوم نہ تھی کہ یہ لوگ کس بات سے مجبور ہو کر صلح کرنی چاہتے ہیں اُن کو معلوم نہ تھا کہ تائید الٰہی نے اہل حمص کے اندر کس قسم کی پریشانی اور بدحواسی پھیلا رکھی ہے مگر چونکہ وہ امن و امان اور صلح کے ہر وقت طالب اور خواہشمند اور خونریزی سے بچنے کو بدل پسند کرتے تھے اس لئے فوراً آمادہ صلح ہو گئے اور اُنھیں شرائط پر صلح کر لی جن شرائط پر دمشق میں کی تھی۔

اس واقعہ سے ہر ذی فہم نہایت آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جب فریق مقابل کے تجربہ کار عقلاء کو مسلمانوں کے حالات کا مشاہدہ کرتے کرتے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہر موقع پر خدا کی طرف سے اُن کی اعانت ہوتی ہے اور اُن کی نصرت و کامیابی سراسر تائید الٰہی پر مبنی ہے ظاہری سامانوں پر موقوف نہیں ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی حقانیت کا اثر اُن پر نہوا ہو۔ اسکو سچا اور آسمانی مذہب نہ سمجھتے ہوں انہیں واقعات سے اور مسلمانوں کے حالات کے مشاہدے نے اُنکے دلوں میں اسلام کی محبت کا بیج جما دیا اور گویا اُن کے باطن میں نور ایمان چمک گیا گو ظاہر میں بوجہ پابندی جا

ومناصب یا خوف غوغاء عوام یا اندیشہ سلطنت اس وقت اسلام کا اظہار نہ کرسکے لیکن ظاہر ہے کہ جب ان موانع کے مرتفع یا ضعیف ہوجانے کے ساتھ اُن کو مسلمانوں سے میل جول ہمنشینی اور ہم کلامی کی نوبت پہنچی اسلام بجلی کی رَو سے بھی زیادہ تیزی اور سرعت کیساتھ پھیلتا چلا گیا اور جو لوگ اپنی باطنی میلان کو ظاہر نہ کرسکے تھے اب بیخوف وخطر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئے یہ بھی اسلام کے بسرعت پھیل جانیکی اصلی لم۔ ورنہ مسلمانوں نے کسی ایک جگہ بھی کسی قسم کے دباؤ یا زور حکومت یا حیلہ وتدبیر سے کام نہیں لیا۔ تاریخیں موجود ہیں کوئی شخص ایک بھی مثال اسکی دکھلا سکتا ہے تو دکھلائے۔

سردارانِ فارس کا معہ لشکر عظیم کے برغبت مسلمان ہونا مسلمانوں کے مدمقابل دوہی قومیں تھیں روم وفارس دونوں قوموں کے علما اور واقف کاروں میں مذہبی روایات کی بنا پر یہ امر ذہن نشین تھا کہ اسلام ضرور پھیلے گا۔ اور مسلمان ان ممالک پر مسلط ہوجائیں گے یہی وجہ تھی کہ اس بھید پر مطلع ہونے والے اشخاص مقابلہ کو پسند نہ کرتے تھے یزدجرد بادشاہ فارس نے مدائن کے مفتوح ہوجانیکے بعد اپنے سرداروں اور سپہ سالاروں کو جمع کرکے مشورہ کیا اور بالآخر یہ قرار پایا کہ یزدجرد نے بہت بڑے سپہ سالار کو جس کا نام (سیاہ) تھا معہ ستر بڑے بڑے افسروں اور امیروں کے سوس کی محافظت کیلئے بھیجا لیکن اہل سوس تو پہلے ہی مصالحت کرچکے تھے۔ اس لئے سیاہ کو مجبوراً رامہرمز اور تستر کے درمیان خیمہ ڈالنا پڑا سیاہ جس عظیم الشان جمعیت اور شان وشوکت سے آیا تھا اُس کا فکر مسلمانوں کو بھی تھا۔ کیونکہ فارس کے منتخب اور چیدہ سردار اُس کے ہمرکاب تھے۔ مگر تائید الٰہی سے مسلمانوں کے لئے جو سامان ہورہا تھا وہ اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ فارس کے افسر اعلےٰ سیاہ نے اُن سرداروں کو جو اُس کے ساتھ اور ماتحتی میں تھے جمع کرکے کہا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم ہمیشہ سے سُنتے چلے آئے ہیں کہ یہ لوگ اس مملکت پر غالب آجاوینگے اور اصطخر کے شاہی محلات میں اُن کے گھوڑے بندھیں گے اور اس وقت اُن کی فتوحات سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ یہ خیال کس قدر متیقن اور صحیح ہے اب تم لوگ

اپنی بہبودی کی بات سوچ لو سب نے کہا ہم تمہارے مشورہ کے تابع ہیں اُس نے کہا تو ہر شخص اپنے متبعین اور خواص کا ذمہ دار بن جائے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ہم اُن کے مذہب میں داخل ہو کر اُن جیسے بن جائیں۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ اور ایک بڑے سردار شیرویہ کو دس افسروں کے ساتھ حضرت ابو موسیٰ سے گفتگو کرنے بھیجا۔ شیرویہ نے اپنی قوم کا پیام پہنچایا کہ ہم بہ رغبت مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ مگر اس شرط پر کہ تمہارے ساتھ ملکر ہم اپنی قوم اہل عجم سے تو مقابلہ کریں گے مگر اہل عرب سے نہ لڑیں گے۔ اور کسی عربی نے ہم سے لڑائی کی تو تم کو ہماری محافظت لازمی ہوگی۔ نیز یہ کہ بیت المال میں سے ہم کو وہ حصہ دیا جاوے جو تم میں کے اشراف اور سرداروں کو دیا جاتا ہے اور یہ کہ عہدنامہ امیرالمومنین کی تصدیق سے مرتب کیا جاوے۔

حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا کہ جب تم مسلمان ہوتے ہو تو ان شرطوں کی کیا ضرورت ہے جو ہمارا حال وہی تمہارا حال۔ اُن لوگوں نے اسکو نہ مانا تو حضرت عمر کی خدمت میں یہ ماجرا لکھا اور وہاں سے جواب آیا کہ جو وہ کہتے ہیں اسکو مان لو۔ اس قرارداد کے بعد سیاہ معہ تمام افسروں اور فوج کے مسلمان ہو گیا اور یہ سب تستر کے محاصرہ میں حضرت ابو موسیٰ کے ساتھ شریک ہوئے لیکن جس مستعدی اور جد وجہد کی توقع تھی وہ اُن سے ظاہر نہ ہوئی تو حضرت ابو موسیٰ نے سیاہ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ اوّل تو ابھی ہم اسلام کے احکام سے تمہاری طرح واقف نہیں دوسرے آپ نے بیت المال سے ہم کو وہ حصہ نہیں دیا جس کے ہم مستحق تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے یہ حال حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا وہاں سے جواب آیا کہ اُنکے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہیئے جو خود مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اُن کیلئے بقدر اُنکے درجے اور جانفشانی کے بیت المال سے مقرر کیا جائے جیسا کہ خود مسلمانوں میں تفاوت درجات ملحوظ رہتا ہے چنانچہ سیاہ اور اُسکے ساتھ پانچ سرداروں کا نام ڈھائی ہزار والوں میں لکھا گیا اور سو شخصوں کا نام ہزار والوں میں وعلیٰ ہذا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو چکا تو حضرت ابو موسیٰ نے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا۔ سیاہ نے یہاں اپنی مردانگی اور عمدہ تدبیری کے جوہر کھلائے۔ آخر شب میں اپنی ملکی

وردی پہنکر اور اُسپر خون کے چھینٹے ڈال کر قلعہ کی دیوار کے نیچے جا پڑا۔ کسی شخص نے اوپر سے دیکھا تو سمجھا کہ ہمارا آدمی زخمی پڑا ہے دروازہ کھول کر اُس کے اُٹھانے کیواسطے چند آدمی گئے جب قریب پہنچے تو سیاہ نے کھڑے ہوکر مقابلہ شروع کر دیا وہ گھبرا کر بھاگے تو اُس نے تنہا ہی قلعہ کے دروازہ پر قبضہ کر لیا اور اسکے پیچھے فوراً مسلمانوں کا لشکر قلعہ میں داخل ہوگیا اور اس طرح ایک شخص کی جرأت سے قلعہ فتح ہوگیا۔ یہ ایک خاص جگہ کا واقعہ ہے جس میں ہزارہا اہل فارس وقت واحد میں مسلمان ہوئے۔ اس واقعہ سے ہم چند نتائج نکال سکتے ہیں۔

(۱) اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کے آنے اور ممالک شام وعراق پر مسلط ہو جانے کا علم ہر دو ملکونکے اہل علم وعقل کو از روئے روایات مذہبی تھا اور قبل از ظہور اسلام اُنکے باہم یہ تذکرے ہوتے تھے۔ قیصر روم وشام ہرقل کو بھی جو اہل کتاب میں سے تھا یہ علم تھا جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ چکے ہیں۔

(۲) یہ لوگ اسلام کو مذہب حق سمجھ کر برغبت وخوشی مسلمان ہوئے۔ خوف وطمع زر اسکے باعث نہیں ہوئے کیونکہ جان ومال کی حفاظت اور اپنے مال ودولت پر بآزادی قابض رہتے کیساتھ مصالحت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی اہل سوس مصالحت کرکے محفوظ ومامون ہوچکے اور اسکی ہزار نظیریں موجود تھیں کہ مسلمانوں نے جو عہد کیا اُس کے خلاف ایک بات نہ کی۔ رہا شرط کرنا سو یہ بھی طمع زر کیوجہ سے نہ تھا۔ بلکہ مساوی حقوق کا طلب کرنا انسانی حریت وشرافت کا مقتضیٰ ہے۔ مساوات حقوق کا مطالبہ عین عقل وتقاضاء انسانیت وحریت کے مطابق ہے۔ اسمیں طمع زر کو دخل ہے نہ حب جاہ۔

(۳) جبتک خدا تعالیٰ کی طرف سے توفیق اور امداد نہو ہدایت کیلئے فقط علم کافی نہیں ہے ہرقل قیصر روم وشام کے پاس جب نامۂ مبارک رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پہنچا تو اُس نے بھی نامۂ مبارک کی بہت تعظیم کی اور آپکے حالات دریافت کرنیکے بعد اپنی قوم کو مسلمان ہونیکی ترغیب دی اور کہا یہ دین ضرور پھیلے گا اور یہ لوگ میرے ملک پر مسلط ہو جائیں گے۔ مگر توفیق شامل حال نہ تھی علم نے

کچھ کام نہ دیا۔ عوام نے دنیا کی راحت کو دائمی نجات پر ترجیح دی۔

ناظرین اس واقعہ اور اسکے نتائج پر مطلع ہو کر آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اسلام جو اس قدر سرعت سے پھیلا کہ ایک ایک موقع پر ہزارہا آدمی مسلمان ہوتے تھے اور وہ بھی معمولی اشخاص نہیں بلکہ فوجی سردار اور لشکر جرار جو معرکۂ کارزار گرم کرنے اور ملک کو اغیار کی مداخلت کرنے سے محفوظ رکھنے کیلئے اپنے بادشاہ سے سرفروشی کا عہد کر کے نکلے تھے اور پھر لڑ کر مغلوب ہونے یا قیدی بننے کے بعد لڑائی اور مقابلہ سے پہلے مسلمانوں کے کثرتِ عساکر اور سازو سامان ظاہری سے مرعوب ہو کر نہیں بلکہ اپنی مذہبی اور قومی روایات کی بنا پر اس تیقن کی وجہ سے مسلمان غالب آئیں گے ضرور مسلط ہوں گے ضرور۔ پھر اُن سے مقابلہ لاحاصل۔ اور یہ علم نہ سلطنت تک محدود تھا۔ بلکہ خواص سے گزر کر عوام تک پہنچ چکا تھا تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس اشاعت میں تلوار کی زور کو بھی کچھ دخل تھا۔ معاذ اللہ استغفر اللہ

ہم اوّل کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں نے بڑی بڑی معرکہ کی لڑائیاں لڑیں۔ ملکی فتوحات میں وہ کمال دکھلایا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ تھوڑے اور بہت تھوڑے زمانہ میں اسلامی فتوحات کے سیلاب عظیم نے ممالک شام و عراق و مصر سے متجاوز ہو کر افریقہ کے ممالک اور اندلس کو زیر و زبر کر دیا مگر حاشا للہ کہ اشاعت اسلام میں ان فتوحات کو کچھ بھی دخل ہو۔ ایک شخص بھی خوف جان کیوجہ سے اسلام لانے پر مجبور نہیں ہوا۔ مصالحت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ امن دینے میں مسلمان اسقدر مستعد تھے کہ کسی نے جھوٹ کو درخواست کی اور وہ سچ مچ قبول کرنے کو موجود ہو جاتے تھے وفاءِ عہد کی یہ حالت کہ اگر کسی ادنے سے بھی وعدہ کر لیا تو سب پر اُس کا احترام واجب۔ پھر ایسی حالت میں کسی کو کیا مجبوری تھی کہ اپنا محبوب و قدیم مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوتا۔

اسلام کے بسرعت پھیلنے کی کل دو ہی وجہ تھیں۔

(۱) مذہبی روایات کی بنا پر اہلِ شام و روم و فارس کو یہ تیقن تھا کہ اسلام مذہب حق ہے اور وہ ضرور پھیلے گا۔

(۲) مسلمان جب کسی ملک یا شہر میں صلح کرکے داخل ہوئے یا فتح کرکے اور اُس جگہ کے لوگوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہنے کا اتفاق ہوا میل جول کا موقع ملا۔ اُن کے معاملات کو دیکھا۔ اُنکی راستبازی۔ خدا پرستی۔ دینداری اور تمام اُن برگزیدہ اوصاف کا مشاہدہ کیا جو ایک ہادی قوم کیلئے ہونی چاہئیں تو خود بخود بلا آزادی اسلام کی محبت دلوں میں راسخ ہوتی گئی اور بخوشی و رغبت سرکش گردنوں کو اسلام کے سامنے جُھکاتی گئی۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہر منصف مزاج ان صریح حالات کی تصدیق میں کبھی تامل نہ کریگا۔ ہٹ دھرم کیلئے نہ کوئی حجت کارگر ہے اور نہ کوئی واضح سے واضح دلیل اسکی تشفی کرسکتی ہے

رستم سپہ سالار اعظم فارس کے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت خیالات مسلمانوں کی اخلاقی و دماغی قابلیتیں اور حسن معاملات

رستم سپہ سالار اعظم فارس کے مقتول ہونیکا ذکر قادسیہ کے تذکرے میں اجمالاً آچکا ہے۔ اسوقت مجھکو اس کا دہرانا مقصود نہیں ہے۔ معرکۂ کارزار قادسیہ کی کیفیت نہ پہلے بیان میں لکھی گئی تھی اور نہ اب لکھی جائیگی۔ کیونکہ یہ ہمارے مقصود سے علیحدہ چیز ہے اسوقت سابق مضمون کی تائید میں کہ اہل فارس کے سرداروں اور شریف خاندانوں میں اسلام کی حقانیت اور غلبہ کا یقین کس قدر راسخ ہوچکا تھا۔ رستم کے قلبی جذبات اور خیالات کا ذکر کرنا مناسب سمجھا گیا۔

یہ وہ شخص ہے کہ فارس بھر میں اس سے بڑھکر مقتدر شجاع اور معتمد علیہ کوئی نہ تھا ملک فارس نے اپنی نجات کی اُمیدیں اُسی کی ذات سے وابستہ رکھی تھیں۔ سلاطین فارس بھی اسی کے محتاج اور اسکی طرف امید و بیم کی نظر سے دیکھتے تھے مجھے دکھلانا ہے کہ ایسے شخص کے خود ذاتی خیالات کیا تھے۔ اور اسلام کی عظمت و محبت کو کہانتک دل میں لئے ہوئے تھا مسلمانوں کے مقابلہ سے کیونکر پہلو بچاتا تھا۔ اور باینہمہ شجاعت و مردانگی بزدلوں کی طرح حیلہ حوالہ سے جنگ کو ٹالتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بدقسمتی نے اُسکو اس دولت سے محروم رکھا اور انجام کار اُسکو وہی روز بد دیکھنا پڑا جس سے وہ بچتا تھا۔ باوجود معرفت و علم ذاتی کے تصدیق کا درجہ نصیب نہ ہوا اور حسرت و افسوس کے ساتھ کفر کی حالت میں جان دیدی۔

عنوان مذکورہ کے ذیل میں بہت سے واقعات اور حالات ہیں جن سے ہمارے اصلی دعوے
اشاعت اسلام پر نہایت خوبی سے روشنی پڑتی ہے اس لئے ناظرین صبر و سکون
مسلسل واقعات کو دجو خاص اس عنوان کے ذیل میں لکھے جائیں گے اور جن کا تعلق عنوان
مذکورہ سابق سے ہی) ملاحظہ فرمائیں اور اُن کے نتائج کا آخر مضمون پر انتظار کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کیوقت سے ملک فارس میں ایسے
تغیرات وحوادث پیش آنے شروع ہوئے کہ ہزارہا سالہ سلطنت کی استوار و مستحکم بنیادیں متزلزل
ہونے لگیں، جلد جلد انقلاب سلطنت نے اُنکی قوت کو منتشر اراد دونکو ضعیف ہمتونکو پست کر دیا تھا
کسریٰ پرویز ۳۸ سال سلطنت کرنیکے بعد ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھٹے سال اپنے
بیٹے اور جانشین کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اور اس کا جانشین شیرویہ بھی آٹھ ماہ سے زیادہ سلطنت
کرنے نہ پایا تھا کہ ہلاک ہو گیا۔ اُسکی جگہ سات برس کا بچہ اردشیر تخت پر بٹھلایا گیا اور ایک
سردار نے جس کا نام بہادر جسنس تھا بطور نائب السلطنت سب اختیارات اپنے ہاتھ میں لئے
ایک معمولی شخص کا غیر محدود اختیارات کو ہاتھ میں لیکر سیاہ و سفید کا مالک بن جانا عام طور پر
سردارانِ فارس کو ناگوار تھا۔ مگر ایک بہت بڑے جرنیل شہریراز کو جسے کسریٰ پرویز نے سرحد روم
پر عظیم الشان فوج کیساتھ مامور کیا تھا زیادہ ناگوار گزرا اور اُس نے آکر فوراً مداین کا محاصرہ کرکے
بالآخر اردشیر کو قتل کیا۔ اور خود سلطنت پر غاصبانہ متمکن ہو گیا۔ یہ شخص خاندان شاہی سے
نہ تھا۔ اِدھر اردشیر کے قتل کرنیکی وجہ سے عام طور پر بُری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ تین بھائیوں
نے جو باڈی گارڈ کے سواروں میں تھے مشورہ کرکے عین جلوس کیوقت جبکہ اُسکو تخت سلطنت
پر جلوہ گر ہوئے چالیس ہی دن گذرے تھے قتل کر دیا۔ اُسکے بعد خاندان شاہی میں سے کوئی
مرد تو اس قابل نظر نہ آیا کہ مالکِ تخت و تاج ہوتا۔ کیونکہ شیرویہ نے اپنے تمام بھائیوں اور
وارثان ملک کو قتل کر دیا تھا اسلئے کسریٰ پرویز کی بیٹی بوران مالک سلطنت بنائی گئی۔ اور وہ
ایک برس چار ماہ سلطنت کرنے پائی تھی کہ ایک دوسرا شخص جو کسریٰ پرویز کے بعید تر رشتہ داروں

میں سے تھا قابض ملک ہو گیا لیکن ابھی ایک ماہ بھی لطف سلطنت نہ اٹھایا تھا کہ اہل فارس نے اس کو بھی قتل کر دیا اور اب کسریٰ پرویز کی دوسری بیٹی ارزمیداخت مالک تاج و نگین بنائی گئی۔

یہ عورت حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی خراسان کے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف فرخ ہرمز نے جو تمام ملک فارس میں اول درجہ کا افسر اور سردار تھا ملکہ کو نکاح کا پیام بھیجدیا

ملکہ نے بوجہ وارث سلطنت نکاح تو مناسب نہ سمجھا، مگر بوجہ خوف صاف جواب بھی نہ دیسکی ملکہ اس کو ملاطفت وحیلہ سے بلوا کر قتل کرا دیا۔

فرخ ہرمز کا بیٹا رستم اسکی غیبت میں خراسان کا قائم مقام گورنر تھا اسکو جب باپ کے قتل کی خبر پہنچی تو اس نے مداین پر چڑھائی کر کے ملکہ کو اندھا کرنیکے بعد قتل کر دیا اور خود سیاہ و سفید کا مالک بن کر ایک اور شخص کو تخت سلطنت پر بٹھلا دیا۔ یہ بھی چھ ماہ سے زیادہ سلطنت کرنے نہ پایا تھا کہ تخت سے اُتار کر قتل کر دیا گیا۔ اسکے بعد ملک فارس بالکل بے سر رہ گیا۔ برائے نام بھی کوئی بادشاہ نہ رہا جو کچھ تھا رستم تھا۔

یہی وہ رستم ہے جس کا حال ہم یہاں لکھنا چاہتے ہیں جس کی ذات پر تمام اہل فارس کا سہارا تھا اور جس کی زبردست قوت اور فوق العادت شجاعت پر ملک بھر کو اعتماد تھا اور جس کے قتل پر قادسیہ کے مشہور عالم معرکہ کا خاتمہ ہوا۔

ادھر تو ملک فارس کی یہ کیفیت تھی اُدھر اسلامی فتوحات کا سیلاب عظیم ملک کو زیر و زبر کرتا ہوا چلا آتا تھا اہل فارس اگر کچھ کرتے تو رستم کے سہارے پر کرتے مگر وہاں اُس کا ایک مدمقابل فیروزان[1] پیدا ہو گیا۔ انکی باہمی مخالفت اور غضب ڈھا رہی تھی۔ وہ آپس کے مناقشات اور جنگ و جدل کیوجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ اپنی قوت کو اہل اسلام کے مقابلہ کیلئے مجتمع کر سکتے۔

فارس کی زبردست اور عظیم الشان سلطنت فی الحقیقت تو ضعیف نہ ہو گئی تھی اُس میں کافی سے زیادہ جنگی مواد موجود تھا عساکر قاہرہ سے چھاونیاں بھری ہوئی تھیں کسریٰ پرویز نے حسن تدبیر یا ظلم و تعدی کے ساتھ اس قدر روپیہ ملک سے وصول کیا تھا کہ خزانے معمور تھے۔

[1] پرویز کو اُسکے بیٹے شیرویہ نے [illegible] قید کرنیکے بعد جو خط لکھا تھا اُس میں منجملہ

یہ ایسی زبردست قوت تھی کہ روم وشام کی عظیم الشان اور قدیم سلطنت کو بھی اُس کے سامنے گردن جھکانی اور ہرقل قیصر روم کو بادل ناخواستہ اپنی بیٹی پرویز کے نذر کرنی پڑی تھی۔ پرویز کو قتل ہوئے ابھی سات سال سے زیادہ نہوئے تھے سلطنت کے تمام ممالک بدستور زیرنگین تھے قوت جوں کی توں موجود تھی صرف ضعف تھا تو یہ کہ بے سری اور خانہ جنگی کیوجہ سے قوت کو کام میں نہ لا سکتے تھے

اراکین سلطنت اور سرداران فارس اس حالت پر زیادہ صبر نہ کر سکے سب نے ملکر رستم اور فیروزان کو جمع کیا اور کہا ملک اس حالت کو پہنچ گیا مگر تمہارا باہمی اختلاف ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اب ہم تم کو اس سے زیادہ دیر تک قائم نہ رہنے دیں گے یا تم دونوں متفق ہو کر ملک کی حفاظت کرو۔ ورنہ اوّل ہم تمکو قتل کر کے خود ہلاک ہو جائیں گے۔

اس پر دونوں نے متفق ہو کر کسریٰ کی بیٹی بوران سے دریافت کر کے کسریٰ کی تمام عورتوں بیبیوں اور باندیوں کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ کسریٰ کی اولاد میں کوئی لڑکا ہو تو بتلاؤ سب نے انکار کیا۔ مگر ایک عورت نے پتہ دیا کہ کسریٰ کا پوتا یزدجرد اپنی ننھیال میں ہے اُسکی ماں نے قتل[1] کے خوف سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) اور الزامات کے یہ بھی تھا کہ تو نے جبر و تعدی کیساتھ رعیت سے روپیہ وصول کر کے خزانوں کو پر کیا ہے پرویز نے اُسکے جواب میں شیرویہ کو لکھا کہ یہ تیرا خیال احمقانہ ہے کہ ہم نے جبر و تعدی سے بضرورت جمع کیا ہے۔ ملک بغیر خزانہ کے کبھی باقی نہیں رہ سکتا تو نے اگر بے طور خرچ کر کے خزانے خالی کر دیے تو انجام برا ہوگا۔ غرض خزانوں کے مالامال ہونیکو شیرویہ تو نتیجہ جبر و تعدی کا بتاتا ہے اور پرویز حسن تدبیر کا اسلئے ہم نے دونوں لفظ لکھ دیے۔ ۱۲

[1] کسریٰ پرویز کے اٹھارہ بیٹے تھے سب میں بڑا شہریار تھا جس کو شیریں نے بیٹا بنا لیا تھا۔ منجموں نے پرویز سے کہدیا تھا کہ سلطنت فارس کا زوال تیری اولاد میں سے ایسے شخص کے وقت میں ہونیوالا ہے جس کے کسی عضو میں نقصان ہوگا۔ اس بنا پر پرویز نے اپنی تمام اولاد کو شادی اور بیاہ سے روک دیا تھا۔ شہریار نے خفیہ بمشورہ شیریں ایک عورت کے ساتھ میل کر لیا جس سے یزدجرد پیدا ہوا۔ مگر خوف قتل سے اُسکو مخفی رکھا گیا۔ آخر عمر میں جب پرویز کو بچوں کی طرف رغبت پیدا ہوئی اور اس کو خیال ہوا کہ میں بھی اپنے بیٹوں کی اولاد کو دیکھتا تو شیریں نے یزدجرد کو بلا کر دکھلایا پرویز اُس کے ساتھ بہت محبت کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے یزدجرد بچوں میں کھیل رہا تھا۔ پرویز کی نظر اُس کے بدن پر پڑی تو معلوم ہوا کہ اُس کا ایک سُرین چھوٹا ہے۔ پرویز نے اُس کو قتل کرنا چاہا مگر شیریں نے یہ کہکر روکدیا کہ اگر یہ امر مقدر ہو چکا ہے تو ہو کر رہیگا۔ اسکے بعد یزدجرد کو وہاں سے کسی دوسری جگہ بھیجدیا ۱۲—

دہاں بھیجدیا تھا۔ رستم اور فیروزان نے یزدجرد کو جسکی عمر ۱۲ سال کی تھی وہاں سے بلاکر تخت شاہی پر بٹھلایا۔

ملک فارس کے عہدہ داراُن ملکی و مالی سرداران فوجی ماتحت نوابوں اور جاگیرداروں سے لیکر رعیت کے ادنیٰ افراد تک (جو ملک کو بے سر اور تخت کو خالی اور سلطنت کو تباہ ہوتے دیکھ کر سخت پریشان واندوہگین تھے۔ اور اس وقت ہر شخص کے نزدیک اپنے ناموس سے زیادہ ملک کی حفاظت اہم اور ضروری تھی) یزدجرد کو تخت پر جلوہ گر دیکھ کر اطاعت و انقیاد کیلئے دوڑ پڑے اور تخت شاہی کے گرد پروانہ وار جمع ہو کر ملک پر قربان ہونیکے واسطے تیار ہو گئے۔

ملک بھر میں جنگ اور حفظ سلطنت کا جوش تو پہلے سے ہی پھیلا ہوا تھا فوجیں میدان جنگ میں جانے اور داد شجاعت دینے کیواسطے بیقرار تھیں اب اتحاد و اتفاق کی ایک لہر تمام جگہ پھر گئی۔

یزدجرد نے ایسی مستحکم اور قوی سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی جس میں کسی جانب بھی ضعف نہ تھا اُسکو وہ بات نصیب ہوئی جو کسریٰ پرویز کو باایں ہمہ سطوت و جبروت حاصل نہ تھی کیونکہ اُس کی حکومت و لونیز نہ تھی۔ بلکہ عام افراد اُسکے جابرانہ احکام سے بیزار تھے اور اسیوجہ سے انجام کار قید ہو کر قتل ہوا۔ اور یزدجرد کیحالت عین برعکس تھی۔ سارے ملک کے دل مسخر تھے ہر فرد فریفتہ اور اُس کے ادنیٰ اشارہ سے ایک مرکز پر جمع ہو کر سب کے سب جان دینے کیلئے تیار تھے۔

یزدجرد نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی منتشر قوت کو مجتمع کر دیا۔ فوجوں کو ملک کے حصوں پر منقسم کر کے چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ اور تمام چھاؤنیوں، سرحدوں اور مورچوں کیلئے فوجیں نامزد کر کے اُن کا تعلق مرکز سے قائم کر دیا اور سلطنت کا وہ رعب و داب از سر نو زندہ کیا جو کچھ عرصہ کیلئے گم ہو گیا تھا اور اس طرح انتظام کر کے مسلمانوں سے مقابلہ یا بالفاظ دیگر اُنکو اپنے ملک کے اطراف سے جنہر وہ مسلط ہو گئے تھے نکالنے کیواسطے مستعد ہو گئے اس بڑی تیاری کے بعد سب سے پہلا اور سب سے بڑا معرکہ قادسیہ کا ہوا گویا یہ سب سامان جنگ قادسیہ کی تمہید تھی۔

ہم نے اس وقت تک مضمون مذکورہ بالا میں جو کچھ لکھا اُس کی غرض یہ تھی کہ ناظرین سلطنت کی موجودہ حالت سے ایسی واقفیت پیدا کر لیں جو واقعات مابعد میں اُنکی رہبری کر سکے اور جس کی

وجہ سے نتیجوں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اب ہم واقعات مابعد کو نمبر وار لکھ کر آخر میں نتیجہ لکھیں گے۔

(۱) اسلامی لشکر جو عراق میں داخل ہو کر فتوحات اسلامیہ کو وسعت دے رہا تھا اُسکے سپہ سالار حضرت مثنیٰ بن حارثہؓ تھے۔ جو شجاعت اور تدبیر میں حضرت خالدؓ سپہ سالار شام کی برابر اور نظیر سمجھے جاتے تھے۔ حضرت مثنیٰ کے پاس کل آٹھ ہزار فوج تھی اُن کو یزدجرد کی تخت نشینی۔ فارس کے اتفاق اور ارادوں کی اطلاع ملی تو قبل اسکے کہ اہل فارس پیش قدمی کریں آپنے کمال ہوشیاری اور دانشمندی سے سب حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ اہل سواد عراق جو اسلام کے ذمہ اور عہد میں داخل ہو چکے ہیں اُن سے بھی نقض عہد کا اندیشہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط کو دیکھتے ہی فرمایا

وَاللّٰہِ لَاَضْرِبَنَّ مُلُوْکَ الْعَجَمِ بِمُلُوْکِ الْعَرَبِ۔ (قسم ہے رب العزت کی اگر ملوک عجم مجتمع ہو گئے ہیں تو میں اُن کے مقابلہ کیلئے ملوک عرب کو بھیجوں گا۔)

آپ نے عام حکم کے ذریعے سے تمام قبائل عرب کو اطلاع دیدی کہ ہر قبیلہ کے رئیس منتخب اور تجربہ کار مدبر خاندانی۔ شریف مقرر واعظ۔ خطیب و شاعر اور جو لوگ فنون جنگ میں ماہر یا قوت شجاعت شہسواری و تیراندازی میں مشہور ہیں سب امیر عراق کے لشکر میں جا ملیں ایسا ہی ہوا۔ آپ کا حکم پاتے ہی جن میں جنگ کی قابلیت تھی یا کسی بات میں ممتاز و مشہور تھے سب نکل کھڑے ہوئے۔ جو قبایل مدینہ اور عراق کی نصف مسافت پر رہتے تھے وہ تو براہ راست عراق کو روانہ ہو گئے اور جو مدینے سے قریب تھے وہ مدینہ میں آکر جمع ہو گئے۔

اس لشکر کے جمع ہو جانیکے بعد حضرت عمرؓ معہ تمام لشکر کے مدینہ منورہ سے باہر ایک چشمہ پر جس کا نام صرار تھا خیمہ زن ہوئے۔ لوگوں کو اسکی وجہ معلوم نہ تھی اور نہ اُنکی جرأت تھی کہ اس کا سبب دریافت کر سکتے جب کبھی ضرورت کسی امر کے دریافت کی ہوتی تھی تو حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ذریعہ بنایا جاتا تھا اور اگر کسی بات کو یہ دونوں صاحب بھی نہ دریافت کر سکتے تو حضرت عباسؓ کے ذریعہ سے کام ہوتا تھا۔ اب بھی لوگوں نے حضرت عثمان[1] رضی اللہ

[1] دیکھو صفحہ ۱۴۰۔

عنہ سے عرض کیا۔ اور انہوں نے آپ سے نقل وحرکت کا سبب پوچھا۔ تب آپ نے سب کو جمع کرکے سارا حال بیان کیا اور اپنے بارہ میں مشورہ طلب کیا کہ میرا خود جانا مناسب ہی یا یہاں رہنا۔ عامۂ سبکی رائے یہ تھی کہ آپ بھی تشریف لے چلیں اور آپ کے ہمرکاب ہم سب ہوں۔ آپنے اسکو قبول کرکے فرمایا کہ سب لوگ تیاری کریں میں بھی چلوں گا۔ ہاں اگر اس سے بہتر کوئی دوسری رائے معلوم ہوگئی تو اُس پر عمل کیا جاویگا۔ اسکے بعد آپنے جلیل القدر صحابہ کو جمع کیا حضرت علیؓ کو بطور قائم مقام مدینہ منورہ میں چھوڑا تھا۔ اور حضرت طلحہ مقدمۃ الجیش پر تھے۔ اور حضرت زبیرؓ وعبدالرحمٰن بن عوف میمنہ ومیسرہ پر ان سب کو طلب فرماکر مکرر مشورہ فرمایا۔ ان حضرات نے متفق ہوکر رائے دی کہ آپ خود تشریف نہ لیجائیں کسی کو امیر بناکر بھیجدیجئے اگر فتح ہوگئی تو فہو المراد اور اگر کوئی دوسری بات ہوئی تو دوسرے اور تیسرے کو مامور فرمائے۔ اس کا اثر دشمن پر زیادہ پڑیگا۔

معلوم ہوتا ہی کہ آپکی اصلی رائے اوّل سے یہی تھی۔ مگر عوام کی تالیف اور تقویت کیلئے اس پہلی رائے کو قبول فرمالیا تھا۔ اب آپنے اعلان کردیا کہ ذی رائے اصحاب کا مشورہ یہ ہی کہ میں خود نہ جاؤں اس لئے یہ ارادہ ترک کردیا گیا اور بعد مشورہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو جو قبیلہ ہوازن پر عامل تھے امیر عسکر عراق بنایا گیا۔ اور آپنے اُن کو طلب کرکے علم امارت عطا فرماکر ارشاد فرمایا۔

لَا یَغُرَّنَّکَ مِنَ اللّٰہِ اَنْ قِیْلَ خَالُ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَصَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَا یَمْحُوا السَّیِّئَ بِالسَّیِّئِ وَلٰکِنَّہٗ یَمْحُو السَّیِّئَ بِالْحَسَنِ فَاِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اَحَدٍ نَسَبٌ اِلَّا طَاعَتُہٗ فَالنَّاسُ شَرِیْفُھُمْ وَوَضِیْعُھُمْ

اس پر غرہ نہ کرنا کہ لوگ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماموں رفیق اور صحابی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بُرائی کو بُرے عمل سے کبھی نہیں مٹاتا۔ البتہ اچھے عمل سے بُرائیاں محو کردی جاتی ہیں۔ اللہ اور بندوں میں کوئی رشتہ قرابت نہیں ہی اگر علاقہ ہی تو صرف اطاعت کا۔ آدمی شریف و رذیل اعلےٰ وادنیٰ اللہ کے یہاں سب برابر ہیں۔ اُن میں

(بقیہ ف صفحہ ۱۲۹) حضرت عثمان رضی اللہ کا درجہ علاوہ وزیر ومشیر ہونیکے ولیعہد کا سا تھا حضرت عمرؓ نے گو کسی کو ولیعہد آخر تک بھی نہیں بنایا مگر صحابہ کا خیال عام طور پر یہی تھا کہ بعد حضرت عمرؓ کے خلافت انہیں کو ملنی چاہیئے اور اسلئے عام طور پر انکو ردیف کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ عرب کے محاورہ میں ردیف اسکو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کام کو سنبھال سکے جو اُس کے سپرد تھا۔۱۲

فِی ذَاتِ اللّٰہِ سَوَاءٌ اللّٰہُ رَبُّھُمْ وَھُمْ عِبَادُہٗ یَتَفَاضَلُوْنَ بِالْعَافِیَۃِ وَیُدْرِکُوْنَ مَا عِنْدَہٗ بِالطَّاعَۃِ فَانْظُرِ الْاَمْرَ الَّذِیْ رَاَیْتَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَلْزَمُہٗ مُنْذُ بُعِثَ اِلٰی اَنْ فَارَقَنَا فَالْزَمْہُ فَاِنَّہُ الْاَمْرُ۔ ھٰذِہٖ عِظَتِیْ اِیَّاکَ اِنْ تَرَکْتَھَا وَرَغِبْتَ عَنْھَا حَبِطَ عَمَلُکَ وَکُنْتَ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ۔

باہم تفاوت مراتب ہی تو عافیت نفس اور گناہوں سے بچنے میں وہ اُسکے انعامات و اکرامات کو صرف طاعۃ کے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں تم اُس طریقہ کو مضبوطی سے پکڑو جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے وفات تک قائم رہے پس یہی میری نصیحت ہے اگر تم نے اُس کو چھوڑ دیا تو پہلے اعمال صالحہ بھی حبط اور محو ہو جائیں گے۔

اور جب حضرت سعدؓ رخصت ہونے لگے تو اُن کو علیحدہ بُلا کر خاص ہدایات فرمائیں ۔ جو حکمت سے لبریز تھیں ۔ اُن ہدایات کو حضرت عمرؓ ہی کے الفاظ میں نقل کرنا مُناسب ہے ۔

ارشاد فرمایا:- اِنِّیْ وَلَّیْتُکَ حَرْبَ الْعِرَاقِ فَاحْفَظْ وَصِیَّتِیْ فَاِنَّکَ تَقْدَمُ عَلٰی اَمْرٍ شَدِیْدٍ کَرِیْہٍ لَا یُخَلِّصُ مِنْہُ اِلَّا الْحَقُّ فَعَوِّدْ نَفْسَکَ وَمَنْ مَعَکَ الْخَیْرَ وَاسْتَفْتِحْ بِہٖ ۔ وَاعْلَمْ اَنَّ لِکُلِّ عَادَۃٍ عَتَادًا فَعَتَادُ الْخَیْرِ الصَّبْرُ فَالصَّبْرَ الصَّبْرَ عَلٰی مَا اَصَابَکَ وَنَابَکَ یَجْتَمِعْ لَکَ خَشْیَۃُ اللّٰہِ وَاعْلَمْ اَنَّ خَشْیَۃَ اللّٰہِ تَجْتَمِعُ فِیْ اَمْرَیْنِ فِیْ طَاعَتِہٖ وَاجْتِنَابِ

(میں تم کو عراق کا امیر عسکر بنا کر بھیجتا ہوں ۔ میری یہ وصیت یاد رکھنا کہ تم ایک سخت اور دشوار کام کیلئے جاتے ہو جس سے خلاصی کی صورت بجز اتباع حق کچھ نہیں اپنے نفس کو عمل خیر کی عادت ڈالو ۔ اور اُسی کے وسیلہ سے فتح کو طلب کرو ۔ اور جان لو کہ ہر ایک عادت کیلئے سامان اور اسباب ہوتے ہیں خیر کا سامان اور سبب صبر ہے ۔ جو مصیبت یا حادثہ پیش آئے اُس میں صبر کو لازم پکڑو ۔ ایسا کرنے سے خوف خدا تمہارے اندر پیدا ہو گا ۔ اور یاد رکھو کہ خوف خدا کی دو ہی علامتیں ہیں اُس کے حکم کی اطاعت کرنا اور معصیت و نافرمانی سے بچنا ۔ اطاعت خداوندی وہی شخص کرتا ہے جو دنیا سے نفرت کرے اور آخرت

مَعْصِيَتِهٖ وَاِنَّمَا اَطَاعَهٗ مَنْ اَطَاعَهٗ بِبُغْضِ الدُّنْيَا وَحُبِّ الْاٰخِرَةِ - وَلِلْقُلُوْبِ حَقَائِقُ يُنْشِئُهَا اللّٰهُ اِنْشَاءً - مِنْهَا السِّرُّ وَمِنْهَا الْعَلَانِيَةُ فَاَمَّا الْعَلَانِيَةُ فَاَنْ يَكُوْنَ حَامِدُهٗ وَذَامُّهٗ فِي الْحَقِّ سَوَاءً وَاَمَّا السِّرُّ فَيُعْرَفُ بِظُهُوْرِ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ وَبِمَحَبَّةِ النَّاسِ فَلَا تَزْهَدْ فِي التَّحَبُّبِ فَاِنَّ النَّبِيِّيْنَ قَدْ سَاَلُوْا مَحَبَّتَهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا حَبَّبَهٗ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا بَغَّضَهٗ فَاعْتَبِرْ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى بِمَنْزِلَتِكَ عِنْدَ النَّاسِ مِمَّنْ يَّشْرَعُ مَعَكَ فِيْ اَمْرِكَ -

کیطرف راغب ہو اور معصیت کا سبب فقط دنیا کی محبت اور آخرت سے بے رغبتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قلوب میں خاص اور صاف اور عمدہ کیفیات راسخ فرمادیتا ہے جنکے بعض ظاہر آثار ہیں اور بعض مخفی۔ ظاہر تو یہ ہیں کہ حق کے اتباع میں کسی کی مدح وذم کی پرواہ باقی نہ رہے! اور مخفی یہ ہیں کہ حکمت کا دروازہ اس پر کھولدیا جاتا ہے۔ اور اُس کا ظہور زبان کے ذریعہ سے ہونے لگتا ہے اور وہ محبوب خلائق بن جاتا ہے۔ تم اندیشہ مدارات خلق یا شائبہ ریا سمجھکر اس امر سے اعراض کرنا انبیاعلیہم السلام نے بھی محبوب خلائق بنی کی خواہش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو دوست رکھتا ہے تو مخلوق میں اُسکو محبوب بنادیتا ہے اور جب کوئی اُسکے یہاں مبغوض ہوتا ہے تو مخلوق میں اسکو مبغوض مردود بنادیتا ہے۔ تم اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ خدا تعالیٰ کے یہاں تمہارا کیا مرتبہ ہے۔ تو جو خواص بندگان خدا تمہارے ہمراہ اور تمہارے کام میں شریک ہیں اُنکے نزدیک اپنے مرتبہ اور قدر و منزلت کو دیکھ لو۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ روانہ ہوئے اور حضرت عمرؓ صرار سے اعوص تک اُن کو رخصت کرنیکے واسطے تشریف لیگئے اور وہاں پہنچکر عام لشکر کو نصیحتیں فرمائیں اسکے بعد ہر قبیلہ معہ اپنے سرداروں کے آپکے سامنے گذرنا شروع ہوا آپ اُن کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن جب قبیلہ سکون آپ کے سامنے سے گزرا تو چہرۂ مبارک پر آثار کراہت و انقباض ظاہر ہوئے اور آپنے اُدھر سے منہ پھیر لیا لوگ اس حال کو دیکھ کر سخت متعجب تھے حضرت عمرؓ انکی روانگی کے بعد بھی

کراہت اور ناراضی کا اظہار فرماتے تھے اس وقت تو کسی کے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر عرصہ کے بعد اسکی حکمت ظاہر ہوئی۔ اسی قبیلہ میں وہ شخص تھا جس نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا۔ اور اسی میں ابن ملجم[1] بھی تھا جس نے اسد اللہ الغالب حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو قتل کرکے اپنی شقاوت کا ثبوت دیا اور ان ہی میں معاویہ بن حدیج بھی تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے بدلہ لینے کو بہانہ بنا کر مسلمانوں پر قتل و ظلم کا بازار گرم کیا اور ان ہی میں حصین بن نمیر بھی تھا جس نے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں بہت کچھ حصہ لیا۔

غرض فتنہ پردازوں کا جتھا اس قبیلہ میں موجود تھا۔ اور یہ وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُنکی صورت سے بیزار اور عراق جانے کو برا سمجھتے تھے۔ اسوقت گو ان لوگوں میں اس قسم کی فتنہ پردازی کی کوئی بات نہ تھی اور اسی وجہ سے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی شرکت جہاد سے کیوں منقبض ہیں۔

---

[1] عبدالرحمن بن ملجم مرادی۔ برک بن عبداللہ تمیمی۔ عمرو بن بکر۔ یہ تینوں شخص فرقہ خارجیہ سے تھے۔ ایک دن ان تینوں نے مشورہ کیا کہ اس وقت اس گمراہ فرقہ (اہل سنت) کے جو سرآوردہ اور امام ہیں اُن کو قتل کر دیا جائے تو دنیا بھی امن سے ہو جائے اور نہروان میں جو ہمارے گروہ کے صلحا قتل ہوئے ہیں اُن کا بدلہ بھی ہو جائے۔ برک بن عبداللہ نے تو امیر معاویہ کا ذمہ لیا۔ اور عمرو بن بکر نے عمرو بن العاص کا اور ان میں کے شقی تر ابن ملجم نے حضرت علیؓ کے شہید کرنے کا عہد کیا۔ اس قرارداد کے بعد تینوں روانہ ہوئے۔ ابن ملجم کوفہ پہنچا تو وہاں ایک نہایت باجمال عورت قطام سے جو اُس کے ہم مذہب تھی ملنا ہو گیا۔ جس کو دیکھ کر یہ فریفتہ ہو گیا اور فوراً نکاح کا پیام دے دیا۔ قطام نے کہا بس شرط پر منظور ہے کہ میرے مہر میں تین ہزار درہم ایک غلام اور ایک باندی دے اور حضرت علیؓ کو قتل کر دے۔ ابن ملجم نے کہا کہ قتل علی کی شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ تجھکو نکاح کرنا منظور نہیں ہے۔ کیونکہ میں زندہ نہیں بچ سکتا۔ قطام نے کہا اگر زندہ بچگیا تو فھو المراد ورنہ آخرت کی نعمت و لذت کافی ہے۔ ابن ملجم تو خود ہی اس ارادہ سے آیا تھا۔ اب نکاح کی طمع نے اور بھی مستعد کر دیا۔ اندھیرے سے مسجد میں جا بیٹھا اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز صبح کو تشریف لائے تو تلوار ماری جس سے آپ شہید ہوئے۔ اسی قصہ کو خوارج کے ایک شاعر نے اس طرح ذکر کیا ہے۔

فلم مھر اساقہ ذو سماحۃ	کمھر قطام بین عرب و اعجم
عرب و عجم میں کسی صاحب ہمت نے	قطام کے مہر کی برابر مہر نہیں دیا
ثلاثۃ آلاف و عبد و قینۃ	و قتل علی بالحسام المصمم
تین ہزار درہم ایک غلام ایک باندی	اور علی (کرم اللہ وجہہ) کا مضبوط تلوار سے قتل کرنا
فلا مھر اغلی من قطام و ان غلا	ولا فتک الا دون فتک ابن ملجم
کوئی مہر کتنا ہی بڑا ہو قطام کے مہر سے زیادہ نہیں ہو سکتا	اور کوئی حملہ ابن ملجم کے حملہ سے بڑھا ہوا نہیں

اس وقت تو یہ بھی قادسیہ کے لشکر کے سپاہی تھے۔ مگر اُن میں یہ فتنہ موجود تھا جس کا ظہور اس وقت سے سترہ اٹھارہ سال بعد ہوا۔

الغرض اس اہتمام کے ساتھ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو رخصت کیا اور ہر قسم کی ہدایات اُن کو کردیں اور اُن کی روانگی کے بعد بھی برابر امداد کیلئے لشکر بھیجتے رہے۔ اور اس طرح حضرت مثنیٰ کی فوج ملا کر کچھ اوپر تیس ہزار لشکر قادسیہ کے معرکہ کیلئے بہم پہنچا۔

اتفاقی امر ہے کہ حضرت سعدؓ ابھی مقام زرود تک ہی پہنچے تھے کہ تجربہ کار اور بیدار مغز امیر عراق مثنیٰ بن حارثہ کا انتقال ہوگیا۔ مگر اُنھوں نے انتقال سے قبل جنگ کے متعلق ضروری ہدایات لکھ کر ایک شخص کو دیں کہ فوراً حضرت سعدؓ کے پاس پہنچادیجاویں۔

اُن ہدایات میں یہ بھی تھا کہ ناف فارس میں داخل ہو کر ہرگز جنگ نہ کریں بلکہ لڑائی کیلئے ایسے موقعہ کو منتخب کریں جو عرب اور فارس کی سرحد پر ہو۔ تاکہ اگر اس عظیم الشان پیش آنیوالے معرکہ میں مسلمان فتحیاب ہوں تو پیش قدمی سہل ہو اور کوئی دوسری بات پیش آوے تو وہ اپنی حدود میں داخل ہو کر حالت کو سنبھالنے اور دوبارہ حملہ کرنیکے قابل ہوجائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی رائے لکھی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اپنے اور مثنیٰ کے لشکر کو جمع کرکے قادسیہ پر مقام کریں۔

حضرت سعدؓ ان ہدایات پر کاربند ہو کر قادسیہ پہنچ گئے۔ اور یہی موقع اس معرکہ کیلئے زیادہ موزوں اور مناسب بھی تھا۔

(۲) یہ تو مسلمانوں کی حالت تھی کہ اُنھوں نے خبر پاتے ہی مقابلہ کا سامان مکمل کرلیا لیکن مداین پایہ تخت فارس میں کیا ہو رہا تھا ہم اُس کا حال بھی بیان کرنا چاہتے ہیں۔

یزدجرد کی تخت نشینی کے بعد تمام قوت یکجا ہو کر ہر قسم کا سامان مکمل ہوچکا تھا اور وہ بہمہ وجوہ مقابلہ بلکہ عرب کو تباہ و برباد کرنیکے واسطے تیار بیٹھی تھی۔ فوجیں سلسلہ وار چھاونیوں میں مقیم لگاتار امداد کو تیار تھیں کہ اسی درمیان میں دیہات عراق کے باشندوں نے حضرت سعدؓ کے قادسیہ پہنچنے اور مواضع متصلہ پر حملہ کرنیکی خبر بھیج کر فریاد کی

یزدجرد نے رستم کو طلب کر کے کہا کہ میں تجھکو اسلامی لشکر کے مقابلے کیلئے بھیجنا چاہتا ہوں آج فارس بھر میں تجھ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے اگر اول ہی مرتبہ ایک سخت حملہ اور زبردست قوت کیساتھ ان کا قلع قمع کر دیا گیا تو اُن کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور پھر ہم خود اُنکے گھر پر حملہ کر کے اُن کو غلام بنائیں گے۔

رستم نے کہا میری رائے اسکے بالکل خلاف ہے۔ عرب کے دل میں عجم کا رعب اُسی وقت تک ہے جبتک میں اُنکے مقابلہ کیلئے نہ نکلوں۔ اگر اول مرتبہ ہی اُنکے مقابلہ کیلئے میں نکلا تو وہ بالکل جری ہو جائیں گے اور جان توڑ کر مقابلہ کرینگے۔ کیونکہ میرے مقابل ہونیکو فارس کی آخری اور پوری کوشش سمجھیں گے۔ رائے یہ ہے کہ ہم یکے بعد دیگرے بڑے بڑے تجربہ کار افسروں کو بھیجتے رہیں اگر فتح ہوئی تو فبہا۔ ورنہ دوسرے کو بھیجا جائیگا وعلی ہذا۔ اس میں ہمیں کامیابی کی اُمید ہے۔ میرے یہاں مقیم رہنے میں بقاء سلطنت ہے۔ ورنہ اسی وقت سے سلطنت کو زوال سمجھئے۔

یزدجرد نے نہ مانا تو رستم نے پھر باصرار یہی کہا کہ مجھے سلطنت کی تباہی آنکھوں سے نظر نہ آتی تو میں کبھی اپنی عظمت اور بڑائی کا اظہار نہ کرتا میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ مجھے نہ بھیجیں میں یہیں مقیم رہوں اور جالینوس کو مقابلہ کیلئے بھیجدوں۔ فتح ہو تو ہو المراد۔ ورنہ دوسرے کو بھیجا جائیگا۔ اور جبکہ عرب لڑتے لڑتے ضعیف اور سست ہو چکے ہونگے میں اپنی تازہ قوت سے اُن پر ٹوٹ پڑوں گا۔ لیکن جب کسریٰ نے کسی طرح نہ مانا تو مجبوراً مقابلہ کیلئے نکلا اور ساٹھ ہزار کی جمعیت کو لیکر ساباط میں جا کر ڈیرہ ڈالا۔ یہاں پہنچکر بھی مقابلہ سے معاف کئے جانیکا پیام بھیجا۔ مگر منظور نہوا۔

(۳) حضرت سعد کو دو ماہ سے زیادہ قادسیہ میں گذر چکے تھے جب رستم کے ساباط پہنچنے کی خبر ملی تو حضرت عمرؓ کی خدمت میں اطلاع بھیجی۔ وہاں سے جواب آیا۔

لَا یَکْرِبَنَّكَ مَا یَاتِیْكَ عَنْهُمْ وَ اسْتَعِنْ بِاللّٰہِ وَتَوَکَّلْ عَلَیْهِ وَلِعَتْ	(تم اُن کے ساز و سامان سے نہ گھبراؤ۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرو اور اُسی پر بھروسہ رکھو۔

اِلَیہِ رِجَالاً مِّنْ اَھْلِ المُنَاظَرَۃِ وَ الرَّاْیِ وَالْجَلَدِ یَدْعُوْنَہٗ فَاِنَّ اللہَ جَاعِلٌ دُعَاءَھُمْ تَوْھِیْنًا لَّھُمْ۔

یزدجرد کے پاس خیندذی رائے اور بہادر لوگ دعوت اسلام کیلئے بھیجو۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس دعوت سے اُن کے ارادوں میں سستی پیدا ہوگی؛

حضرت سعدؓ نے دو قسم کے لوگوں کا انتخاب کیا ایک وہ جو خاندانی اور مشہور مدبر وذی رائے تھے۔ دوسرے وہ جو ذی رائے ہونیکے ساتھ قوی ہیکل تنومند وجیہ اور صاحب رعب تھے۔ اس قسم کے تیرہ اشخاص کو کسریٰ کے پاس بھیجا۔ اور نعمان بن مقرن کو اس جماعت کا امیر بنایا یہ جماعت ساباط میں گذرتی ہوئی سیدھی مدائن پہنچی۔ رستم کی طرف التفات بھی نکیا۔ یزدجرد کو اطلاع ملی تو اُس نے وزراء اور اُمراء سلطنت کو جمع کرکے اس جماعت دعاۃ کو دربار میں طلب کیا اور دریافت کیا کہ تم لوگوں کو ملک فارس پر چڑھائی کرنے اور ہم سے لڑنے کی کیا وجہ ہے کیا تم کو اس وجہ سے جرأت ہوگئی کہ ہم تمہاری طرف سے غافل تھے۔

نعمان نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحم فرمایا اپنے برگزیدہ رسولؐ کو بھیجا جن کے ذریعہ سے ہم کو ہدایت ہوئی۔ آپنے ہم کو اعمال صالحہ کا حکم دیا اور اعمال بد سے روکا اور اُسکے قبول کرلینے پر دنیا و آخرت کی بھلائی کا وعدہ فرمایا۔ قبائل عرب یکے بعد دیگرے سب اسلام میں داخل ہوگئے۔ آپنے ہم کو حکم دیا کہ عرب سے متصل جو ملک ہیں ہم اُن کو بھی دعوت اسلام پہنچائیں۔ اسلئے ہم تمکو اس بہترین دین کی طرف بُلاتے ہیں جس نے اچھی اور بھلی باتوں کی ترغیب دی۔ اور قبیح باتوں سے نفرت دلائی اگر تم نے اسکو قبول کرلیا تو تم اپنے ملک پر بدستور حکمران وقابض رہو۔ ہم کتاب الٰہی تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے اس کا اتباع لازم ہوگا۔ اگر تم اس کو نہ مانو تو دو سخت باتوں میں سے سہل بات کو یعنی جزیہ دینے کو قبول کرو۔ اگر جزیہ قبول کرلیا تو ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کرینگے۔ ورنہ پھر مقابلہ اور لڑائی کے لیئے تیار ہوجاؤ۔"

یزدجرد نے یہ برجستہ تقریر سُن کے کہا کہ دنیا میں تم اہلِ عرب سے زیادہ کوئی قوم حقیر و ذلیل نہ تھی۔ نہ تمہارا شمار زیادہ تھا۔ اور نہ تمہارے پاس کچھ سامان تھا۔ تم ملک فارس کے مقابلہ کی طمع نہ کرو اگر تم اس دھوکہ میں آئے ہو کہ ہم خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ تو یہ خیال غلط ہے اور اگر تنگدستی سے مجبور ہو کر نکلے ہو تو ہم تمکو کھانے پینے کا سامان دیں گے اور کسی نرم خو حاکم کو تم پر امیر مقرر کر دینگے یہ سُن کر جماعت وعاۃ کو تھوڑی دیر کیلئے سکوت ہوا۔ ان کو بیدھڑک گفتگو کرنے سے شرف اور حیا مانع ہوتی تھی۔ مگر یہ سکوت دیر تک قائم نہ رہا مغیرہ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کسریٰ سے کہا

یہ لوگ عرب کے سردار اور خاندانی شریف اور بزرگ ہیں۔ اور خاندانی شریف وسردار ہمیشہ شریفوں کی عزت اور حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسوجہ سے ابتک پورا پیام جس کے لئے بھیجا گیا تھا ادا نہیں کیا۔ اب میں تمکو کہتا ہوں سُنئے۔ ہماری تنگدستی فقر و فاقہ ذلّت و قلّت کی جو آپ نے بیان کی بالکل درست اور بجا ہے ہم ایسے ہی تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اس ہماری ذلت پر رحم فرما کر ہمارے اندر اپنے محبوب رسول ؐ کو بھیجا۔ مغیرہ نے نعمان کی گفتگو کا سارا خلاصہ بیان کر کے آخر میں کہا کہ اب اسکی سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ یا اسلام لاؤ یا ذلیل ہو کر جزیہ دو ورنہ ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کریگی"۔

یہ بے باکانہ اور دلیرانہ گفتگو اوّل ہی سے امراء دربار پر بجد گراں گذر رہی تھی مگر اس جواب کو سُن کر یزدجرد غصہ میں بھر گیا۔ اور کہا کہ اگر قاصدوں کو قتل کرنا خلاف قانون دنیا نہوتا تو میں تمکو قتل کرا دیتا۔ میرے یہاں سے تم کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اپنے امیر سے کہدینا کہ کل رستم کو بھیجونگا جو امیر کو اور اُسکے ساتھ تم کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دیگا۔ اور پھر وہ تمہارے ملک پر تباہی نازل کریگا۔ اسکے بعد یہ حکم دیا کہ مٹی کی بڑی سی گھڑی بنا کر ان میں سے سب سے زیادہ شریف اور سردار کے سر پر رکھدی جائے۔ یہ سُنتے ہی عاصم بن عمرو نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں میری گردن پر رکھدی جائے۔ وہ اُسکو لیکر نکلے اور فوراً سوار ہو کر حضرت

سعدؓ کو بشارت دی کہ لیجئے اللہ تعالیٰ نے ارض فارس آپ کو عطا فرمائی ہے۔

رستم بھی سباط سے آگیا تھا۔ یزدجرد نے کہا کہ عرب میں اس سے زیادہ سمجھ دار اور حاضر جواب اور شجاع دوسرے لوگ نہوں گے۔ ہم اہل عجم بھی اس سے بہتر جواب دیسکتے تھے بیشک وہ جو گفتگو کرتے تھے صدق و یقین پر مبنی تھی۔ اور بیشک اُن سے فتوح ممالک کا وعدہ کیا گیا جس کو وہ حاصل کر کے رہیں گے۔ مگران میں کا سردار احمق تھا اُس نے مٹی اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی رستم نے کہا وہ سب سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ وہ اس بات کو سمجھا جسے دوسرے نہ سمجھے تھے۔

رستم دربار سے نہایت غم و غصّہ کی حالت میں واپس آیا۔ اُس نے سواروں کو دوڑایا کہ جس طرح ہو عاصم بن عمرو کو گرفتار کرلائیں۔ مگر وہ نکل چکے تھے۔ رستم کو علم نجوم اور کہانت میں دخل تھا اُس نے کہا کہ بے شبہ عرب زمین فارس کو لے گئے۔

(۴) رستم جس وقت مداین سے ساباط کی طرف روانہ ہوا تھا تو اُس کے ساتھ ساٹھ ہزار فوج تھی لیکن ساباط پہنچنے کے بعد جمعیت بڑھنی شروع ہوگئی اور جب ہر طرح سے مایوس ہوکر بجز پیش قدمی چارہ نہ رہا تو ساباط سے قادسیہ کی طرف کوچ کیا۔ اور اُس وقت اُس کی کمان میں ایک لاکھ بیس ہزار نہایت مکمل و آراستہ سپاہ تھی۔ شاگرد پیشہ اور ہر ایک سپاہی اور افسر کے خاص خادم اُن کے علاوہ تھے اسی طرح اگر کل جمعیۃ کو دیکھا جائے تو تین لاکھ سے کم نہوگی۔ اور مسلمان جس سے مقابلہ کیلئے جا رہا تھا اُنکے پاس تمام ملک عرب میں اعلان دینے کے بعد تیس ہزار سے زیادہ نبرد آزما نہ تھے۔

رستم نے اس عظیم الشان لشکر کو اس طرح ترتیب دیا۔ مقدمۃ الجیش میں چالیس ہزار فوج زیر کمان افسر اعلے جالینوس کو مقرر کیا اور ساقہ میں بیس ہزار۔ اور خود ساٹھ ہزار لشکر کے ساتھ تھا جس کو اس طرح ترتیب دیا کہ قلب میں خود۔ اور میمنہ پر ہرمزان اور میسرہ پر بہرام۔

ساباط سے روانہ ہونے کیوقت رستم نے اپنے بھائی بندوان کو لکھا کہ قلعوں کی مرمت و اصلاح کر کے لڑائی کیواسطے مستعد ہو جاؤ۔ میری رائے تو عرب سے مقابلہ کرنے کی نہ تھی مگر بادشاہ نے مجبور کر کے کہا کہ اگر تم نہ جاؤ گے تو میں خود میدان جنگ میں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اہل عرب

ضرور غالب آ کر ہمارے ملک پر مسلط ہو جائیں گے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ جنگ کو لیت و لعل میں ٹالا جائے۔ مگر بادشاہ کے حکم نے مجبور کر دیا۔ ساباط کے پل پر رستم کی جابان سے جو بڑے افسوں میں تھا ملاقات ہو گئی۔ یہ دونوں علم نجوم کے ماہر تھے۔ جابان نے رستم سے کہا کیا جو بات مجھکو نظر آتی ہے تم کو نظر نہیں آتی۔ رستم نے کہا نظر تو آتی ہے مگر میں ایک رسّی کی باگ سے زبردستی کھنچا جاتا ہوں۔ یعنی بادشاہ کے جبر سے لڑائی کیلئے جاتا ہوں۔ ورنہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ ہم پر غالب آئیں گے۔

ساباط سے چلکر پہلی منزل کوثی[1] میں ہوئی۔ یہاں ایک مسلمان عرب رستم کو ملا۔ رستم نے پوچھا کہ تم اس ملک میں کیوں آئے۔ کہا اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ ہم سے تمہارے ملکوں کا کیا ہے اُس کو لینے آئے ہیں۔ یہ تنہا شخص تھا اور قاصد نہ تھا کہ قتل سے مامون ہوتا مگر اُس نے ایسی بیدھڑک اور صاف صاف گفتگو کی کہ آخر رستم نے غصہ میں آکر اُسکو قتل کر دیا۔

کوثی سے چلکر دوسری منزل برس میں ہوئی۔ یہاں پہنچکر رستم کے لشکر نے خوب بدمستیاں کیں شرابیں پی کر عورتوں پر دست درازیاں کیں لوگوں کے مال غصب کئے اور جو نہ کرنا تھا سب کچھ کیا۔ لوگ گھبرا اُٹھے اور رستم کے پاس فریاد لائے۔ رستم نے کہا بیشک اُس عربی نے جس کو ابھی قتل کیا تھا، سچ کہا ہے ہم اپنے اعمال ہی کی بدولت اس حالت کو پہنچے ہیں۔ باوجودیکہ مسلمان ملک فتح کرنے اور لڑنے آئے ہیں۔ مگر وہ ان دیہات والوں کے ساتھ نہایت اچھا معاملہ کرتے ہیں۔ اور تم باوجودیکہ وہ تمہاری رعایا ہیں اس قدر ظلم کرتے ہو۔ بیشک تم اسی قابل ہو کہ تمہارا ملک تم سے سلب کر لیا جائے اور بیشک ایسا ہی ہو گا۔ اس کے بعد مجرموں کے قتل کرنیکا حکم دیا۔

تیسری منزل ہیرہ میں اور چوتھی نجف میں ہوئی۔ یہاں پہنچکر رستم نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے اُترا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے ساتھ ہیں۔ فرشتہ نے اہل فارس کے تمام

[1] کوثی وہی مقام ہے جس کیمتعلق فتح مداین سے پہلے ایک مسلمان نے کہا تھا کہ ہم جبتک کوثی کے شہد کو آفریدین کے سیبوں کے ساتھ نہ کھالیں گے نہ لوٹیں گے۔

ہتھیار لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیئے۔ اور آپ نے حضرت عمرؓ کو عطا فرمائے۔ اس خواب سے رُستم کا رنج اور بھی بڑھ گیا اور وہ خیال جو دل میں راسخ تھا نہایت پختہ ہوگیا۔

(۵) رستم نجف میں تھا اور مقدمۃ الجیش نجف اور سیلحین کے درمیان تھا۔ حضرت سعد نے عمرو بن معدی کرب اور طلیحہ اسدی کو طلیعہ بنا کر دشمن کی خبر لانے کیواسطے بھیجا۔ یہ ابھی ایک فرسخ بھی نہ گئے تھے کہ دشمن کا ہراول اُن کو نظر آگیا۔ عمرو بن معدی کرب تو دیکھ کر واپس ہونے لگے۔ مگر طلیحہ نے کہا میں تو پوری خبر لاؤں گا۔ عمرو نے کہا تیرے اندر غدر کا مادہ رکھا ہوا ہے عکاشہ بن محصن کے قتل کے بعد تجھ سے فلاح کی اُمید نہیں مگر نہ مانا۔ عمرو نے آکر حضرت سعد کو اطلاع دی کہ دشمن بالکل قریب ہے طلیحہ ہراول اور مقدمۃ الجیش کو قطع کرتے ہوئے سیدھے رستم کے لشکر میں پہنچے اور رات بھر خوب جانچا۔ لیکن چپکے سے واپس آنے کو پسند نہ کیا۔ بلکہ ایک افسر کے خیمہ کو کاٹ کر اُس کا قیمتی گھوڑا کھول لیا اور اس طرح دو تین افسروں کے خیمے کاٹ کر گھوڑے کھول کر ساتھ لئے۔ لشکر میں اطلاع ہوئی تو سوار اُن کے پیچھے دوڑے ایک سوار طلیحہ کے قریب پہنچا تو اس کو قتل کر دیا پھر دوسرا پہنچا اُسکو بھی قتل کیا۔ پھر تیسرا پہنچا اُس نے دیکھا کہ میں بھی مقتول ہوتا ہوں تو طلیحہ جب قیدی بنانے کی خواہش کی طلیحہ اس کو لیکر حضرت سعد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کل حال بیان کیا اُس قیدی نے حضرت سعد سے امان حاصل کر کے کہا کہ میں بچپن سے لڑائیوں میں رہا۔ فنون جنگ سیکھے۔ بہادروں کو دیکھا۔ مگر اس جیسا شخص نہیں دیکھا۔ تنہا شخص دو فرسخ قطع کر کے ستر ہزار کی جمعیت میں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ دس دس پندرہ پندرہ خدمت گذار بھی ہیں داخل ہوتا ہے اور پھر فقط جاسوسی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ خیمے گرائے اور گھوڑے لیکر چلا۔

اوّل جو شخص اُس کے پیچھے گیا وہ فارس میں ایک ہزار سواروں کی برابر سمجھا جاتا ہے اُس کو قتل کیا۔ اُس کے بعد دوسرا بھی اُسی درجہ کا تھا۔ اُس کو بھی قتل کیا۔ میں بھی اپنے یہاں ایک ہزار کی برابر سمجھا جاتا ہوں میرے بعد لشکر بھر میں مجھ جیسا کوئی نہیں رہا۔ مگر مجھے موت آنکھوں سے نظر آگئی تب میں نے قید ہونے کو مرنے پر ترجیح دی۔ اس تقریر کے بعد وہ شخص مسلمان ہوگیا

حضرت سعدؓ نے اس کا نام مسلم رکھا۔ یہ شخص بھی انہیں افراد میں سے تھا جنہوں نے قادسیہ میں نمایاں خدمات انجام دیں اور ہر معرکہ میں طلیحہ کے ساتھ رہے۔

(٦) حضرت سعد نے مقدمۃ الجیش کا امیر زہرہ کو مقرر کیا تھا۔ رستم مداین سے قادسیہ تک جو پانچ چھ منزل سے زیادہ مسافت نہ تھی چار ماہ میں پہنچا۔ اُسکی غرض محض لڑائی کو ٹالنا تھا۔ ادھر حضرت عمرؓ کی ہدایت بھی یہی تھی کہ ڈھیل دیجائے۔ اور لڑائی میں عجلت نہ کی جائے۔ اسلئے حضرت سعدؓ نے بھی اپنی طرف سے اقدام نہ کیا۔

رستم جب قادسیہ پہنچگیا تو مقدمۃ الجیش عساکر اسلام کے افسر اعلےٰ زہرہ کو طمع زر اور ملاطفت سے اس بات پر راضی کرنا چاہا کہ جس طرح ہو سکے مسلمانوں کو اس ارادہ سے باز رکھے۔ رستم اور زہرہ میں باہم اس طرح گفتگو ہوئی۔

(رستم) ہمارا اور عرب کا پڑوس ہونیکی وجہ سے دامن چولی کا ساتھ رہا ہے۔ ہم نے ہمیشہ اُن کی جان و مال کی حفاظت کی۔ ہر قسم کی مالی امداد سے اُنکی دستگیری کر کے فقر و فاقہ سے بچایا۔

(زہرہ) بیشک عرب کی یہی حالت تھی اور وہ طمع زر اور گذر اوقات کیلئے تمہارے غلام بنے ہوئے تھے۔ مگر اب حالت بدل گئی۔ اُن کا مقصود صرف پیٹ پالنا اور دولت حاصل کرنا تھا۔ ہمارا مقصود رضاء مولیٰ اور ثواب آخرت ہی۔ کسی قسم کی طمع ہم کو اس ارادہ سے نہیں روک سکتی۔ ہم گمراہ تھے۔ اللہ نے ہم پر رحم فرماکر اپنے رسول کو مبعوث فرمایا۔ اور اُن سے یہ وعدہ فرمایا۔ کہ جماعت کو اُن پر مسلط کریگا۔ جنہوں نے اس دین کو قبول نہیں کیا۔ اور یقین دلایا کہ جبتک یہ لوگ اسلام پر اور اُس کے وعدوں پر پختگی سے اعتقاد رکھیں گے برابر غالب آتے جائیں گے اسلام دین حق ہے۔ جو اس کا متبع ہوگا دائمی اور لازوال عزت کا مستحق ہوگا۔ اور جو اس سے اعراض کریگا۔ برابر ذلیل رہیگا۔

(رستم) اسلام کی حقیقت کیا ہی۔

(زہرہ) عمود اسلام توحید اور رسالت کی شہادت ہی۔

(رستم) اس کے بعد کیا ہے؟

(زہرہ) اُس کے احکام میں سے بڑا حکم یہ ہے کہ صرف خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ غیر اللہ کو عبادت کے کسی شعبہ میں شمہ برابر دخل نہ ہو یعنی عبادت شرک جلی وخفی سے بالکل خالی ہو اور پھر یہ کہ سب مخلوق کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھ کر یکساں معاملہ کیا جائے شریف کو رذیل پر امیر کو غریب پر ترجیح نہ دی جائے۔

(رستم) یہ تو بہت ہی اچھا دین ہے۔ کیا اگر ہم اس کو قبول کرلیں تو تم ہمارا ملک ہمارے حوالے کرکے چلے جاؤ گے۔

(زہرہ) بے شک ایسا ہی ہوگا۔

(رستم) (یہ سب گفتگو سن کر) آپ نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ اہل فارس نے اردشیر کے وقت سے کمتر درجہ کے لوگوں کو ایسا ذلیل وخوار بنا رکھا ہی کہ کوئی شخص اپنے مخصوص پیشے اور کام کے سوا سلطنت کے کسی کام میں حصہ نہیں لے سکتا اور نہ وہ امرا شرفا کیساتھ کسی رتبہ میں شریک ہوسکتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ جب یہ لوگ اپنے پیشوں کو چھوڑ دینگے تو اُنکی عادات بدل جائیں گی اور اُمرا کے مقابل بن کر لڑنے کو تیار ہوجائیں گے۔

(زہرہ) ہم تو لوگوں کے ساتھ ایسا بھلائی اور مساوات کا معاملہ کرنیوالے ہیں جو کسی نے نہیں کیا۔ ہمکو رعایا پیشہ ور۔ اور کمتر درجہ کے لوگوں کے بارہ میں جو حکم ہوا اُس کی اطاعت کرینگے اگر وہ اُمرا کی قدر و منزلت کرتے ہیں احکام خداوندی کی اطاعت نکریں تو ہم کو کیا نقصان ہی۔

رستم کے دل پر زہرہ کی گفتگو کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ اُس نے واپس آکر فوجی افسروں و ذی رائے لوگوں سے مشورہ کیا اور کہا کہ میرے نزدیک تو ہم سب کا مسلمان ہوجانا بہتر ہے لیکن سب نے ناک چڑھائی اور اس بہتر رائے کو قبول کرنے پر آمادہ نہوئے۔

رستم اس سخت انکار پر بھی مایوس نہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو خیال میرے دلمیں راسخ ہے

مسلمانوں کی گفتگو سُن کر اُن کے طور و طریق کو دیکھ کر اُن لوگوں کے دل میں بھی آہستہ آہستہ اثر کر جائے اور انجام کار ہم سب متفق ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش بن جائیں۔ اس بنا پر اُس نے حضرت سعدؓ کی خدمت میں قاصد بھیجا کہ کچھ لوگ گفتگو کرنے کو ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ حضرت سعدؓ نے چند منتخب لوگوں کی ایک جماعت کو بھیجنا چاہا۔ مگر ربعی بن عامر نے عرض کیا کہ گفتگو کے لئے ایک جماعت جائیگی تو اہل فارس سمجھیں گے کہ ہمارے دلوں پر اُنکی جمعیت کا کچھ رعب پڑا ہے یا ہم اُن کو وقعت کی نظر سے دیکھتے اور اُن سے گفتگو کو مہتم بالشان کام سمجھتے ہیں۔ ایک آدمی جانا چاہئے اس پر تنہا ربعی ہی کو جانیکا حکم ہوا۔ قادسیہ کے پل پر پہنچے تو رستم نے اُن کو وہیں روک کر اپنے یہاں عظمت و شان دکھلانیکے سامان شروع کر دیے۔ دور تک زربفت کے فرش بچھائے گئے۔ اعلیٰ درجہ کی وردیوں سے آراستہ فوج دو رویہ کھڑی کی گئی۔ اور خود رستم اپنے مرصع و جواہر نگار تخت پر شان و شوکت کیساتھ بیٹھا۔ اور گرد امرا اور افسرانِ فوج بیش قیمت گدّوں پر تکیہ لگا کر بٹھائے گئے اسکے بالمقابل مسلمانوں کے سفیر (ربعی) کی حالت اور ہیئت بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ گھوڑے پر سوار تھے تلوار ایک پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑے میں لپٹی ہوئی چمڑے کے بدہیئت تسمہ سے کمر میں بندھی ہوئی تھی اونٹ کی عرق گیر کو کرتہ کی طرح پہن کر کمر باندھ رکھی تھی جب بایں ہیئت کذائی مکلف فرش کے کنارے پہنچے تو اُن سے کہا گیا کہ گھوڑے سے اُتر کر پیادہ چلیں۔ مگر نہ مانا۔ بلکہ اُنہیں زربفت کے فرشوں پر سے گھوڑے سمیت گذرتے ہوئے رستم کے قریب پہنچے۔ وہاں اُتر کر نہایت استغنا اور تحقیر سے دو گدّوں کو درمیان سے پھاڑ کر گھوڑے کو باندھ دیا۔ اُن سے کہا گیا کہ ہتھیار کھول کر علیحدہ رکھدو۔ کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا میں خود نہیں آیا تم نے بلایا ہے۔ رستم کو اطلاع ہوئی تو اُس نے کہا اسی حالت میں آنے دو۔

وہاں سے آہستہ آہستہ اور قریب قریب قدم رکھتے اور نیزہ پر سہارا دیتے ہوئے اس طرح چلے کہ اعلیٰ اور بیش قیمت قالینوں میں سوراخ ہو گئے۔ اور دکھلا دیا کہ یہ سب مزخرفات ہماری نظروں میں خاک سے زیادہ ذلیل ہیں۔ رستم کے سامنے پہنچے تو فرش اُٹھا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

اور نیزہ کو فرش پر گاڑ دیا۔ کسی نے کہا تم زمین پر کیوں بیٹھے۔ جواب دیا کہ ہم تمہارے ان مزین فرش پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ رستم نے بذریعہ ترجمان گفتگو شروع کی۔

(رستم) تم اس ملک میں کیسے اور کس غرض کیلئے آئے ہو۔

(ربعی) اللہ ہمکو لایا ہے اور اُس نے ہمکو اس غرض سے بھیجا ہے کہ ہم لوگوں کو تنگی سے نکال کر فراخی میں پہنچائیں اور ادیان باطلہ کے ظالمانہ قوانین کی تنگ و تاریک گھاٹیوں سے نکال کر اسلامی عدل و مساوات کی شاہراہ پر ڈالیں اُس نے اپنا دین دیکر ہم کو بھیجا ہے۔ جو اُس کو قبول کریگا ہم اُسکے ملک کو اُسکے حوالے کرکے چلے جائینگے اور جو انکار کریگا اُس سے مقابلہ کریں گے۔

(رستم) آپکا مطلب ہم نے سمجھ لیا لیکن کیا آپ ہمیں اسقدر مہلت دیسکتے ہیں کہ ہم اس میں غور کریں۔

(ربعی) آپ کو تین دن کی مہلت دی۔ آپ خوب سوچ لیجئے اس درمیان میں ہم لڑائی کی ابتدا نہ کرینگے۔ تمہاری طرف سے ابتدا ہو تو دوسری بات ہے۔ میں اپنی اور تمام عساکر اسلامیہ کی طرف سے اس معاہدہ کا ذمہ دار ہوں۔

(رستم) کیا تم سب کے سردار ہو۔

(ربعی) مسلمان مثل جسم واحد ہیں۔ اُن میں کا ادنیٰ بھی جو کر گذرتا ہے اعلیٰ کو اسکی پابندی لازمی ہے۔ رستم نے اس گفتگو کے بعد جو برسر دربار ہوئی تھی۔ تمام افسروں کو تنہائی میں بُلا کر کہا تم نے کبھی بھی ایسی واضح اور روشن گفتگو سنی ہے۔ اب بھی میرا کہنا مانو۔ سب نے نہایت نخوت سے جواب دیا ہم اس کتے (معاذ اللہ) کے دین کی طرف کبھی راغب نہ ہونگے۔ اسکے کپڑے نہیں دیکھے کیسے سڑے ہوئے اور بوسیدہ ہیں جن کو دیکھ کر بھی نفرت ہوتی ہے۔

رستم نے کہا تمہاری عقلوں پر افسوس ہے اُسکے کپڑوں کو دیکھتے ہو۔ ذاتی اخلاق۔ جرأت و متانت اور گفتگو اور رائے کو نہیں دیکھتے۔ عرب اپنے برگزیدہ اوصاف کی حفاظت کرتے ہیں تمہاری طرح کپڑوں کی زیب و زینت کے درپے نہیں ہوتے۔

اس گفتگو کے بعد ربعی وہاں سے رخصت ہو گئے۔

کوتاہ بین اور حقیقت ناشناس ہمیشہ ظاہری طمطراق کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اخلاق کی پاکیزگی اور نفوس کی تقدیس و تطہیر اصل چیز ہے۔ ظاہر بین لباس کی زینت سے جلالت قدر اور رفعت شان کا اندازہ کرتے ہیں اور حقیقت الامر اس کے بالکل خلاف ہے۔

حضرت امام شافعی کا سُرّمَن رائے[1] میں ایک حجام کی دوکان پر گذر ہوا آپ نے اس سے اصلاح بنانے کو فرمایا۔ حجام امراء۔ وزراء کی اصلاحیں بناکر معقول اُجرت لینے کا خوگر تھا امام صاحب کی معمولی اور بوسیدہ اور میلے کپڑوں سے متنفر بھی ہوا اور یہ سمجھا کہ یہ تو خود سائل معلوم ہوتے ہیں مجھے کیا دینگے۔ اُس نے اصلاح بنانے سے انکار کردیا۔ امام شافعی صاحب انکار کی وجہ سمجھ گئے۔ اپنے غلام کو جو ساتھ تھا ارشاد فرمایا کہ تیرے پاس کیا ہے۔ اُس نے کہا۔ دس دینار۔ فرمایا اس حجام کو دیدو اور وہاں سے یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔

عَلَیَّ ثِیَابٌ لَوْ یُبَاعُ جَمِیْعُھَا	بِفَلْسٍ لَکَانَ الْفَلْسُ مِنْھُنَّ اَکْثَرَا
میرے بدن پر ایسے کپڑے ہیں کہ اگر ان کو فروخت کیا جائے	تو ایک فلوس کی برابر بھی قیمت نہ ملے۔
وَفِیْھِنَّ نَفْسٌ لَوْ یُقَاسُ بِمِثْلِھَا	جَمِیْعُ الْوَرٰی کَانَتْ اَجَلَّ وَاَخْطَرَا
لیکن اُنکے اندر ایسا نفس ہے کہ اگر تمام مخلوق کا اُس جیسے سے	موازنہ کیا جائے تو اُسی کا مرتبہ بڑھا رہے گا۔
وَمَا ضَرَّ نَصْلَ السَّیْفِ اِخْلَاقُ غِمْدِہٖ	اِذَا کَانَ عَضْبًا حَیْثُ وَجَّھْتَہٗ فَرٰی
تلوار کی دھار کیلئے میان کا بوسیدہ ہونا کیا مضر ہے	اگر وہ ایسی تیز ہو کہ ہر چیز کے درمیان سے نکل جائے جس کی طرف اشارہ کی جائے

ظاہر ہے کہ امام شافعیؒ مجتہد مطلق اور اپنے وقت کے فرد فرید امام ہیں خلیفہ وقت بھی اُنکی تعظیم کرتا تھا۔ مگر حجام نے کپڑوں کو دیکھ کر نفرت کا اظہار کیا۔ اور اُنکے پاک اخلاق و اوصاف کا اُس کو اندازہ نہوا۔ امام جلیل الشان نے اس موقع پر جو کچھ فرمایا وہ خود سرائی میں داخل نہ تھا بلکہ اس عام غلط فہمی کو رفع کرنے کی غرض سے اس قدر فرمانے پر مجبور ہوئے اور جب کوئی دینی و شرعی ضرورت آپڑی تو ایسے اظہار کی اجازت ہے۔

[1] بغداد کے متصل ایک شہر کا نام ہے جس کو معتصم باللہ نے آباد کیا اور دارالخلافہ بنایا تھا ۱۲۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس ضرورت کیوقت فرعون سے فرمایا تھا۔

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (مجھ کو زمین کے خزانوں کا منتظم و نگران مقرر کردے میں خوب محافظت کرنیوالا اور جاننے والا ہوں)

دس دینار عطا فرمانے کو بھی کوئی شخص اسراف پر محمول نہ کرے آپکو ان عام خیالات کی اصلاح کے ساتھ یہ بھی دکھلانا تھا کہ اہل اللہ اور متوکلین علی اللہ کے نزدیک اشرفی اور روپیہ سب بے حقیقت ہیں۔

ایک دفعہ بعض ظاہر پرستوں نے حضرت جنید سے صوفیہ پر طعن کرتے ہوئے سوال کیا۔

مَا بَالُهُمْ وَسِخَةٌ ثِيَابُهُمْ (اُن کے کپڑے میلے کچیلے کیوں رہتے ہیں)

جواب میں ارشاد فرمایا لکنھا طاھرۃ (لیکن وہ پاک ہوتے ہیں)

اس کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ کپڑوں کا میلا رکھنا محمود امر ہے یا صوفیہ کا مسلک یہ ہے کہ کپڑے میلے پہنا کریں۔ بلکہ حاصل جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کو طہارت ثوب کا اہتمام ہوتا ہے نفاست و صفائی بہت عمدہ چیز ہے۔ مگر اس جماعت کو جو دنیا سے منقطع اور بالکلیہ آخرت کی طرف راغب ہوتے ہیں اپنی مشغولی سے اس قدر فرصت نہیں ملتی کہ لباس کی نفاست کی طرف توجہ کریں۔ اور چونکہ طہارت شرط عبادت ہے اس لئے اُس سے غفلت نہیں کرتے۔ اس کو بجنسہ ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا حدیث شریف میں وارد ہے۔

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ اَوْ کَمَا قَالَ (بہت سے پراگندہ بال غبار آلودہ دروازوں پر سے ہٹا دیے گئے۔ ایسے مقبول ہوتے ہیں کہ اگر اللہ کے اوپر کسی بات کی قسم کھا بیٹھیں تو اُن کی قسم پوری کر دی جائے)

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ غبار آلودہ اور پراگندہ بال دروازوں پر سے دھکے دیکر ہٹا دیا جانا ایسی پسندیدہ باتیں ہیں کہ اُن کو اختیار کیا کرو۔

الغرض ظاہر بین لباس کو دیکھتے ہیں۔ اور حقیقت شناس اخلاق اور اوصاف کو۔ رستم اپنی قوم کو سمجھاتا رہا۔ مگر بد قسمتی سد راہ ہوگئی نہ سمجھے اور ہرگز نہ سمجھے۔

مگر رستم نے اب بھی ہمت نہ ہاری اور اپنی کوشش سے باز نہ آیا۔ اگلے روز پھر حضرت سعدؓ کی خدمت میں پیام بھیجا کہ ربعی کو ایک دفعہ اور بھیج دیجئے۔ حضرت سعدؓ نے بجائے ربعی کے حذیفہ بن محصن کو بھیجا۔ یہ حضرت بھی اُسی شان اور اُسی ہیئت و لباس میں اُسی انداز سے تشریف لائے لیکن فرق اتنا تھا کہ ربعی تو گھوڑے سے اتر کر بیٹھ گئے تھے اور یہ نیچے بھی نہ اُترے رستم نے چاہا کہ گھوڑے سے اُتریں مگر انکار کر دیا اور اُسی طرح سواری کی حالت میں رستم سے گفتگو شروع ہوئی

رُستم ہم نے تو ربعی کو بلایا تھا تم کیوں آئے۔

حذیفہ۔ ہمارے امیر اسلام کے قانون مساوات پر پورا عمل کرتے ہیں وہ ہمکو نرمی اور سختی رنج و راحت میں مساوی رکھتے ہیں۔ کل ربعی کی نوبت تھی اور آج میری ہے۔

رُستم۔ پھر تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو۔

اس سوال کا جو جواب ربعی نے دیا تھا وہی بجنسہ حذیفہ نے دیا اور اُس کے بعد رستم نے وہی سوال کئے جو ربعی سے کئے تھے حذیفہ نے وہی جواب دیئے جو ربعی نے دیے تھے۔

رُستم۔ ہم کو عذر کرنے کیواسطے کتنی مدت کی مہلت دیتے ہو۔

حذیفہ تین دن کی جن میں سے ایک دن گذر چکا ہے یعنی ربعی جو مدت مقرر کر گئے ہیں۔ اُسی وقت سے حساب لگایا جائیگا۔ میں اُن سے علیحدہ کوئی مدت مقرر نہیں کر سکتا۔

اس گفتگو کے بعد رستم نے اپنی قوم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ افسوس جس بات کو میں سمجھے ہوئے ہوں تم نہیں سمجھتے۔ کل ایک شخص آیا اور اُس نے ہمارے زرق برق سازو سامان کو نہایت حقارت سے دیکھا اور اپنے گھوڑے کو ہمارے مکلّف فرشوں پر کھڑا کر دیا۔ آج یہ دوسرا آیا۔ اُس نے گھوڑے سے اُترنا بھی گوارا نہ کیا۔ اور جو گفتگو کی اُس کو تم نے سُن لیا۔ مگر وہ نہ سمجھے اور حذیفہ واپس چلے گئے۔

لیکن رستم نے ایک دفعہ اور آخری کوشش کر کے اپنی بدبخت قوم کو سمجھانا چاہا اور حضرت سعدؓ سے کہلا بھیجا کہ کسی اور کو گفتگو کیواسطے بھیج دیجئے۔

اس دفعہ مغیرہ بن شعبہ بھیجے گئے آج بھی حسب دستور دور تک زر بفت کے فرش بچھائے گئے۔ افسروں کے سروں پر تاج اور اعلےٰ قسم کے لباس تھے رستم خود نہایت شان سے تخت پر جلوہ گر تھا۔

مغیرہ انہیں فرشوں پر گھوڑے سمیت گذر کر فوراً رستم کی برابر تخت پر بیٹھ گئے۔

اہل فارس نے ربعی اور حذیفہ کے بے باکانہ معاملات پر تو صبر کیا۔ مگر آج نہ رہا گیا مغیرہ کو کھینچ کر تخت سے نیچے گرا دیا۔

مغیرہ نے فرمایا میں تو سنتا تھا کہ اہل فارس ذی عقل حلیم۔ بردبار۔ با وقار ہیں لیکن تم سے زیادہ تو کوئی قوم بھی سفیہ و نادان نہ ہو گی۔ ہم اہل عرب آپس میں ایک دوسرے کو غلام نہیں بناتے سب مساوی درجہ پر رہتے ہیں۔ میرا گمان تھا کہ تم بھی ہماری طرح مساوات کا معاملہ کرتے ہو گے۔ مجھ کو تخت سے اُتار کر نیچے گرانے سے بہتر یہ ہوتا کہ تم مجھے اپنے یہاں کے برتاؤ سے اور کم درجہ والوں کو غلام و ذلیل سمجھنے کے قانون سے مطلع کر دیتے میں خود ہی تخت پر نہ بیٹھتا میں خود نہیں آیا۔ بلکہ تمنے بلایا تھا اس لئے میرے ساتھ یہ معاملہ کرنا مناسب نہ تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تم ضرور مغلوب ہو گے۔ کیونکہ کوئی سلطنت ایسے افعال و اخلاق کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

کم رتبہ لوگوں نے مغیرہ کی یہ تقریر سُنی تو ضبط نہ کر سکے۔ اور بول اُٹھے کہ بیشک یہ عربی سچ کہتا ہے۔ سرداروں اور امیروں نے آپس میں کہا کہ اس عربی نے ایسی گفتگو کی ہے کہ اسکے بعد ہمارے غلام کبھی اطاعت نہ کرینگے۔ اللہ ہمارے اسلاف کا ستیاناس کرے جنہوں نے اس امتِ عرب کو حقیر اور ناقابل التفات سمجھا۔ اس کے بعد رستم اور مغیرہ میں گفتگو شروع ہوئی۔

رستم نے اپنی قوم کی عظمت و شان ظاہر کر کے کہا کہ عرب سے زیادہ کوئی قوم ذلیل نہ تھی۔ ہمنے تمکو کبھی کسی شمار میں نہیں سمجھا۔ جب تمہارے یہاں خشک سالی ہوتی تھی تو تم خیرات مانگنے ہمارے یہاں آتے تھے اور ہم تمکو کچھ دیدیتے تھے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اب بھی تم اسی وجہ سے آئے ہو میں تمہارے امیر کیواسطے ایک خلعت اور خچر اور ہزار درہم کا حکم دیتا ہوں اور تم میں سے ہر ایک کے

واسطے ایک بوجھ کھجوروں کا تم یہ لیکر چلے جاؤ میں نہیں چاہتا کہ تم کو قتل کر دوں۔

مغیرہ۔ بعد حمد و صلوٰۃ۔ تم نے اپنی نسبت جو کچھ بیان کیا نہایت صحیح ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں۔ اور ہماری بھی کیفیت تھی جو تم نے بیان کی۔ لیکن دنیا کی دولت قائم رہنے والی نہیں وہ بدلتی رہتی ہے۔ اہل فقر کو ثروت کی توقع لگی رہتی ہے اور ثروت والے فقر و فاقہ کی مصیبت سے خائف رہتے ہیں۔ تم اگر شکر کرتے تمہاری دولت قائم رہتی۔ ہم پر اللہ نے رحم فرمایا۔ ہمارے اندر اپنے رسول کو بھیجا۔ ہم نے اُن کا اتباع کیا۔ ہماری وہ حالت بدل گئی۔ اور پھر وہی گفتگو کرکے جو ربعی اور حذیفہ نے کی تھی کہا کہ تین باتوں کے سوا چارہ نہیں اسلام یا جزیہ یا مقاتلہ تنا اور اضافہ کر دیا کہ اب تو ہم نے اور ہمارے اہل و عیال نے سرزمین فارس کے عمدہ کھانے اور میوے کھائے۔ جن کو ہم چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

رستم۔ تم سب قتل کر دیے جاؤ گے اور یہاں رہنا نصیب نہ ہوگا۔

مغیرہ۔ ہم میں سے جو قتل ہوگا جنت میں جائیگا۔ اور تمہارے مقتولین نار میں۔ اور پھر جو مسلمان زندہ بچیں گے وہ تمہارے اوپر غالب آئیں گے۔

رستم۔ قہر زدہ غصہ اور غضب میں کہنے لگا کہ کل دن چڑھنے نہ پائیگا کہ ہم تم سب کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس گفتگو کے بعد مغیرہ تو واپس ہو گئے۔ لیکن رستم کے دلمیں اسلام کا اثر جا گزین تھا۔ غصہ بھی تھا تو محض عارضی اور دکھلاوے کا۔ اُس نے سرداران فارس کو تنہائی میں بلا کر کہا کہ تم کو ان لوگوں سے کیا نسبت ہے۔ یہ اپنے دعوے میں سچے ہوں یا جھوٹے۔ مگر مرد اور بہادر۔ گویا اور حاضر جواب بھی ہیں۔ جب انکی عقل و فہم حفظ راز اور معاملہ فہمی اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ جس سے گفتگو کی جاتی ہے علیحدہ علیحدہ یا اکٹھے۔ انمیں کسی ایک بات اور ایک رائے میں بھی اختلاف نہیں ہوتا۔ تو سمجھ لو کہ وہ اپنے مدعا میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لو کہ یہ لوگ اپنے دعوے میں صادق ہیں۔ تب تو دنیا کی کوئی قوت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر بد قسمت امراء فارس اس معقول و مدلل بات کو سُن کر بھی اپنی ہیجاہٹ پر قایم رہے

اور اپنی شجاعت و دلیری دکھلاکر مقابلہ کیلئے آمادگی ظاہر کی۔

رستم کو علم نجوم یا کہانت کے ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ کل کو میدان جنگ میں مغیرہ کی آنکھ پھوٹ جائیگی۔ اُس نے ایک شخص کو مغیرہ کے پیچھے دوڑایا اور کہدیا کہ جب وہ پل سے پار ہو جائیں تو میری پیشین گوئی سُنا دینا۔ رستم کی غرض یہ تھی کہ مغیرہ اس پیشین گوئی سے متاثر ہونگے اور شاید اُن کو حقانیت اسلام میں کچھ تردد ہو جائے۔ رستم اور اہلِ فارس کو جو محض باطل پرست سمجھ رہے ہیں اُس میں کچھ تذبذب ہو جائے۔ مگر استغفر اللہ۔ صحابہ ایسے خام خیال اور کچے نہ تھے کہ وہ کسی نجومی۔ کاہن یا جوگی کی پیشین گوئی پر ڈھیلے ہو جاتے۔ وہ اسلام کے درجات شریعت و طریقت معرفت و حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھے۔ رمل و نجوم کے حسابات۔ کہانۃ۔ القاء شیطانی اور مرتاض جوگیوں کے کشف کی اصلیت کو خوب جانتے تھے۔

رستم کا یہ پیام سُنتے ہی خوش ہوکر کہنے لگے کہ " تو نے مجھے بڑی بشارت دی اگر مجھ کو تمہارے اور بھائیوں سے جہاد کرنیکے واسطے بینائی کی ضرورت نہوتی تو میں تمنا کرتا کہ دوسری آنکھ بھی کل ہی پھوٹ جائے۔

قاصد نے مغیرہ کی یہ گفتگو رستم کو سُنائی تو اُس نے امراء اور سرداروں سے کہا کہ اب میرا کہنا مان لو۔ ان سب مراحل کے بعد حضرت سعد نے بطور اتمام حجت تین نہایت فہمیدہ اور سنجیدہ حضرات کو رستم کے پاس بھیجا ان لوگوں نے اُس سے کہا کہ ہم تم کو ایسی بات کی طرف بُلاتے ہیں جس میں سراسر بھلائی اور سلامتی ہے۔ دین حق کو قبول کرلو ہم یہیں سے واپس ہو جائیں گے۔ تمہارا ملک تمہارے پاس رہیگا۔ کوئی تم پر حملہ کریگا تو ہم تمہارے مددگار ہونگے۔ خدا سے ڈرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ قوم فارس کا تمام ہونا تمہارے ہی ہاتھوں پر لکھا ہوا ہو۔ تم اگر اس دین میں داخل ہو گئے اور وساوس شیطانی کو دفع کردیا تو ابھی ذراسی دیر میں قابل غبطہ بن جاؤ گے یعنی اسلام کی لازوال دولت کیساتھ اپنی اس امارت و ریاست پر قائم رہکر۔ دنیا و آخرت کی سرداری اور عزت تم کو ملجائیگی اور اس حالت کو دیکھ کر لوگ تم پر غبطہ و رشک کرنے لگیں گے۔ ایک کلمہ زبان سے کہہ لینے میں بادشاہت حاصل ہوتی ہے۔

رستم نے کہا ان باتوں سے کیا حاصل۔ ہماری تمہاری مثال ایسی ہے کہ کسی باغ میں ایک لومڑی گھس آئی تھی مالک باغ نے کہا ایک لومڑی کیا کر سکتی ہے۔ لومڑی نے مالک کا استغنا دیکھ کر اور لومڑیوں کو بلا لیا۔ مالک نے جب یہ دیکھا تو راستہ بند کر کے سب کو قتل کر دیا۔ یا تمہاری مثال ایسی ہے کہ مکھی نے شہد کو دیکھ کر کہا کہ جو مجھ کو شہد میں پہنچا دے اسکو دو درہم دونگی لیکن جب پہنچگئی تو اب کہتی ہے جو نکالدے اسکو چار درہم دونگی۔ تمنے ہماری بے پرواہی سے دھوکہ کھایا۔ اور اس طمع میں آگئے لیکن اب یہاں سے سالم نہیں جا سکتے۔ فاقہ اور تنگدستی تم کو لائی ہے۔ اگر تم آدمیونکی طرح جانا چاہتے ہو تو ہم تمکو کھانے پینے کیواسطے کچھ دیدیں گے۔

سفرا اسلام نے کہا کہ ہمارا جو کچھ حال تم نے بیان کیا ٹھیک ہے۔ ہم ایسے ہی ذلیل و حقیر محتاج و تنگدست تھے لیکن اللہ نے فضل فرمایا۔ کفر سے نکال کر دولت اسلام عطا فرمائی ذلت کے بعد عزت نصیب کی۔ اختلاف اور جتھے بندی کی جگہ ہم میں اتفاق و یکجہتی عطا فرما کر مخالفین اسلام سے مقابلہ کا حکم دیا۔ جو مثالیں تم نے بیان کیں یہ درست نہیں۔ بلکہ ہماری تمہاری مثال ایسی ہے کہ کسی شخص نے نہایت اعلیٰ قسم کا باغ لگایا جس میں نہریں جاری کیں۔ اور عالیشان محلات بنائے۔ اسمیں نوکر چاکر رکھے۔ جو درختوں کی آبیاری اور پھلوں کی محافظت کریں۔ باغ کی سرسبزی اور شادابی کی ہر وقت فکر رکھیں۔ یہ ملازم پر تکلف محلات میں رہکر باغ کی خدمات سے غافل اور بدمستیوں میں مشغول ہو گئے۔

مالک باغ نے سمجھایا اور ڈھیل دی مگر نہ سمجھے تو بجائے اُنکے ایسے لوگوں کو مامور کیا جو مالک کی مرضی کے موافق خدمت بجالائیں۔ پہلے ملازموں کو نکال کر باہر کریں یا اپنا غلام بنا کر رکھیں خدا تعالیٰ نے تمکو جس غرض کیواسطے دنیا کی حکومت و سلطنت۔ ریاست و وجاہت عطا فرمائی تھی تم اُس سے غافل بلکہ منکر ہو گئے۔ نیابت الٰہی کے طریقے چھوڑ بیٹھے۔ مالک کو مالک بھی نہ سمجھا بلکہ بجائے توحید کے آتش پرستی وغیرہ میں مبتلا ہو گئے۔ اور جو ہدایات تمکو دیگئی تھیں اُن میں سے کسی ایک پر بھی عمل نکیا۔ تو اب اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھیجا ہے اور یہ خدمت ہمارے سپرد کی ہے۔

رستم پر اس واضح اور کھلی ہوئی گفتگو کا کچھ اثر نہوا۔ بلکہ یہ کہا کہ کل لڑائی ہوگی۔ دریا کو عبور کر کے تم ہماری طرف آؤ گے۔ یا ہم آئیں سفرا نے کہا تم عبور کر کے آؤ۔

فریقین جنگ کی تیاری میں مشغول ہو گئے لیکن شب ہی کو رستم نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے اُترا اُس نے لشکر فارس کی سب کمانیں لیکر اُن پر مُہر لگا دی۔ اور آسمان پر لے گیا رستم اس خواب کو دیکھ کر سخت مغموم ہوا۔

صبح ہی اپنے خواص اور مصاحبین کو بُلا کر کہا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو بار بار متنبہ کرتا اور سمجھاتا ہے مگر ہم نہیں سمجھتے۔ اسکے بعد رستم نے دو زرہیں پہنیں اور خود پہنا۔ تمام ہتھیار لگائے اور اُچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور کہا۔ غداً ندقھم (کل ہم اُنکو یعنی مسلمانوں کو پیس ڈالیں گے۔

ایک مصاحب نے کہا انشاء اللہ۔ رستم نے کہا وہ نہ چاہیگا تب بھی ہم پیس ڈالیں گے۔

رستم کے اس فقرہ پر تعجب ہوتا ہے۔ اُسکو تو اسلام کے حق ہونے اور مسلمانوں کے غالب ہو جانیکا یقین تھا۔ اُسکی زبان سے ایسا فقرہ کیونکر نکلا۔ مورخین اسکی تاویل کرتے ہیں کہ دل میں تو اُس کے وہی مضمون تھا اور وہ اپنے خواص و مصاحبین سے بار بار ظاہر بھی کر چکا تھا۔ مگر اہل فارس کی ہمت بڑھانیکے لئے اور لڑائی کیواسطے مستعد و آمادہ کرنے کیلئے شجاعت کا اظہار کیا۔

مگر میرا خیال اس کے بالکل خلاف ہے۔ رستم کا خیال واقعی وہی تھا۔ کہ اسلام حق۔ مسلمانوں سے مقابلہ بے سود۔ وہ ضرور غالب آئیں گے۔ مگر بدبختی اُسپر سوار تھی۔ آدمی کو ایک بات کا علم ہوتا ہے۔ مگر غصہ کیحالت میں اُسکا علم بدلجاتا ہے۔ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اُسکے خلاف اپنے اختیار و رضا سے کرتا ہے رستم کے یہ الفاظ کسی مصلحت پر مبنی نہ تھے۔ بلکہ جوش مردانگی۔ نخوت و غرور۔ قوت و کثرت جمعیت کی بنا پر زبان سے نکلے تھے۔ اور انہی باتوں سے ہمکو تقدیر کا قائل ہونا اور افعال عباد کو مخلوق باری ماننا پڑتا ہے۔ آدمی اپنے اختیار سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس علم و ارادہ جب ہی تک کام دیتے ہیں جبتک کہ ارادہ خداوندی کے موافق ہوں۔ تدبیر بھی اُسی وقت کام دیتی ہے جب تقدیر الٰہی اُسکی موافقت کرے۔ ورنہ کوئی شخص اپنے ارادہ و اختیار سے ذرہ بھر بھی حرکت نہیں کر سکتا

جس کو وہ اپنا اختیار سمجھتا ہے حقیقت میں اضطرار ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی عجیب و وسیع قدرت سے بے اختیاری کو اختیار کی صورت میں ظاہر فرما دیا ہے۔

الغرض رستم نے لڑائی کو ٹلانے اور اپنی قوم کو مسلمانوں کی مخالفت سے باز رکھنے اور اُنکو ہر صورت سے سمجھا کر اسلام قبول کرنے یا مصالحت کر لینے کی کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ادھر امیر عسکر اسلام نے بھی بحکم عام قوانین اسلام و ہدایات خاص امیر المؤمنین بار بار قاصد بھیجکر دعوت اسلام دینے اور راہ حق کو واضح کرنے اور اہل فارس کو ہر طرح اطمینان دلانے اُنکی جان و مال و عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ اُٹھانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ مگر تقدیر آلٰہی غالب رہی۔ فریقین کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور دنیا کے مشہور ترین معرکہ قادسیہ کا آغاز ہو گیا۔

قادسیہ کا ایسا سخت معرکہ ہوا کہ اُسکے بعد اہلِ فارس سے ایسی کوئی سخت لڑائی نہیں ہوئی۔ پایہ تخت مداین پر تو کچھ مقابلہ ہی نہیں ہوا کیونکہ ساٹھ ہزار جمعیت کو بےخوف و خطر دجلہ عبور کرتے دیکھ کر عجمیوں کے اوسان باختہ ہو گئے تھے اور اُن کو سوائے فرار راستہ نظر نہ آتا تھا۔ البتہ نہاوند کا معرکہ جس کو اہلِ فارس کی آخری کوشش کہنی چاہیئے بہت سخت تھا مگر ساز و سامان اور بعض خاص وجوہ سے وہ بھی قادسیہ سے دوسرے ہی درجہ پر تھا۔ یزدجرد دارالسلطنت میں تخت شاہی پر جلوہ افروز تھا۔ افواج تازہ دم میدان جنگ میں پہنچکر داد شجاعت دینے کیلئے مضطرب و بیقرار تھیں۔

رستم و ہرمزان۔ جالینوس و فیرزان جیسے جنرل موجود تھے انتظام ہر قسم کا مکمل و آراستہ تھا پایۂ تخت سے میدان جنگ تک کا ایسا مکمل انتظام کیا گیا تھا کہ تار برقی کے بعد اگر کوئی ذریعہ جلد خبر رسانی کا ہو سکتا ہے تو وہی ہے سپاہیوں کو اتنا قریب قریب کھڑا کیا گیا تھا کہ ایک دوسرے کی گفتگو اور آواز کو بے تکلف سُن لے اس طرح میدان جنگ سے پایہ تخت تک اُن کی آن میں جزوی و کلی امور کی اطلاع پہنچتی تھی اور اسی طرح پایہ تخت سے ہدایات و احکام کا سلسلہ جاری تھا۔

رستم نے مسلمانوں کو بیس ڈالنے کیواسطے ممکن سے ممکن ذرائع سے کام لیا۔ اپنی فوج کو مکمل ترتیب دیکر قلب میں تخت پر متمکن ہوا اور گرد و پیش اٹھارہ زرہ پوش ہاتھیوں کو ترتیب سے کھڑا کیا۔ جنگی

محفوظ و مضبوط عماریوں میں اوّل درجہ کے بہادر سوار تھے۔ اسکے بالمقابل عرب کے پاس تو سامان کہاں تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار نبرد آزما کے مقابلہ کیلئے بتیس ہزار فوج تھی۔ عربی گھوڑے ہاتھیوں کی صورت سے متوحش ہو کر بھاگتے تھے۔ مگر انجام کار یہ معرکہ مسلمانوں کی نمایاں کامیابی اور رستم کے قتل پر ختم ہوا۔ واقعات جنگ ہمارے موضوع میں داخل نہیں ہیں اسلیئے اُنکے ذکر کی حاجت نہیں

اب ہم ان واقعات سے اُن نتائج کو دکھلانا چاہتے ہیں جن سے ہمارے اصل دعوی کا ثبوت ہوتا اور اُس کے ہر ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ نتائج حسب ذیل ہیں

نتیجہ اوّل

اسلام نے جس سلطنت اور خلافت کی بنا قائم کی اسمیں مشورہ کی یہ قدر قیمت تھی کہ خلیفۃ المسلمین کسی رائے قائم کرنیکے واسطے مسلمانوں کے عام و خاص افراد سے مشورہ طلب کرتے ہیں مشورہ دینے میں بھی ہر شخص آزاد ہی ہر شخص باطمینان کھڑا ہو کر بیدھڑک رائے ظاہر کرنیکا مختار ہی خلیفہ کبھی کثرت رائے پر ایک جانب کو ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ اوّل مرتبہ حضرت عمرؓ نے خود میدانِ جنگ میں تشریف لیجانے کا فیصلہ کثرت رائے پر کر دیا اور کبھی قوت دلیل پر جیسا کہ اسی معاملہ میں حضرت علیؓ اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی رائے کو تسلیم کر کے عمل پیرا ہوئے اور کثرت رائے کو جس میں حضرت عثمانؓ کی رائے بھی شریک تھی "جو گویا بمنزلہ ولیعہد خلافت سمجھے جاتے تھے" ترک کر دیا۔ علاوہ خاص اس واقعہ کے حضرت عمرؓ کا عام قاعدہ یہی تھا کہ جب کوئی امر پیش آتا تھا اُس میں اسی طرح آزادی کے ساتھ مشورہ فرماتے تھے۔ خلافت راشدہ کے اس طرز عمل سے ہمکو چند فائدے حاصل ہوئے۔

(الف) سلطنت کے اس طرز کی بنیاد اسلام نے ڈالی۔ آجکل کی متمدن او پارلیمنٹی سلطنتیں بھی اس سے زیادہ بہتر اور آزاد طریقہ قائم نہیں کر سکیں۔

(ب) کسی جانب کثرت رائے کا ہونا صواب و مطابقت واقعہ کی ضمانت نہیں کر سکتا اور نہ یہ ضرور ہوتا ہی کہ اُسپر عمل کیا جائے۔ اصل مدار قوت دلیل پر ہی ممکن ہی کہ قلیل التعداد لوگ

کی دلیل قوی ہو اور اُسی جانب حق بھی ہو اور اُسی میں بہتری اور کامیابی بھی مضمر ہو۔

شوریٰ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ موافق و مخالف رایوں کے سب پہلو واضح اور ظاہر ہو جائیں اُن میں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دینا خلیفہ کی قوت ممیزہ کا کام ہے۔ مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ کی طرح عقل و دانائی۔ فراست و تجربہ کامل ہو اور کسی قسم کی آلائش دنیا و غرض ساتھ لگی ہوئی نہ ہو۔ خاص و عام کو اُن کے انتخاب و ترجیح پر اطمینان ہو چنانچہ صحابہ کے طرز عمل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ باوجود کثرت رائے جب حضرت عمرؓ نے اس رائے کو ترک فرمایا تو کسی نے اُس سے انکار نہیں کیا۔ کیونکہ آپکی عقل و تدبیر تجربہ اور خیر خواہی اسلام اور سب سے بڑھ کر آپکی فراست و شان محدثیت پر سب کو کامل اطمینان تھا۔

البتہ اگر خلیفۂ وقت یا صدر مجلس اس درجہ کا نہ ہو اور مسلمان کسی ایک رائے پر متفق نہ ہو سکیں تو اختلاف و نزاع کو رفع کرنے کا بہترین طریقہ کثرت رائے ہے۔ اس زمانہ میں بھی اگر صدر مجلس حضرات صحابہ کا سچا جانشین ہو اپنے اندر عقل و تدبیر۔ تجربہ و دانشمندی ہمدردی و اخلاص لئے ہوئے نور یقین و فراست آسمانی سے مزین ہو اور باوجود اختلاف رائے کے مسلمان اُسکی بات پر اعتماد و اطمینان کر سکتے ہیں۔ یا کسی معاملہ میں قلت رائے کی تائید قرآن و حدیث کی کسی صحیح و صریح فیصلہ سے ہوتی ہے تو کثرت رائے قابل اعتماد نہیں ہے۔ ورنہ درصورت اختلاف و نزاع کثرت رائے سے ایک جانب کو ترجیح دیجا سکتی ہے۔

مشورہ دینے اور رائے ظاہر کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے جو صحابہ کا تھا ہر شخص آزادی سے اپنی رائے دیتا تھا۔ لیکن کسی کو اپنی رائے پر اصرار نہ تھا۔ اُسکی رائے کیخلاف جو فیصلہ ہوتا تھا۔ اُس پر ایسی ہی خوشی سے عمل کرتا تھا جیسا اُس وقت عمل کرتا جبکہ اُسکی رائے پر فیصلہ ہوتا۔

نتیجۂ دوم

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ہدایتیں حضرت سعد کو فرمائیں اُنکو دیکھنے سے ہمکو بہت سے اہم اور ضروری فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

(الف) صحابہ باوجود ان تمام کمالات و اوصاف حسنہ اور مقبولیت کے اپنی کسی عمل صالح پر غرہ نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر وقت رضاء الٰہی کے طالب اور اُسکے خلاف سے خائف رہتے تھے۔

(ب) صحابہ میں ایک سے ایک اعلیٰ اور برتر و فائق موجود تھے مگر حضرت عمرؓ اپنے فرائض کو کسی پر بھروسہ کر کے ترک نہ فرماتے تھے حضرت سعد کو باوجودیکہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے مناسب مقام اور موقع پر پوری پوری نصیحتیں فرمائیں جس سے ہمکو دو باتیں حاصل ہوتیں۔

اوّل یہ کہ خلیفہ اور سلطان وقت کو اپنے فرائض کے ادا کرنے میں پوری بیدار مغزی سے کام لینا چاہیے۔ اگر اس خیال پر کہ دوسرا شخص واقف کار ہے سکوت کیا جائے تو کبھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

أَرَأَيْتُمْ إِنِ اسْتَعْمَلْتُ عَلَيْكُمْ خَيْرَ مَنْ أَعْلَمُ ثُمَّ أَمَرْتُهُ بِالْعَدْلِ أَقَضَيْتُ مَا عَلَيَّ قَالُوا نَعَمْ قَالَ لَا حَتَّى أَنْظُرَ فِي عَمَلِهِ أَعَمِلَ بِمَا أَمَرْتُهُ أَمْ لَا۔

(ترجمہ) اگر میرے علم کیموافق سب سے بہتر شخص کو تم پر امیر بنا کر عدل و انصاف کی ہدایت کردوں تو میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ سب نے عرض کیا بیشک ہو جائیں گے آپ نے فرمایا اتنی بات سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتا یہ دیکھنا بھی میرا فرض ہے کہ آیا وہ ہدایات پر عمل کرتا ہے یا نہیں۔

دوئم یہ کہ باوجود عالم و واقف ہونیکے جلیل القدر حضرات سے بھی کسی ابتلاء کے وقت ذہول یا نسیان یا فروگذاشت ممکن ہے۔ اسلیے اُنکو متنبہ کرتے رہنا لوازمات میں سے ہے حضرت عمرؓ کا بھی یہی طریقہ تھا جن صحابہ پر آپکو ہر طرح اطمینان تھا اُن کا امتحان بھی کرتے رہتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام کا سفر کیا تو امیر شام حضرت ابو عبیدہ سے فرمایا ہم کو اپنے گھر لیچلو اُنہوں نے فرمایا آپ وہاں جا کر کیا کرینگے۔ وہاں جا کر رونیکے سوا اور کچھ نہو گا مگر آپکے اصرار پر لیگئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہارا اسباب کہاں ہے۔ تم امیر شام ہو تمہارے پاس تو سوا ایک نمدہ اور لکڑی کی رکابی اور مشکیزہ کے کچھ بھی نہیں۔ کچھ کھانیکی چیز ہو تو لاؤ حضرت ابو عبیدہؓ نے روٹی کے سوکھے ٹکڑے لا کر سامنے رکھدیے۔ حضرت عمرؓ رو پڑے۔ حضرت ابو عبیدہ نے

نے فرمایا میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔ کہ آپ وہاں جا کر روئیں گے۔ ہم کو زیادہ سامان کی کیا ضرورت ہے اتنا ہی کافی ہے جو اصلی قیام گاہ یعنی آخرت تک پہنچا دے حضرت عمرؓ نے فرمایا۔
غَيَّرَتْنَا الدُّنْيَا كُلَّنَا غَيْرَكَ يَا أَبَا عُبَيْدَةَ (اے ابو عبیدہ دنیا نے ہم سب کو متغیر کر دیا مگر تم پر اثر نہیں ہوا۔)

حضرت عمرؓ کو یہی جانچنا تھا کہ اس زہد میں جو بہ برکت صحبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہوا ہے کچھ کمی تو نہیں آگئی۔ مگر اس ظاہری طور پر دیکھ لینے کے بعد بھی آپ غافل نہ رہے پھر بھی مخفی طور پر اسکی جانچ ضرور کی کہ دنیا کی طرف کسی درجہ میں بھی التفات ہے یا نہیں ایک مرتبہ آپ نے انکی خدمت میں چار سو دینار (اشرفی) بھیجے۔ اور قاصد سے کہدیا کہ دیکھ کر آنا کہ وہ کیا کرتے ہیں حضرت ابو عبیدہ نے قاصد کے سامنے ہی سب اشرفیاں اہل حاجت کو تقسیم کر دیں ایک بھی نہ رکھی ظاہر ہے کہ ان میں سے کچھ تھوڑا سا رکھ لیتے تو کسی درجہ میں بھی طمع دنیا کی بات نہ تھی اور نہ حضرت عمرؓ اس پر گرفت کر سکتے تھے خود ہی بھیجا تھا۔ اس لئے سب کا سب بھی رکھ لیتے تو کیا بیجا تھا۔ مگر وہاں تو فی الحقیقت دل میں دنیا کیلئے کچھ جگہ بھی نہ تھی۔

عمال اور والیوں کی نگرانی سیاست کی ان اصول میں سے ہے کہ جس کو جس درجہ تک ترک کر دیا گیا اسی قدر خرابیوں کا ظہور ہوا اور یہیں سے ہم کو الحزم سُوءُ الظن کا مطلب بھی معلوم ہو گیا۔ یہ ضرور نہیں کہ دانشمند خواہ مخواہ بدگمان ہوتا اور دوسروں کو متہم سمجھتا ہی بلکہ اپنی بیدار مغزی سے معاملہ ایسا کرتا ہی جیسا بدگمانی کی حالت میں کیا جائے۔

(ج) صحابہ کے علوم نہایت عالی اور غامض تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان ہدایات میں تدابیر سلطنت و سیاست کو ختم کرنیکے ساتھ شریعت و حقیقت کی نہایت دقیق علوم کا بھی چند لفظوں میں دروازہ کھولدیا اور یہیں سے ہم کو یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ صحابہ ہر ایک بات میں اعلیٰ و برتر و فائق ہیں۔ کوئی کسی درجہ تک پہنچ جائے۔ مگر شریعت و طریقت حقیقت و معرفت میں انکی مساوات نہیں کر سکتا حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا حامد و ذام حق کے معاملہ میں یکساں ہوں۔ کہنے اور سننے میں یہ دو لفظ ہیں مگر فی الواقع شریعت و طریقت کا خلاصہ یہی ہی۔ کوئی شخص

اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ جبتک کہ سوا رضا مولیٰ اور طلب حق اسکے قلب میں کسی امر کی گنجائش نہ رہی ہو جب تک غیر خدا کا کچھ بھی لگاؤ رہیگا۔ کبھی اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اہل تصوف کا تمام ریاضات و مجاہدات سے یہی مطلب ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ شیخ العرب و العجم قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ نے مکہ معظمہ سے اپنے خلیفہ خاص حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کو تحریر فرمایا کہ عرصہ سے آپنے اپنے حالات تحریر نہیں فرمائے۔ اسکے جواب میں حضرت مولانا نے بہت سی اظہار ندامت و اعتراف تقصیر کے بعد نہایت مختصر لفظوں میں تحریر فرمایا کہ اپنے اندر چند باتیں پاتا ہوں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ مادح و ذام یکساں ہیں" جس روز یہ جواب حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچا تو حاضرین مجلس کا بیان ہے کہ فرط مسرت سے حضرت پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی اور بار بار فرماتے تھے۔ کہ یہ باتیں کس کو نصیب ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کو حضرت مولانا کی کفش برداری کا موقع ملا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا کا اصلی اور بے تکلف حال یہی تھا جو تحریر فرمایا۔ کسی کی مدح و ذم سے ذرا بھی متغیر نہ ہوتے تھے۔ اور امر حق کے اظہار میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اور یہی اظہار حق اور تصلب فی الدین ہے جو علماء ربانیین کو صحابہ سے ورثہ میں ملا ہے جس کا نام تعصب و تنگ خیالی رکھا گیا۔

(د) نام و نمود کی طلب نیک نامی و نام آوری کی خواہش وجاہت کی تحصیل محبوب خلائق بنجانا مذموم اور غیر پسندیدہ یا خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر ہے بھی ایسا ہی۔ کیونکہ کوئی شخص جبتک مدارات خلق نہ کرے اور امور شریعت میں مداہن نہ بنے کبھی لوگوں میں مقبول اور عام خلائق کے نزدیک محبوب نہیں بن سکتا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے روشن اقوال نے اس کا قاعدہ کلیہ بھی بتلا دیا۔ آپنے اول تو ارشاد فرمایا کہ حق گوئی میں حامد و ذام برابر ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں کوئی شخص محبوب عام نہیں ہوسکتا اور پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم محبوب خلائق بننے سے اعراض مت کرو اور اُس کو خلاف دیانت نہ سمجھو۔ بظاہر تو یہ جملہ اول ارشاد کے

معارض و مخالف ہے مگر حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔ آپ نے اُسکو بالکل صاف کر دیا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ وجاہت و مقبولیت کے دو درجہ ہیں ایک یہ کہ حق کو چھپا کر اور لوگوں کی رضا کو حق پر مقدم سمجھ کر حاصل کی جائے یہ بالکل مذموم اور حرام ہے۔ اسی کی مذمت آئی ہے۔ یہ درجہ مقبولیت کا عوام الناس میں حاصل ہوتا ہے۔ خواص کے قلب میں ایسے شخص سے بجائے محبت کے نفرت ہوتی ہے۔ ایسی وجاہت کو انبیا علیہم السلام اور خواص نے ہرگز طلب نہیں کیا۔ اور نہ اپنے لئے کسی درجہ میں گوارا کیا۔ دوسرا یہ کہ اعمال صالحہ اور اتباع شریعت کے ذریعہ سے خداوند عالم کا مقبول و محبوب بنجائے۔ اور اس ذریعہ سے محبوب خلائق بنے۔ کیونکہ حق تعالیٰ جسکو مقرب بناتا ہے اُسکو مخلوق میں محبوب و مقبول بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں وارد ہے۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّی اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَیُحِبُّهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَاءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ (رواہ مسلم)

(حضرت) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو جبرئیلؑ سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم فلاں بندہ کو محبوب سمجھتے ہیں تم بھی اُس سے محبت کرو جبرئیلؑ خود محبت کرنے لگتے ہیں اور آسمان میں منادی کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص خدا کا محبوب ہے تم بھی اُس سے محبت کرو اس پر آسمان والے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر وہ زمین میں مقبول بنجاتا ہے۔)

اس سے معلوم ہو گیا کہ مقبولیت کا اصلی طریقہ کیا ہے۔

یہ مقبولیت خواص کی ہے اور یہی پسندیدہ اور محمود ہے۔

کَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا (اللہ کے یہاں صاحب وجاہت ہیں) میں اسی مرتبہ کی مدح فرمائی ہے۔ اور وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا (اے اللہ اُسکو پسندیدہ اور مرضی بنائیے) میں اسی درجہ کی طلب ہے۔

ان دونوں درجوں کو پہچاننے کی علامت وہی ہے جو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمائی کہ اگر اہل اللہ اور خواص میں محبت و مقبولیت ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کے یہاں بھی محبوب و مقبول ہے اور یہی

محبت عوام تک سرایت کرجائے تو بیشک قابل مدح وشکر ہے ورنہ قابل مذمت۔ اکثر دنیا طلب علمار اور مشایخ کی مقبولیت قسم اول کی ہوتی ہے اور علمار ربانیین کی مقبولیت قسم ثانی کی۔

نتیجہ سوم

اُن تمام اوصاف وکمالات کیساتھ جو حضرت عمرؓ میں بدرجۂ اتم موجود تھے آپکے اندر شان فراست خاص امتیاز لئے ہوئے تھی جس کے بارہ میں جو فراست ظاہر کی کبھی اُسکے خلاف نہ نکلی۔

قبیلہ سکون بھی منجلہ دیگر قبایل کے جوش واخلاص کیساتھ معرکہ کارزار کی طرف قدم بڑھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے گذرے تو بجائے خوش ہونیکے آپ منقبض ہوگئے اور اس انقباض کا اثر ہمیشہ قبیلہ سکون کے ذکر پر ظاہر ہوتا رہا اور یہ صرف اسوجہ سے کہ آپنے اپنی شان فراست سے اس قبیلہ میں فتنہ پردازی کا مادہ احساس فرمایا۔ اور یہ آپکی فراست بالکل صحیح اور سچی تھی بڑے بڑے مفسدوں اور اسلام میں سخت رخنہ ڈالنے والوں کا معدن یہی قبیلہ تھا جیساہم مختصر اور اشارہ کرآئے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی اس خاص امتیازی شان کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّکُ فِیْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَاِنَّہٗ عُمَرُ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔	(ابوہریرہ روایت کرتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی اُمتوں میں صاحب الہام وفراست ہوتے تھے میری اُمت میں ایسا کوئی ہے تو عمر ہے۔)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس فضیلۂ خاصہ میں امتیاز واختصاص ضرور تھا

ف۔ کوئی شخص الفاظ حدیث سے یہ نہ سمجھے کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس اُمت میں کسی صاحب فراست والہام کے ہونیمیں تردد تھا۔ یہ بات وہ شخص کہہ سکتا ہے جو عربی اور اُردو کے محاورہ سے بالکل ناواقف ہو۔ اس طرز ادا میں اظہار تردد نہیں ہوتا۔ بلکہ جس شخص کی نسبت اثبات حکم ہے اُسکی نسبت تیقن اور تاکید کا اظہار منظور ہوتا ہے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی سخی ہے تو حاتم ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا بھر میں سوا رحاتم کے اور کوئی سخی نہیں ہے۔

یا دنیا میں کسی سخی کے موجود ہونے میں تردد ہے۔ بلکہ حاتم کے بالیقین وصف سخاوت سے متصف ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

واقعات وحالات تاریخی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر وسیع اور طویل وعریض ملک میں جس کا انتظام آپکے مبارک ہاتھوں میں تھا اور انتظام بھی صرف ایک قسم کا نہیں۔ بلکہ ایک طرف معرکہ کارزار میں فوجیں بھیجنے اور افسروں کو نامزد کرنے اور مواقع جنگ متعین کرنیکا ہی تو دوسری جانب ملکی اور عدالتی یا رفاہِ عام شہرونکے آباد کرنے سڑکوں کے نکالنے پلوں کے بنانے اور نہروں کے جاری کرنے کا وغیرہ وغیرہ۔

جس بارہ میں آپنے جو فراست ظاہر فرمائی وہ بالکل ہو بہو صحیح نکلی۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ اہل حمص نے بارگاہ خلافت میں اپنے والی سعید بن عامر کی خلاف شکایات پہنچائیں۔ آپنے سُن کر فرمایا۔ الٰہی میری فراست سعید بن عامر کے بارہ میں غلط نہ نکلے سعید بن عامر کو مدینہ میں طلب کرکے اُن لوگوں سے فرمایا تم اپنی شکایات بیان کرو۔ عرض کیا پہلی شکایت یہ ہی کہ ہر روز بہت دن چڑھے برآمد ہوتے ہیں۔ سعید بن عامر نے جواب دیا کہ بیشک صحیح ہی۔ میرے پاس کوئی خادم تو ہے نہیں خود ہی آٹا گوندھ کر روٹی پکاتا ہوں۔ اور وضو کرکے باہر نکلتا ہوں۔ فرمایا اور کیا شکایت ہے۔ عرض کیا دوسری یہ کہ رات کو کسی کی بات نہیں سُنتے۔ سعید بن عامر نے جواب دیا کہ میں اس بات کو ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا۔ مگر اب مجبوراً عرض کرنا پڑا۔ میں نے دن تو ان لوگوں کیواسطے خاص کر دیا ہی اور رات خالص اللہ کیواسطے رکھی ہے۔ فرمایا اور کیا شکایت ہی۔ عرض کیا تیسری یہ کہ مہینے میں ایک دن بالکل برآمد نہیں ہوتے۔ سعید بن عامر نے عرض کیا صحیح ہی۔ خادم نہونیکی وجہ سے مجھے خود ہی اپنے کپڑے دھونے پڑتے ہیں۔ مہینہ میں ایک روز اس کام کیواسطے مقرر کر لیا ہی۔ آپنے فرمایا خدا کا شکر ہے میری فراست غلط نہ نکلی۔ اہل حمص سے فرمایا جاؤ اپنے والی کی قدر کرو۔

نتیجہ چہارم

عراق کے اس عظیم الشان معرکہ میں تیس ہزار سے کچھ زیادہ اسلامی لشکر تھا جن میں کا ہر ایک فرد

تہذیب و شائستگی۔ اخلاص و ہمدردی۔ دانشمندی و حسن تدبیری شجاعت و مردانگی کا مجسم نمونہ تھا کسی ایک فرد سے بھی اس طویل معرکہ میں ابتدا سے انتہا تک کوئی ایک حرکت ایسی سرزد نہیں ہوئی جس سے مسلمانوں پر بدنما دھبا لگتا۔ بلکہ اُنکی ہر ہر ادا سے اسلامی صداقت کا سکہ مخالفوں کے دلوں پر بیٹھتا جاتا تھا۔ ہر ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بات منہ سے نکالتے ہیں پہلے سے سوچے ہوئے اور مشورہ کر کے طے ہوئی ہے۔ جو انداز اختیار کرتے ہیں اُس سے مخالف پر رعب پڑتا اور اسلام کی برتری کا ثبوت ہوتا ہے۔ وہ ملک فتح کرتے تھے تو مفتوح قوموں کی حالت ابتر سے بہتر ہو جاتی تھی۔

کسریٰ اور رستم کے دربار میں ہر ایک سفیر نے اپنے اپنے نمبر پر جو بات کی مناسب وقت اور تدبیر و فراست سے لبریز کی جس سے درباری اور عام رعایا تو کیا خود کسریٰ و رستم بھی مرعوب ہو گئے۔ ایک اگر اپنے گھوڑے کو قیمتی فرش و نہر سے گذارتے ہوئے۔ یا بیش قیمت قالینوں کو اپنے نیزوں سے پھاڑتے ہوئے مسند و نسے باگ ڈور باندھنے اور مکلف فرش کو اُٹھا کر خود زمین پر بیٹھنے سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ساز و سامان ہماری نظروں میں نہایت حقیر اور غیر قابل التفات ہیں اور ان نمائشی سامانوں سے ہم پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ تو دوسرے سفیر مغیرہ نہایت استغنا سے گذرتے ہوئے رستم کی برابر تخت پر جا بیٹھتے ہیں۔ اور اہل فارس اُنکو کھینچکر تخت سے نیچے اُتارتے ہیں۔

تخت پر بیٹھنے سے اپنے مساوات یا برتری کا ثبوت دینا مقصود نہ تھا اور نہ اپنے لیے وہ اسکو باعث عزت سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ یہ جانتے تھے کہ مجھکو تخت سے اُتار دیا جائیگا۔ مگر اپنی فراست و روشن ضمیری۔ تدبیر و دانائی سے اوّل ہی سمجھ لیا تھا کہ اس طرح بیدھڑک جا بیٹھنے سے اس فوق العادت جرات کو دیکھکر وہ مرعوب ہو جائیں گے اور جب وہ مجھکو تخت سے اُتارینگے تو یہ ظاہر کرنیکا موقع ملیگا کہ اسلام نے اس تفاوت و امتیاز کو جائز نہیں رکھا جو فارس میں مروّج ہے کہ حکام و امرا رعیت کو بمنزلہ غلام کے سمجھتے اور خود خدا بن کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

درباریوں پر تو رعب چھا گیا اور اہل فارس کے دلوں میں اسلام کی محبت کا بیج جم گیا۔

رعایا حریت و مساوات کی تحصیل کیلئے اسلام کے حلقۂ اثر میں داخل ہونیکے واسطے بیتاب ہوگئی۔
اُدھر رستم بول اُٹھا کہ اس گفتگو کو سُننے کے بعد رعایا کبھی ہماری مطیع نہ ہیگی۔ امراء فارس گھبرا کر
کہنے لگے خدا برا کرے ہمارے اسلاف کا جنہوں نے فارس میں اس تفوق و امتیاز کی بنیاد ڈالی
جس کا خمیازہ آج ہمکو بھگتنا پڑتا ہے دونوں سفیروں کی دونوں دائیں گہری پالیسی اور اعلیٰ تدبیر و
ہوشمندی کا نتیجہ تھیں۔

پہلے دن کے طرز عمل نے اگر یہ اثر ڈالا کہ انسان کی برتری ان سامانوں سے نہیں ہے۔ بلکہ
اُس کا مدار اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ معاملات اور سب سے بڑھکر اپنے خالق و مالک کیساتھ ربط و کامل
اتقیا دسے ہے دل اگر ان کمالات سے معمور ہے جو ایک انسان میں ہونے چاہئیں تو ان نمایشی سامانوں
کی ضرورت نہیں اور اگر بجائے انسانی کمالات کے وحشیانہ اخلاق بھرے ہوئے ہیں تو یہ سامان
کچھ کارآمد نہیں ہیں۔ تو دوسرے دن کے معاملہ نے اسلامی قوانین حریت و مساوات وغیرہ کا سکہ
دلوں پر بٹھا دیا۔

اہل فارس خود سمجھ گئے کہ ہم ابتری و ذلت کی حالت میں زندگی کے مراحل طے کر رہے تھے
اگر انسانیت اور آزادی کا لطف ہے تو صرف مسلمانوں کی اطاعت اور اُنکے زیر اثر آجانے میں۔ رستم
سفراء اسلام کو بار بار اس لئے بلاتا تھا کہ اُنکی گفتگو سے امراء دربار متاثر ہو کر میرے ہمخیال ہوجائیں
وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ مگر سفیر اپنا کام کر گئے۔ اُنمیں سے ہر ایک جو بات کہتا یا جو
معاملہ کرتا تھا اُس سے نہ صرف رستم اور درباری متاثر و مرعوب ہوتے تھے۔ بلکہ عوام افراد میں اسلام
اور مسلمانوں کی محبت بیٹھتی چلی جاتی تھی۔ ایک ایسی قوم سے جسکو وحشیانہ اور بدویانہ زندگی بسر کرتے
ہوئے صدیاں گذر گئی ہوں جنکی تنگدستی و فاقہ مستی ضرب المثل ہو۔ جو ہمیشہ فارس و روم کے غلام
بنے رہے ہوں۔ کسریٰ و رستم بھی بروقت گفتگو اُنکی اس حالت کو یاد دلا کر شرمندہ کرنا۔ اور طمع زر
دیکر ٹال دینا چاہتے ہوں۔ یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ دشمن کے ملک میں فاتحانہ حیثیت سے داخل
ہو کر بھی کسی پر چیرہ دستی نہ کریں۔ فقر و فاقہ کی تکلیف اُٹھاتے ہوئے ایسے سرسبز ملک میں پہنچیں اور

کوئی چیز خلاف قانون لینا گوارا نہ کریں۔ بلکہ اپنی ہر ادا سے ثابت کریں کہ اُنکو ان لبھانیوالی چیزوں کی طرف اصلا رغبت نہیں ہے۔

اسلام کی اشاعت کا اصلی راز انہیں اخلاق و معاملات میں مضمر تھا اور اب بھی مسلمان کسی قسم کی ترقی کر سکتے ہیں تو انہیں اخلاق و اوصاف سے متصف ہونیکے ساتھ وحشیانہ افعال یا حرکات یا جابرانہ تہور و مردانگی۔ یا ملحدانہ تخیلات کبھی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیں گے۔

نتیجہ پنجم

شام و روم عراق و جزیرہ وغیرہ ممالک پر پیشقدمی سے مسلمانوں کو خونریزی کا بازار گرم کرنا یا باشندوں کو ملک بدر کرکے اُن کی املاک و متاع پر قابض ہونا مقصود نہ تھا۔ نہ اُنکو ذلیل بناکر خود آقا و مالک بننا اُن کی اغراض میں داخل تھا۔ بلکہ اصلی غرض و غایت یہ تھی کہ مخلوق کو قوانین کی تیرہ و تار مہلک اور پیچیدہ عقبات سے نجات دلا کر امن و آسایش تہذیب و تمدن کی شاہراہ پر لا ڈالیں اور اُن کو حریت و آزادی کے ذائقۂ انسانیت کی دولت و نعمت سے متمتع کریں اس اعلےٰ وارفع مقصود کیلئے جو طریقے اختیار کئے گئے نہایت سہل تھے۔ یا اسلامی اوصاف و کمالات کی طرف راغب ہو کر برضا و رغبت مسلمان بن جائیں یا تھوڑا سا محصول (جزیہ) دیکر مسلمانوں سے مساوات کا درجہ حاصل کریں۔ میزان عدل میں مسلمانوں کی برابر تلیں حقوق میں برابر کا حصہ لیں آزادی و اطمینان کے ساتھ اپنی املاک پر بلکہ ملک پر قابض و حاکم رہیں مسلمان خود اُن کی حمایت و حفاظت کرینگے۔

اسلامی سفرا اور نائبین کی گفتگو یزدجرد اور رستم سے بغور ملاحظہ کی جائے اُس کا حاصل اسکے سوا کچھ نہیں ہے اور یہی مطلب کلمۃ اللہ کے بلند و بالاتر کرنے سے تھا جس کیلئے مسلمان مامور تھے۔ نظیر دیکھنی ہے تو ہرمزان سے مصالحت کا معاملہ دیکھ لینا کافی ہے جن کا مفصل تذکرہ آیندہ ایک عنوان میں لکھا جائیگا۔ وہ بشرط ادا ء محصول اپنے ملک پر قابض و متصرف رہا۔ اور مسلمانوں نے اُسکی اور اُسکے ملک کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔

نتیجہ ششم

مسلمانوں کا سرزمین عرب سے نکل کر قدیم اور زبردست سلطنتوں سے معرکہ آرا ہونا۔ لیٹروں اور غارتگروں کا سامان یا چنگیز خانی فتوحات کا نمونہ نہ تھا۔ بلکہ ابتدا سے انتہا تک انکی تمام حرکات وسکنات۔ ارادے منصوبے۔ عملی کام ایسے مرتب اور باقاعدہ تھے۔ کہ اس زمانے کے متمدن و شائستہ قومیں بھی اس سے زیادہ تو کیا پوری پوری تقلید بھی نہیں کر سکتیں تاریخ عالم کی ورق گردانی اور واقعات سابق وحال کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتح و اقبال مند قوموں کی کامیابی کا راز امور ذیل میں مضمر ہے۔

فنون جنگ میں مہارت۔ اتفاق و اتحاد۔ ہمدردی ملکی و قومی۔ ایثار و جان نثاری۔ جوش و استقلال۔ ہمت۔ و مردانگی حفظ راز۔ اطاعت امیر و معدلت گستری و نصفت شعاری مساوات و حریت تعدی و ظلم سے پرہیز۔ جوش انتقام میں اعتدال پر قائم رہنا۔ دشمن کے ملک سے کما حقہ واقفیت حفظ ما تقدم۔ انتظام ذرائع خبر رسانی۔ و فراہمی رسد وغیرہ وغیرہ

یہ وہ باتیں ہیں کہ جس قوم میں پائی گئیں فتح و نصرت انکی ہمرکاب ہوئی

مذکورہ بالا واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بات بدرجہ کمال مسلمانوں میں موجود تھی۔ مادی ترقیات کی وجہ سے یہ ممکن بلکہ واقع ہے کہ بعض خاص انتظامی امور میں متمدن قومیں اس وقت ترقی کر جائیں۔ مگر اصولی باتوں پر نظر ڈالتے ہوئے صاف صاف تسلیم کر لینا پڑیگا کہ ان اوصاف میں مسلمانوں سے بڑھ کر کوئی قوم نہ اس وقت تک تھی اور نہ اس کے بعد اب تک ہوئی۔ مدعی تو پہلے سے بھی بہت ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں مگر کوئی یہ بتلادے کہ ان اصول پر مجموعی طور سے کہاں تک عمل کیا گیا ہے مسلمانوں کا سا اتفاق و اتحاد جو اس وقت تھا کسی قوم میں بھی نہیں ہوا حفظ راز کا حال ظاہر ہے غیر تو کیا اپنوں کو تدابیر جنگ کے راز قبل از وقت معلوم نہ ہوتے تھے۔ ایثار کی یہ حالت تھی کہ سخت سے سخت خطرہ کے موقعہ پر ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ میں آگے ہو جاؤں۔ جو گزند پہنچے مجھکو پہنچے۔ میرے بھائی اس سے محفوظ رہیں۔ یزدجرد اور رستم کے یہاں جا کر دلیرانہ گفتگو کرنا خطرہ سے

خالی نہ تھا۔ مگر اس پر بھی یہ نہوا کہ ایک شخص کو دوسری بار جانیکی نوبت ہوتی۔ ہمت و استقلال کا یہ
حال تھا کہ تن تنہا بادشاہ وقت سے ایسی بیدھڑک گفتگو کرتے تھے جس سے خود بادشاہ اور درباری
مرعوب ہوجاتے تھے۔ جوش و مردانگی اس سے ظاہر ہے کہ طلیحہ اسدی تن تنہا ساٹھ ہزار کی جمعیت
میں رات کیوقت گئے اور چپ چاپ واپس آنے کو پسند نہ کیا۔ دشمن کے ملک میں اُس وقت تک
قدم نہ رکھتے تھے جبتک اُسکی اندرونی حالت سے پوری واقفیت نہو جاتی۔

اس زمانہ میں میدان جنگ اور دشمن کے ملک کے نقشے تیار ہوتے ہیں مگر اُس وقت بھی اس
اُصول پر مضبوطی سے عمل تھا حضرت عمرؓ نے امیر لشکر حضرت سعدؓ کو تحریر فرمایا۔

صِفْ لِی الْاَرْضَ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْھَا (سرزمین عراق کا حال ایسا لکھو کہ گویا میں اُسکو دیکھ رہا ہوں۔

حضرت سعدؓ نے ایسا ہی کیا۔ یہ نقشہ کھینچا نہ تھا تو کیا تھا۔ اس نقشہ کو ملاحظہ فرماکر قادسیہ کو
جنگ کیلئے منتخب کیا گیا۔ اسی طرح ایک قدم بھی اندرون ملک میں داخل ہونیکی ممانعت تھی جبتک
کہ سامان رسد اور ذرائع خبر رسانی کا کامل بندوبست نہو سلسلہ امداد برابر متصل نہو۔ انتظام ڈاک
ایسا تھا کہ امیر عراق چھوٹی چھوٹی باتوں میں دارالخلافت سے مشورہ طلب کرتے تھے اور وہاں سے
فوراً جواب آتا تھا۔ اگر ڈاک کا کامل انتظام نہوتا تو ہزاروں میل کے فاصلہ پر اس قدر جلد خبریں کیونکر
پہنچ سکتیں۔ اور جواب کیسے آسکتا تھا۔ رہی معدلت والضاف۔ حریت و مساوات وغیرہ یہ تو وہ
باتیں ہیں جس کا سکہ مفتوح قوموں پر فتح سے قبل ہی بیٹھ چکا تھا۔ اس قانون میں حاکم و محکوم
امیر و رئیس عالم و جاہل سب مساوی تھے اور باینہمہ مساوات امیر کی اطاعت اس درجہ تھی کہ سر مو
کوئی شخص سرتابی نہ کرسکتا تھا۔ امیر عسکر اُن ہدایات پر جو دارالخلافہ سے آتی تھیں نہایت پابندی
کے ساتھ کاربند ہوتے تھے۔ اور یہی حال ہر ماتحت کا اپنے افسر کی اطاعت میں تھا۔ کیا ایسے
شائستہ اور باقاعدہ لشکر کو کوئی شخص غارتگروں سے تشبیہ دے سکتا ہے۔ یا ان فتوحات کو غارتگری
کا نتیجہ بتلا سکتا ہی۔ اگر کسی شائستہ اور متمدن قوم نے اس سے آدھا بھی کردکھایا ہو تو بتلادے لیکن
مسلمانوں نے ان قوانین کی تعلیم کسی لا کالج یا ملیٹری کالج میں نہیں پائی تھی۔

قانون بین الاقوام بھی اُس وقت مدون نہ ہوئے تھے۔ امن عام قائم رکھنے کیواسطے ہیگ کی کانفرنس بھی وضع نہ ہوئی تھی۔ اور پھر بھی وہ سادہ لوگ سب امور میں ماہر تھے۔

عرب کا جہل اور بدویت۔ سادگی وفاقہ مستی تو ایسی مشہور تھی کہ روم وشام فارس وغیرہ میں جب کسی سفیر سے گفتگو ہوئی تو انکو سابق حالات یاد دلائے گئے اور مسلمانوں نے بھی بے تکلف اُن سب باتوں کو تسلیم کیا۔ بایں ہمہ یہ باتیں اُنمیں کہاں سے آئیں اور کیونکر سیکھیں۔ صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا اقرار واعتقاد کرنے اور خدا کے حبیب ومحبوب نبی اُمیّ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند ساعت ہمنشینی سے۔

اس سے یہی بات نہ معلوم ہوئی کہ اسلام نہ تمام باتونکی رہبری کیلئے کافی ہے۔ بلکہ یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ نفس اسلام کو (جو صدق دل سے اور کمال رسوخ وپختگی کے ساتھ ہو وہ تمام خوبیاں اور عمدہ اطوار وعادات جو ہدایات قرآنی وتعلیم پاک نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کا نتیجہ ہیں۔ اور جن کے ساتھ متصف ہونے سے خود دین ودنیا کی خوبیاں عقل ودانش کے مراتب حاصل ہوجاتے ہیں) لازم وملزوم ہیں یا مسلمان اور پختہ مسلمان ہونا تمام اخلاقی اور دماغی کمالات وروشن ضمیری کی ضمانت ہیں۔

نتیجہ ہفتم

رستم کو خود یہ علم تھا کہ مسلمان ضرور ملک فارس پر قابض ہونگے۔ اور ہم پر غالب آئیں گے اور اس لئے وہ ہر پہلو سے لڑائی کو ٹالنا چاہتا تھا۔ اُس نے بادشاہ سے باصرار عرض کیا کہ مجھے میدان جنگ میں جانے سے معاف کیا جائے۔ اُس نے بار بار سفراء اسلام کی گفتگو امراء فارس کو سنا کر اُنکو سمجھانا چاہا کہ ان لوگوں کی یہ گفتگو اور یہ پاکیزہ حالات اور اعلیٰ وبرتر خیالات وکمالات ہیں۔ اُن کے معاملات اپنے دشمنوں کے ساتھ یہ ہیں۔ وہ کس قدر سچے اور رصاف اور اُن کا دین کیسا برگزیدہ اور اُن کے قوانین کیسے عمدہ ہیں۔ اُس نے کوشش کی کہ میں خود اور میرے ساتھ تمام امراء ولشکر بغبت مسلمان ہوجائیں اور اپنے ملک وحکومت کو بدستور اپنے قبضہ میں رکھیں جس کا اقرار وہ مسلمانوں سے لے چکا تھا اگر مسلمان ہوگئے تو ملک اُن کا اُنکے قبضہ میں رہیگا مسلمانوں کے غلبہ اور حقانیت کا

علم فقط رستم ہی تک محدود نہ تھا بلکہ جملہ خواص و سرداراس میں شریک تھے۔ جس کو وہ عوام پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ رستم اور باجان کی گفتگو اس کی شاہد ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تمام خواص و سرداروں کو رستم و باجان کی برابر تیقن نہ ہو۔ مگر اس علم سے خالی نہ تھے اور گو عوام کو اس راز سے کتنا ہی غافل رکھنا چاہا مگر سخن نہاں کے مانند آں رازے کزو سازند محفلہا۔ جبکہ خواص میں باہم چرچا تھا۔ تذکرے تھے اور رستم نے برسر دربار سفیران اسلام سے گفتگو کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تو ناممکن تھا کہ اُن تک یہ خیال نہ پہنچا۔ اور وہ اس اثر سے متاثر نہ ہوتے رستم کی کچھ پیش نہ چلی اُدھر بادشاہ نے مجبور کیا۔ ادھر اس کے ماتحت افسروں نے ملک کی حفاظت میں جان توڑ کر کوشش کی دشمن کو ہلاک و تباہ کرنے کی سب تدبیریں عمل میں لائے۔ کوئی دقیقہ سرفروشی و جانبازی کا اُٹھا نہ رکھا۔ رگ حمیت نے تھوڑی دیر کیلئے اُس کے سب قلبی خیالات راسخ اور تیقن علم کو مٹا دیا اور وہ نہایت قوت و شوکت کے ساز و سامان کے ساتھ دلیرانہ (غداً اُندُّھُمْ دَقّاً) کہتا ہوا میدان کارزار کو روانہ ہوا۔ اس علم نے اُسکے ارادے میں کسی قسم کی سُستی اور ہمت میں ضعف پیدا نہیں کیا بلکہ اس سے زیادہ تن دہی دکھلائی جو لاعلمی کی حالت میں دکھلاتا۔ اب اُس نے اُس عداوت کا اظہار کیا جو معاند اور جاحد حق کرتا ہے۔ یہ عداوت جہل کی عداوت سے کہیں زیادہ اور مضبوط ہوتی ہے جہل کا علاج تنبیہ سے ہو سکتا ہے۔ مگر عناد کا علاج نہیں ہے مسلمانوں کے غلبہ و تسلط کو اہل فارس کے ضعف یا پستی ہمت و دلشکستگی پر محمول کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اور جس طرح کفار عرب و اہل مکہ نے باوجودیکہ اُن کے دلوں میں مذہب اسلام کی سچائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت و راستبازی مرکوز تھی۔ اُنہوں نے وہ تمام حالات و معجزات دیکھے تھے جن کو دیکھنے و سُننے سے سنگدل سے سنگدل بھی نرم ہو جاتا۔ آپکی کوئی بات کبھی غلط نہ نکلی جو پیشین گوئی فرمائی صادق اُتری۔ جو حجت طلب کی دکھلادی گئی۔ وہ آپس میں بیٹھ کر آپ کی حقانیت کے تذکرے کرتے تھے مگر باینہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی۔ آبروریزی۔ دشنام دہی۔ اور انجام کار بغاوت و قتل میں مسلمانوں کو تنگ کرنے اور حتی کہ مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے جانے اور وہاں بھی انکا

پیچھا کرنے اور ضعیف مسلمانوں کو طرح طرح کے عذاب دیکر اسلام سے پھیر دینے میں ممکن سے ممکن کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجام کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معہ اپنی جماعت کے ہمیشہ کے لئے مکہ معظمہ چھوڑ دینا پڑا۔ مگر ہجرۃ کر جانیکے بعد بھی اُنکے صفحۂ ہستی سے معدوم کر دینے کی کوششوں سے باز نہ آئے کبھی یہود مدینہ سے سازش اور منافقوں کو آمادہ کرکے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی تدابیر میں مشغول ہونا اور انجام کار عرب کے تمام قبائل کو متفق بناکر غزوہ خندق کی صورت میں مدینہ کا محاصرہ کرنا۔ کبھی ملوک غسان وغیرہ کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کیلئے آمادہ کرنا۔ غرض خفیہ و علانیہ جس طرح بھی ممکن تھا اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے اور مسلمانوں کو جو اُن کے ہم قوم ہموطن رشتہ دار اور عزیز تھے ۔

جنکی عزت اُنکی عزت تھی جنکی فلاح میں اُنکی فلاح تھی جو اگر غالب آکر سلطنت و حکومت کی مسند پر بیٹھتے تو اُنھیں کی سلطنت و حکومت ہوتی (چنانچہ ایسا ہی ہوا جب اسلام کا غلبہ اور مسلمانوں کا تسلط ممالک شام و روم وغیرہ پر ہوا۔ یہی لوگ مسندآرائے حکومت ہوئے۔ ابو سفیان (جو بعد ابوجہل کے تمام کفار مکہ کے افسر اعلےٰ اور تمام معرکوں کے بانی مبانی تھے اور اُنھیں کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے جوش انتقام سے جنگ اُحد میں حضرت حمزہ کا جگر چبایا تھا) معرکہ یرموک میں اعلےٰ اور ذمہ داری کی خدمت: قاص (خطیب و لیکچرار) پر مامور تھے جن کا کام یہ تھا کہ اپنی موثر تقریر اور جادو بیانی سے مسلمانوں میں جوش کی روح پھونکتے رہیں اُنکے دونوں بیٹے یزید و معاویہ گورنری شام پر ممتاز ہوئے اسی طرح عکرمہ بن ابی جہل اور سب بڑے بڑے سردارانِ مکہ خود یا اُنکی اولاد ذمہ داری کے اعلےٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔ مگر یہ علم حقانیت اور یہ تعلقات قومیت و قرابت و وطنیت اُن کو کسی بات سے مانع نہ آئی۔ فتح مکہ اور ہر طرح سے مغلوب ہو جانے کے بعد بھی جبتک اُنکے اندر کا حقہ اسلام راسخ نہ ہو گیا دلوں میں یہ خیال لئے رہے حنین کی لڑائی میں جب نو مسلموں اور اُن کے ذیل میں چند قدیم اور پختہ مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے تو یہی ابو سفیان وغیرہ جو ابھی چند روز ہوئے فتح مکہ کے دن مسلمان ہو چکے تھے ایسے خوش ہوئے کہ اپنے دلی جذبات کو چھپا نہ سکے۔ اور بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا

جادو اب باطل ہو گیا۔ دوسرے بولے کہ بس جی اب مسلمانوں کے قدم کہیں نہ جمینگے۔ دریا سے ورے تو یہ ٹھہر ہی نہیں سکتے
مدینہ کے یہود خوب جانتے تھے کہ نبی آخر الزمان مبعوث ہونے والے ہیں۔ آپکے اندر وہ سب علامتیں
دیکھتے تھے جو اُن کے یہاں لکھی ہوئی تھیں۔ مگر عناد و بغض حب جاہ و ریاست نے اجازت نہ دی۔
پر نہ دی کہ دولت اتباع سے مالامال ہوتے۔ دغابازیاں کیں۔ کتاب اللہ کے احکام چھپائے مشرکین
مکہ کا ساتھ دیا۔ قتل و غارت ہوئے۔ جلاوطن ہوئے مگر ہٹ سے باز نہ آئے۔ علی ہذا منافقین مدینہ
سب کچھ جانکر اپنے بھائیوں کے حسد و بغض کی وجہ سے اس حقیقی نعمت سے محروم رہے۔

یہی حال رستم اور اس کے ہمخیال امرا اور ارکان سلطنت و رعایا کا تھا اور اُن کو علم اور تیقن
ضرور تھا۔ مگر نہ اس درجہ کا جو مشرکین عرب و یہود مدینہ و منافقین کو تھا اور نہ اُن کے سامنے علم و یقین
کے وہ اسباب تھے جو ان لوگوں کے سامنے تھے اسلئے وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی پوری قوت اور سامان
سے نبرد آزما ہوتے اور نہ فقط معرکۂ قادسیہ کے اختتام تک ہی اُن کی یہ ہمت قائم رہی۔ بلکہ پایۂ تخت
نکل جانیکے بعد بھی اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ نہاوند کا سب سے آخری معرکہ ایسا سخت تھا کہ باوجود فتوحات
اسلامیہ کے اس قدر وسیع ہو جانے اور تقریباً کل مملکت فارس و شام زیرنگین ہو جانے اور ہر قسم
کے سامان جنگ میں سہولت و وسعت ہونے کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر اہتمام کرنا پڑا کہ
اس سے پہلے کسی معرکہ میں نہ کیا تھا۔ اہل فارس نے بھی اتنا زور دکھلایا کہ اس سے قبل نہیں دکھلایا تھا۔
رستم کے ہمرتبہ فیرزان کی کمان میں ڈیڑھ لاکھ نبرد آزما فوج جمع تھی۔ اور امداد کا سلسلہ برابر جاری
تھا۔ ہزیمت سے محفوظ رہنے کیواسطے وہ سخت صورتیں تجویز کیں جو قادسیہ میں بھی نہ کی تھیں اپنے
پیچھے گہری خندق کھودی اور اپنے اور خندق کے درمیان لوہے کے گوکھرو اور کانٹے بچھا دیے
اور سات سات سپاہیوں کو ایک ایک زنجیر میں باندھ دیا کہ بھاگ ہی نہ سکیں اور اگر بھاگیں تو کانٹوں
میں پھنس کر رہ جاویں اور اس پر بھی کوئی بھاگ نکلے تو خندق میں گر کر ہلاک ہو جائے۔ غرض انتہائی
کوشش اور بہادری کو خرچ کیا اور جبکہ یزدجرد کو ملک فارس میں کہیں قدم رکھنے کو جگہ نہ رہی تب بھی
اپنی زد سے باز نہ آیا۔ خراسان و ترکستان اور چین تک پہنچ کر مسلمانوں سے مقابلہ کرتا اور کراتا رہا۔

اس لئے یہ تو کوئی شخص ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ اہل فارس میں فی الحقیقت ضعف تھا۔ یا اپنے اس علم کی وجہ سے کما حقہٗ مقابلہ نہ کیا اور مسلمانوں نے ایک ضعیف و مردہ قوم پر غلبہ حاصل کر لیا ہاں اس علم و یقین کا یہ اثر ضرور ہوا کہ جس جس ملک پر فتح حاصل کر کے مسلمان مسلط ہو جاتے اور وہاں اسلام کی برکات پھیلاتے جاتے تھے وہاں کے باشندے جو پہلے سے علم کے درجے میں اسلام کی صداقت دل میں لئے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے معاملات سے اور اُن کے اس قانون حریت و آزادی معدلت و نصفت سے واقف تھے جس کا برتاؤ وہ اپنے دشمنوں اور مفتوح قوموں سے کرتے تھے جب اُن کو بالذات مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تھا اُن کی ہر ہر بات کو آنکھ سے دیکھتے تھے اور پھر اُس ہمدردی اور شفقت اور مساوات کا مشاہدہ کرتے تھے جو اُن کیساتھ برتے جاتے تھے اور ان سب سے بڑھکر اُنکے اُن حالات کو بھی دیکھتے تھے جس سے مسلمانوں کی دُنیا سے بے تعلقی آخرت کی رغبت اور ہر ایک بات میں رضاء الٰہی کا طالب ہونا معلوم ہوتا تھا۔ تو اسلام کی محبت ایسے غیر محسوس طریقے سے سرایت کر جاتی تھی کہ وہ بے اختیار زبان کے اقرار سے پہلے دل سے مسلمان اور نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کے شیدائی بن جاتے تھے اور یہی ایک سبب تھا جسکی وجہ سے بلا کسی قسم کے جبر یا تدبیر و حیلہ کے ملک کے ملک اور قوم کی قوم تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمان ہو جاتے تھے اور یہ ایسا موثر اور قوی سبب تھا کہ کوئی دوسرا سبب اُسکے مقابلہ میں موثر نہیں ہو سکتا۔ اسکے خلاف جو شخص کوئی دوسرا سبب بیان کرے محض دعویٰ بے دلیل ہے جس کو کبھی ثابت نہیں کر سکتا۔

رستم کے اور امراء فارس کے خیالات اور اُس کے ذیل میں دوسرے خیالات لکھنے میں ہمنے کسی قدر طول سے کام لیا لیکن جس مطلب کے ہم درپے ہیں اُسکے اظہار کیواسطے واقعات مذکورہ کا تذکرہ نہایت ضروری تھا۔ ان واقعات سے چند نتائج اخذ کئے ہیں جنمیں ہر ایک بجائے خود مستقل بالشان اور نہایت مفید ہے لیکن اصلی مقصود ان مسلسل حالات کے ذکر کرنے سے یہی آخر نتیجہ ہے جس کا تعلق ہمارے اصلی دعوے سے ہے ہم اُمید کرتے ہیں کہ منصف مزاج و معقول پسند اسکو بغور ملاحظہ فرمائینگے

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس عنوان کو ختم کریں اسقدر لکھدینے کی ضرورت باقی ہے کہ رستم یا اراکین سلطنت امراءِ فارس یا عام رعایا کو اسلام کی صداقت اور مسلمانوں کے غلبہ کا یقین کس ذریعہ سے ہوا تھا۔ قیصر روم و شام تو اہلِ کتاب میں سے تھا۔ علیٰ ہذا یہود مدینہ بھی اُنکو اگر آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے علم ہوا تو قرینِ قیاس ہے مگر قوم مجوس جو کسی آسمانی مذہب کی پابند نہ تھی نہ کتاب الٰہی اُنکے پاس اُنکو علم ہوا تو کیونکر۔ اس خلجان کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ممکن ہے کہ فارس اور روم کی سلطنتیں باہم ملی جلی تھیں کبھی اُن میں باہمی جنگ ہوتی تھی اور کبھی صلح غرض آپس میں ایسے تعلقات تھے جنکی وجہ سے یہ امر کچھ مستبعد نہیں ہے۔ کہ جو خیال قیصر شام و روم اور علماء نصاریٰ میں راسخ تھا اُنکے ذریعہ سے فارس تک بھی پہنچ گیا ہو۔ یا یہ کہ عرب کے اکثر حصوں پر فارس کی حکومت تھی اور عرب کے کاہنوں اور نجومیوں میں ولادت باسعادت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی کھلبلی پڑ گئی تھی اور بعد ولادت حضور انور تو عرب بھر میں چرچا ہو گیا تھا کچھ بھی مستبعد نہیں ہے کہ یہ خیالات عرب سے فارس تک پھیل گئے ہوں لیکن اصلی وجہ اسکی یہ ہے کہ فارس میں خود ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے اُن کو بالذات یہ علم ہو گیا۔

آپ کی ولادت باسعادت کی شب میں ایوان کسریٰ کو زلزلہ آگیا اور اُس کے چودہ کنگرے گر گئے۔ یہ ایوان دنیا کی مشہور عمارتوں میں تھا۔ کسریٰ جیسے زبردست بادشاہ نے کروڑہا روپیہ صرف کرکے ۲۳ سال میں تعمیر کرایا تھا۔ اُسمیں زلزلہ آنا اور کنگروں کا گرجانا معمولی بات نہ تھی۔ کسریٰ انوشرواں سخت مغموم اور پریشان ہوا۔ اوّل اوّل تو اُس نے استقلال سے کام لیکر اپنے صدمہ کو پوشیدہ رکھا اور اس واقعہ کو طشت از بام کرنا چاہا۔ مگر بالآخر دربار منعقد کیا اور اراکین سلطنت پر اس غیر معمولی اور عظیم واقعہ کو جس کے لئے بظاہر کوئی سبب نہ تھا ظاہر کرکے اسکی وجہ اور لم کو دریافت کرنا چاہا۔ دربار ابھی منعقد ہی ہوا تھا۔ اور انوشرواں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ اطلاع ملی کہ آجکی شب تمام آتشکدوں کی آگ بجھ گئی اور اس مجلس میں ایلیا کے گورنر کا مراسلہ بدیں مضمون پہنچا کہ :-

آج شب بحیرہ ساوہ کا پانی بالکل خشک ہو گیا اور اُسی مجلس میں شام سے اطلاع پہنچی کہ

سماوہ کی ندی کا پانی منقطع ہو گیا۔ اور اُسی وقت طبریہ سے خبر آئی کہ بحیرہ طبریہ میں پانی کی روانی موقوف ہو گئی۔ انوشرواں تو اپنے دل میں پہلے ہی سے پریشان تھا۔ ان خبروں سے اُس کے رنج و ملال کی انتہا نہ رہی۔ اور اُس وقت اُس نے بیان کیا کہ آج کی شب میں ایوان کو سخت زلزلہ آیا۔ اور چودہ کنگرے گر گئے۔ یہ سُن کر موبذان[1] بولا میں نے بھی آج کی رات دیکھا ہے کہ سخت اور زبردست اونٹ اور اُنکے پیچھے عربی گھوڑے دجلہ کو عبور کر کے بلاد عجم میں پھیل گئے۔ کسریٰ نے موبذان سے اسکی تعبیر پوچھی تو اُس نے کہا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی جانب سے کوئی بات ظاہر ہونیوالی ہے۔ آپ حیرہ کے عامل کو لکھیے وہ کسی عالم کو جو وقائع آئندہ کے حالات سے باخبر ہو بھیجدے گا۔ کسریٰ کے حکم پر نعمان ابن المنذر نے عبدالمسیح غسانی کو بھیجدیا جس کی عمر اُس وقت ڈیڑھ سو سال کی تھی۔ یہ سب واقعات اور مشاہدات و خوابیں اُس کے سامنے بیان کئے گئے تو اُس نے کہا کہ اس کا پورا علم میرے ماموں سطیح[2] کو ہے جو شام کے شہر جابیہ میں رہتا ہے۔ عبدالمسیح کو مع ایک جماعت کے سطیح کے پاس بھیجا گیا۔ یہ ایسے وقت پہنچے کہ سطیح تین سو سال اور بعض روایات کیموافق سات سو سال زندہ رہکر دم توڑ رہا تھا اور اپنے حال میں مشغول تھا مگر سطیح نے بآواز بلند کہا۔

اصم ام یسمع غطریف الیمن (یمن کا سردار بہرہ ہو گیا ہے یا سنتا ہی)

عبدالمسیح کی آواز سُن کر سطیح نے آواز سُن کر کہا۔

عَبْدُ الْمَسِيْحِ عَلٰى جَمَلٍ مُشِيْحٍ اِلٰى سَطِيْحٍ (عبدالمسیح تیز رو اونٹ پر سطیح کے پاس ایسے وقت پہنچا)

وقد وافی علی الضریح بعثک ملک (کہ وہ قبر کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ شاہ فارس نے تجھ کو بھیجا ہے)

---

[1] موبذان چیف جسٹس کو کہتے تھے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ سب سے بڑے آتشکدہ کے محافظ و خادم کو موبذان کہتے تھے۔ لیکن اس میں کچھ مخالفت نہیں ہی۔ ممکن ہی کہ یہ دونوں جلیل القدر عہدے ایک ہی شخص کے سپرد ہوں ۱۲۔

[2] عرب میں دین ابراہیمی کے ضعیف ہو جانیکے وقت کہانت کا زور ہو گیا تھا۔ اہل عرب اپنے معاملات میں کاہنوں کے فیصلے پر راضی ہوتے تھے۔ اور وقائع آئندہ کے مطابق اُنہیں کے اقوال پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کاہنوں میں دو شخص بہت ہی مشہور و مستند ہوئے ہیں۔ شق اور سطیح۔ لیکن ان دونوں میں بھی سطیح کا درجہ بڑھا ہوا تھا۔ سطیح کے بدن میں سوائے کھوپری کے کہیں ہڈی نہ تھی اور اسی وجہ سے وہ بیٹھنے پر قادر نہ تھا۔ البتہ غصہ کیوقت پھول جاتا تھا اور بیٹھنے پر قادر ہوتا تھا۔ خود کہیں نہ جا سکتا تھا۔ اُس کا چہرہ سینہ میں تھا۔ گردن بالکل نہ تھی جب اُس سے کچھ دریافت کرنا ہوتا تھا تو اسکو ایسی طرح ہلاتے تھے جیسے گھی نکالنے کیوقت برتن کو ہلاتے ہیں۔ ہلانے سے اُس میں ہوا بھر جاتی تھی۔ سانس چڑھ جاتا تھا۔ اُس وقت پوچھنے پر جواب دیتا تھا۔ سطیح کی عمر تین سو اور بقول بعض سات سو سال ہوئی ۱۲۔

ساسان اثر تجاس الایوان وخمود النیران وسرویا الموبذان رای ابلاً صعاباً تقود خیلاً عراباً قد قطعت دجلۃ وانتشرت فی بلادھا یا عبد المسیح اذا کثرت التلاوۃ وظہر صاحب الہراوۃ وغاصت بحیرۃ ساوۃ وخمدت نار فارس فلیس بابل للفارس مقاما ولا الشام لسطیح شاما یملک منہم ملوک وملکات علی عدد الشرفات وکل ما ھو آت آت۔

(تزلزل ہونے آتشکدوں کے سرد ہوجانیکا سبب اور موبذان نے جو یہ خواب دیکھا تھا کہ زبردست اونٹوں کے پیچھے عربی گھوڑے دجلہ کو قطع کرکے بلاد فارس میں پھیل گئے اسکی تعبیر پوچھنے بھیجا ہے! ای عبد المسیح جب تلاوت قرآن بکثرت ہونے لگے اور صاحب عصا (مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ظاہر ہوجائیں بحیرہ ساوہ کا پانی خشک ہوجائے اور فارس کے آتشکدے سرد ہوجائیں تو سمجھ لینا بابل اہل فارس کی جاء قیام نہیں رہی اور نہ شام کا ملک سطیح کیواسطے رہا۔ چودہ کنگرے جو ایوان فارس کے گرے ہیں انکی شمار کیموافق کل چودہ بادشاہ فارس کے ہونگے اور جو بات آنیوالی ہے نہایت قریب ہے)

اس گفتگو کے ختم ہوتے ہی سطیح کا دم توہوا ہوا۔ اور عبد المسیح نے فارس کی راہ لی کسریٰ انوشرواں سے سارا ماجرا بیان کیا تو اُس نے سُن کر کہا۔ چودہ بادشاہ ہونیکے واسطے تو زمانہ دراز چاہئیے۔ اس مدت میں تو بڑے بڑے تغیرات ہوجائیں گے لیکن مسکین کو یہ خبر نہ تھی کہ وعدہ خداوندی بہت جلد پورا ہونیوالا ہے۔ چار ہی برس کی قلیل مدت میں دس بادشاہ تو سلطنت کرکے قتل یا معزول ہوئے۔ باقی چار کا خاتمہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شروع خلافت تک ہوگیا۔ لیکن پایۂ تخت اور مملکت فارس کو تو پہلے ہی سے وداع کرگئے تھے۔ یزدجرد نے دوسرے ملک گھر پڑ کر جان دی۔ اور تین ہزار ایک سو چونسٹھ سال کی قدیم سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ واقعات تو کسریٰ انوشروان عادل کے زمانہ میں ہوئے۔ اور یہ ایسے واضح حالات تھے کہ کسی خاص شخص تک اُن کا علم محدود نہ تھا۔ کوئی شخص اپنے خواب کو مخفی رکھ سکتا تھا۔ اور کوئی کسی خاص واقعہ کا اخفا بھی کرسکتا تھا۔ جیسا کہ خود انوشروان نے ایوان کے زلزلہ کو مخفی رکھنا چاہا مگر ان تمام حالات اور متواتر روایات کا اخفا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اگرچہ فارس میں اس امر کا

علم پہلے سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھا کہ اہل عرب ملک۔ فارس پر مسلط ہو جائیں گے چنانچہ سابور ذی الاکتاف کے حالات میں لکھا ہے کہ اُس نے عرب کو سخت اذیتیں پہنچائیں وہ قبائل عرب کو برباد اور تباہ کرتا تھا۔ اور جو شخص ملجاتا تھا۔ اُس کے مونڈھے اُکھاڑ دیتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اُس کو ذوالاکتاف کا لقب دیا گیا تھا۔ اسی طرح تباہی نازل کرتا ہوا قبیلہ تمیم تک پہنچا تو یہ لوگ پہلے ہی اپنے منازل کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ وہاں سواء عمیر بن تمیم کے جس کی عمر تین سو سال کی تھی کوئی بھی نہ ملا۔ یہ اس درجہ ضعیف ہو گیا تھا کہ بیٹھ بھی نہ سکتا تھا اور اسی لئے اُسکو زنبیل میں لٹاکر لٹکا دیا جاتا تھا۔ سپاہی عمیر کو سابور کے پاس لیگئے۔ سابور نے اُس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ باوجود ضعف و پیرانہ سالی عقل و گویائی کامل ہے۔ عمیر نے سابور سے عرب کو قتل و غارت کرنے اور اس قسم کی اذیتیں پہنچانیکا سبب دریافت کیا۔ اُس نے کہا ان لوگوں کا گمان ہے کہ نبی آخر الزمان مبعوث ہونگے تو ملک فارس ہمارا ہو جائیگا۔ عمیر نے کہا مگر آپ نے شاہانہ عقل و حلم سے کام نہ لیا۔ اگر اُن کا یہ خیال غلط ہے تو آپ کو کیا مضرت اور اگر صحیح ہے تو ان کی گردن پر کوئی ایسا احسان چھوڑنا چاہیئے تھا جس کو وہ یاد رکھتے اور اپنے غلبہ کیوقت اہلِ فارس کے ساتھ بطور جزاء احسان مراعات کرتے۔ عمیر کی اس گفتگو کا سابور پر پورا اثر ہوا۔ اور وہ ان سخت حرکات سے رُک گیا۔

گو یہ علم کسی معتبر اور مستند روایات یا دلیل پر مبنی نہ ہو مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خواہ بربنار کہانت و نجوم جس کا اس زمانہ میں بہت چرچا تھا۔ اور اُنہیں کے اقوال پر عام طور پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ اور اُنہیں کے فیصلوں کو ناطق و واجب العمل سمجھا جاتا تھا۔ یا بربنار روایات یہود مدینہ جو خاص نبی آخر الزمان کے اتباع اور امداد کیلئے وہاں آباد ہوئے تھے اور بوجہ اہل کتاب ہونیکے اُن کے اقوال قابل اعتماد مانے جاتے تھے اس کا چرچا عرب میں اور اُن کی وجہ سے ممالک متصلہ میں ضرور تھا لیکن انوشروان عادل کے وقت جو امور پیش آئے وہ ایسے واضح اور روشن تھے کہ کسی کو انکار کی گنجائش نہ تھی اور اسی وجہ سے یہ علم درجہ یقین تک پہنچکر اہلِ فارس میں راسخ ہو گیا تھا۔

انوشروان کے بعد اُس کا پوتا پرویز تخت سلطنت پر بیٹھا تو اُس کو بھی متواتر ایسے ہی واقعات

پیش آئے۔ اور اُس کے دربار کے کثیر التعداد کاہنوں اور نجومیوں نے بھی ان آثار کو مبعوث ہونے والے نبی کا پیش خیمہ تبلایا جن کی اُمت ملک فارس پر حکمرانی کرے گی۔ ان واقعات نے اس سابق علم کو اور بھی تقویت پہنچا دی رستم اور اُس کے سواہت سے دوسرے اراکین سلطنت خود بھی علم نجوم و کہانت میں مہارت رکھتے تھے اُن کو ذاتی طور پر بھی اور اس لئے وہ تقلیداً نہیں بلکہ اپنے مشاہدات کی بناپر اسلام کو حق سمجھ کر اُس کی طرف مائل تھے۔ ان سب کے علاوہ وقت ظہور اسلام سے اس وقت تک جس قسم کے حالات خود ملک عرب میں پیش آئے یا فتوح شام و عراق کیوقت دیکھے گئے اور مسلمانوں کا طرز و انداز۔ خالق و مخلوق کے ساتھ۔ معاملات اور اپنے دشمنوں اور مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ ان سب باتوں کی وجہ سے خود بخود بلا استدلال و استنباط یہ امر ذہن نشین ہوتا گیا کہ اسلام ایک زبردست قوت ہے جو تمام قوتوں پر غالب آکر رہیگی اور مسلمان اپنے اندر وہ اوصاف لئے ہوئے ہیں جنکی خوبی کا سکہ اسی طرح بیٹھتا چلا جائے گا کہ کوئی تدبیر اُسکے خلاف کارگر و مفید ثابت نہوگی۔ ایسا ہی ہوا مسلمانوں نے جدھر کا رُخ کیا۔ قوموں کی قومیں اسلام کا خیر مقدم کرنے کیلئے تیار بیٹھی تھیں۔ خوشی خوشی اُسکے حلقہ میں داخل ہوتی گئیں مسلمانوں نے کسی کے ساتھ نہ جبر یہ معاملہ کیا اور نہ ناجائز اور خلاف عقل و انسانیت ترغیب و تحریص کا۔

وہ صداقت سے معاملہ کرتے تھے اور یہی اُن کی بڑی تدبیر تھی اور اسی سے اُن کو ہر قسم کی کامیابی نصیب ہوئی مخالف اپنی پوری قوت سے مقابلہ کرتے تھے مگر اُن کے پاس ان اعلےٰ اوصاف کے مقابلہ کا سامان نہ تھا اس سے وہ بالکل عاجز تھے اور یہی وہ اوصاف تھے جن کا بے اختیاری اثر قلوب کو مسخر کر لیتا تھا۔

مسلمانوں کے کمال اخلاق حسن معاملہ صلح پسندی حب امن۔ حفظ جان و مال کی خواہش و رغبت۔ احکام شرع کی پابندی۔ وفا عہد اور اس قسم کے جملہ اوصاف حسنہ کے ساتھ متصف ہونیکا یقین موافق و مخالف سکے ذہنوں میں یہاں تک راسخ ہوگیا تھا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم

و غلام بھی اُنکے ان اوصاف کے اعتماد پر بڑی سے بڑی ذمہ داری کا کام بلا استفسار کر بیٹھتا تھا اور مخالف بھی مسلمانوں کے برتاؤ سے ایسے مطمئن تھے کہ ذرا سا سہارا ملنے پر اپنی جان و مال کو بالکل اُن کے حوالے کرنے کیواسطے تیار ہو جاتے تھے اور مسلمان ادنی آدمی کی بات کا بھی وہی پاس کرتے تھے جو ایک مقتدر عہدہ دار کی بات کا۔

ذیل کا واقعہ بھی انہیں واقعات میں سے ہے جس سے بڑھکر امن پسندی۔ وفاء عہد کی مثال کوئی شخص کسی قوم میں کسی ملک میں کسی زمانہ میں دکھلا نہیں سکتا۔

سوس کو صلحاً فتح کرنے کے بعد جندی سالور کا محاصرہ کیا گیا۔ صبح و شام محاصرین حملہ کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اسی حالت میں ایک دن صبح کو مسلمانوں نے دفعتہً یہ بات دیکھی کہ محصورین شہر کے دروازے کھول کر باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ اور اپنے ساتھ مسلمانوں سے خرید و فروخت کرنے کیلئے دوکانیں بھی لے آئے۔ مسلمان اس حالت کو دیکھ کر سخت متعجب و متحیر تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ مگر اُنہوں نے اپنی مستمر عادت پر عمل کرکے بجائے اسکے کہ اُن پر حملہ کرتے یہ دریافت کیا کہ تم اس طرح بلا کھٹکے کیسے چلے آئے۔

محصورین نے کہا کہ تم نے ہم کو امن دیا اور امن کا رقعہ لکھ کر شہر میں پھینکا۔ مسلمانوں نے کہا ہرگز ایسا نہیں ہوا۔ اُن لوگوں نے کہا ہم جھوٹ نہیں بولتے ہمارے پاس یہ رقعہ موجود ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک غلام نے جو محصورین ہی کا ہم قوم تھا امان کا رقعہ لکھ کر شہر میں پھینکدیا مسلمانوں نے محصورین سے کہا کہ یہ ایک غلام کا فعل ہے اُن لوگوں نے کہا ہمیں معلوم نہیں تم میں غلام کون ہے اور آزاد کون۔ ہم تو تم پر اعتماد کرکے چلے آئے تمہارا جی چاہے عہد شکنی کرو۔ مسلمان یہ سُنکر چپ ہو رہے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھکر بھیجا وہاں سے جواب آیا۔

اِنَّ اللّٰہَ عَظَّمَ الوَفَاءَ فَلَا	اللہ تعالیٰ نے وفاداری کی بڑی عظمت بیان فرمائی ہے
تَکُونُونَ اَوفِیَاءَ حَتّٰی تَفُوا مَا دُمتُم	اور تم لوگ کبھی وفادار نہیں کہلائے جا سکتے جبتک تم
فِی شَکٍّ اَجِیزُوھُم وَفُوا لَھُم فَوَافُوا	ایسی حالت میں بھی وفاء عہد کرو جو تمکو شک ہو کہ آیا ہم نے

لهم وانصرفوا عنهم | وفا عہد لازم ہے یا نہیں اُنکے عہد کو نافذ کرو۔ اس پر مسلمانوں نے عہد کو پورا کیا۔ اور وہاں سے واپس ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ اگر غلام کو یہ اطمینان نہوتا کہ جو کچھ میں کر گزروں گا اُس کو مسلمانوں کا سپہ سالار پورا کریگا۔ تو وہ اپنی قوم کو کبھی خطرہ میں نہ ڈالتا۔ اور اُن کو محفوظ مورچہ بندی سے نکال کر کھلے میدان میں مسلمانوں کے رحم پر نچھوڑتا۔ اور خود محصورین کو یہ یقین نہوتا کہ مسلمانوں میں کا ادنیٰ بھی جو عہد کریگا اُس کو وہ پورا کریں گے۔ تو وہ کبھی نہایت بیفکری کے ساتھ بلا ساز و سامان جنگ دوکانیں اور بازار لیکر نہ نکلتے۔ وہ تو یہ سمجھ کر امن تو ہو ہی گیا۔ اب چلکر اُن لوگوں کے ساتھ خرید و فروخت کر کے نفع اُٹھاؤ تجارتی سامان لیکر آئے تھے۔ یہ تھے مسلمانوں کے اخلاق و معاملات اور یہ تھے اُنکی شریعت کے احکام جس پر ہر شخص کو اطمینان تھا۔ اور کیسے نہوتا جبکہ اُن کی شریعت کا مسلم مسئلہ تھا۔

يد المسلمين واحدة تسعى بذمتهم ادناهم | (مسلمانوں کا قبضہ ایک ہے۔ اُن کے عہد کے واسطے ادنیٰ بھی سعی کرتا ہے)

اور جبکہ اُن کے خلیفہ کی بار بار یہی تاکید ہو کہ کسی طرح خواہ ہنسی میں یا اشارہ سے کوئی ایسا فعل کیا جائے جس سے دشمن اپنے لئے امن سمجھ لیں تو اُس کو پورا کرو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعدؓ کو تحریر فرمایا۔

القي في روعي انكم اذا لقيتم العدو وهزمتموهم فمتى لاعب احد منكم احدا من العجم بامان او بلسان كان عندهم امانا فاجروا ذلك مجرى الامان والوفاء فان الخطاء بالوفاء بقية وان الخطاء بالغدر هلكة وفيها وهنكم وقوة عدوكم

(میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ جب تم دشمن سے مقابلہ کرو اور ان کو ہزیمت ہو جائے اور تم بطور مذاق کے امن دینے کی بات کہو یا زبان اور اشارے سے کوئی ایسی حرکت کرو جس کو دشمن امان سمجھیں تو اس کو پورا کرو وفا کرنا اگرچہ خطا سے ہو کار آمد ہے۔ اور عہد شکنی اگرچہ عمداً نہ ہو غلطی رائے سے ہو تب بھی ہلاکی کا سبب ہے اور یہ بات تمہاری ضعف اور دشمن کی قوت کا موجب ہے)

مطلب یہ ہے کہ وفا کرنے میں غلطی ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اور نقض عہد کرنا کسی حال میں بھی اچھا نہیں ہے۔ اس لئے وفا کرنے میں احتیاط کی جانب اختیار کرنی چاہیئے۔

حضرت عمر رضی اللہ کے ارشاد اور مسلمانوں کے اس معاملہ سے جو محصورین کے ساتھ کیا یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی۔ کہ مسلمان حقیقی طور سے ان زرین اصول کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے۔ انکی مذہبی تعلیم یہی تھی اور وہ واقعی یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ہم دنیا میں اسلام کی خوبیاں پھیلانے اور مخلوق خدا کو امن و آزادی کی شاہراہ پر چلانے اور انکی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ اُن کو اعتقاد تھا کہ ہم سچّے طور سے ان اُصول پر عمل نہ کرینگے تو کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے اور نہ جو وعدے ہم سے کئے گئے ہیں پورے ہو سکتے ہیں اگر اسلام کی حقیقی اور واقعی تعلیم یہی نہ ہوتی اور مسلمان یہ سمجھے ہوئے نہ ہوتے کہ اسلام پھیل سکتا ہے یا اُس کے اوصاف دلوں میں جگہ پکڑ سکتے ہیں۔ تو اسی طرح پر کہ ہم ان اُصول پر ظاہر و باطن صدق دل سے عمل نہ کریں۔ اگر انکی یہ باتیں محض ظاہری اور نمائشی ہوتیں تو ممکن تھا کہ جب محصورین بلا کسی قسم کی اطلاع کے دفعۃً شہر سے باہر نکل آئے تھے اور امن حاصل کرنے کی کوئی درخواست بھی نہ کی تھی تو مسلمان بلا دریافت حملہ کر دیتے اور جب ایک جماعت کو قتل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے تب اُن کی بات سُنتے اور انجام کار اپنی انصاف پسندی اور حب امن کا بھی ثبوت دیتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک شخص نے بھی بھولے سے اُن پر دست درازی نہیں کی حالانکہ سوا اُس غلام کے جس نے محض وطن پرستی اور اپنے ہم قوموں کے بچانے کیلئے یہ حرکت کی تھی کسی کو بھی علم نہ تھا۔ مگر چونکہ اس وقت اسلام کے اصلی محاسن اور اوصاف کیساتھ مسلمانوں میں کوئی ایسی بات پیدا نہ ہوئی تھی کہ اُن کو جو نفسانی خواہشوں کی طرف چلاتی یا دنیا کے مال وجاہ کیطرف مائل کرتی اس لئے سب نے احتیاط کی جانب کو اختیار کیا اور بعد اس تحقیق کے بھی کہ یہ فعل ایک غلام کا ہے اور وہ اُسکے نافذ کرنے پر مجبور نہیں ہیں اپنی طرف سے اُس کے عہد کو توڑنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ دربار خلافت سے بذریعہ عرضداشت ہدایت طلب کی۔ اور وہاں سے وہی حکم آیا کہ نہیں اُس عہد کو اگرچہ غلام ہی کا ہے پورا کرو۔ علی ہذا حضرت عمرؓ کا اپنی طرف سے یہ تحریر فرمانا کہ جیسا کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں خود اس بات کی

شہادت دیتا ہے کہ شریعت میں فی نفسہ اس کا کس قدر اہتمام تھا۔ اور یہ کہ خلیفۃ المسلمین اور سب مسلمان اپنی کامیابی صرف اس صورت میں سمجھے ہوئے تھے کہ مخلوق کی حقیقی فلاح وبہبود کی کوشش کریں۔ اس کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ وہ غلطی سے بھی کوئی ایسی بات نکریں جس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچے یا اسلام پر عہد شکنی کا دھبہ لگے۔ وہ اسلام کی قوت اور شوکت اسی بات میں سمجھے ہوئے تھے کہ اس کے احکام کی پوری پابندی کی جائے۔ ورنہ ایک فاتح قوم کی حیثیت سے ممکن تھا کہ مسلمان بھی اپنی قوت وشوکت دکھانے کیلئے کبھی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے جو عام طور پر فاتح اقوام کا دستور ہے۔ دنیا نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے اور اس وقت جیسا کہ ایک جانب فنون جنگ مدارج کمال پر پہنچائے گئے اور نسل انسانی کو حیات کی خوشگوار فضا سے نکال کر ملک عدم میں پہنچانے کے وہ آلات ایجاد کئے گئے جس سے آن کی آن میں دنیا ویران ہو سکتی ہے۔

اسی طرح دوسری جانب امن عام۔ حفظ جان و مال کے بھی وہ قوانین بنائے گئے ہیں کہ دنیا انکو حیرت انگیز سمجھتی ہے۔ یہ اسی ترقی یافتہ زمانہ کا کرشمہ ہے کہ سلطنتیں بھی باہم ایک عام قانون میں جکڑی ہوئی ہیں۔ خونریزی سے اور بدامنی سے بڑھ کر اس وقت کوئی جرم نہیں ہے۔

مگر ان تمام اعلےٰ قوانین اور تمدن و شائستگی کی ان تمام برکتوں کا جو مخلوق کو بلا امتیاز رنگ و مذہب شامل ہیں۔ اور جن پر متمدن اقوام کا ناز بجا ہے۔ اسلام کی سادہ اور بے لوث ہدایات سے مقابلہ کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام اقوام ملکر بھی اُس درجہ کے قریب نہیں پہنچ سکیں جس کو اسلام نے جاری کیا اور جس پر ایک سادہ اور بدویت کے اخلاق سے متصف قوم عمل پیرا ہو چکی اس شائستگی کے زمانہ میں بھی حالت جنگ کے اندر امن طلب کرنیکے سے جو نہایت سہل اور انتہائی طریقہ مقرر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہتھیار ڈالدیئے جائیں یا سفید جھنڈا اُڑا دیا جائے مگر اُسکو اس اسلامی طریقہ سے کیا نسبت ہے جسکی عمرؓ نے ہدایت فرمائی۔ اور جس پر مسلمان کاربند ہوئے۔ امن کا اشارہ اور وہ بھی خواہ مذاق میں ہو یا واقعی اور کوئی ایسا فعل جس سے واقع میں امن دینا مقصود بھی نہ تھا مگر فریق ثانی امن سمجھ گئے۔ اور پھر امن دینے والا یا ایسی حرکت کرنیوالا بھی یہ ضرور نہیں کہ ذمہ دار افسر ہی ہو بلکہ ادنیٰ

سپاہی اور غلام بھی کر بیٹھے تو وہی حکم ہو جو ایک اعلیٰ افسر کے فعل کا۔ انصافاً فرمائیے کہ کیا کوئی متمدن قوم بھی امن کے ایسے سہل قاعدوں کی پابند ہے یا ہو سکتی ہے۔ جن کا پابند اسلام آج سے تیرہ سو برس پہلے اپنے پیرووں کو کر گیا ہے۔ اور پھر کیا ایسے ہی مذہب کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بجبر پھیلایا گیا۔ اور پھر اگر ہم یہ دعویٰ کریں تو کیا بیجا ہے کہ تمام بہترین اُصول کا جاری کرنیوالا اسلام ہے تمام اقوام دنیا کے رہبر مسلمان ہیں۔ وہ جو کچھ کر گئے ہیں اسکی تقلید بھی پوری نہیں ہو سکی اور جو کچھ کیا گیا ہے اُنہیں کے اُصول سے اخذ کر کے اور اُسی راستہ پر چل کر۔

ہرمزان کا عجیب حیلہ سے امن حاصل کر کے مسلمان ہونا

ہرمزان فارس کے اُن سات مشہور گھرانوں میں سے ایک خاندان کا معزز ممبر تھا۔ جو فارس بھر میں چوٹی کے شریف اور خاندانی نواب کہلاتے تھے۔ ہرمزان اپنے ذاتی جوہروں میں بھی ممتاز تھا۔ اسی وجہ سے قادسیہ کے معرکہ میں میمنہ کی کمان جس میں تقریباً بیس ہزار نبرد آزما تھے۔ اسکے سپرد تھی۔ جنگ قادسیہ کا فیصلہ فارس کے برخلاف ہو چکا تو ہرمزان نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔ اہواز پہنچکر وہاں کی خود مختارانہ حکومت سنبھالی اور مسلمانوں پر غارت گرانہ حملے شروع کر دئے۔

عتبہ بن غزوان عامل بصرہ نے اس سے مشوش ہو کر حضرت سعدؓ سے اہل میسان کیلئے امداد طلب کی نعیم بن مقرن اُنکی امداد کو بھیجے گئے۔ ادھر عتبہ نے سلمی بن القین اور حرملہ بن مریطہ کو بھیجا۔ اُنھوں نے حدودِ میسان پر ایک عربی قوم کی امداد سے جو وہاں آباد تھی جس کو بنو العم بن مالک کہا جاتا تھا اور جس کے سردار غالب و کلیب وغیرہ تھے ہرمزان پر حملہ کیا اسکو شکست ہوئی۔ اور سوائے صلح کر لینے کے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ صلح میں اتنی نرمی برتی گئی کہ ہرمزان اپنے مذہب پر قائم رہکر تمام ملک اہواز کا حاکم رہے۔ البتہ نہر تیری۔ مناذر اور سوق اہواز مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔

مناذر پر جنگی چوکی قائم کر کے غالب کو امیر مقرر کر دیا گیا۔ اور نہر تیری کی جنگی چوکیاں کلیب کی امارت میں دی گئیں۔ اس طرح انتظام کر دینے کے بعد مسلمان افسر واپس آ گئے۔ تھوڑے ہی

دنوں کے بعد غالب اور حرملہ سے ہرمزان کا ایک زمین کی حد بندی کے معاملہ میں نزاع ہوگیا عتبہ بن غزوان نے اسکے تصفیہ کیلئے ایک کمیشن بھیجا۔ جس کے افسر اعلےٰ حرملہ اور سلمی فاتح اہواز تھے اُنھوں نے جاکر بیانات سُنے تو غالب و کلیب حق پر تھے اُنھیں کے موافق فیصلہ صادر فرمایا۔ ہرمزان نے اس فیصلہ سے ناراض ہوکر عہد شکنی کرکے اداء محصول سے انکار کیا اور قبائل اکراد سے امداد لیکر بھاری لشکر جمع کرلیا۔ امراء سرحد نے عامل بصرہ کو اطلاع دی اُنھوں نے بارگاہ خلافت میں اطلاع دیکر مشورہ اور امداد طلب کی۔ امیر المومنین نے حرقوص بن زہیر سعدی کو فوج کی کمان اور جو ملک فتح کریں اُسکی امارت سپرد کی۔ حرقوص نے ہرمزان پر حملہ کیا وہ شکست کھاکر رامہرمز بھاگ گیا حرقوص نے تمام ملک اہواز پر قابض ہوکر ملکی انتظامات شروع کردیئے۔ اس سے فارغ ہوکر جزء بن معاویہ کو ہرمزان کے تعاقب میں بھیجا۔ جزء نے مدینہ سُرق فتح کرکے اُس میں نہریں جاری کیں اور بنجر زمینوں کو آباد کرکے ویرانہ کو سرسبز و شاداب بنا دیا۔ ہرمزان یہ حالت دیکھکر پھر صلح کرلینے پر مجبور ہوا۔ اور اب بھی اُسی نرمی کے ساتھ صلح ہوئی کہ جن جن شہروں پر وہ قابض ہے اُسی کے تسلط میں رہیں۔ البتہ محصول ادا کرتا رہے جسکے معاوضہ میں مسلمان اُسکی اور اُسکے ملک کی حفاظت کریں گے لیکن ہرمزان کو عہد شکنی کی عادت پڑی ہوئی تھی یزدجرد جو دارالسلطنت کو چھوڑکر دربدر مارا پھرتا تھا اُس نے ہرمزان کو اُبھارا اور ساتھ ہی کل باشندگانِ اہواز کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کردیا جس سے ایک دفعہ پھر ہرمزان آمادہ جنگ ہوگیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے عامل کوفہ حضرت سعد کو لکھا کہ نعمان بن مقرن کی ماتحتی میں بھاری لشکر بھیجیں۔ اور ابوموسیٰ اشعری کو جو اس وقت بجائے عتبہ کے بصرہ کے گورنر تھے لکھا کہ ایک بڑی جمعیت بصرہ سے بھیجی جائے اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ بصرہ اور کوفہ کے دونوں لشکروں کے سپہ سالار ابوسبرۃ بن ابی رہم بنائے جائیں۔ اس دفعہ ہرمزان نے جان توڑکر مقابلہ کیا۔ کیونکہ فارس کا بیشمار لشکر اس کی امداد کیلئے تھا۔ ادھر باشندگانِ ملک باغی ہوگئے تھے مسلمانوں کے نامی اور مشہور بہادر اس معرکہ میں شہید ہوئے مگر انجام کار ہرمزان کو ہزیمت

ہوئی اور وہ تستر میں جاکر پناہ گزین ہوا۔ چند ماہ محاصرہ جاری رہا۔ دوران محاصرہ میں مسلمانوں کے چند سر برآوردہ اور نام آور شہسوار شہید ہوئے۔ برا بن مالک جو یمامہ کے معرکہ میں شہرت حاصل کر چکے تھے اور مجزرۃ بن ثور کو خود ہرمزان نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ اس درمیان میں ایک شخص نے نعمان بن مقرن کو شہر میں داخل ہونیکے کے خاص راستہ سے اطلاع دی اور چند بہادروں نے داخل ہوکر شہر پر قبضہ کر لیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حقیقی اتحاد و اتفاق کے ساتھ صوری و ظاہری یکجہتی و مساوات اس درجہ مرغوب و محبوب تھی کہ نماز کی صفوں میں ذرا سے تفاوت کو کہ کسی کا سینہ نکلا ہوا ہو یا قدم آگے پیچھے ہو جائے ہرگز گوارا نہ فرماتے تھے اسکے خلاف کرنیوالوں کیلئے سخت تہدیدی احکام جاری فرمائے۔ فرمایا:۔

لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوهِكُمْ — (مسلمانو! یا تو نماز میں اپنی صفیں سیدھی کیا کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں میں مخالفت پیدا کریگا۔

حاصل یہ کہ اگر صفیں سیدھی نہ کرو گے اور قیام نماز کی حالت میں تم ایک سیدھ میں نہ ہوگے تو اندیشہ ہے کہ تم میں نفاق و اختلاف پیدا ہو جائے۔ یا اس سے بڑھکر سزا یہ ملے کہ چہرے مسخ ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ کے ارشاد نے حکمتوں کے دروازے کھولدیئے آپنے اول تو یہ فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں باوجود فریقین کی باطل پرستا اور تعداد میں مساوی ہونیکے کامیابی و نصرت کا سہرہ اہل فارس کے سر پر اس لئے بندھا کہ وہ ایک حکومت کے تابع ایک اشارہ پر چلنے والے تھے۔

اور اسی ارشاد سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ باوجود اسلام کے آسمانی مذہب ہونے اور مسلمانوں کے حق پرست ہونیکے اُن کی کامیابی کا ظہور بھی اتفاق و اتحاد ہی کی صورت میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ قوموں کی ترقی و تنزل کا راز اتفاق میں مضمر ہے اور نااتفاقی کو ادبار و ذلت لازم مسلمان جہاں اپنے مذہب سے بے خبر ہو کر آسمانی برکات کو کھو بیٹھے اور اصول شریعت کو چھوڑ کر عقل نارسا کی بدولت فیشن کے تابع ہو گئے۔ مادیات کی پرستش میں لگ گئے۔ وہیں اتفاق کی لازوال

دولت کو بھی کھو بیٹھے اور اسی وجہ سے فقر و ذلت کے گڈھے میں گرتے چلے گئے۔ اور چلے جاتے ہیں۔

حضرت عمر نے ہرمزان سے فرمایا کہ تیرے پاس بار بار عہد شکنی اور مسلمانوں کے اذیت پہنچانے انکو قتل و ہلاک کرنے کا کیا جواب اور کیا عذر ہے۔ ہرمزان نے کہا میں بوجہ اندیشۂ قتل اپنا عذر و جواب بیان نہیں کر سکتا۔ اگر آپ امن دیں تو بیان کروں۔ آپنے فرمایا۔ لا تخف (اندیشہ مت کرو) اس کے بعد اس نے پینے کیواسطے پانی طلب کیا۔ جو ایک بھدّے بدہیئت لکڑی کے پیالہ میں لاکر دیا گیا اس نے کہا اگر میں پیاس سے مر بھی جاؤں گا تب بھی ایسے پیالہ میں نہیں پی سکتا۔ اس پر اسکی مرضی کیموافق گلاس میں لاکر پانی دیا گیا۔ اس نے گلاس ہاتھ میں لیکر سخت مضطربانہ انداز سے کہا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ پانی پینے کی حالت میں قتل نہ کر دیا جاؤں۔ آپ نے فرمایا:۔

لَا بَاسَ عَلَيْكَ حَتّٰى تَشْرَبَهٗ (پانی پینے تک کچھ اندیشہ نہیں ہی)

ہرمزان نے یہ سن کر پانی گرا دیا۔ آپنے فرمایا۔

أَعِيدُوا عَلَيْهِ وَلَا تَجْمَعُوا عَلَيْهِ بَيْنَ الْقَتْلِ وَالْعَطَشِ (اس کو اور پانی دیدو۔ پیاس اور قتل کو اس کے لئے جمع مت کرو)

ہرمزان نے کہا مجھے پانی پینا منظور نہیں۔ نہ پیاس ہے۔ مجھے تو اس بہانہ سے امن حاصل کرنا تھا آپنے فرمایا میں تجھے قتل کئے بغیر نہ چھوڑونگا۔ اس نے کہا آپ مجھے امن دیچکے۔ فرمایا ہرگز امن نہیں دیا۔ اس پر حضرت انس بولے۔ امیر المومنین یہ سچ کہتا ہے آپنے اسکو امن دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا میں براء بن مالک اور مجزاۃ بن ثور جیسے لوگوں کے قاتل کو امن دے سکتا ہوں۔ تم یا اسکی کوئی دلیل بیان کرو ورنہ تم کو بھی باطل کی تائید کی وجہ سے تنبیہ کی جائیگی حضرت انس نے فرمایا آپ اسکو فرما چکے ہیں

لَا بَاسَ عَلَيْكَ حَتّٰى تُخْبِرَنِيْ وَلَا بَاسَ عَلَيْكَ حَتّٰى تَشْرَبَهٗ۔ (جبتک تو بیان نہ کردے کچھ اندیشہ نہیں۔ اور جبتک پانی نہ پی لے کچھ اندیشہ نہیں)

دوسرے حاضرین مجلس نے بھی حضرت انس کی تائید کی۔ اس پر حضرت عمر نے سکوت فرمایا۔ اور ہرمزان

سے ارشاد فرمایا۔

خَدَعْتَنِیْ وَلَا انْخَدِعُ اِلَّا لِمُسْلِمٍ (تو نے مجھے دھوکہ دیا اور میں تو کسی مسلمان ہی کے دھوکہ میں آ سکتا ہوں)

ہرمزان اس تدبیر سے امن حاصل کرکے مطمئن ہونیکے بعد مسلمان ہو گیا۔ اور حضرت عمرؓ نے اسکے واسطے عطا میں وہ درجہ مقرر فرمایا جو بڑے رتبہ والے مسلمانوں کے واسطے تھا۔ یعنی دو ہزار والوں میں نام لکھا گیا۔ اس عجیب و غریب واقعہ سے چند نتیجے حاصل ہوتے ہیں۔

نتیجہ اوّل۔ اہل فارس آخر دم تک مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی کوشش کرتے رہے کسی ممکن اور مناسب موقع پر مقابلہ سے درگذر نہ کیا۔ مغلوب ہو کر صلح کر لیتے تھے اور وقت ہاتھ آتے ہی آمادہ جنگ ہو جاتے تھے۔

نتیجہ دوم۔ مسلمان جس ملک اور جس علاقہ کو فتح کرتے تھے تمدن و تہذیب پھیلاتے جاتے تھے اور ملک آباد کرکے گلزار بنا دیتے تھے۔ ایک جگہ کو جب تک باقاعدہ متمدن نہ بناتے آگے نہ بڑھتے

نتیجہ سوم۔ مسلمانوں کی امن پسندی۔ خونریزی۔ اور ان کا اتلاف نفوس سے پرہیز و اجتناب اس درجہ تسلیم ہو چکا تھا کہ انکے مخالف اور سخت پولیٹکل مجرم بھی حیلے بہانوں کے ساتھ نفع اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہرمزان کو اپنے جرم کا حال معلوم تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نقض عہد اور جلیل القدر اصحاب کو قتل کی سزا کبھی قتل سے ورے نہ ہوگی حضرت عمرؓ بھی پہلے سے ارادہ اس کے قتل کا کر چکے تھے۔ مگر بایں ہمہ ہرمزان نے ایک نہایت پوچ حیلہ سے امن حاصل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چونک کر فرمانا کہ میں نے ہرگز امن نہیں دیا۔ بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ متکلم اپنی مراد و مطلب کو خوب سمجھتا ہے۔ کلام کا مطلب ظاہر تھا کہ اس پانی کو پینے تک اندیشہ نہیں یعنی اگر پینا چاہے تو اندیشہ نہیں یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ جبتک پانی نہ پیئے۔ چاہے ساری عمر نہ پیئے تب بھی اندیشہ نہیں ہے۔ ہرمزان تو حیلے چالاکی سے کام لینا چاہتا تھا اور صحابہ بھی اس کو خوب سمجھتے تھے۔ مگر ان کو تو حضرت عمرؓ کے وہی فقرے یاد تھے جو امان العبد کے عنوان میں بیان ہو چکے ہیں کہ وفاء عہد میں غلطی کر گزرنا یہ اس سے بہتر ہے

کہ نقض عہد میں غلطی کرو یعنی اگر شبہ بھی ہو کہ عہد ہو چکا ہے تو اُسکو پورا کرو۔ اس لئے اُنہوں نے احتیاط کی جانب اختیار فرما کر ہرمزان کی تائید کی اور حضرت عمرؓ کو بھی ماننا پڑا اور اس چالاکی سے ہرمزان نے امن حاصل کیا۔ لیکن اسلام کی محبت اُس کے دل میں آ چکی تھی۔ گو حب ریاست اس کو مانع آتی تھی۔ مگر ابتداء سے مسلمانوں کے حال دیکھتا تھا۔ اور راستہ کی طویل صحبت میں اور بھی خوب جانچنے کا موقع ملا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے پر حضرت عمرؓ کے حالات دیکھ کر تو بول ہی اُٹھا کہ کیا یہ نبی ہیں۔ مگر چونکہ وہ ایک بہادر خاندانی نواب تھا اُس کو یہ گوارا نہوا کہ اسلام لانا خوف پر محمول ہو اس لئے مامون اور مطمئن ہو کر مسلمان ہوا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس احساس و میلان باطنی کا ادراک کر لیا اور فرمایا۔

دَرِّ الخدع الا لمسلم

ظاہر ہے کہ ہرمزان کی تدبیر کارگر ہو چکی تھی۔ صحابہ کی تائید سے حضرت عمرؓ بھی تسلیم فرما چکے اور اُسکو امن دے چکے تھے۔ پھر اس فرمانے کا مطلب کیا تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اگر تو مسلمان نہوا تو قتل کر دیا جائیگا۔ یہ امر تو خود آپکی عام ہدایت کے مخالف تھا۔ بلکہ ان الفاظ سے آپنے لطیف پیرایہ میں اپنی فراست کا اظہار فرمایا جس کا ظہور یہ ہوا کہ وہ اُسی وقت مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہو جانیکے بعد نہ صرف سابق تمام جرموں سے درگذر ہوئی بلکہ اُس کو اُسی اعزاز سے اپنے گروہ میں داخل کیا گیا۔ جیسا کہ اپنے خاندان کے اعتبار سے تھا۔

کیا ایسے صریح اور صحیح واقعات کے بعد بھی کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اسلام بزور پھیلایا گیا۔ مسلمانوں نے کسی ایک فرد کو بھی گو وہ ان کے قابو اور اختیار ہی میں کیوں نہو۔ اسلام لانے پر مجبور کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ہرمزان کا مقتول ہونا

ہرمزان جس تدبیر سے امن حاصل کر کے باطمینان و اختیار مسلمان ہوا اُسکو تو ہم مفصل بیان کر چکے لیکن اُس کے قتل کا واقعہ بھی اسلامی تاریخ میں مہتم بالشان واقعہ ہے جس کی بدولت دو جلیل القدر خلفاء اسلام میں اختلاف رائے ہوا۔ اگرچہ واقعہ قتل کو ہمارے عنوان اشاعت سے تعلق نہیں ہے۔ مگر اوّل تو اس وجہ سے کہ ہرمزان کے ابتدائی حال کی ساتھ اُسکے خاتمہ کا تذکرہ بھی ایک قسم کی مناسبت رکھتا ہے۔ علاوہ بریں چونکہ اس

بیان میں بہت سی ایسی مفید باتیں لکھی جائیں گی جن سے اصل عنوان کی تائید ہوگی اور مسلمانوں کے ذاتی محاسن اور شریعت کے پاک قوانین پر روشنی پڑے گی۔ اس لئے ہم اُس کو بھی لکھ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اُس کے قتل کا تعلق امیر المومنین حضرت عمرؓ کی شہادت سے ہے۔ اس لئے وہیں سے مضمون کو شروع کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے قلب میں دو خیال جو بظاہر متضاد معلوم ہوتے تھے جمع تھے۔ اور شہادت کا شوق۔ اُدھر مدینہ منورہ میں وفات اور حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو مبارک میں دفن ہونا اور اس لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللّٰھمّ ارزقنی شھادۃً فی سبیلک (الٰہی مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب فرما۔ اور میری
واجعل موتی فی بلد رسولک (موت اپنے رسول کے شہر میں مقرر فرما)

ظاہر ہے کہ شہادت کی تمنا اس کی مقتضی تھی کہ آپ مدینہ منورہ سے دور معرکہ کارزار میں جان دیتے اور مدینہ میں وفات کی خواہش کا تقاضا یہ تھا کہ آپ بستر مرگ پر وفات پاتے مگر حق تعالیٰ نے آپ کی دونوں آرزوؤں کو پورا فرمایا جس کی ظاہری صورت یہ پیش آئی۔ مغیرہ بن شعبہ کے پاس ابو لولوہ نام ایک غلام تھا جو عیسائی مذہب رکھتا تھا اور روم سے اسیر ہو کر آیا تھا۔ مگر اصل سے فارسی تھا۔ کسی زمانہ میں اہل روم اُس کو اسیر بنا کر لے گئے تھے۔

یہ غلام اپنے موجودہ مذہب پر پختگی سے قائم رہنے کے ساتھ قومی تعصب اور حمیت کو بھی پوری طرح دل میں لئے ہوئے تھا۔ نہاوند کا سخت معرکہ ختم ہو کر بہت سے قیدی جب مدینہ منورہ لائے گئے تو ابو لولوہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ قیدیوں میں سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا تھا اور کہتا تھا۔

اکل عمر کبدی (عمر نے میرا جگر کھا لیا)

مگر باوجود ان خیالات کے مسلمانوں میں ہر کہ بے خوف و خطر نہایت آزادی سے زندگی بسر کرتا تھا۔ آدمی بہت ہوشیار اور طرح طرح کی صنعت و دستکاریوں میں ماہر تھا۔ اُس کے

سو لی مغیرہ بن شعبہ نے پوری آزادی دیکر دو درہم یومیہ کا ٹکس اُس پر لگا دیا تھا۔ ایسے صناع اور ماہر پر دو درہم یومیہ کچھ بھی نہ تھے۔ مگر اس پر بھی اُس نے یہ دیکھ کر کہ اسلامی عدالت میں ہر شخص نہایت آزادی کے ساتھ عرض معروض کر سکتا ہے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے آقا مغیرہؓ سے کہکر محصول کم کرا دیا جاوے۔ حضرت عمرؓ نے سُنکر دل میں تو یہ ارادہ فرما لیا کہ مغیرہؓ سے کمی کی سفارش کر دیں گے۔ مگر اُس سے فرمایا کہ تجھکو تو بہت سی صنعتیں آتی ہیں یہ محصول زیادہ نہیں ہے۔ اور پھر فرمایا میں نے سُنا ہے تو ایسی چکی بنا سکتا ہے جو ہوا کے ذریعہ سے آٹا پیسے۔ اگر ایسا ہے تو مسلمانوں کیلئے ایک چکی بنا دے۔

ابو لؤلوہ نے کہا بیشک ایسی چکی آپ کیلئے بنا دونگا جس کا چرچا مشرق و مغرب میں ہو جائیگا اُس نے اس گفتگو میں آپ کو قتل کر دینے کی دھمکی دی تھی اور آپ بھی اُسکو فوراً سمجھ گئے۔ چنانچہ اُس کے چلے جانیکے بعد فرمایا۔

لقد اوعدنی العبد الآن (غلام مجھکو قتل کی دھمکی دیکر گیا ہے۔)

مگر اس پر اُس سے کسی قسم کی نباز پرس کی اور نہ اُس کو نظر بند کیا اور نہ اپنی حفاظت کا خاص سامان کیا۔

اس گفتگو سے اگلے روز کعب احبار آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ آپ کی وفات کے صرف تین دن باقی ہیں۔ جو کچھ وصیتیں کرنی ہیں کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہا توراۃ میں ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا توراۃ میں عمرؓ کا نام ہے کہا نام تو نہیں۔ مگر جو علامات ہیں وہ سب آپ پر منطبق ہیں۔ اگلے روز کعب نے آکر پھر کہا کہ اب دو روز باقی رہ گئے ہیں۔ دوسرے روز آکر کہا اب صرف ایک روز رہ گیا۔ حضرت عمرؓ بالکل تندرست تھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ تین دن ختم ہو جانیکے بعد صبح کی نماز کیلئے تشریف لیگئے۔ نماز غلس سے یعنی اندھیرے سے شروع ہوتی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ تھا کہ مصلے پر پہنچکر دو نو طرف صفوں کو سیدھا کرنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔

ابولؤلؤہ اندھیرے سے اول صف میں قریب مصلے مسلمانوں میں مل جلکر کھڑا ہوگیا جب آپ مصلی پر پہنچے اور تسویۂ صفوف کیلئے فرمایا تب اُس نے آپ پر دو دھارے خنجر سے جو زہر سے بجھایا ہوا تھا حملہ کیا اور چھ زخم لگائے آپ وہیں گر گئے۔ ابولؤلؤہ نے اور بھی کئی مسلمانوں کو شہید کیا۔ بالآخر ایک مسلمان نے اُس پر اپنی بارانی کوڈالدیا۔ ابولؤلؤہ نے یہ سمجھ کر کہ میں گرفتار ہوگیا اُسی خنجر سے اپنا کام تمام کرلیا۔

حضرت عمر نے اُسی وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنا امام بنادیا۔ نماز اختصار کے ساتھ پورا کرنے کے بعد آپکو مکان پر لیگئے۔ صحابہ پر اور تمام مسلمانوں پر صدمے کی یہ کیفیت تھی کہ گویا آجتک اُن پر اس قسم کی کوئی مصیبت پیش نہیں آئی۔ اور اُن کا صدمہ حق بجانب تھا۔ دوربین اور خواص حضرات تو جانتے تھے کہ آپکی بابرکت زندگانی فتن اور حوادثات کیلئے سدِراہ ہے۔ آپ کا اس عالم سے اُٹھ جانا اور مسلمانوں میں اختلاف وفتن کا ظہور پذیر ہونا گویا لازم وملازم ہیں۔ مگر وہ طبقہ جو ان احساسات سے خالی الذہن لیکن آپ کے عدل ورافت عام کے خوشگوار سایہ میں تربیت پا رہا تھا اُس پر خواص سے زیادہ اس صدمہ کا اثر تھا۔

امتثال احکام شرع کی بناء پر بظاہر گو صبر وسکون تھا۔ مگر دلوں میں قلق واضطراب کے دریا موجزن تھے۔ چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حسرت ویاس اندیشہ واضطراب کا سماں بندھا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی۔ مگر حضرت عمرؓ کو نہ اپنی جان کا کچھ خیال تھا اور نہ ان مہلک زخموں کی تکالیف پر کچھ اظہار کلفت۔ بلکہ وہی مسلمانوں کی محبت وہمدردی اب بھی اُنہیں مشغول کئے ہوئے تھی۔ اوّل فکر تو یہ تھا کہ میرا قتل کسی مسلمان کے ہاتھ سے تو نہیں ہوا۔ مبادا میری وجہ سے کوئی مسلمان عذاب میں مبتلا ہو۔ چنانچہ آپ نے گھر پہنچے پر اپنے صاحبزادے عبداللہ کو بُلا کر یہ کہا۔ دیکھو مجھکو کس نے قتل کیا۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ ابولؤلؤہ غلام مغیرہ نے۔ فرمایا کہ وہی صناع وکاریگر۔ عرض کیا گیا کہ وہی۔ فرمایا:۔

الحمد للہ الذی لم یجعل منیتی بید — خدا کا شکر ہے اُس نے میری موت ایسے شخص کے

رجل سجد للہ سجدۃ واحدۃ — ہاتھ نہیں جس نے ایک سجدہ بھی اللہ کیواسطے کیا ہو۔

لیکن ابھی یہ فکر باقی تھا کہ شاید کوئی مسلمان اس مشورہ میں شریک ہو۔ اس لئے جب انصار و مہاجرین عیادت کی غرض سے آتے تھے تو آپ پوچھتے تھے۔

اعن ملأ منکم کان ھذا — کیا تمہاری جماعت کے مشورہ و اتفاق سے یہ فعل ہوا

وہ فرماتے تھے معاذ اللہ — (خدا کی پناہ ہم ایسا کیونکر کرسکتے تھے)

اس سے مطمئن ہو کر سب سے اہم امر کی طرف متوجہ ہوئے اور خلافت کا معاملہ اُن چھ اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کردیا جن سے آخر دم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی اور خوش رہے۔ اسی درمیان میں کعب احبار بھی بغرض عیادت آئے تو آپ نے اُنکو دیکھ کر فرمایا۔

فاوعدنی کعب ثلاثا اعدھا — ولا شک ان القول ما قال لی کعب

مجھکو کعب نے تین دن کے اندر مرنیکی خبر دی جسکو میں شمار کرتا تھا — اس میں شک نہیں بات وہی تھی جو کعب نے کہی تھی

ومالی حذار الموت انی میت — ولکن حذار الذنب یتبعہا ذنب

موت کا تو کچھ ڈر نہیں تھا کیونکہ میں مرنیوالا تھا — ہاں گناہوں کا خوف تھا جو یکے بعد دیگرے ہوتے ہیں

ایک مرتبہ اسی حالت میں فرمایا۔

ظلوم لنفسی غیر انی مسلم — اصلی الصلوٰۃ کلہا واصوم

اپنے نفس کیلئے بڑا ظالم ہوں۔ مگر ہاں مسلمان ہوں — نمازیں سب پڑھتا ہوں اور روزے سب رکھتا ہوں

اس کے بعد آپ آخر تک تسبیح و تہلیل و ذکر میں مشغول رہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

بڑے صاحبزادے عبد اللہ تو آپکے قدم بقدم جھگڑے اور فتنہ سے دور رہنے والے اور مسلمانوں میں کسی قسم کے اختلاف پیدا کرنے یا کسی اختلاف اور نزاع میں شرکت سے پرہیز کرنے والے تھے۔ حدود شرع سے ایک انچ اِدھر اُدھر قدم رکھنے والے نہ تھے اسلئے آپ تو باپ کی مفارقت اور ایک نصرانی غلام کے ہاتھ سے قتل ہونیکو جو فی الحقیقت ناقابل برداشت صدمہ تھا صبر و استقلال سے ضبط کئے ہوئے کو وقار بنے رہے تھے کوئی حرف زبان سے الیسانہ نکلا

جو خلاف شان ہوتا۔ کوئی حرکت ایسی نہ کی جس سے اضطراب معلوم ہوتا۔ مگر چھوٹے صاحبزادے عبیداللہ کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ضبط سے گذرے ہوئے تھے۔ اُنکو یہ بھی وہم تھا کہ میرے باپ کا قتل گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے وہ کہتے تھے۔

واللہ لاقتلن رجالا ممن شرک فی قتل ابی (خدا کی قسم میں اُن لوگوں کو قتل کرونگا جو میرے باپ کے قتل میں شریک ہوئے)

اسی غم و غصہ میں ابو لؤلؤہ کی بیٹی کو قتل کر دیا۔ عبدالرحمن ابن ابی بکر نے بیان کیا کہ میں نے ابو لؤلؤہ اور حنیفہ (نصرانی غلام تھا) اور ہرمزان کو باہم سرگوشی کرتے دیکھا تھا مجھکو دیکھ کر بھاگ گئے اور اُن کے پاس سے ایک خنجر گرا جس کی دونوں طرف نوکیں تھیں۔ یہ وہی خنجر تھا جس سے حضرت عمرؓ شہید کئے گئے تھے۔ یہ سننا تھا کہ عبیداللہ نے حفینہ اور ہرمزان کو بھی جاکر قتل کر دیا۔ اور ابھی ان کا غصہ فرو نہ ہوا تھا معلوم نہیں اس شبہ میں کس کسکو قتل کرتے مگر حضرت سعدؓ نے اُن کو گرفتار کر کے اپنے یہاں نظر بند کر دیا۔

خلافت کا معاملہ جب طے ہو چکا اور حضرت عثمانؓ خلیفہ تسلیم کر لئے گئے بیعت عامہ ہو چکی تو سب سے پہلے عبیداللہ کا ہی معاملہ پیش ہوا۔ حضرت عثمان نے فرمایا۔

اشیروا علی فی ھذا الرجل الذی فتق فی الاسلام ما فتق (مجھے اُس شخص کے بارہ میں جس نے اسلام کے اندر ایسا بڑا رخنہ ڈالا مشورہ دو کیا کروں)

یعنی اس شخص نے جو بیگناہ صغر سن بچی کو اور ایک نصرانی کو جو ہمارے عہد میں تھا اور ایک مسلمان کو بلا ثبوت قتل کر دیا اور اسلام کے اندر بڑا رخنہ ڈالا کیا کیا جائے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا قصاص لیا جائے۔ بعض مہاجرین بولے یہ امر بھی نازیبا معلوم ہوتا ہے کہ کل تو عمرؓ شہید ہوئے تھے اور آج اُن کا بیٹا قتل کیا جائے۔ اسمیں اختلاف رائے ہوا تو عمرو بن العاص نے کہا کہ امیر المومنین یہ قتل ایسے وقت ہوا کہ آپکو مسلمانوں پر تسلط نہ تھا۔ اس لئے آپ

اگر قصاص جاری نکریں تو گنجایش ہے۔ حضرت عثمانؓ نے سب کی رائیں سن کر اور صحابہ کے عام خیالات کا اندازہ کر کے حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ کو ایسے وقت کہ ابھی وہ شہید ہو چکے ہیں قتل کرنیکو پسند نہیں کرتے فرمایا کہ میں خلیفہ ہوں اور مجھکو ولایت حاصل ہے اسلئے میں قصاص سے درگذر کر کے مقتولین کی دیت اپنے مال میں سے ادا کرتا ہوں مگر حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کو پسند نہیں کیا۔ اور اپنے زمانہ خلافت میں ارادہ قصاص لینے کا فرمایا۔ عبید اللہ اسی خوف سے شام چلے گئے اور امیر معاویہ کی رفاقت کا دم بھرنے لگے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ اور صدر اوّل کے مسلمانونکا دینی امور میں اہتمام کس قدر بڑھا ہوا تھا۔ اور اُن کی استقامت کس درجہ پر تھی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت معمولی واقعہ نہ تھا۔ اور وہ بھی اندھیرے میں مسجد کے اندر اور عین نماز کیوقت۔ اوّل تو یہ بالکل ممکن تھا کہ ایک ایسے اچانک اور مخفی حملہ کی وجہ سے جسکی نسبت یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حملہ آور کون ہے تنہا ہے یا جماعت ہے۔ اور یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تنہا حضرت عمر ہی مقتول ہیں یا اور بھی خصوصاً جبکہ حضرت عمرؓ کے ساتھ کئی شخص مقتول و مجروح ہوئے ہوں۔ یہ خیال پختہ ہو سکتا تھا کہ بہت سے آدمی اسی ارادہ سے آئے ہوں اور اُن کا مطمح نظر صرف ایک ایک ذات واحد نہو بلکہ اور بھی چیدہ مسلمانوں کا خاتمہ کر دینا مدنظر ہو۔

ایسی حالت میں بالکل ممکن تھا کہ بہت سے لوگ خصوصاً وہ جو پچھلی صفوف میں تھے گھبرا کر مسجد سے نکلجاتے اور جیسا کہ ایک ایسی مبہم اور گول مول حالت میں اضطراب ہونا چاہیے تھا پیش آتا لیکن تمام مسلمان ایسی حالت پر باطمینان کھڑے رہے صفوف کی ترتیب میں فرق نہ آیا اگلی ہی صف میں سے بعض حضرات نے اپنا برنس ڈالکر ابو لولو کو گرفتار کرلینا چاہا اور اُسنے خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ زخمی ہو کر گر گئے مسلمانوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر کیا ممکن تھا کہ ایسے سخت وقت میں بھی دین کے رکن اعلیٰ نماز میں کچھ فرق پڑتا۔ حضرت عمر اسی جگہ لیٹے ہے اور حضرت عبد الرحمن بن عوف نے آگے بڑھ کر نماز پڑھا دی ایسے اضطراب میں نماز کا وقت بھی مؤخر ہو جانا

قریب الوقوع تھا۔ مگر ہرگز ایسا نہ ہوا۔ یہ تھا صحابہ کا انہماک امور دین میں اور یہ تھی اُن کی استقامت جس سے ہمکو سبق لینا اور اُن کے افعال کو مشعل راہ بنانا چاہئے۔

یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت عمرؓ کو سوائے ایک درد کے دوسرا کوئی درد نہ تھا وہ ہر وقت ایک ہی فکر میں مشغول تھے اپنی زندگی صحت اور عافیت کے زمانہ میں بھی وہی خیال تھا جو سب خیالوں پر غالب تھا اور زخموں کی بیچینی میں جبکہ موت سامنے کھڑی تھی وہی ایک مسلمانوں کی بہبودی اور خیر خواہی کا خیال پیش نظر تھا اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا فکر تھی تو صرف یہ کہ کوئی مسلمان تو میرے قتل میں ملوث ہوکر مستوجب عذاب نہیں ہوا۔ اللہ اکبر یہ ہمدردی اور دلسوزی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے اوصاف کو کھودیا ہے جس سے اُنکی حالت تباہ و برباد ہے ان میں ہمدردی بھی ہے تو دینی نہیں بلکہ جس کا نام قومی رکھا گیا ہے اور جس کو مذہب سے بیگانہ اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔

ہمکو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جلیل القدر صحابہ کا قدم توکل اور ایمان بالقدر پر کس قدر راسخ تھا۔ حضرت عمرؓ نے ابو لؤلؤ کی تہدید کا منشا اور نتیجہ اُسی وقت سمجھ لیا تھا۔ آپ کو دوسرے ذرائع سے بھی علم تھا کہ میں ضرور شہید ہونگا۔ اور آپکا یہ فرمانا۔

لَقَدْ اَوْعَدَنِیْ الْعَبْدُ الْاٰنَ (غلام ابھی دھمکی دیکر گیا ہے)

بتلا رہا ہے کہ ابو لؤلؤہ کے قاتل ہونیکا بھی یقین تھا مگر چونکہ ادھر تو توکل کامل اُدھر ایمان بالقدر پورا اس لئے باوجودیکہ ابو لؤلؤہ پر سیاستاً نگرانی قائم کردینے کا حق حاصل تھا کچھ انتظام نہیں فرمایا۔ اپنی حفاظت بھی فرماتے تو کسی قسم کا شرعی حرج نہ تھا لیکن تدبیر سے بھی تو تقدیر کے خلاف ہوتا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ میں اس مضمون کو بیان فرمایا گیا ہے۔

ایمان بالقدر کے معاملہ میں حضرت عمر کا درجہ چونکہ محض علم سے جو شرط ایمان ہی تجاوز ہوکر بمقام اور حال راسخ تک پہنچا ہوا تھا اس لئے اپنے قتل کے تیقن کے بعد بھی جو وجوہ آپکو حاصل تھا کسی قسم کی جنبش یا حرکت آپ میں پیدا نہیں ہوئی۔ کعب احبار روز آکر کہتے ہے کہ

اتنا وقت آپکی زندگی کا باقی رہگیا ہے۔ آخری دن بھی اطلاع دے گئے کہ صرف آت ہی رہگئی ہے۔ مگر نہ آپکی طبیعت پر خلجان تھا اور نہ کسی قسم کا اضطراب۔ نہ کسی تدبیر کے درپے ہوئے۔ نہ اپنی جان بچانے کی فکر کی۔ بلکہ حسب معمول اسی اطمینان و سکون کے ساتھ نماز کو تشریف لیگئے۔ یہ ہے حقیقی توکل اور یہ ہے ایمان بالقدر جو صحابہ کو حاصل تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کا واقعہ شہادت بھی بجنسہ ایسا ہی ہے۔ ابن ملجم مرادی جس کے ہاتھ آپ شہید ہوئے۔ قتل سے بلکہ قتل کے ارادہ سے بھی غالباً پہلے ایک مرتبہ آپکی خدمت میں اپنی ایک حاجت لیکر حاضر ہوا جس کو آپ نے پورا فرمانیکا حکم دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ یہ شخص میرا قاتل ہے۔ اور زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔

اُرِیْدُ حَیٰوتَہٗ وَیُرِیْدُ قَتْلِیْ | عَذِیْرُکَ مِنْ خَلِیْلِکَ مِنْ مُرَادِ

(میں اسکی زندگی چاہتا ہوں اور وہ میرے قتل کے درپے ہے۔ اس مرادی دوست کی ہمدردی پر مجھے کون معذور سمجھنے والا ہے)

کسی نے عرض کیا آپ اسکو قتل کیوں نہیں کر دیتے۔ فرمایا

فَمَنْ یَقْتُلُنِیْ | (مجھے کون قتل کریگا)

اور بعض روایات میں یہ لفظ ہیں۔

کَیْفَ اَقْتُلُ قَاتِلِیْ | (میں اپنے قاتل کو کیونکر قتل کروں)

اس ارشاد کا صاف مطلب یہ تھا کہ میرا قتل جس وقت اور جسکے ہاتھ سے تقدیر الٰہی میں مقرر و معین ہو چکا ہے اسکے خلاف ہرگز نہو گا۔ نہ میں اسکے سوا کسی اور کے ہاتھ سے قتل ہونگا اور نہ میں اسکے قتل کرنے پر قادر ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی حفاظت کیلئے کچھ انتظام نہیں فرمایا بلکہ شہادت کی گھڑی کا اشتیاق کیساتھ انتظار فرمانے لگے۔ اور محبت لقاء الٰہی کے غلبہ میں کئی روز سے غذا بھی تقریباً ترک کر دی۔ افطار کے بعد کبھی بڑے صاحبزادے کے یہاں اور کبھی چھوٹے صاحبزادے کے یہاں چند لقمے تناول فرما لیتے تھے اور فرماتے تھے میں چاہتا ہوں اپنے رب کے یہاں خالی پیٹ جاؤں۔

ابن ملجم کو بھی نہ نظر بند فرمایا۔ اور نہ قتل کا ارادہ کیا۔ کیونکہ آپکو خوب علم تھا کہ تقدیر کیخلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر باوجود اس علم و یقین کے بھی آپ اپنے تحفظ کی تدبیر فرماتے یا ابن ملجم پر بنا ٔ ظن نگرانی فرمادیتے تو ہرگز خلاف شرع نہوتا۔ اور نہ ایمان بالقدر کے منافی سمجھا جاتا۔ کیونکہ تقدیر پر ایمان کے ساتھ تدبیر اور ہر قسم کی تدبیر کرنیکی اجازت ہی بلکہ بعض موقعوں پر لازم و ضروری ہی۔

ایمان بالقدر بایں معنی کہ فاعل و متصرف ہر چیز میں جناب باری ہیں اور جو مقرر ہو چکا ہے اُسکے خلاف کسی تدبیر سے نہیں ہو سکتا ہر مسلمان پر فرض ہی فرق اتنا ہی کہ عوام کو درجہ علم میں یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور خواص کو علم سے متجاوز ہو کر ذوق و حال و شہود کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے اور اسی وجہ سے اُن کا توکل تام اور کامل ہوتا ہی۔ باایں ہمہ خواص کے اکثر افراد تدبیر مناسب اختیار فرمانے سے دریغ نہیں فرماتے۔

صحابہ میں توکل اور ایمان بالقدر علی تفاوت الدرجات کامل تھا مگر بایں ہمہ تدبیر اور عدم تدبیر میں اُن کے حالات مختلف ہیں۔ کبھی تدبیر کرتے ہیں اور کبھی ساقط التدبیر ہوجاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما محاربات اور انتظامات ملکی میں وہ تدبیر استعمال فرماتے تھے جن کی ایسے عظیم الشان خلفاء سے توقع رکھنی چاہیے اور اپنی خاص ذات کے بارہ میں ساقط التدبیر رہے لیکن دونوں حالتوں میں ایمان بالقدر یکساں تھا۔

تقدیر کا مسئلہ جیسا کہ شرط ایمان ہے ویسا ہی اُس کا سمجھنا ذرا دشوار بھی ہے۔ اکثر سطحی خیال اور بعض اپنی عقل ناتمام کے تابعین کو اس کے سمجھنے اور تقدیر و تدبیر کو جمع کرنے میں اشکال پیدا ہوتا ہی لیکن جو شخص قرآن و حدیث کی بیشمار نصوص و صحیح روایات پر مطلع ہے اور جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات و اعتقادات سے واقف ہی اُس کو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ تقدیر کی حقیقت کیا ہی اور یہ کہ تقدیر بایں معنی جو جمہور اہلسنت کا عقیدہ اور سلف صالح و آئمہ مجتہدین کا متفق علیہ ہے۔ بیشک شرط ایمان ہے۔ ایمان بلا اعتقاد مسئلہ تقدیر ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا اور یہ کہ تقدیر و تدبیر کے جمع ہونے میں عقلاً کوئی اشکال ہے۔ اور نہ شرعاً اس میں کسی قسم کی تنگی و حرج ہے۔

لیکن تعجب ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے رسالہ میں جس میں اسلام کے اصلی خط و خال حقیقی تصویر واقعی اور آج سے تیرہ سو سال پہلے اسلام کے اعتقادیات بیان کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہو اور جس کے اجراء سے مسلمانوں کا صراط مستقیم پر چلانا مقصود ہو دیکھتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے مختار کامل اور قادر مطلق ہیں۔ خدا تعالیٰ کو اُن کے اختیار میں کچھ دخل نہیں ہے تقدیر کا حاصل فقط یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے علم کامل و مطابق واقع کے موافق افعال عباد کی نظام اور ترتیب وقوعی کا کماحقہ علم ہے اُسکے خلاف خارج میں واقع نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کی مثال ریلوے ٹائم ٹیبل بنانے والوں کی سی ہے جس طرح وہ ریلوے لائینوں کے اوقات کو منضبط کر کے ٹائم ٹیبل بناتے ہیں اور اُسی نظام مرتبہ کیموافق ٹرینوں کی آمد و شد ہوتی ہے۔ مگر اُن کو ٹرین کے چلانے اور روکنے میں کچھ دخل نہیں ہے اس کا تعلق محض انجن ڈرایور سے ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا تعلق نظام افعال کے سلسلہ میں علم و انکشاف سے زیادہ نہیں ہے انسان جو اپنے اندرونی اسٹیم کارخانہ کا ڈریور ہے افعال کو صادر کرنے نہ کرنے کا مختار ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ٹائم ٹیبل بنانیوالوں کا علم چونکہ ناقص ہے حوادث و موانع اتفاقی تک اُسکی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے بسا اوقات اُس میں تفاوت ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا علم چونکہ ہر طرح کامل ہے۔ اُس میں احتمال خلاف کا نہیں ہے۔

یہ حاصل مطلب ہے اُس تقریر کا جو مسئلہ تقدیر کی تحقیق میں رسالہ تہذیب الاخلاق مطبوعہ امرتسر جلد ایک نمبر ۲ میں لکھی گئی ہے۔

باخبر حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ یہ تحقیق جو رسالہ مذکورہ میں مندرج ہے معتزلہ اور قدریہ کے مسلک کے موافق ہے قرآن و حدیث کی صاف و صریح ہدایات۔ قرن اول صحابہ سلف صالح اور جمہور اُمت کے عقیدہ سے مخالف ہے ہم کو خواہ مخواہ اس میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے لئے کسی مذہب کو پسند کرے۔ یا بزعم خود دلائل سے اُسکی ترجیح بھی ثابت کرے۔ لیکن گفتگو صرف اس میں ہے کہ اسلام کے اصلی خط و خال دکھلانے کے پردہ میں معتزلہ اور قدریہ کے مذہب کو رواج دیا جائے۔

مسلمانوں کی بدقسمتی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ کوئی ہمدرد اُنکی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتا ہے
مگر اُن کی شومی طالع سدراہ ہو جاتی ہے۔ اور مصلح کی سعی بھی بجائے مفید ہونیکے مضر ہو جاتی ہے
ہمیں نہیں معلوم کہ مسئلہ تقدیر کو اس پیرایہ میں جو اعتقادات اہلِ سنت سے مخالف ہو قرون
اولیٰ میں جس کا پتہ نہو۔ قرآن وحدیث جسکے خلاف شہادت دیتے ہوں بیان کرنے کا محرک کیا امر
ہوا ہے۔ اگر فقط یہی کہ تقدیر کو تدبیر کے منافی سمجھ لیا ہی یا یہ کہ لوگ تقدیر کی مجبوری کو آڑ بنا کر اخلاقی
کمزوریوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے کیرکٹر کے نقائص کو اس پردہ میں چھپاتے ہیں۔ تو میرے
خیال میں یہ بھاری غلطی کا ارتکاب ہی۔ تدبیر تقدیر کے منافی نہیں ہی۔ کوئی شخص شرعاً اس کا مجاز
نہیں کہ اپنے کیرکٹر کے نقائص کو اس پردہ میں چھپائے۔ یا افعال قبیحہ کے ارتکاب اور اخلاق
رویہ کے انہماک کیلئے مسئلہ تقدیر سے امداد لے۔ خداوند عالم بیشک افعال عباد کا خالق ہے
مخلوق جو کچھ کرتی ہے اُسی کے اختیار سے کرتی ہی اُس نے اپنے علم محیط و قدرت کاملہ سے افعال
عباد کو خاص نظام و ترتیب سے مقدر فرمایا ہے۔ مگر ساتھ ہی تدبیر کا بھی حکم دیا ہی بہت سے مواقع میں
ترک تدبیر قطعاً حرام ہے۔ اسی طرح تقدیر کے حوالہ سے اخلاقی کمزوریوں کے ارتکاب میں اقدام کرنا
یا اعمال حسنہ اور عبادات شرعیہ سے تقدیر کے بہانہ سے جان چرانا دونوں قطعی حرام ہیں کوئی شخص
حجت میں اُس کو پیش نہیں کر سکتا اور نہ کسی درجہ میں معذور سمجھا جا سکتا ہی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی یہ اشکال پیش آیا تھا کہ جب جنتی کا جنتی ہونا اور دوزخی کا دوزخی
ہونا پہلے سے مقرر ہو چکا ہے کوئی ساری عمر کیسے ہی عمل کرے ہوتا وہی ہے جو مقدر ہو چکا ہے تو
عمل کی کیا ضرورت ہی۔ تقدیر کے بھروسہ پر بیٹھ رہنا چاہیئے۔ اور اسی لئے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ
وسلم کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا۔ فَفِيمَ الْعَمَلُ (پھر عمل سے کیا فائدہ)

جواب میں ارشاد فرمایا:۔

اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ

عمل کرتے رہو کیونکہ ہر شخص کیلئے وہی کام سہل ہوتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہی۔

یعنی جو کچھ مقدر کیا گیا ہی اُس کا ترتب اعمال پر ہے اور اعمال علامت ہیں انجام نیک و بد کے صحابہ رضی اللہ عنہم کیلئے یہ مختصر و جامع ارشاد کافی ہو گیا۔ تقدیر و تدبیر جمع کرنیکی حقیقت اُنکی سمجھ میں آگئی۔ اس کے بعد اُن کو اس مسئلہ میں کبھی خلجان نہ ہوا اور نہ تدبیر کے استعمال میں کبھی متردد ہوئے۔

الغرض یہ سمجھ لینا کہ مسئلہ تقدیر کا اعتقاد انسان کو کاہل سُست نکما اور اپاہج بنا دیتا ہی مسلمانوں کے ادبار و تنزل کا سبب فقط یہی ایمان بالقدر ہے غلطی اور بھاری غلطی ہے۔ نہ اسلام کی یہ ہدایت ہے نہ مسلمانوں کا یہ طرز عمل اسلام نے بزور و تاکید ہر قسم کی تدبیر کے استعمال کا حکم دیا ہے مسلمانوں نے اپنے عروج و نمو کے زمانہ میں جبکہ ایمان بالقدر صدر اوّل کے دلوں پر استحکام کے ساتھ قابض تھا اور جبکہ ایمان بالقدر محض علم ہی کے درجہ تک محدود نہ تھا بلکہ شہود تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ تدبیریں کیں۔ وہ اُصول و قوانین وضع کئے۔ ایسے انتظامات جاری کئے جن کو آج تیرہ سو سال بعد بھی مشعل راہ بنانا ہر قسم کی فلاح و بہبود کی ضمانت کر سکتا ہی۔

خلفاء راشدین ایک طرف اگر انتظامات ملکی میں منہمک و مصروف رہتے تھے تو دوسری جانب تدابیر منزل سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک جانب اگر فنون جنگ میں جد و جہد ہو رہی تھی تو دوسری جانب اصول تمدن بنائے جاتے تھے۔

ہاں خواص اہلِ اسلام کا ایک طبقہ کسی وقت تدبیر کو ترک بھی کر دیتا اور ساقط التدبیر بنجاتا ہی مگر وہ نہ اسلام کے عام منافع اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے اسباب میں ترک تدبیر کا حکم دیتے ہیں اور نہ خود اس کا ارتکاب کرتے ہیں اور نہ عبادات و معاملات میں ترک تدبیر کو دخل دیتے ہیں بلکہ یہ طبقہ جس قدر ترقی کرتا جاتا اور مسئلہ القدر جتنا بھی زیادہ اُنپر منکشف ہو جاتا ہے اعمال صالح اور اخلاق حسنہ میں اُنکی جد و جہد بڑھتی جاتی ہی۔

البتہ ایسے معاملات میں جنکے اندر تدبیر و عدم تدبیر دونوں کی اجازت ہی اور جن کے نفع و ضرر کا تعلق عامہ مسلمین سے نہیں ہی تدبیر کو ترک فرماتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق جن کے حسنِ تدبیر اور بر وقت تدارک نے اسلام کو ایک سخت مہلک فتنہ سے بچا لیا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچنے سے ایسے اختلاف کی جڑ کاٹ دی جو قریب تھا کہ

مہاجرین و انصار میں پھوٹ پڑتا۔ اسلام کو سخت تزلزل اور نہایت خطرناک عقبات سے انہیں کی تدبیر نے نکالا۔ فتنہ ارتداد میں بڑے بڑے صحابہ کے متامل و متردد ہونیکے وقت انہیں کی استقامت و ثابت قدمی نے اسلام کے اُکھڑے ہوئے قدم جمائے فتوح شام و عراق اور ہر قسم کی انتظامات کی بنیاد آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے پڑی۔

بایں ہمہ تدبیر و ہوشمندی جب آپکو مرض وفات پیش آیا اور لوگوں نے عرض کیا۔

الا ندعو الطبیب	(کیا طبیب کو نہ بلا لائیں) آپ نے فرمایا
قد اتانی وقال لی انا فاعل لما اُرید فعلموا مرادہٗ فسکتوا	(طبیب میرے پاس آیا تھا اُس نے کہا کریں جو چاہوں گا کرونگا) (لوگوں نے آپ کا مطلب سمجھ کر سکوت کیا)

مطلب یہ تھا کہ حق تعالیٰ کا جو ارادہ میری ذات کے ساتھ متعلق ہو چکا ہے ہو کر رہیگا طبیب کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ نے اس وقت خاص اپنے بارہ میں تدبیر کو ساقط کردیا۔ اور علاج نہ کیا اس لئے کہ علاج کرنے اور نہ کرنے کا از روئے شرع آپکو اختیار تھا۔ اور عین ایسی حالت میں جبکہ آپ ساقط التدبیر بنے ہوئے تھے مسلمانوں کی فلاح کی فکر و تدبیر سے غافل نہ تھے آپ کو اس وقت یہ فکر درپیش تھا کہ مبادا میرے بعد خلافت کے معاملہ میں کچھ اختلاف ہو جائے اور مسلمانوں کو بیوقت فتنہ میں مبتلا ہونے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے اسلئے آپ اسکی تدبیر میں مشغول ہو گئے۔

حضرت عمرؓ سے بہتر کوئی دوسرا شخص آپ کے خیال میں اس منصب کیلئے موزوں نہ تھا مگر تنہا اپنی رائے سے ایسا کرنا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ حضرت عبد الرحمن بن عوف کو بلا کر اس بارہ میں مشورہ کیا۔ اُنھوں نے فرمایا آپ کا حسن ظن جس قدر اُن کی جانب ہے وہ اُس سے بھی بہت بڑھے ہوئے ہیں البتہ مزاج میں ذرا سختی و درشتی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ درشتی اس لئے ہے کہ مجھکو نرم دیکھتے ہیں میں نے خوب آزما لیا ہے۔ کہ جب مجھے زیادہ نرمی کرتے دیکھتے تھے تو وہ سخت بن جاتے تھے اور جب مجھے ذرا غصہ میں دیکھتے تھے تو نرمی کا پہلو اختیار کر لیتے تھے مستقل خلیفہ ہو کر درشتی نہ کرینگے۔

اس کے بعد حضرت عثمان کو بلا کر مشورہ کیا۔ اُنہوں نے کہا۔

سَرِیْرَتُهٗ خَیْرٌ مِّنْ عَلَانِیَتِهٖ وَلَیْسَ فِیْنَا مِثْلُهٗ	(اُن کا باطن ظاہر سے بھی زیادہ اچھا ہے اور اب ہم میں اُن کی مثل کوئی نہیں ہے)

دونوں صاحبوں سے مشورہ لیکر آپ نے فرمایا:۔

لَا تَذْکُرَا مِمَّا قُلْتُ لَکُمَا شَیْئًا وَلَوْ تَرَکْتُهٗ مَا عَدَوْتُ عُثْمَانَ وَالْخِیَرَةُ لَهٗ اَنْ لَا یَلِیَ مِنْ اُمُوْرِکُمْ شَیْئًا۔ وَلَوَدِدْتُ اَنِّیْ کُنْتُ مِنْ اُمُوْرِکُمْ خِلْوًا۔	(میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ اور اگر میں عمر کو چھوڑتا تو عثمان کو اختیار کرتا۔ اور بہتر اُن کیلئے یہی ہے کہ تمہارے معاملات میں سے کسی بات کے ذمہ دار نہ بنتے۔ میں چاہتا تھا کہ ان معاملات کی ذمہ داری سے بری رہتا)

اس گفتگو کے بعد طلحہ بن عبید اللہ تشریف لائے اور فرمایا کیا آپ نے عمرؓ کو خلیفہ بنایا ہے آپ کی موجودگی میں اس قدر متشدد ہیں تو مطلق العنان ہو کر کیا نہ کریں گے۔ آپ کو خدا کے یہاں اس کی جوابدہی کرنی ہوگی۔

آپ نے یہ گفتگو سُن کر فرمایا۔ مجھ کو بٹھلا دو۔ بیٹھ گئے تو فرمایا۔

اَبِاللّٰهِ تُخَوِّفُنِیْ اِذَا لَقِیْتُ رَبِّیْ فَسَاَلَنِیْ قُلْتُ اِسْتَخْلَفْتُ عَلٰی اَهْلِكَ خَیْرَ اَهْلِكَ	(کیا اللہ کے خوف سے مجھ کو ڈراتے ہو۔ جب میں اپنے رب کے پاس جاؤں گا۔ اور مجھ سے سوال ہوگا تو کہدوں گا کہ تیری مخلوق پر سب سے بہتر کو خلیفہ بنا کر آیا ہوں۔

یہ باتیں ہو چکیں تو حضرت عثمان کو عہد نامۂ خلافت عمری لکھوانے کیلئے تنہائی میں بلایا اور فرمایا لکھو۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

هٰذَا مَا عَهِدَ اَبُوْبَکْرِ ابْنُ اَبِیْ قُحَافَةَ اِلَی الْمُسْلِمِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ	(یہ وہ عہد نامہ ہے جو ابو بکر ابن ابی قحافہ نے مسلمانوں کیلئے لکھا۔ بعد حمد و صلوٰۃ کے،

اس قدر لکھوانے پائے تھے کہ آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ لیکن حضرت عثمان کو چونکہ منشا

معلوم تھا۔ اس لئے اما بعد کے بعد یہ عبارت تحریر فرما دی:۔

فَاِنِّیْ قَدِ اسْتَخْلَفْتُ عَلَیْکُمْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَلَمْ اٰلُکُمْ خَیْرًا۔ | (یعنی کہ میں نے عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنایا۔ اور تمہاری خیراندیشی میں کوتاہی نہیں کی۔)

تھوڑی ہی دیر میں آپ کو ہوش آیا۔ تو حضرت عثمان سے فرمایا کیا لکھا ہے۔ اُنہوں نے پوری عبارت جو لکھی تھی سُنادی۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کی دانشمندی اور دوراندیشی سے خوش ہو کر فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا شاید آپ کو یہ خیال تھا کہ عہدنامہ ناتمام رہ گیا ہی اگر اسی بیہوشی میں میرا انتقال ہوگیا تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہوجانیکا احتمال ہی۔ فرمایا بیشک یہی بات تھی حضرت عثمانؓ نے فرمایا:۔

جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرًا عَنِ الْاِسْلَامِ وَاَھْلِہٖ | (اللہ تعالیٰ آپکو اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے)

جب عہدنامہ مرتب ہوچکا تو لوگوں کو جمع کرکے اُس کو برسر مجمع سُنادینے کا حکم دیا سب نے سُن کر تسلیم کرلیا۔ اسکے بعد پھر خود آپ نے سب سے خطاب کرکے فرمایا۔ کیا تم اُس شخص سے راضی ہو جس کو میں نے خلیفہ بنایا ہی۔ دیکھو میں نے اپنے کسی عزیز رشتہ دار کو خلیفہ نہیں بنایا۔ بلکہ عمرؓ کو بنایا ہے میں نے اپنی طرف سے غور و تامل میں کوتاہی نہیں کی۔ تم سب کو اُن کی اطاعت کرنی چاہئے سب نے جواب دیا ہم خوشی سے اطاعت کو تیار ہیں۔ اس قصہ سے فراغت پا چکے تو حضرت عمرؓ کو بلا کر بہت کچھ نصیحتیں اور وصیتیں فرمائیں

سمجھنے اور غور کرنیکی بات ہی کہ وہ ذات مقدس جو مسئلہ تقدیر پر اُس معنی میں جو جمہور اہلِ سنت کے نزدیک علم ہے۔ اس درجہ ایمان کامل رکھتی ہی کہ ہر چیز میں فاعل و متصرف ذات باری کو سمجھتی ہے۔ اور جو اپنے خاص معاملہ میں تدبیر کو ساقط کئے ہوئے تقدیر پر شاکر ہے۔ معاملہ خلافت کے سرانجام میں جس کا تعلق عام مسلمانوں کی بہبودی و فلاح سے ہے۔ کس قدر منہمک ہے اور کس حُسن تدبیر و دانشمندی سے انجام دیا ہے کیا ایسے حالات کے بعد کوئی شخص یہ کہدینے کا مجاز ہے کہ ایمان بالقدر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے اور تدبیر کو چھوڑ کر ذرائع کسب و معاش اور ترقی سے روکنے کی طرف داعی ہی معاذاللہ یہ سراسر نافہمی ہے۔ وہ کونسا زمانہ صدر اوّل سے اس وقت تک ایسا گذرا ہے جس میں

مسلمانوں نے تدابیر کا استعمال نہیں کیا صنعت و حرفت تجارت وغیرہ میں جدوجہد سے کام نہیں لیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اقوام عالم کا حال ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ جب کسی قوم کے تنزل کا زمانہ آتا ہے تو بمقتضاء مشیت الٰہی تدابیروں بھی نقصان پڑجاتا ہے۔

البتہ اسلام نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ ہم سب کچھ کریں۔ مگر اپنی تدبیر پر بھروسہ نہ کریں۔ بلکہ فاعل و متصرف ہر چیز میں خدائے وحدہ لاشریک لہ کو سمجھیں اور یہ ایسی سچی تعلیم ہے۔ کہ اس کے خلاف کا مدعی منکر کوئی خالق و مخلوق کا رابطہ قائم نہیں رکھ سکتا۔

رہی یہ بات کہ بہت سے لوگ اپنے کیرکٹر کے نقصان کو چھپانے کیلئے مسئلہ تقدیر کو آڑ بناتے یا اس گھمنڈ پر ارتکاب معصیت میں دلیر ہو جاتے ہیں۔ سو یہ احمقانہ خیال اسلام کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے یہی لوگ اپنی بہت ہی حقیر اور جزئی منفعت پر تمام ممکن تدبیریں خرچ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے لیکن معاملات خداوندی میں محض مخلوق کے طعن و تشنیع سے جان بچانے کیلئے ایسی شوخ چشمی سے کام لیتے ہیں۔ نہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ آخرت میں ہمارا یہ عذر لنگ کچھ کارآمد نہیں ہے یہ لوگ فی الحقیقت ایمان بالقدر نہیں رکھتے اُن کا حال بالکل اُن راسخ الایمان والوں کے عکس ہے جو ایمان بالقدر میں پختہ ہونیکے ساتھ شرعی اور بہبودی خلق کے معاملہ میں نہایت چست اور پختہ ہوتے ہیں اور اپنے ذاتی و دنیاوی معاملات کی تدبیر میں مشغول و منہمک نہیں ہوتے۔

لیکن کیا ضرور ہے کہ ایسے بیہودہ لوگوں کے خیال و روش سے متاثر ہو کر ہم ایک اسلامی اصولی اور اعتقادی مسئلہ کو بدلنے یا اسکی ایسی تشریح کرنے پر مجبور ہوں جس سے وہ عقیدہ جو تیرہ سو سال سے اہلسنت کا مسلم مسئلہ ہے اور قرآن و حدیث میں جس کیلئے بیشمار تصریحیں موجود ہیں بدل جائیں۔

اور اگر مسئلہ تقدیر میں اس جدید تحقیق اور مذہب قدریہ کی تائید کا محرک یہ خیال ہو کہ تقدیر کو مذہب اہل سنت کے مسلک پر مان لینے سے سلسلہ اسباب و مسببات لغو ہوا جاتا ہے حالانکہ اسباب و مسببات کا ارتباط اُنکی تاثیر و تاثر ایسا بدیہی اور عقلائے عالم کا مسلم ہے کہ اُس کیخلاف کوئی دلیل اور کوئی دعویٰ مسموع نہیں ہو سکتا تو یہ خیال بھی غلطی ہے مسئلہ تقدیر اور ایمان بالقدر سے ہرگز سلسلہ

اسباب و مسببات منقطع و لغو نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے اپنے تصرفات و اختیارات کو عالم امکان میں اسباب و مسببات کے پیرایہ میں ظاہر فرمایا ہے۔ امور تقدیری کا ظہور بھی اسی لباس میں ہوتا ہے لیکن اس سلسلہ میں بھی موثر حقیقی وہی ذات پاک ہے تمام اسباب و علل کی علت اُس کا ارادہ و مشیت ہے

مسئلہ تقدیر کے متعلق ایک مبسوط و مدلل تحریر ہم علیحدہ لکھیں گے اس جگہ ذیل میں بقدر ضرورت لکھدیا ہے تاکہ مسلمان اس مہلک غلطی میں مبتلا نہ ہوں جس کا اندازہ تہذیب الاخلاق کے مضمون سے ہوتا ہے

ہم منازعت و مخاصمت یا اظہار خلاف کو ہرگز پسند نہیں کرتے مگر تہذیب الاخلاق اور اشاعت اسلام دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام کے حقیقی مسائل بلا افراط و تفریط مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جائیں اور مسلمانوں کو عام گمراہی و غلط فہمی سے بچایا جائے۔ اسلئے ہمارا عرض کرنا محض نیک نیتی پر مبنی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ تہذیب الاخلاق اپنے دعوے کا پاس کریگا اور ایسے مسائل جو متفق علیہ اہل سنت ہیں قلم فرسائی کر کے مسلمانوں کو مغالطہ اور پریشانی میں نہ ڈالے گا مسلمان بحال خود درماندہ و تباہ ہیں۔ سب کچھ تباہ ہو جانیکے بعد صرف اسلام کا نام باقی ہے۔

ہم کو یا کسی ہمدرد کو یہ مناسب نہیں ہے کہ اسلام کے اُصول پر طبع آزمائی کر کے ایک طرف تو مقابلہ نصوص کے مجرم بنیں دوسری جانب اسلام کا نام مٹا کر دنیا سے مسلمانی کو رخصت کر دینے کے سبب بنیں ہماری تحریر و تقریر کیلئے وسیع میدان موجود ہیں۔ ہم کو گنجایش ہے کہ مسلمان کی فلاح و بہبود کیلئے نفیس سے نفیس مضمون قوم کے سامنے پیش کریں اور دنیا و آخرة کی بھلائی اور نیکنامی کمائیں۔ خدا تعالیٰ مجھ کو اور سب مسلمانوں کو اُس کی توفیق عطا فرمائے۔

اس ضمنی بحث کو یہیں چھوڑ کر اصل مضمون کی طرف عود کرتے ہیں۔

واقعہ شہادت عمری سے یہ نتیجہ بھی بہت آسانی سے نکلتا ہے کہ مذہب اسلام میں ایک بلند پایہ مسلمان اور معمولی نصرانی یا یہودی غلام کی (جو عہد کے ذریعہ سے حریم اسلام کے پرامن فضا میں داخل ہو چکا ہو) حفاظت جان و مال یکساں ہے جس آزادی سے ایک پختہ مسلمان ممالک اسلام میں رہ سکتا ہے اُسی آزادی سے ایک ادنیٰ درجہ کا غلام۔ عیسائی ہو یا یہودی و مجوسی بسر کر سکتا ہے

حضرت عمرؓ کی شہادت معمولی بات نہ تھی۔ آپ جیسی مجموعہ اوصاف و کمالات کا ایسی بیدردی سے ہلاک کیا جانا خود ایک عظیم الشان حادثہ تھا۔ لیکن جبکہ یہ دیکھا جائے کہ آپکی ذات فتن و اختلافات کیلئے سدراہ بنی ہوئی تھی اور آپ کے بعد اسلام میں نیا دور شروع ہونیوالا تھا تو یہ مصیبت اور بھی ہولناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں پر اس حادثہ کا زیادہ اثر تھا۔ اور وہ اس طرح متحیر و پریشان تھے کہ گویا اس سے پہلے اُن پر کوئی حادثہ گذرا ہی نہیں۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ فوراً ایک کمیشن کے ذریعہ سے سازش قتل کی تحقیقات شروع ہو جاتی جس جس پر شبہ بھی ہوتا فوراً زیر حراست لے لئے جاتے اور جو کسی درجہ میں ملوث ثابت ہوتے ان کو سخت تر سزائیں دیجاتیں۔ یا جن پر کسی درجہ میں بھی شبہ ہوتا تو اُن پر تعزیری احکام جاری کئے جاتے اور عجب نہیں کہ اس معاملہ کے متعلق فوری تدابیر شروع کی جاتیں۔ مگر عبید اللہ بن عمرؓ کی بے قاعدہ اور خلاف احکام اسلام تعدی نے معاملہ کی صورت ہی بدلدی۔ اور بجائے اس کے کہ حضرت عمرؓ کے قتل کی تحقیقات ہوتی عبید اللہ بن عمرؓ بحیثیت مجرم گرفتار کئے گئے جفینہ و ہرمزان اور ابولولوہ کی بیٹی کا معاملہ پیش ہو گیا۔

تھوڑے سے تامل کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر حضرت عمرؓ کی شہادت اور مفارقت کا صدمہ تو بے انتہا تھا۔ مگر معاملہ قتل میں دیتہ یا قصاص یا تحقیقات کا اس قدر اہتمام نہ تھا جسقدر ہرمزان۔ جفینہ وغیرہ کے قتل کا جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایک نصرانی کے ہاتھ سے دارالاسلام بلکہ دارالخلافہ میں شہید ہوئے تھے اُس کی سزا یہ تھی کہ اولیاء مقتول یا قصاص میں اُسکو قتل کرتے یا دیتہ لیکر چھوڑ دیتے یا بالکل معاف کر دیتے لیکن جبکہ قاتل نے خودکشی کر لی تو اب قصاص و دیت کا معاملہ تو ختم ہو چکا۔ صرف یہ بات باقی رہ گئی تھی کہ یہ قتل کسی سازش کا نتیجہ تو نہیں ہے اگر سازش ثابت ہوتی تو مجرموں کو جرم کے موافق سزا دیجاتی۔ خلاصہ یہ کہ از روئے احکام شریعت ایک ذات کے بدلے میں قاتل ہی قتل کیا جا سکتا ہے اس میں خلیفہ وقت ہوں یا کمتر درجہ کا مسلمان اور ذمی سب برابر ہیں اس سے تجاوز نہ ہونا تعدی و ظلم ہے اسی وجہ سے قاتل کی خودکشی کرنے سے یہ معاملہ تو ظاہری طور پر ختم ہو گیا تھا۔ اور ہرمزان وغیرہ کا قتل چونکہ دارالخلافہ میں ایک مسلمان کے ہاتھ سے بلا وجہ

وبلاتحقیق ہوا۔ اس لئے صحابہ خلیفۂ وقت اور تمام مسلمانوں میں پریشانی پھیل گئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ دروازہ کھل گیا تو ذمی لوگ دارالاسلام میں تھوڑے سے شبہ پر بید هڑک قتل کردیئے جایا کریں گے اور اسلام نے جو مساوات و آزادی کا عام قانون دے کر ذمی اور مسلمانوں کی جان و مال کو مساوی کردیا ہے وہ متروک العمل ہوجائیگا۔ اسی وجہ سے یہ اہتمام تھا کہ خلافت کا قصہ یکسو ہوتے ہی بیعت عامہ سے فراغت کے بعد سب سے پہلے یہی معاملہ پیش ہوا۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے جفینہ اور ہرمزان کے قتل کو اسلام کے اندر رخنہ ڈالنے سے تعبیر کیا۔ حضرت عمرؓ کے قتل کو جو فی الحقیقت اسلام کیلئے ناقابل تلافی نقصان تھا ضبط کرلینا اور ایک نصرانی و نومسلم کے قتل کو رخنۂ عظیم سمجھنا اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ اس صورت میں اسلام کے قانون کا متروک ہونا اور اُن کے اُن اوصاف کا مٹ جانا لازم آتا تھا جن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کو تمام مذاہب اور تمام عالم پر برتری حاصل تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب خلیفہ شہید کے صاحبزادے عبیداللہ بحیثیت مجرم پیش ہوئے تو آزادی کے ساتھ رائے زنی شروع ہوگئی حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے جلیل القدر صحابی کی رائے صاف بلا تورِیہ یہ تھی کہ اُن کو قصاص میں قتل کردیا جائے اور جو لوگ اُن کے قتل میں متامل تھے اُنہوں نے بھی یہ عذر پیش نہیں کیا کہ ایک نصرانی یا نومسلم کا قتل (جن کے اسلام پر بھی اعتماد نہو) خصوصًا شبہ کی حالت میں اُسکی سزا یہ نہیں ہو کہ ایک مسلمان کو اُس کی عوض میں قتل کردیا جاے۔ یہ تو سب کے نزدیک مسلم تھا کہ سزا اسکی بجز قصاص یا دیۃ کے اگر اولیاء مقتول راضی ہوجائیں کچھ نہیں۔ مگر وہی صدمہ قتل اور مفارقت عمری جو عام طور پر سوہان روح ہو رہا تھا بہت سے حضرات کو اس کشمکش میں ڈال رہا تھا کہ کل تو حضرت عمرؓ بیدردانہ قتل ہوئے اور آج قصاص میں اُن کا بیٹا قتل ہوجائے اور اس میں اس قدر گنجایش بھی مل گئی تھی کہ خلیفہ وقت کے تسلط سے پہلے کا واقعہ تھا اور خلیفہ کو باعتبار ولایت عامہ یہ اختیار بھی تھا کہ مقتول کی دیۃ دیکر سزا قتل جاری نہ کرتے۔ اور آخر اسی پر فیصلہ ہوا۔

حضرت عثمان نے یہ فرمایا کہ مجھ کو ولایت حاصل ہو میں اپنے مال میں سے اولیاء مقتول کو دیۃ دیئے دیتا

قصاص سے درگذر کرتا ہوں۔ معاملہ کو ختم کردیا۔

مگر حضرت علی کرم اللہ وجہ اس فیصلہ پر رضامند نہوئے اور آپنے اپنے زمانہ میں پھر قصاص جاری کرنا چاہا اور اس اندیشہ سے عبیداللہ بھاگ کر شام چلے گئے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ عبیداللہ اپنے عالی مرتبت باپ کے ادب و لحاظ کی بدولت قصاص سے بچ گئے۔ مگر وہ سب کی آنکھوں سے گر گئے اور ہر گز انکی وہ وقعت باقی نہ رہی جو اُن کے مرتبہ و حیثیت کے مناسب ہونی چاہیئے تھی یا اُن کے برادر عبداللہ بن عمرؓ کو حاصل تھی۔ تواریخ سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو آخر تک یہ فیصلہ کھٹکتا رہا۔ بلکہ شاید وہ اُس وقت قصاص جاری نہ کرنے کو دفع الوقتی اور مصلحت پر مبنی سمجھتے رہے۔ چنانچہ زیاد بن لبید انصاری جب عبیداللہ کو دیکھتے تو کہا کرتے تھے۔

أَلَا يَا عُبَيْدَ اللهِ مَا لَكَ مَهْرَبٌ
وَلَا مَلْجَأٌ مِنْ اِبْنِ أَرْوَى وَلَا خَفَرُ

(اے عبیداللہ خبردار تم کو کوئی ٹھکانا اور کوئی پناہ وامن کی جگہ ابن اروی یعنی عثمان سے نہیں ہے)

أَصَبْتَ دَمًا وَاللهِ فِي غَيْرِ حِلِّهِ
حَرَامًا وَقَتْلُ الْهُرْمُزَانِ لَهُ خَطَرُ

(قسم ہے خدا کی تونے ایک ناحق خون کیا ہے۔ اور ہرمزان کا قتل بڑی بات ہے۔

عَلَى غَيْرِ شَيْءٍ غَيْرَ أَنْ قَالَ قَائِلٌ
أَتَتَّهِمُونَ الْهُرْمُزَانَ عَلَى عُمَرْ

(ایک شخص کی مہمل بات کہنے سے بلا وجہ قتل کردیا کیا اتنی بات سے تم ہرمزان کو عمر کے بارہ میں متہم سمجھنے لگے۔

فَقَالَ سَفِيهٌ وَالْحَوَادِثُ جَمَّةٌ
نَعَمْ أَتَّهِمُهُ قَدْ أَشَارَ وَقَدْ أَمَرْ

(ایک بیوقوف نے کہدیا حالانکہ حوادث کے اسباب بہت ہیں ضرور اسکو متہم سمجھو اسی نے اشارہ کیا اور اسی نے قتل کا حکم دیا

عبیداللہ نے حضرت عثمانؓ سے اسکی شکایت کی تو آپنے بُلا کر اُن کو منع فرمادیا۔ مگر اس پر بھی یہ معافی کھٹکتی رہی۔

اب ایک منصف صاحب فہم و بصیرت جس کے آگے تواریخ عالم بھی کھلی ہوئی ہوں اور جو اقوام دنیا کا وسیع تجربہ رکھتا ہو انصافاً کہدے کہ کیا دنیا میں کسی قوم نے ایسی آزادی اور مساوات کا برتاؤ اپنی ایسی رعایا کے ساتھ کیا ہے۔ جو اُن کے ہم مذہب و ہم وطن نہوں کیا کسی

قوم نے ایسی ہمت و استقلال سے کسی اس قسم کے واقعہ کا فیصلہ کیا ہے جو مسلمانوں نے کیا۔ اور کیا کسی نے ایسا ضبط و تحمل دکھلایا ہے جو مسلمانوں نے ایسے تلاطم اور سخت حادثہ کے وقت دکھلایا یہی وہ اوصاف تھے جن کی بدولت دنیا اسلام کی مسخر ہو گئی۔

ہرمزان کے قتل اور اداء دیتہ کا یہ فیصلہ تو اُس عام روایت کے موافق ہی جس کو تمام مؤرخین نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اگر ہم ایک دوسری روایت پر نظر ڈالیں جس کو مورخین نے بعض وجوہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ تمام مباحث کا خاتمہ ہو گیا۔ اور گویا حسب روایت اول جس فیصلہ سے بمقتضاء بعض مصالح رکنا ثابت ہوتا تھا۔ اُس کا نفاذ پوری طرح ہو گیا۔

ہرمزان کا بیٹا قماذبان کہتا ہے کہ عجمی لوگ ہموطن ہونے کی وجہ سے باوجود اختلاف مذہب بھی آپس میں ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے تھے (جیسا کہ اس زمانہ میں جب دو ہموطن اگرچہ مختلف المذہب ہی کیوں نہوں اجنبی جگہ جمع ہو کر باہم مربوط و مانوس ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ابو لؤلوہ کا گذر ہرمزان کے پاس ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ ہرمزان نے دیکھنے کیلئے خنجر ہاتھ میں لیا۔ اور پھر اُس کو دیدیا۔ ایک شخص نے خنجر واپس دیتے ہوئے اُس کو دیکھ لیا۔ جب حضرت عمرؓ شہید ہوئے تو اُس شخص نے خنجر کو پہچان کر کہا کہ یہ تو ہرمزان نے ابو لؤلوہ کو دیا تھا عبیداللہ بن عمرؓ نے سُن کر ہرمزان کو قتل کر دیا۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوگئے اور معاملہ قتل ہرمزان پیش ہوا۔ تو عبیداللہ قصاص کی غرض سے میرے حوالے کئے گئے میں اُن کو قتل کرنے کی غرض سے لیچلا۔ اور جتنے مسلمان تھے سب میرے ساتھ میرے موید اور مددگار تھے کوئی مزاحم نہ تھا البتہ اُن کی دلی خواہش تھی کہ میں معاف کر دوں میں نے اُن کے میلان قلبی کا خیال کر کے کہا کہ میں اُس کو قتل کر سکتا ہوں سب نے عبیداللہ کو بُرا کہکر بالاتفاق جواب دیا بیشک کر سکتے ہو میں نے کہا کیا تم مجھکو اُس کے قتل سے روک سکتے ہو۔ سب نے کہا ہرگز نہیں۔ اس طرح پر اطمینان کر چکنے کے بعد میں نے محض اللہ کے واسطے عبیداللہ کو معافی دیدی مسلمان اس قدر خوش ہوئے کہ مجھے اپنے سروں پر اٹھا لیا اور اسی طرح میرے گھر تک لیگئے۔ ایک قدم بھی زمین پر نہ پڑنے دیا۔

اس روایت کو اگر صحیح مان لیا جائے تو یہ مسلمانوں کی استقامت اور تصلب کی انتہائی مثال ہوگی جس میں کسی مصلحت اور رعایت کو ہرگز دخل نہیں۔ اور یہ وہ بات ہوگی جس کی تقلید سے تمام اقوام دنیا عاجز سمجھے جائیں گے۔

لیکن مورخین کو اس روایت کی صحت میں اس وجہ سے کلام ہے کہ اگر ولی قصاص یعنی غمازیان معاف کر چکا ہوتا تو حضرت علیؓ اپنے زمانۂ خلافت میں عبید اللہ کے قتل کا ارادہ نہ کرتے اور عبید اللہ بھی اس اندیشہ سے بھاگ کر شام میں جا کر امیر معاویہ کے زمرہ میں شامل نہ ہوتے مگر میرے خیال میں یہ وجہ اس روایت کے رد کرنیکے واسطے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ جب حضرت عثمان نے اپنے مال میں سے دیت دیکر قصاص کو معاف کر دیا اور یہ فیصلہ نافذ ہوئے بارہ سال گذر گئے تو اس قدر عرصہ کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفۂ وقت کے نافذ شدہ فیصلے کو منسوخ کرکے قصاص لینے کا ارادہ کرتے سمجھ میں نہیں آتا۔

عبید اللہ کا بھاگ کر شام میں چلا جانا تسلیم ہے مگر یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ حضرت علی کے اس ارادہ سے مطلع ہو کر گئے ہوں۔ . . . . بلکہ اُن کو معلوم تھا کہ حضرت علی کا خیال میری نسبت اچھا نہیں ہے۔ اُن کے پاس رہنا میرے لئے مضر ہوگا میں یہاں رہکر کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور میں ضرور کسی نہ کسی وقت مورد عتاب بن جاؤں گا۔ اس وجہ سے اپنے لئے شام چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔

البتہ روایت اوّل کے مرجح ہونے کی دو وجہیں ضرور ہیں۔ اوّل یہ کہ باعتبار سند کے یہ روایت قوی ہے۔ دوسری یہ کہ اگر عبید اللہ اس طرح معاف کئے گئے ہوتے تو زیاد بن لبید انصاری اپنے اشعار میں اس کا تذکرہ نہ کرتے۔ اور حضرت عثمانؓ کو قصاص لینے پر آمادہ نہ کرتے۔ یا حضرت عثمانؓ کو ترک قصاص کی وجہ سے مورد طعن نہ بناتے۔

بہرحال ان میں سے جس روایت کو بھی صحیح مان لیا جائے ہم جس مدعا کے درپے ہیں وہ دونوں میں باحسن وجوہ حاصل ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل ہم اس کا فیصلہ بھی کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کسی گہری اور لمبی سازش کا نتیجہ تھا جس میں ابو لؤلؤہ جفینہ۔ ہرمزان اور کعب احبار اور دوسرے اسی قسم کے نومسلم اور ذمی شریک تھے۔ یا صرف ابو لؤلؤہ کی ہی خباثت تھی جس کی اطلاع ممکن ہے اُس نے کسی کو دی ہو یا نہ دی ہو۔

زمانۂ حال کے بعض مورخین کا خیال ہے ہرمزان و کعب احبار وغیرہ بہت سے مجوسی و یہودی ایسے تھے جو گو مسلمان ہو گئے تھے مگر مجوسیت و یہودیت کی محبت اُن کے اندر سے زائل نہ ہوئی تھی اس کا خواہ یہ مطلب سمجھ لیا جائے کہ اُن کا اسلام محض منافقانہ تھا یا یہ سمجھ لیا جائے کہ مسلمان تو تھے مگر اُدھر سے تعلق منقطع ہو کر اسلام کی محبت پوری راسخ نہ ہوئی تھی اِدھر بہت سے عجمی و رومی غلام جو اپنے اصل مذہب پر قائم تھے مدینہ منورہ میں موجود تھے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں سے روم۔ شام۔ عراق و فارس کی سلطنتوں کا تباہ ہونا تازہ ہی قصہ تھا مسلمانوں کا لشکر اطراف عالم میں پھیل کر جس طرح ملکوں کو زیر و زبر کر کے سلاطین و اُمرا کو اسیر بنا رہا تھا اُس کو بھی وہ دیکھ آئے تھے۔ یہ وہ اسباب تھے جنکی وجہ سے بغض و عداوت کی آگ اُن کے اندر مشتعل ہو رہی تھی وہ مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی قوت اور روز افزوں ترقی کیسا تھ اپنی قوم کی تباہی کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ اور چونکہ حضرت عمرؓ کی قوت انتظامیہ کے یہ سب ظاہری ثمرات تھے۔ اس وجہ سے اُن کے ساتھ خصوصیت سے بغض و عناد ہونا بھی لازمی بات تھی۔ ابو لؤلؤہ کا غیظ و غضب تو اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ اُس کے چھپانے پر بھی قادر نہ تھا نہاوند کے اسیر جب مدینے میں آئے تو وہ مضطربانہ ہر ایک کے سر پہ ہاتھ پھیرتا جاتا اور کہتا جاتا تھا عمرؓ نے میرا جگر کھا لیا ہرمزان اگرچہ مسلمان ہو گیا تھا۔ مگر اوّل تو وہ خود شاہی کے رتبہ سے قیدیوں کی حیثیت میں مدینہ لایا گیا تھا۔ اُس کے اندر غدر و نقض عہد کا مادہ پہلے ہی موجود تھا۔ چند بار مسلمانوں سے معاہدہ کر کے پھر چکا تھا ایسے حالات کو دیکھتے ہوئے قرین عقل ہے کہ وہ بھی اپنے دل میں سخت غم و غصہ لئے ہوئے انتقام کی فکر میں ہو۔ کعب احبار بھی گو مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر اصل سے یہودی تھے۔ یہود کو جو عداوت

اہل اسلام سے بھی ظاہر ہے۔ پھر یہ قیاس کرنا کیوں مستبعد ہے کہ ان سب کی سازش اور مشورہ سے یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ یہ بات تو بہت ہی مستبعد تھی کہ توریت میں آپکی شہادت کا ذکر ہو یا کعب احبار کو اس کے ذریعہ سے علم ہوا ہو بلکہ وہ حقیقتاً اس راز پر مطلع تھے۔ اور خیر خواہی جتلانے کیلئے بار بار آکر آپ کو مطلع کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ کعب احبار خود اس سازش میں شریک نہوں۔ مگر اُسی تعلق کی بنا پر جو ان سب میں مشترکاً موجود تھا اس راز پر مطلع ضرور تھے۔ اور آپ سے صراحتاً سازش کا حال نہ کہہ سکے مگر دوسرے پیرایہ میں اُس کو ظاہر کر دیا۔

یہ حاصل ہی اُس مضمون کا جو اس بارہ میں علامۂ رفیق بک العظیم مصری نے اشہر مشاہیر اسلام میں لکھا ہے۔ مگر مجھے اس فیصلے سے کچھ اختلاف ہی۔

جفینہ اور ابو لؤلؤہ کا نصرانی ہونا ظاہر ہے اور اُن کو روم وعجم کی سلطنتوں کے تباہ ہونے اور اپنی غلامی اور جلاوطنی کا بے انتہا صدمہ بھی مسلم ہے۔ اور ابو لؤلؤہ کا غم وغصہ کو اپنے حرکات و افعال سے ظاہر کرنا بھی تسلیم ہے اور اس لئے یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ اُس کے ارادہ پر جفینہ بھی مطلع یا شریک رہے ہو۔ اگرچہ جفینہ کا ارتکاب جرم میں کسی درجہ بھی حصہ نہ لینا بتلا رہا ہے کہ جو خباثت وشرارت ابو لؤلؤہ کے دلمیں بھری ہوئی تھی اُس سے وہ خالی تھا ورنہ اگر دونوں ابتدار سے اس سازش میں مساویانہ شریک ہوتے تو جفینہ کچھ نہ کچھ عملی حصہ بھی لیتا اور اس طرح الگ تھلگ نہ رہتا۔

مگر ہرمزان اور کعب احبار کو سازش قتل میں شریک سمجھنا یا کم از کم مطلع ہونا قابل تسلیم نہیں ہی۔ ہرمزان بیشک مجوسی تھا مسلمانوں کے ہاتھوں اسکی ریاست بھی برباد ہوئی تھی اور اُس کو عہد شکنی کی عادت بھی پڑی ہوئی تھی لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ صدق دل سے مسلمان ہوجانیکے بعد بھی اُسکے اندر دغابازی ومضرت رسانی کا مضمون باقی رہ گیا ہو۔ دیکھو طلیحہ اسدی اور عمرو بن معدی کرب دونوں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام لائے لیکن بعد وفات مرتدین کے سرگروہ بن گئے۔ طلیحہ نے تو دعوی نبوت ہی کر دیا اور عمرو نے اپنی ذاتی شجاعت سے اس فتنہ میں بہت کچھ حصہ لیا اور جب پختہ کار مسلمان ہوگئے تو وہ کارنمایاں کئے جن سے صفحات تاریخ

بھرے پڑے ہیں۔

اُن دونوں کی حالتوں میں انقلاب اُس انقلاب سے بہت زیادہ ہے۔ جو ہرمزان کی حالت میں ہوا تھا۔ ہرمزان نے مسلمانوں سے مصالحت کی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ جس قدر ملک اس کے قبضے میں ہی اُس پر آزادانہ قابض و متصرف رہے۔ مذہب نہیں بدلا تھا۔ ایسی صورت میں اُسکو تھوڑا سا موقع ملتے ہی سب معاہدوں کو توڑ کر رکھدینا مستبعد بات نہ تھی۔ دنیا کے تمام بہادر و مدبر ایسا ہی کرتے ہیں۔ ضرورت پڑجانے پر دب جاتے اور صلح کر لیتے ہیں اور وقت ہاتھ لگنے پر پھر خم ٹھونک کر مقابلہ کیلئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ لیکن جب وہ اسیر ہوکر مدینے میں لایا گیا۔ اور ایک عجیب حیلہ سے امن حاصل کرکے مطمئن ہوگیا۔ اور پھر اپنے ارادہ و اختیار سے مسلمان ہوا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُس کے اسلام کو نفاق پر محمول کریں۔

ہرمزان خلافت فاروقی کے چوتھے یا پانچویں سال مسلمان ہوا تھا۔ اگر اُس کا اسلام نفاق پر مبنی ہوتا تو اس پانچ چھ سال کے عرصے میں ضرور اس کی حالت کا اندازہ مسلمانوں کو ہوجاتا اور وہ اُنکی نظروں میں مشتبہ رہتا لیکن تاریخ ہمیں بتلارہی ہے کہ اُس پر کبھی کوئی اشتباہ نہیں ہوا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ جب وہ امن حاصل کرچکنے کے بعد اپنے قدیم مذہب پر قائم رہکر آزادی سے رہ سکتا تھا۔ جیسا کہ جفینہ اور ابو لؤلؤہ رہے تو اُس کو منافقانہ مسلمان ہوکر خطرہ میں پڑنے کی کیا وجہ تھی کیونکہ مسلمان ہوجانیکے بعد اسلام سے پھر کر مرتدین کی سزا کا مستوجب ہوتا۔

کیا بہت سے اور مجوسی مسلمان ہوکر اپنے اسلام پر آخری دم تک صداقت سے قائم نہیں رہے بیشک جو مسلمان ہوئے صدق دل سے ہوئے اور جو مسلمان بھی نہیں ہوئے مگر مسلمانوں کے زیر سایہ رہے وہ اُن کے حسن معاملہ۔ عدل و انصاف قانون مساوات کے ایسے گرویدہ رہے کہ کوئی حرکت خلاف نہ کرسکے الا ماشاء اللہ۔ اس لئے ہم ہرگز ہرمزان کے اسلام پر شبہ کرنے اور سازش قتل میں شریک سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں سمجھتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب عبید اللہ سے قصاص لینے کی تیاری تھی تو کسی نے اُن کو بچانیکے لئے

یہ عذر پیش نہ کیا کہ ہرمزآن مسلمان ہی نہ ہوا تھا۔ یا گو بظاہر مسلمان تھا۔ مگر دل سے مسلمانوں اور اسلام کا دشمن تھا قتل کی سازش میں وہ ضرور شریک تھا۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ دارالخلافہ میں ایک ایسے شخص کی حالت پر (جہاں اس قسم کے لوگوں کی تعداد بھی زیادہ نہو۔ اور جو ہر وقت اُن پختہ کار بیدار مغز اور ذی ہوش مسلمانوں کے ساتھ شب و روز بسر کرتا ہو) کسی کو بھی کسی قسم کا اشتباہ نہوتا اور کوئی عبیداللہ کا ہمدرد اس موقعہ پر اس عذر کو پیش نہ کر سکتا بلکہ برخلاف اُسکے زیاد بن لبید نے اس اشتباہ کا دفیعہ کیا اور کہا :- (اتتہمون الہرمزان علی عمر)

اگر فقط ابولولوہ جفینہ اور ہرمزان کو سرگوشی کرتے دیکھنا اور عبدالرحمن ابن ابی بکر کو دیکھ متفرق ہوجانا یا خنجر کا اُن کے پاس سے گرنا اس کی دلیل ہے۔ تو یہ ہرگز کافی نہیں ہے۔ ابولولوہ تو یہ ارادہ پختہ کئے ہوئے تھا۔ اور اس غرض کیلئے اُس نے خنجر زہرآلود تیار کیا تھا جفینہ کو بھی اُس کا ہمراز مان لو۔ ان دونوں کا گزر ہرمزان کے پاس ہوا اور انہوں نے دیکھنے کو خنجر ہاتھ میں لیا دیکھ کر واپس کر رہے تھے کہ عبدالرحمن بن ابی بکر سامنے آ گئے۔ اُن دونوں کے دلوں میں چور تھا۔ اور چور کو اضطراب ہونا لازمی امر اور فطرت کیموافق ہے۔ اس لئے گھبرا کر متفرق ہونے لگے۔ اور اسی اضطراب میں خنجر بھی گر گیا۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہرمزان پر بھی کوئی اثر اضطراب کا ظاہر ہوا تھا۔ جو اضطرابی حرکت ہوئی اُن دونوں کی طرف سے ہوئی۔ خنجر بھی اُن دونوں کے پاس سے گرا۔ الغرض اس قرینہ کی وجہ سے بھی ہرمزان مشتبہ ہو سکتا ہے نہ مجرم بنایا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زیاد بن لبید نے اس قرینہ پر اس کو مشتبہ قرار دینا سفاہت سے تعبیر کیا۔ اور اپنے اُس شعر میں جس کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ بتلا دیا کہ حوادث کیلئے مختلف سبب ہوتے ہیں کسی ایک واقعہ کیلئے ایک ہی سبب قرار دینا دانشمندی نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ ہرمزآن کے کسی طرز عمل سے مسلمانوں کو اس کی نسبت کچھ اشتباہ نہیں ہوا تھا۔ اور فقط اس قرینہ سے جو عبدالرحمن بن ابی بکر نے بیان کیا تھا۔ اُس کو مشتبہ نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ ہرمزان کو اس سازش میں شریک سمجھا جائے۔

بلکہ حضرات صحابہ اور خود حضرت عمر کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرمزان کے صادق الایمان ہونے پر ان کو اعتماد تھا۔ اس کے اخلاص و نیک نیتی پر بھروسہ کر کے امور عظام میں امیر بنا تے مشورہ طلب کرتے اور اس کی رائے پر عمل پیرا ہوتے۔

بخاری شریف جلد اوّل صفحہ ۴۴۷ میں جبیر بن حیہ سے روایت ہے۔

قال بعث عمر الناس فی افناء الامصار یقاتلون المشرکین فاسلم الھرمزان فقال انی مستشیرک فی مغازی ھذہ قال نعم مثلھا ومثل من فیھا من عدو المسلمین مثل طائر لہ راسان ولہ جناحان ولہ رجلان فان کسر احد الجناحین نھضت الرجلان والراس وان کسر الجناح الآخر نھضت الرجلان والراس وان شدخ الراس ذھب الرجلان والجناحان والراس فالراس کسری والجناح قیصر والجناح الآخر فارس فمر المسلمین فلینفروا الی کسری۔

حضرت عمر نے مسلمانوں کو مختلف بلاد میں کفار کے مقابلہ کیلئے بھیجا تھا۔ جب ہرمزان مسلمان ہو گئے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ میں تم سے اس بارہ میں مشورہ کرتا ہوں کہ مسلمان کس طرف کو زیادہ متوجہ ہوں ہرمزان نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے جس قدر دشمن اور مد مقابل ہیں اُنکی مثال ایک جانور کیسی ہے جس کے ایک سر دو بازو اور دو پیر ہوتے ہیں۔ اگر اسکی ایک بازو توڑ دی جائے تو دوسری بازو اور پیروں سے نقل و حرکت کر سکتا ہے اور اگر دوسری بازو بھی توڑ دیجائے تو پیروں اور سر کے ذریعہ سے کھڑا ہو سکتا ہے اور حرکت کر سکتا ہے لیکن اگر سر کچل دیا جائے تو بازو اور پیر سالم بھی رہیں تب بھی کچھ نہیں کر سکتا اسی طرح کسریٰ بمنزلہ سر کے ہے اور ایک بازو قیصر روم ہے دوسرا بازو فارس مناسب ہے کہ مسلمان پہلے کسریٰ کی طرف متوجہ ہوں۔

تھوڑے سے تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہرمزان کا یہ مشورہ سراسر اخلاص و ہمدردی سے تھا یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر نے اس رائے پر عمل فرما کر نعمان بن مقرن کو کسریٰ کی طرف بھیجا۔

اس حدیث میں واقعات کا بہت اختصار و اجمال کیا ہے۔ اور راس و خباجین کے اس طور سے مشخص کرنے میں جو ہرمزان نے بیان کیا مورخین و محدثین نے تفصیلی بحث بھی کی ہے مگر مفصل واقعات اور جناح و راس کی تحقیق ہمارے بحث سے علیحدہ ہے۔ اس لئے ہم اس کو ترک کرتے ہیں ورنہ اُس کی بھی مکمل بحث کر دی جاتی۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں بذیل شرح حدیث مذکور ہرمزان کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

فاسرہ ابو موسیٰ الاشعری وارسل بہ الی عمر مع انس فاسلم فصار یقربہ ویستشیرہ ثم اتفق ان عبید اللہ ابن عمر بن الخطاب اتھمہ بانہ واطاء ابا لؤلؤہ علی قتل عمرؓ فعدا علی الھرمزان فقتلہ بعد قتل عمرؓ۔

ابو موسیٰ اشعری نے ہرمزان کو قید کر کے انس بن مالک کے ساتھ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجدیا۔ وہاں جاکر وہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمرؓ اس کو مقرب بنا کر معاملات میں مشورہ فرمانے لگے۔ پھر اتفاق یہ ہوا کہ عبید اللہ بن عمرؓ نے اس کو ابو لؤلؤہ کی موافقت اور سازش قتل عمر رضی اللہ عنہ کی شرکت میں متہم سمجھا اور زیادتی کر کے اس کو قتل کر دیا۔

حافظ ابن حجر کی تحریر سے دو باتیں صاف معلوم ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ حضرت عمرؓ نے اسکو قابل اعتماد سمجھ کر مقرب اور رازداری کے امور میں اپنا مشیر بنا لیا۔ کیا حضرت عمرؓ جیسے مدبر اور صاحب فراست کی نسبت کوئی شخص یہ خیال کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ آپ نے ایک منافق اور مکار اور عہد شکن پر اعتماد کیا تھا۔ ممکن تو ہے مگر حالات اور واقعات اسکی تکذیب کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ابو لؤلؤہ کی موافقت کے اشتباہ کو اتہام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی کے نزدیک بھی ان کی حالت مخدوش نہ تھی۔

حافظ موصوف الصدر تقریب میں بھی اس کی نسبت ایسے ہی لفظ لکھتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد اس واقعہ کے بھی قرون مابعد میں اس کو مشتبہ سمجھا گیا۔ تقریب التہذیب کی عبارت

یہ ہے

وقع فی البخاری عنہ کلام موقوف وھو مخضرم من الثانیۃ اسلم علی ید عمر وقتل یوم قتلہ	(بخاری میں ہرمزان سے کلام موقوف مذکور ہے وہ مخضرم یعنی آپ کا زمانہ پایا۔ مگر مسلمان بعد میں ہوا، طبقہ ثانیہ سے ہی حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اور جس دن شہید ہوئے اُسی روز مقتول ہوا۔

ہرمزان کے متعلق جس قدر بیان ہوا اُس سے اس قدر ثابت ہو گیا کہ اس کو مشتبہ ومتہم سمجھنے کے لئے کوئی وجہ اور قرینہ صحیح نہیں۔ اس لئے اس مضمون کو ختم کر کے کعب احبار کے متعلق بھی کچھ لکھ دینا چاہتے ہیں۔

ہرمزان کی نسبت تو ایک ظاہری بات ایسی بھی تھی جس کی وجہ سے اس پر کسی کو کچھ اشتباہ کی گنجایش ہوتی۔ مگر کعب احبار کی شرکت سازش قتل یا کم از کم سازش کے حال سے خبردار سمجھنے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں۔

کعب احبار تورات کے عالم تھے۔ اور مسلمان ہو جانے کے بعد صحابہ کو ان پر کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہا تھا بلکہ کتب احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور خوب اختلاط وارتباط سے معاملہ کرتے تھے مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ امام مالک وابوداؤد وترمذی ونسائی ابوہریرہ کی حدیث نقل کی ہے۔

ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں طور کی جانب گیا۔ وہاں کعب احبار سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کی آپس میں بات چیت شروع ہو گئی۔ وہ مجھ کو توراۃ کی باتیں سناتے تھے اور میں احادیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیان کرتا تھا میں نے اسی دوران گفتگو میں وہ حدیث بیان کی جس میں یہ آیا ہے کہ جمعہ کے روز ایک ساعت ہے جس کے اندر مسلمان کی دعا قبول ہوتی ہے۔ کعب نے کہا یہ ساعت ہر جمعہ کو نہیں بلکہ سال بھر میں ایک دفعہ ہوتی ہے میں نے کہا ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر جمعہ کو ہوتی ہے کعب نے توراۃ کو دیکھ کر کہا بیشک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہر جمعہ کو ہوتی ہے۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں! اسکے بعد میری ملاقات عبداللہ بن سلام سے ہوئی۔ اور میں نے کعب احبار کی ملاقات اور گفتگو کا تذکرہ کیا جب میں نے کعب کا یہ مقولہ ذکر کیا کہ وہ ساعت سال بھر میں ایک دفعہ ہوتی ہی تو انہوں نے کہا کذب کعب (کعب غلط کہتے ہیں) اور جب میں نے ذکر کیا کہ تورات کو دیکھکر کعب نے کہا کہ بلیشک ہر جمعہ کو ہوتی ہے تو فرمایا صدق کعب (کعب نے ٹھیک کہا)

مذکورہ بالا احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہ اُن سے علمی باتیں کرتے اور توراۃ کی باتیں پوچھتے تھے توراۃ میں حضرت عمرؓ کے قتل کی پیشین گوئی مذکور ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ تورات آسمانی کتاب تھی اور اُس میں گذشتہ واقعات کے ساتھ زمانہ آیندہ کے متعلق بھی خبریں دی گئی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس میں بشارت کا ہونا تو محقق امر ہے اگر خلفاء راشدین کا تذکرہ بھی بذیل واقعات کسی ایسے پیرایہ میں ہو جس کو علماء توراۃ خوب سمجھتے ہوں تو اس میں انکار کی کیا بات ہی۔

آخر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی تو قیامت تک کے پیش آنیوالے حوادث کی نسبت تذکرے ہیں۔ خود حضرت عمرؓ کی شہادت کے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔ گو اس طرح پر نہ فرمایا کہ عمرؓ شہید ہونگے مگر جس اشارہ سے اس مضمون کو ادا فرمایا وہ صراحۃً سے کم نہ تھا۔

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صعد احدا و ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ فرجف بھم فضربہ برجلہ فقال اثبت احد فانما علیک نبیؐ و صدیق و شہیدان۔

حضرت انس سے روایت ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معہ ابوبکر صدیق اور حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے جبل احد پر تشریف لیگئے۔ پہاڑ لرزنے لگا۔ تو آپ نے پیر مار کر فرمایا۔ احد ساکن ہو جاؤ۔ تمہارے اوپر سوا، ایک نبی اور ایک صدیق اور دو شہیدوں کے اور کوئی نہیں۔

ظاہر ہے کہ دو شہید حضرت عمر و عثمان تھے۔ یہ کنایہ صراحۃً عمر و عثمان و شہیدان کہدینے سے زیادہ بلیغ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ تورات میں تحریف و تبدیل ہوگئی ہی تو ہم کو اس کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل

نہیں مگر یہود میں تورات کے ایسے عالم بھی موجود تھے جو صحیح کو سقیم سے جدا کر کے بتلا سکتے تھے احادیث میں بھی ضعیف اور موضوع روایتیں شامل کر دی گئیں مگر حفاظ اور نقاد احادیث نے (جزاہم اللہ خیر الجزاء) سب کو الگ کر کے رکھ دیا +

اگر کعب احبار اس وجہ سے مشتبہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ اصل سے یہودی تھے۔ اور یہود کی بغض و عداوت معلوم ہے۔ تو یہ نہایت ہی پوچ بات ہی یہودی الاصل ہونا اگر وجہ اشتباہ قرار دیا جا سکتا ہی تو عبد اللہ بن سلام بھی یہودی تھے۔ کیا کوئی شخص فقط اس وجہ سے کہ وہ یہودی تھے اُن کے تمام فضائل و کمالات سے قطع نظر کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ سلمان فارسی بھی اصل سے مجوسی تھے اور پھر نصرانی ہو کر یہود مدینہ میں آکر رہے تھے۔ گویا اس اعتبار سے اُن کی عداوت سہ آتشہ تھی سلمان منا اھل البیت (سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں) کے عالیشان ارشاد سے انہیں کی سرفرازی فرمائی گئی تھی اور پھر ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بھی اُن کی بات پر اعتماد کرتے تھے۔ اور خاص اس قصہ میں بھی سن کر یہ فرمایا کہ کیا توراۃ میں میرا نام ہی۔ تورات کی روایت سُننے سے اکراہ و انکار نہیں کیا تو اس وقت ان کو مشتبہ قرار دینے کا مطلب صاف یہ ہی کہ تمام صحابہ اور خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دانائی ہوشمندی عقل و فراست پر دھبہ لگایا جائے۔

معمولی سا معمولی شخص بھی حرکات و سکنات اقوال و افعال سے اپنے ہمنشین کی حالت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ مگر صحابہ اور حضرت عمرؓ باوجود اس فراست کے ایسے بھولے بھالے سیدھے سادھے تھے کہ کعب احبار ان کو ساری عمر دھوکا دیتے رہے اور ان میں سے ایک بھی کبھی متنبہ نہوا بلکہ برابر ان کے اخلاص پر اعتماد کرتے رہے۔ اور عبد اللہ بن سلام نے بھی جو کعب احبار سے واقف ہونیکے ساتھ تورات کے بڑے عالم تھے کبھی اس دھوکہ سے بچانے کی فکر نہ کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ خود بھی کعب احبار کے ہم خیال ہو نگے۔ لیکن میرے خیال میں شاید ہی کوئی شخص حضرت عبد اللہ بن سلام کی نسبت اس قسم کا خطرہ یا وہم بھی دل میں لانے کی جرأت کر سکے گا۔ اور جب یہ نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ عبد اللہ بن سلام کو تو مشتبہ نہ سمجھا جائے اور کعب احبار کو متہم بنانے میں محض ایسے قیاسات سے

جن کیلئے کوئی منشا صحیح موجود نہ ہو کام لیا جائے۔

ہرمزان اور کعب احبار کے متعلق جو کچھ لکھا گیا۔ اگرچہ اصل مضمون سے غیر متعلق ہے مگر میرے نزدیک اس کا صاف کر دینا ضرور تھا۔ اس لئے بہت ہی اختصار کے ساتھ اس قدر عرض کر دیا گیا۔ مجھے اُمید ہے کہ باخبر اور فہمیدہ اصحاب کیلئے یہ بیان کافی ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جبلہ بن الایہم کا مرتد ہونا۔ اس مضمون کو مسلسل دیکھنے والے سخت متعجب و پریشان ہونگے کہ سلسلہ مضمون میں اسلام کے پھیلنے غیر اقوام کا حلقۂ اسلام میں داخل ہونے اور اسلام کے محاسن کا بیان ہوتا چلا آتا ہے مسلمان ہو کر مرتد ہو جانے کو اس عنوان سے کیا تعلق ہے لیکن فہمیدہ اور سخن شناس کبھی متعجب نہوں گے۔ کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ ہماری غرض اس عنوان کے تحت میں یہ امر ثابت کرنا ہے کہ اسلام نے کسی کو زبردستی اپنے حلقہ میں داخل نہیں کیا۔ اُس نے دُنیا کے سامنے اپنی خوبیاں اور اپنے متبعین کے اخلاق و معاملات پیش کئے ہیں۔ جس شخص میں قابلیت و اہلیت قبول حق کی تھی بخوشی داخل ہوا۔ اسلام نے نہ کسی کو بجبر و اکراہ اپنے اندر بُلایا اور نہ ایسے افراد کو جن کے اسلام کی بنیاد مستحکم نہ تھی۔ یا جو اسلامی قوانین کے قبول کرنے اور ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔ جن کے دماغ میں سے سابق خیالات و اعتقادات محو نہ ہوئے تھے۔ اور ان میں اس کی قابلیت بھی نہ تھی کہ کسی وقت سچے مسلمان بن جائیں اُن کو اپنے حلقہ سے نکال کر باہر پھینک دیا۔

جبلہ کا واقعہ فی الحقیقت ہمارے عنوان کے جس کے ذیل میں یہ حالات و واقعات بیان ہوتے چلے آتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تائید ہے۔ اسی لئے ہم اس کو یہاں لکھنا چاہتے ہیں۔

ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ جبلہ کے مرتد ہو جانے اور اسلام کے حلقۂ اثر میں داخل ہو کر نصرانیت کے حصار میں پناہ پکڑنے سے اسلام کی وہ برتری ثابت ہوتی ہے کہ جبلہ جیسے بہت سے تاجداروں کے اسلام قبول کرنے سے ہوتی اور اس کے اعلیٰ قوانین اعلیٰ و ادنیٰ طبقات کی مساوات خلفاء اسلام کی معدلت و نصفت اور بلا مداہنت تعمیل احکام کا ایسا ثبوت ملتا ہے جس کا وجود زمین کے کسی حصہ پر باقی نہ تھا۔ اور جو صرف اسلام اور محض اسلام کی تعلیم کا اثر تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم

اس خاص واقعہ کو لکھیں ملوک غسان کا مختصر تذکرہ اور ان کی اقتدار و سطوت کی اجمالی حالت دکھلا کر جبلہ سے روشناس کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سیل عرم[1] کے بعد بنی قحطان کے بہت سے قبیلے یمن کو چھوڑ کر دوسرے اطراف و اکناف میں آباد ہو گئے بنی لخم کے بعض افراد نے یمن سے ہجرت کر کے ملک عراق میں فرات کے قریب حیرہ اور انبار پر آبادی قائم کر کے ایک جدید سلطنت کی بنیاد ڈالی اور یہ سلاطین مناذرہ کے لقب سے مشہور ہوئے اسی طرح اوس و خزرج کے بعض قبیلوں نے ملک شام میں ایک چشمہ پر جس کا نام غسان تھا ڈیرہ ڈالا اور حوران و بلقاء پر قبضہ کر کے عظیم الشان سلطنت قایم کر دی اور ملوک غسانیہ کے معزز اور باسطوت نام سے مشہور ہو گئی۔

عرب کی یہ دونوں سلطنتیں ایک عراق میں اور دوسری شام میں اگرچہ بجائے خود نہایت زبردست اور باسطوت و جبروت تھیں اور اندرونی انتظامات میں خود مختار و آزاد بھی تھیں مگر اصولی طور پر اوّل الذکر تو کسریٰ فارس کی اور دوسری قیصر روم کی ماتحت تھیں۔ بغیر منظوری مرکزی سلطنت کے بادشاہ کی تخت نشینی اور اُمور عظام طے نہ ہو سکتے تھے۔ فارس اور روم میں جب کبھی مقابلہ ہوتا تھا تو ہر ایک سلطنت اپنے اپنے ماتحت ریاست سے امداد لیتی تھی۔ اور اس اعتبار سے گویا ملوک حیرہ یعنی مناذرہ اور ملوک غسان میں بھی مقابلہ رہتا تھا۔ ملوک غسان میں سب سے پہلا بادشاہ جفنہ ہوا ہے اور سب سے آخری بادشاہ جبلہ بن الایہم ہے جس کا تذکرہ اس عنوان میں کیا جائیگا۔

حسان بن ثابت نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص اور مؤید بروح القدس تھے ایک سو بیس برس کی عمر پائی جس میں سے ساٹھ برس زمانہ جاہلیت میں گذرے اور ساٹھ اسلام میں زمانہ جاہلیت میں آپ کا تعلق دربار آل جفنہ سے بہت کچھ تھا۔ جبلہ بن الایہم کے یہاں سے نابغہ

[1] غالباً بہت سے حضرات کو سیل عرم کے حالات معلوم کرنیکا خیال پیدا ہو جائے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ مضمون زیر عنوان کو ختم کرنیکے بعد اسکے واقعات بھی اختصار کیساتھ بیان کر دیے جائیں گے۔

ذبیانی جیسے مشہور شعراء جاہلیت کے مقابلہ میں بڑے بڑے انعام و خلعت پائے تھے۔

ملوک غسان نے قیاصرہ روم کے ساتھ تعلق و ارتباط کی وجہ سے اپنا قدیم مذہب بت پرستی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ اور اسی وجہ سے شام کے اکثر قبائل میں نصرانیت کے قدم جم گئے تھے اور یہ قبائل عرب متنصرہ کہلائے جاتے تھے۔

اسلام کی روز افزوں ترقی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صدائے حق بلند و بالاتر ہونے کا تمام ملک عرب پر اثر تھا۔ اور جبتک یہ لوگ اس کے ذائقہ سے واقف نہ ہو گئے اور انکی کوشش یہی رہی کہ اسلام کی اٹھتی ہوئی قوت کو وہیں دبا دیا جائے۔ اس عالم کے مہکا دینے والے پھول کو کھلنے سے پہلے کلی ہی میں مسل دیا جائے۔ اسی بنا پر جس سے جس قدر ہوسکا اپنا زور ختم کر کے بیٹھ رہے۔ لیکن قریش مکہ کے بعد سب سے زیادہ جن کو اسلام کی قوت توڑ دینے اور اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی فکر تھی وہ ملوک غسان تھے۔ قبائل عرب اگرچہ مقابلہ پر آمادہ ہوئے تھے۔ مگر اُن کے پاس نہ باقاعدہ لشکر تھا اور نہ کسی قسم کا ساز و سامان تھا۔ غسانیوں کی سلطنت نہایت باقاعدہ اور زوردار تھی اُن کا لشکر بھی آراستہ تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک زبردست سلطنت سے اُن کے تعلقات وابستہ تھے قیصر روم ہر وقت اُن کی امداد پر آمادہ اور مستعد تھا۔ ملک غسان دل میں اس خیال کو لئے ہوئے بیٹھا اور اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اسی درمیان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قاصد شجاع بن وہب الاسدی نامۂ مبارک لیکر اس کے نام ایسے وقت پہنچے جبکہ قیصر روم کسریٰ کے مقابلہ سے فارغ ہو کر دوگانہ شکر ادا کرنے بیت المقدس آیا ہوا تھا اور شاہِ غسان اُن کی دعوت کے انتظام میں مشغول تھا۔ اسی وجہ سے کئی روز حضرت شجاع کو وہاں قیام کرنا پڑا اور رسائی نہ ہوئی۔ مگر اس درمیان میں بادشاہ کا حاجب (ایڈیکانگ) اُن سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حالات اور اسلام کی حقیقت دریافت کرتا رہا۔ اور جب وہ بیان فرماتے تو اس پر رقت طاری ہوتی۔ اور کہتا کہ میں نے انجیل میں آخر الزمان کے حالات دیکھے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ شام میں مبعوث ہونگے۔ مگر معلوم ہوا کہ عرب کے بے آب و گیاہ ملک میں مبعوث ہوئے ہیں میں تو ایمان لے آیا۔ البتہ اظہار بیا

اس کا اندیشہ ہے کہ بادشاہ مجھے قتل کر دے گا۔ آخر ایک روز قاصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملک غسان کے سامنے پیش ہوئے۔ اور انہوں نے نامۂ مبارک اُس کو دیا جس کا مضمون یہ تھا

فانی ادعوك الی ان تؤمن باللہ — میں تم کو فقط ایک خدا پر ایمان لانے کی طرف بلاتا ہوں

وحدہ لا یبقی لك ملكك۔ — اگر تم ایمان لائے تو تمہارا ملک بحالہ تمہارے لیے رہیگا۔

شاہ غسان نامۂ مبارک کو پڑھ کر بھڑک اُٹھا۔ اور غصہ سے یہ بات کہی کہ میرا ملک کون چھین سکتا ہے میں خود مدینہ پر چڑھائی کروں گا۔ اور اُسی وقت فوجی افسروں کو آراستگی لشکر کا حکم دیا۔ اور قاصد سے کہا جواب خط یہی ہے کہ جو کیفیت تم نے دیکھی ہے بیان کر دینا چلتے وقت حاجب نے پیام دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام کے بعد عرض کر دینا کہ میں ایمان لے آیا ہوں۔ حضرت شجاع فرماتے ہیں میں نے ملک غسان کی پوری کیفیت بیان کی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ باد ملکہ (اُس کا ملک تباہ ہوگیا) اہلِ سیر نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ نامۂ مبارک کس کے نام لکھا تھا۔ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام جو منجانب قیصر روم دمشق کا گورنر تھا یا جبلہ بن الایہم کے نام جو حوران وبلقاء کا تاجدار اور مالک تاج ونگین تھا۔ سیرۃ حلبی میں تو اصل اس کو قرار دیا گیا ہے کہ نامۂ مبارک حارث کے نام تھا۔ اور ابن ہشام وغیرہ دوسرے مصنفین نے لکھا ہے کہ شجاع بن وہب جبلہ کے یہاں نامۂ مبارک لیکر گئے تھے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ دونوں کے نام علیحدہ علیحدہ نامہ لیکر گئے تھے۔ میرے خیال میں بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل بادشاہ تو جبلہ تھا۔ اس لئے لازم تھا کہ جب رسول اللہ علیہ وسلم نے سب چھوٹے بڑے ملوک اور رؤسا عرب کے نام خطوط بھیجے تو جبلہ کے نام جو سب سے زیادہ طاقتور اور بانخوت تھا۔ کیوں نہ بھیجتے۔ البتہ یہ امر قرین قیاس تھا کہ حارث کے نام خط نہ بھیجا جاتا۔ کیونکہ وہ خود مستقل بادشاہ نہ تھا۔ بلکہ قیصر روم کا گورنر اور ایک خاص صوبہ پر مامور تھا۔ اور گو مستقل بادشاہ نہ تھا۔ مگر اپنے اقتدار اور اُس تقرب کی وجہ سے جو دربار قیصر میں اُسکو حاصل تھا۔ جبلہ سے بھی زیادہ باوقعت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ گورنر شام سلطنت غسان کا رزیڈنٹ بھی ہوتا تھا۔ قیصر کے احکامات شاہ

غسان تک بواسطہ گورنر شام پہنچتے تھے۔ اس لئے اس کے نام بھی نامۂ مبارک بھیجا جانا چاہیئے۔

الغرض اس مراسلت کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اب مشتعل ہو گئی اور ملک غسان اپنی تمام قوت سے آمادۂ پیکار ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

غسانیوں کے اسی دیرینہ اور مضمر عداوت اور حال کے اشتعال ہی کا ایک ثمرہ معرکہ موتہ بھی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل قیصر روم کے نام ایک خط حارث بن عمیر کے ہاتھ بھیجا۔ ملک شام کے ایک صوبہ پر شرحبیل بن عمرو غسانی منجانب قیصر حاکم تھا۔ حارث جب اُس موضع میں پہنچے جس کا نام مؤتہ تھا تو شرحبیل نے حارث سے دریافت کیا شاید تم بھی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قاصد ہو انہوں نے اقرار کیا تو شرحبیل نے اُسی وقت اُنکی گردن مار دی۔ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قاصد کسی جگہ مقتول نہوا تھا۔ اور نہ دنیا کے قانون میں قاصدوں کا قتل کرنا جائز تھا آپ کو اطلاع پہنچی تو نہایت سخت صدمہ ہوا اور آپ نے تین ہزار کی جمعیت انتقام کی غرض سے بھیجی۔ اور زید بن حارثہ کو سپہ سالار مقرر فرمایا۔ لیکن یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر زید مقتول ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب امیر بنائے جائیں۔ اور وہ بھی مقتول ہوں تو عبداللہ بن رواحہ امیر مقرر کئے جائیں وہ بھی مارے جائیں تو مسلمان خود کسی کو منتخب کر لیں ایک یہودی نے جو اس مجلس میں بیٹھا ہوا تھا سُن کر کہا کہ انبیاء بنی اسرائیل جب ایسا فرماتے تھے تو سب کے سب مقتول ہوتے تھے۔ آپ بھی اگر نبی ہیں تو یہ تینوں ضرور مقتول ہوں گے۔ پھر اس یہودی نے زید بن حارثہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اگر یہ نبی ہیں تو یاد رکھو کہ تم اب یہاں لوٹ کر نہ آؤ گے جو کچھ کہنا سننا ہے کہلو اُس پر حضرت زید نے بلا کسی قسم کے خوف و تردد کے فرمایا (اشھد انہ نبی) (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نبی ہیں)

یہ تین ہزار کی جمعیت جو مسلمانوں کے اعتبار سے تو بھاری لشکر سمجھا جاتا تھا مگر دشمن کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہ رکھتا تھا روانہ ہوئے اور موتہ پہنچکر مسلمانوں کو خبر پہنچی کہ خود قیصر ایک لاکھ رومی لشکر کے ساتھ موجود ہے اور اُس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ عرب متنصرہ اور دوسرے قبائل ہیں۔ غرض اڑھائی لاکھ کی جمعیت سے مقابلہ ہے اس خبر سے مسلمانوں میں تردد پیدا ہو گیا اور دو روز اس مشورہ میں

گذر گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اصل حال کی اطلاع بھیجدی جائے۔ اس پر آپ یا امدادی لشکر بھیجیں گے یا ہم کو واپسی کا حکم دیں گے۔ مگر تیسرے روز عبداللہ بن رواحہ نے مسلمانوں کی ہمتیں بندھوائیں۔ اور کہا کہ ہم آجتک لشکر کی کثرت اور سامان کی عمدگی پر بھروسہ کر کے کبھی نہیں لڑے ہم تو ہمیشہ اپنے دین کی سچائی اور وعدہ ہائے خداوندی پر بھروسہ کر کے میدان میں جاتے ہیں یا تو ہی کیا ہے یا غالب آجائیں گے یا شہید ہو جائیں گے۔

یہ گفتگو سن کر سب مسلمان آمادہ ہو گئے۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ یہاں تو معرکۂ کارزار گرم ہوا وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب حال منکشف ہوتے گئے۔ آپ نے مجمع صحابہ میں فرمانا شروع کیا۔ زید مقتول ہوئے۔ اور جھنڈا جعفر نے سنبھالا جعفر مقتول ہوئے اور جھنڈا عبداللہ بن رواحہ کے سپرد ہوا عبداللہ بن رواحہ بھی مقتول ہوئے اور اب جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے یعنی خالد نے ہاتھ میں لیا۔ اور اسکے ہاتھ پر فتح ہوئی تینوں جلیل القدر صحابہ اور سپہ سالاروں کے بعد حضرت خالد امیر ہوئے تو انہوں نے لشکر کی ترتیب کو بدل کر جنگ کی ابتدا کی اور دشمن نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو جدید امداد پہنچی اس طرح ایک سخت خونریز معرکہ کے بعد ہر فریق اپنے اپنے موقعہ پر ہٹ گیا اور لڑائی بند ہو گئی مسلمانوں کیلئے فی الحقیقت صحیح وسالم بچکر نکل آنا ہی فتح عظیم تھی۔ کیونکہ مٹھی بھر آدمی اس بے تعداد لشکر سے کیونکر جان بچا سکتے تھے۔ اور اس لئے اس کو فتح فرمانا بالکل درست تھا۔

لیکن بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت خالد کے حملہ کی تاب نہ لا کر رومی لشکر کو سخت ہزیمت اختیار کرنی پڑی اور ان میں سے بے انتہا مقتول و مجروح ہوئے۔

فی الحقیقت ان دونوں روایتوں میں کچھ تخالف نہیں ہے حضرت خالد نے لشکر کی ترتیب بدل کر اوّل بار حملہ کیا تو ایک سخت لڑائی کے بعد ہر دو فریق بلا ہزیمت لڑائی کو ختم کر کے اپنے اپنے موقع پر ہٹ آئے ہوں اور جب حضرت خالد کو یہ معلوم ہوا کہ رومی لشکر میں آثار مرعوبیت پیدا ہو گئے ہیں تو دوسرا زبردست حملہ کیا ہو جس سے انکے پیر اکھڑ گئے کیونکہ لڑائی سات روز تک جاری رہی تھی۔ اور اس درمیان میں متعدد بار حملوں اور مدافعت کی نوبت آئی تھی۔

الغرض موتہ کا سخت ترین معرکہ جو حقیقت میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے پہلا معرکہ تھا۔ اور مسلمانوں کو اس وقت تک کسی باقاعدہ لشکر سے مقابلہ نہوا تھا۔ اور سلاطین عظام میں کسی کے ساتھ نبرد آزمائی کی نوبت نہ آئی تھی غسانیوں ہی کی عداوت اور سخت ترین بغض کا نتیجہ تھا۔

غزوہ تبوک جو سخت ترین غزوہ تھا جس نے کھرے اور کھوٹے کو علیحدہ کر کے رکھدیا جس نے منافقوں کی پوری حقیقت کھولدی اور اسی وجہ سے اسکو فاضحہ یعنی رسوا کرنے والا بھی کہتے ہیں اگرچہ گو معرکہ کارزار کی نوبت نہیں آئی مگر تھا وہ غسانیوں ہی کی عداوت کا ایک شوشہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ عرب متنصرہ اور غسانیوں نے ہرقل قیصر روم کو اطلاع دی کہ یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جو دعوۂ نبوت کرتا تھا ہلاک ہوگیا اور اُسکی امت کے لوگو نپر قحط سالی کی سخت مصیبت نازل ہے۔ اس وقت سے بہتر دوسرا کوئی وقت اُنکے استیصال کا نہ ملے گا۔ قیصر نے یہ خبر سُنکر لشکر عظیم ملک شام میں جمع کیا اور مقدمۃ الجیش کو بلقار یعنی پایہ تخت ملوک غسان میں بھیجدیا۔ اس خبر کو سُنکر آپ نے بھی بہ نفس نفیس مسلمانوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ شام کا قصد فرمایا اس غزوہ میں مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ تبوک پہنچکر معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل بے اصل تھی۔

ان واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملوک غسان اور عرب متنصرہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے کس قدر بغض تھا۔ اور گویا تمام مخالفین کی منتشر قوتیں سمٹ کر بلقار میں جمع ہوگئی تھیں اور اسی وجہ سے مسلمان بھی اس کو اہمیت اور اندیشہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

مسلمانوں میں غسان کے حملہ کا جسقدر چرچا تھا اُس کا حال اُس طویل حدیث سے معلوم ہو سکتا ہے جو بخاری وغیرہ کتب حدیث میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔

ہم اُس حدیث کو بتمامہ نقل کرنا مناسب مقام نہیں سمجھتے۔ البتہ وہ فقرے جو اس غرض سے متعلق ہیں یہاں لکھتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا تھا ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے وہ دو کونسی ہیں جن کے بارے میں ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما نازل ہوا ہے

اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب قصہ بیان فرمایا منجملہ اُس کے یہ ہے۔

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ کے عوالی[1] میں سے بنی اُمیہ بن زید میں رہتا تھا۔ ایک انصاری میرے رفیق تھے اُن کی اور میری یہ قرارداد ہو چکی تھی کہ ہم میں سے ایک شخص اپنی اپنی باری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرے اور وہاں کے واقعات آکر دوسرے سے بیان کردے اور دوسرا امورِ خانہ داری وغیرہ ضروریات میں مصروف رہے ہم برابر سُنتے تھے کہ غسان مدینہ پر چڑھائی کرنیوالا اور اُس کے سامان میں مصروف ہے ہم کو اس کے حملہ کا خوف اور آمد کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ اسی درمیان میں ایک روز میرا رفیق انصاری اپنی باری کے دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے عشار کے بعد لوٹا۔ تو اُس نے نہایت زور و شدت سے دروازہ کو کوٹا۔ اور کہا کیا عمر گھر میں ہیں۔ اُسکے اس خلاف عادت انداز سے میں گھبرا کر نکلا۔ تو اُس نے کہا غضب ہو گیا سخت حادثہ پیش آیا۔ میں نے کہا اجاء غسان (کیا غسان آپہنچا)

قال لا بل اعظم من ذلک واھول۔ | (کہا نہیں اس سے بھی بڑھکر حادثہ پیش آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دیدی ہے)

حضرت عمرؓ صبح ہی اُٹھکر آپ کی خدمت میں پہنچے اور وہاں جاکر معلوم ہوا کہ طلاق کی خبر غلط ہے البتہ آپ کسی وجہ سے رنجیدہ اور یکسو ہو کر بالاخانہ میں تشریف رکھتے ہیں۔

اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غسان کی چڑھائی کا مدینہ کے گھر گھر میں چرچا تھا چھوٹے بڑے سبکو اسکا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ گویا ہر وقت اُسکی آمد کے منتظر تھے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے حادثہ کا لفظ سُنتے ہی یہ خیال کرلیا کہ غسان آپہنچا۔

یہاں پر یہ خدشہ نہ کیا جائے کہ صحابہ کو جبکہ اپنے غلبہ اور دین اسلام کی کامل اشاعت اور فتح کا ... یقین تھا ان کو ہر قسم کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ تو ان کو غسان کی وجہ سے اس قدر خوف اور اندیشہ کیوں تھا کیونکہ بیشک ان کو اسلام کی برتری اور غلبہ کا یقین کامل تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] عوالی اُن محلوں کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے جانب مشرق واقع تھے اور قبیلہ اوس کی منازل اُن میں واقع تھیں۔

وعدوں کو مو بہو سچا سمجھتے تھے اُن کو یقین تھا کہ ایک دن کسریٰ وقیصر کی سلطنتیں اسلامی علم کے سایہ میں ہونگی غسان بیچارہ کی کیا حقیقت ہے۔ مگر انسانی طبیعت آثار سے ضرور متاثر ہوتی ہے اور ظاہری طور پر سرور وغم۔ شدہ۔ ورخار۔ وسعت وتنگی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ امر بھی باعث تشویش ہو تو عجب نہیں کہ اگرچہ انجام کار غسانی خائب وخاسر ہی رہیں۔ مگر معلوم نہیں کہ ایسے سخت معرکہ میں کتنی جانیں ضائع ہوں کتنے گھر ویران برباد ہو جائیں۔ آخر موتہ کے سخت اور عظیم الشان معرکہ میں انہیں غسانیوں کی بدولت مسلمانوں کو کس قدر نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ اُن کے چیدہ برگزیدہ سپہ سالار کام آئے تھے۔ اور اس لشکر کو خواہ اس وجہ سے کہ لڑائی کا اختتام کامل فتح پر نہوا تھا۔ بلکہ حضرت خالد کے حسن تدبیر سے لڑائی اس طرح ختم ہوگئی تھی کہ ہر دو فریق ہٹ گئے تھے۔ یا اس وجہ سے کہ بعض لوگ میدان سے بھاگے تھے (فرارون) (یعنی بھاگنے والے) کہا گیا جس کے دفعیہ کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے بل انتم الکرارون (تم بھاگنے والے ہرگز نہیں ہو بلکہ لوٹ کر حملہ کرنے والے ہو)۔

الغرض فتح وغلبہ کے تیقن کے ساتھ ہر شخص میں انفراداً تشویش کا پیدا ہو جانا۔ اور اپنے نفس پر بھروسہ کرنے کیوجہ سے یا ہر شخص خاص کو اپنے انجام کی فکر ہونے سے خوف واندیشہ کا محسوس ہو جانا صحابہ کے علو مرتبت۔ توکل اور رسوخ ایمانی کے بالکل منافی نہ تھا۔

یہاں ایک دوسرا شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ غسانی کا مدینہ پر چڑھائی کرنا۔ اور مسلمانوں کے استیصال کے ارادہ سے آنا حقیقت میں اسلام کیلئے بھاری اور سخت وقت تھا۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنے ارادہ میں کسی درجہ بھی کامیاب ہوتا تو نہ اسلام کی خیر تھی نہ مسلمانوں کا کہیں ٹھکانا تھا۔ پھر حضرت عمر کے رفیق انصاری کا یہ کہنا جل اعظم من ذلک واھول (بلکہ اُس سے بھی بڑا اور خوفناک حادثہ پیش آیا) کیونکر درست ہوسکتا ہے۔ غسانی کا فتنہ عام تھا اور یہ صورت خاص تھی جس کا اثر ازواج مطہرات یا اُن کے قریبی رشتہ داروں تک پہنچتا تھا۔ اور وہ اس قسم کا صدمہ تھا جس سے کسی زندگی کے مراحل طے کرنیوالے اور تاہل ومعاملات دنیا میں مشغول رہنے والے کا بالکل محفوظ رہنا دشوار اور قریب ناممکن کے ہے۔

اسی وجہ سے اس قسم کے واقعات معمولی سمجھے جاتے ہیں اور انکی مضرت ایک خاص لحاظ سے متجاوز نہیں ہوتی۔

اس شبہ کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ چونکہ حضرت عمر کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ بھی ازواج مطہرات میں تھیں۔ اس لئے اس صدمہ کا اثر خاص حضرت عمر کی ذات تک زیادہ پہنچتا تھا۔ اور اسی بنا پر اُنکے رفیق انصاری نے اُسکو اعظم قرار دیا۔ یعنی آپ کیلئے غسانی کے حادثہ سے بھی زیادہ ہے

یہ جواب بجائے خود صحیح ہے۔ اُس تعلق کیوجہ سے جو آدمی کو اپنی اولاد کیساتھ ہوتا ہے اور اُس دائمی شرف و فخر کے فوت ہوجانے سے جو درصورت ظہور طلاق متیقن تھا رفیق انصاری کا بہ نسبت حضرت عمر اُسکو اعظم و اہول قرار دینا سراسر قرین قیاس اور مطابق عقل تھا۔

لیکن اگر اُس وجہ کے ساتھ اس کو بھی ملالیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو محبت اور عشق ذات مقدس حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اسکی بنا پر کوئی حادثہ اور کوئی صدمہ اور کوئی مصیبت اگرچہ کتنی ہی بڑی ہو اس سے زیادہ نہو سکتی تھی کہ آپکے قلب مبارک کو کسی قسم کی کلفت یا کوئی ملال و صدمہ پہنچے غسانی کا فتنہ ایک ظاہری طور پر تشویش میں ڈالنے والی بات تھی اور حضور کے قلب مبارک کا ملال صحابہ کے خرمن صبر کو جلا دینے والا۔ اُنکی عافیت و راحت کو برباد کرنیوالا۔ اُن کی زندگی کو تلخ کردینے والا تھا۔

اس بنا پر سب پریشانیوں پر یہ پریشانی غالب آگئی۔ غسانی کی آمد آمد کی خبریں سب صحابہ صبر و سکون کیساتھ سن رہے تھے فکر تھا تو بمقتضائے بشریت اسی قدر تھا جیسا کہ اس قسم کے واقعات میں ہونا چاہیئے ظاہری طور پر نہ کچھ اُس کا اہتمام تھا نہ ایسی ہل چل تھی جسے کوئی اجنبی شخص محسوس کرسکے۔

برخلاف اس صورت کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو ذرا اندوہگین دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم بے اختیار ہو رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو صبح کی نماز پڑھاکر بالاخانہ پر تشریف لیگئے اور صحابہ کی ایک جماعت منبر شریف کے گرداگرد گریہ و زاری میں مشغول تھی۔

صحابہ کی اس حالت کو دیکھکر ہر شخص خیال کرسکتا ہے کہ یہ صدمہ اُنکے نزدیک بھی اور فی الواقع بھی

اُس فتنہ سے جو غسانی کی آمد میں متصور تھا بہت زیادہ تشویش ناک اور خطرناک تھا۔

اس میں بھی اختلاف ہے کہ غسانی جس کے مدینے پر حملہ کرنے کی خبر گرم تھی۔ حارث ابن ابی شمر گورنر دمشق تھا یا جبلہ ابن الایہم تاجدار حوران و ملقباء۔

طبرانی میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ غسانی جبلہ ابن الایہم تھا یہی روایت قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جبلہ خود مستقل بادشاہ اور اندرونی انتظامات میں خود مختار تھا۔

اگر قیصر روم کے ایماء سے بھی ایسی صورت پیش آئی ہو تب بھی ظاہر یہ ہے کہ جبلہ ہی آگے کیا گیا ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ حارث و جبلہ دونوں کے اتفاق و اتحاد سے ایسا عزم کیا گیا ہو۔ اُدھر قیصر روم نے حارث کو مامور کیا اور ادھر جبلہ آمادہ ہوا ہو۔ واللہ تعالیٰ بالصواب۔

ناظرین ان واقعات سے آپ کو ملوک غسان اور اُس کے سب سے آخری بادشاہ جبلہ کا حال بالاجمال معلوم ہوگیا اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ اُنکے تعلقات مسلمانوں سے کس قدر کشیدہ تھے اور یہ کہ قریش مکہ کے بعد جو مدینہ منورہ کا محاصرہ کر کے بے نیل مرام واپس گئے تھے اب اسلام کی شوکت اور عروج کے زمانہ میں باقاعدہ اور جرار لشکر کے ساتھ حملہ کا ارادہ کیا تو صرف ملوک غسان نے اس سے اُن کی عداوت اور قوت دونوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ناظرین یہ ہے وہ جبلہ بن الایہم جس کا تذکرہ اس عنوان میں کرنا چاہتے ہیں۔

جبلہ بن الایہم نے اظہار عداوت میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ مگر باں ہمہ وہ اسلام کے محاسن سے واقف تھا اُس کے کانوں تک اسلام کی خوبیاں پہنچتی رہتی تھیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق اور مرسل من اللہ ہونیکے دلائل و علامات کا بھی اُس کو علم ہوتا رہتا تھا۔ انصار کا مسلمان ہو کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں ٹھہرانا اور حمایت اور حفاظت کیلئے کمربستہ ہو کر جان و مال کو فدا کردینا بھی رفتہ رفتہ اُس کے اندر اسلام کی تحریک پیدا کر رہا تھا کیونکہ انصار اُس کے ہم جد تھے۔

بالآخر یہ تحریک قوی ہوتی گئی۔ اور گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو گذر گیا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ خیال اُسکے قلب میں اس درجہ راسخ ہوا کہ اُس نے خود بدایت کر کے حضرت

عمرؓ کو لکھا کہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

آپ نے نہایت مسرت سے تحریر فرمایا تم بے تکلف چلے آؤ۔

لك مالنا وعليك مالنا (ہر حال میں تم ہم جیسے بن جاؤ گے)

جبلہ اپنے قبیلہ عک وغسان کے پانسو آدمیوں سمیت روانہ ہوا۔ مدینہ سے دو منزل رہ گیا تو حضرت عمرؓ کی خدمت میں اطلاع بھیجی اور اپنے لشکر کے دو سو سواروں کو حکم دیا کہ زربفت حریر کی سرخ زرد وردیاں پہنیں اور گھوڑوں پر دیباج کی جھولیں ڈال کر سونے کے طوق انکو پہنا دیں اور خود اپنا تاج سر پر رکھا اور پوری شان دکھلانے کو اپنے خاندان کی بہترین اور مایہ فخر یادگار قرط ماریہ[۱] تاج میں لگائیں اور اس شان سے مدینہ میں داخل ہونیکے لئے تیار ہوا۔

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو اُس کے استقبال اور باعزاز و تکریم اُتارنیکا حکم دیا۔ مدینہ منورہ میں ایک عام مسرت اور خوشی کا جوش پھیلا ہوا تھا۔ بچے اور بوڑھے اس جلوس کے نظارہ کے دیکھنے کو نکل کھڑے ہوئے۔ اور نہ صرف مردوں ہی کو اس پراثر نظارہ کو دیکھنے کا شوق تھا بلکہ بوڑھیاں۔ اور جوان عورتیں کنواری لڑکیاں اور چھوٹی بچیاں سب کی سب جھروکوں اور کھڑکیوں میں دیکھنے کے لئے کھڑی ہوگئیں حقیقت میں مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھ کر خوشی کی کونسی بات ہوسکتی تھی کہ دین اسلام جس کے پھیلانے کی خدمت اُنکے سپرد ہوتی تھی اُس کے اندر اس طرح رضا و خوشی سے بڑے بڑے تاجدار داخل ہوں لیکن اس وقت یہ خوشی اس وجہ سے بھی دوبالا ہو رہی تھی کہ وہی شاہ غسان جس کے حملہ کا چرچا گھر گھر تھا اور جس کے خوف سے سب سہم رہے تھے آج اس طرح سر تسلیم جھکائے حصار مدینہ میں داخل ہوتا ہے۔ یہ خدا کی قدرت کا ایک تماشا اور اسلام کی ایک کرامت تھی اور اسی وجہ سے سب چھوٹے

---

[۱] ماریہ بنت ظالم حجر اکل المرار کی زوجہ اور ہند الہنود کی بہن تمام ملوک غسان کی دادی ہے اُس کے پاس جو بالیاں تھیں جن میں دو موتی کبوتر کے بیضہ کی برابر لگے ہوئے تھے۔ یہ بالیاں اپنی خوبصورتی اور بیش قیمت موتیوں کی وجہ سے بے مثل سمجھی جاتی تھیں کہا جاتا تھا کہ روئے زمین کے بادشاہوں کے خزانہ میں ایسے موتی اور ایسی بالیاں نہیں ہیں۔ ملوک غسان کو ان پر فخر تھا اور وہ اُن کو بیش قیمت اور نادر ہونیکے علاوہ اپنی صاحب اقبال دادی کی یادگار سمجھ کر اُن کا نہایت احترام کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے جبلہ نے یہ دکھلانے کو کہ اپنی اس شاہانہ حیثیت و حالت آزادی و خود مختاری کو چھوڑ کر دین اسلام میں داخل ہو کر خلیفۃ المسلمین کے اتباع کو گوارا کرتا ہوں۔ ان بالیوں کو بھی اپنے تاج میں لگا لیا تھا۔ ۱۲

بیتابانہ اس جلوس کو دیکھنے کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔

الغرض اس عزت و تکریم شان و شوکت اور استقبالیہ جماعت کی جھرمٹ میں شاہانہ جلوس کے ساتھ جبلہ مدینہ کے اندر داخل ہوا حضرت عمر نے مراسم مہمانداری میں کوئی کسر نہ رکھی۔ اور مدینہ منورہ میں چندروز اُن نئے مہمانوں کی آمد سے خوب چہل پہل رہی۔

زمانۂ حج قریب تھا حضرت عمر ہر سال بہ نفس نفیس حج کو تشریف لیجایا کرتے تھے۔ اس سال ارادہ کیا تو جبلہ بھی ہمرکاب روانہ ہوا۔ بدقسمتی سے وہاں یہ بات پیش آئی کہ طواف کی حالت میں جبلہ کے تہبند پر جو بوجہ شان امارت زمین پر گھسٹتا ہوا جاتا تھا قبیلہ فزارہ کے ایک شخص کا پیر رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے تہبند کھُل گیا۔ جبلہ کو غصہ آیا اور اُس نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ اُس کی ناک ٹیڑھی ہوگئی۔

مقدمہ خلافت کی عدالت میں پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے جبلہ سے فرمایا کہ یا تم مدعی کو رضامند کرو ورنہ قصاص دینے پر رضامند ہو جاؤ۔ جبلہ کو یہ خلاف توقع فیصلہ سخت ناگوار گذرا۔ اُس نے کہا کہ ایک معمولی شخص کے عوض مجھ سے قصاص لیا جائیگا۔ میں بادشاہ ہوں اور وہ عام رعیت کا ایک فرد آپنے فرمایا کہ اسلام نے تمکو اور اُس کو بادشاہ اور رعیت کو اپنے احکام میں مساوی کر دیا ہے کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے۔

جبلہ نے کہا کہ میں تو یہ سمجھ کر مسلمان ہوا تھا کہ پہلے سے زیادہ باعزت و محترم ہوکر رہونگا۔ آپنے فرمایا اسلامی قانون کا فیصلہ تو یہی ہے جس کی پابندی ہم پر اور تم پر لازمی ہے۔ اس کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔ عزت قائم رکھنی ہے تو اُس کو راضی کرلو۔ ورنہ مجمع عام میں بدلہ دینے کو تیار ہوجاؤ۔

جبلہ نے کہا تو میں عیسائی بن جاؤں گا۔ آپنے فرمایا تو اب تیرا قتل ضروری ہوگا۔ کیونکہ مرتد کی سزا یہی ہے۔ جبلہ نے کہا تو آپ مجھے اپنے معاملہ میں غور کرنے کے واسطے رات بھر کی مہلت دیجئے یہ درخواست منظور ہوئی۔ جبلہ رات کو لشکر سمیت خفیہ مکہ سے نکل بھاگا۔ اور قسطنطنیہ پہنچکر نصرانی بن گیا۔ قیصر نے اُس کے اکرام میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ اور جاگیریں اُس کو

دیں۔ عزت واحترام میں اپنے مساوی بنادیا۔

اس عرصہ میں حضرت عمرؓ نے ایک قاصد دعوت اسلام دینے کیواسطے قیصر کے پاس بھیجا۔ قیصر نے اسلام سے تو انکار کیا۔ مگر مصالحت پر رضامند ہوگیا۔ اور اس قاصد سے کہا کہ تمہارا ایک بھائی جو اسلام سے بیزار ہوکر عیسائی بن گیا ہے .... یہاں موجود ہے اُس سے بھی ملو۔ یہ قاصد جبلہ کے یہاں پہنچے تو قیصر کے دروازہ پر جو سازو سامان جاہ جلال دیکھا تھا وہ یہاں دیکھا۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ جبلہ اعلیٰ درجہ کے بلورین تخت پر جلوہ گر ہے اُس نے مجھکو پہچانا تو اپنے برابر تخت پر بٹھلایا۔ اور مسلمانوں کے حالات پوچھنے شروع کئے میں نے کہا اب تو بہت زیادہ ہو گئے۔ حضرت عمر کو دریافت کیا۔ میں نے کہا بہت اچھی طرح سے ہیں حضرت عمر کی خیریت اور سلامتی کا حال سُنکر اُس کے چہرہ پر انقباض کے آثار ظاہر ہوئے مجھکو بیٹھنے کیوقت معلوم نہ تھا کہ میں سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ جب معلوم ہوا تو تخت سے نیچے اُتر کر بیٹھ گیا۔ جبلہ نے کہا۔ تم اس اعزاز کو کیوں چھوڑتے ہو۔ میں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسی جگہ بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ کے نام مبارک کیساتھ مجھ سے صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سُنکر اُس نے بھی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ زبان سے ادا کئے۔ بعد میں مجھ سے کہا کہ دل صاف ہونا چاہئے پھر کسی جگہ بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔

قاصد کہتے ہیں کہ اُس کی زبان سے صلی اللہ علیہ وسلم سُنا تو مجھے اُس کے مسلمان بن جانے کی طمع ہوئی۔

میں نے کہا کہ جبلہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ کہا کیا ان حرکتوں کے بعد بھی میں مسلمان ہو سکتا ہوں۔

میں نے کہا ایک فزاری شخص نے اس سے بھی بڑھ کر جرم کیا تھا مسلمانوں پر تلوار چلائی تھی پھر وہ مسلمان ہو گیا ہے میں اُس کو مدینہ میں مسلمان چھوڑ کر آیا ہوں۔

جبلہ نے کہا اتنی بات پر تو مسلمان نہیں ہوتا۔ اگر حضرت عمرؓ اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کریں اور

اپنے بعد مجھے ولی عہد خلافت بنا دیں تو بیشک مسلمان ہو جاؤں گا

راوی کہتے ہیں میں نے نکاح کی ذمہ داری تو کرلی۔ مگر ولیعہدی کی ذمہ داری نہ کی اُس کے بعد جبلہ نے ایک خادم کو اشارہ کیا۔ فوراً ہی چاندی کی رکابیوں میں کھانا آنا شروع ہوا۔ اور ایک سونے کے خوان میں میرے سامنے بھی رکابیاں رکھی گئیں۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اُس نے سبب پوچھا۔ میں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اُس نے بھی میرے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ادا کئے۔ اور پھر یہی کہا کہ دل پاک ہونا چاہیئے کسی برتن کے اندر کھانے میں کیا ڈر ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر پھر خادم کو اشارہ کیا تو فوراً سونے کی مرصع بجواہر کرسیاں دس اُس کے داہنی جانب اور دس بائیں جانب بچھا دی گئیں۔ اور پھر بیس خوش گلو گانے والیاں زیور سے لدی ہوئی قیمتی لباسوں میں ناز و انداز سے آکر داہنے بائیں بیٹھ گئیں۔ اور پھر ایک باندی آئی جس کے سر پر ایک خوبصورت چھوٹی سی چڑیا بیٹھی تھی۔ اور دونوں ہاتھوں میں دو پیالیاں تھیں ایک میں مشک اور عنبر باریک پسا ہوا۔ دوسری میں گلاب کا عرق۔ خادم نے ایک سیٹی دی جس کو سُن کر وہ چڑیا اُڑی اور گلاب کے عرق میں غوطہ لگا کر دوسری پیالی میں لت پت ہو گئی۔ اور جبلہ کے تاج پر جو صلیب تھی اُس کے اوپر جا کر بیٹھی۔ اور اپنے پروں کو اس خوبصورتی سے ہلایا کہ مشک و عنبر کے چھینٹے جبلہ کے چہرے اور ڈاڑھی پر گرے۔ جبلہ غایت سرور سے بہت ہنسا۔ اور ان باندیوں کو گانے کا اشارہ کیا۔ داہنی طرف کی جماعت نے اس خوبی سے گایا کہ جبلہ پر سرور کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر دوسری جماعت کو اشارہ کیا اُن کے گانے سے اُس پر گریہ طاری ہوا۔

یہ حالت تھی یہ جاہ و جلال تھا۔ یہ احترام و اکرام تھا۔ قیصر کو جو بات نصیب نہ تھی وہ جبلہ کو تھی جبلہ خود بھی بادشاہ تھا اور قیصر کو ایسے با اعزاز شخص کا نصرانی بن جانا غنیمت کیا عزت کا باعث تھا۔ اس لئے اپنی ذات سے بھی اُس کو مقدم سمجھتا تھا۔

مگر جبلہ اسلام کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا مسلمانوں کے معاملات اُن کے اخلاق اور برتاؤ کا

خود تجربہ کیا تھا - رہ رہ کر اپنی حرکت پر پشیمان ہوتا تھا - اور اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہونے سے سخت بیزار تھا -

سفیر اسلام کو سب کچھ اپنا تزک و احتشام دکھلانے کے بعد نہایت حسرت و اندوہ کے ساتھ اشعار ذیل اُسکی زبان پر جاری ہوئے -

تَنَصَّرَتِ الْأَشْرَافُ مِنْ خَوْفِ لَطْمَةٍ
خاندانی شریف تھپڑ کے خوف سے نصرانی بن گئے

وَمَا كَانَ فِيهَا لَوْ صَبَرْتُ لَهَا ضَرَرْ
اگر میں اُس پر صبر کرتا تو کچھ نقصان نہ تھا

تَكَنَّفَنِي فِيهَا لَجَاجٌ وَنَخْوَةٌ
نخوت اور ہٹ نے مجھکو گھیر لیا

وَبِعْتُ بِهَا الْعَيْنَ الصَّحِيحَةَ بِالْعَوَرْ
اور میں نے تندرست آنکھ کو عیب ناک کے بدلے فروخت کیا

فَيَا لَيْتَ أُمِّي لَمْ تَلِدْنِي وَلَيْتَنِي
اے کاش میری ماں مجھکو نہ جنتی اور کاش

رَجَعْتُ إِلَى الْأَمْرِ الَّذِي قَالَ لِي عُمَرْ
میں حضرت عمرؓ کے حکم کو مان لیتا

وَيَا لَيْتَنِي أَرْعَى الْمَخَاضَ بِقَفْرَةٍ
اور کاش میں کسی جنگل میں اونٹ چراتا

وَكُنْتُ أَسِيرًا فِي رَبِيعَةَ أَوْ مُضَرْ
اور ربیعہ و مضر میں غلام بنا ہوا ہوتا

وَيَا لَيْتَ لِي بِالشَّامِ أَدْنَى مَعِيشَةٍ
اور کاش ملک شام میں تھوڑا سا روزینہ ہوتا

أُجَالِسُ قَوْمِي ذَاهِبَ السَّمْعِ وَالْبَصَرْ
اور اپنی قوم میں اندھا بہرا ہو کر گذار دیتا

ہر شخص جبلہ کی اس حالت اور اشعار کے مفہوم کو ملا کر اندازہ کر سکتا ہے کہ شاہی جاہ و جلال میں بھی اُسکو اسلام کی سادگی اور برتری رہ رہکر یاد آتی تھی اور اُس کے دلمیں حسرت اور یاس کے نشتر چبھوتی تھی - وہ پشیمان تھا کہ ایک تھوڑی سی بات پر میں نے اسلام کی لازوال دولت کو ہاتھ سے کھو دیا اور دنیا کی ہی حقیقی راحت اور آسایش کو جو حریت و مساوات کے سوا کہیں حاصل نہیں ہو سکتی برباد کر کے اس چند روزہ عیش و آرام اور تزک و شان کو خرید لیا مسلمانوں کے اخلاق و اوصاف خلیفہ سے لیکر ادنیٰ رعیت تک ایک رنگ میں رنگے ہونا اور تفوق و امتیاز کا نام تک نہ ہونا آنکھوں میں پھر تے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح پھر اُن میں جا ملوں - مگر بدبختی سدراہ تھی -

راوی کہتے ہیں کہ میں نے واپس ہو کر سب حال حضرت عمر کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تم نے اُس کی تمام شرطیں کیوں نہ مان لیں وہ اسلام لے آتا۔ ہوتا وہی جو اللہ کو منظور تھا

دوسری مرتبہ جب پھر حضرت عمر نے قیصر کے پاس قاصد کو بھیجا تو اُس کو ہدایت کر دی کہ جبلہ جو شرطیں کرے اُن کو مان لیا جائے۔ مگر جب یہ قاصد قسطنطنیہ پہنچے تو لوگ جبلہ کو دفن کر کے واپس آرہے تھے۔ سرلیشی نے شرح مقامات میں جبلہ کے واقعہ کو اس طرح لکھا ہے۔ مگر آغانی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیصر روم کے یہاں قاصد کا بھیجنا اور جبلہ سے ملاقات کا ہونا متعدد بار ہوا ہے۔

حضرت امیر معاویہ نے بھی ولایت دمشق کے زمانہ میں قاصد بھیجا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بھیجا ہے۔ اور جبلہ سے دونوں قاصدوں کی گفتگو ہوئی ہے۔ حضرت عمر نے جثامہ بن مساحق الکنانی کو بھیجا تھا۔ اور حضرت معاویہ نے عبداللہ بن مسعدۃ الفزاری کو۔ ایک دوسرا فرق سرلیشی اور اغانی کی روایات میں یہ ہے کہ مذکورہ بالا شرائط کی گفتگو کو جو جبلہ نے اپنے اسلام کیلئے پیش کی تھیں۔ سرلیشی نے حضرت عمر کے قاصد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اغانی میں حضرت عمرؓ کے قاصد کا سارا واقعہ ملاقات اسی طرح لکھا ہے جس طرح سرلیشی نے۔ مگر شرائط اسلام اور حضرت عمرؓ کی طرف سے اُس کے جواب کا تذکرہ اُس میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ گفتگو حضرت امیر معاویہ کے قاصد عبداللہ بن مسعدہؓ کے ساتھ لکھی ہے۔ اور شرائط بھی وہ نہیں جو حسب بیان سرلیشی ہم نے اوپر بیان کی تھیں۔ بلکہ حسب ذیل شرائط پیش کی تھیں۔

(۱) بیس گاؤں جو غوطہ دمشق میں واقع اور ہماری ملک تھے۔ ہم کو واپس دیدیے جائیں۔

(۲) میری تمام جماعت کیلئے بیت المال سے روزینہ مقرر کیا جائے۔

(۳) ہم کو بیش قیمت خلعت و انعامات دیے جائیں۔

حضرت امیر معاویہ نے ان شرائط کو قاصد سے سُن کر کہا کہ تم نے کیوں نہ ان شرطوں کو منظور کر لیا۔ میں پورا کرتا۔ اس کے بعد آپ نے اس مضمون کا خط لکھا کہ تمہاری سب شرائط منظور ہیں۔ لیکن اُس کا انتقال ہو چکا تھا۔

ان روایات میں اگرچہ بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہی۔ مگر حقیقت میں تعارض نہیں ہی

یہ بالکل قرین قیاس ہی کہ حضرت امیر معاویہ نے بھی اُس وقت جبکہ حضرت عمرؓ کی جانب سے لایت دمشق کے گورنر اور سرحد روم وشام کے محافظ تھے قیصر روم سے مراسلت کی ہو۔ اور اُن کے قاصد کو جبلہ سے ملنے کی نوبت آئی اور اُسکی طرف سے ایسی شرائط پیش کیگئی ہوں جو حضرت امیر معاویہ کے حد اختیار میں ہوں۔ اور جو گو مالی اعتبار سے بھاری ہوں مگر اُن کے تسلیم میں بظاہر عذر و انکار کی کوئی وجہ نہو اور حضرت عمرؓ کے قاصد کے سامنے ایسی سخت شرائط پیش کیں۔ جن کا تسلیم کرنا بظاہر ممکن نہ تھا۔ مگر حضرت عمر نے بکمال دوراندیشی وشفقت اُن کو منظور کر لیا ہو۔ اور دونوں کی طرف سے منظوری کی اطلاع اُس وقت پہنچی ہو کہ اُس کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہاں اگر ہم حضرت امیر معاویہ کی مراسلت کو اُس زمانہ کے واقعات میں درج کریں جس وقت وہ مستقلاً دمشق کو دارالخلافت بنا کر مسند خلافت پر متمکن تھے۔ تو یقیناً دونوں روایتوں میں سے ایک کو غلط کہنا پڑتا ہے۔ مگر یہ احتمال خلاف واقع ہی۔ کیونکہ جبلہ کا انتقال ۲۰ھ یعنی خلافت عمری میں ہو چکا تھا۔

آغانی کی روایت میں اگر حضرت عمر کے قاصد کے ساتھ کسی قسم کے شرائط اور اُن کے جواب کا تذکرہ نہیں ہی تو کچھ ہرج نہیں۔ راوی اکثر روایات میں اختصار کر دیتے ہیں۔ اغانی کے اس ایک ہی واقعہ میں مختلف روایات ہیں بعض روایات مجمل ہیں۔ اور بعض مفصل۔ الغرض جبلہ کے واقعہ میں ہم سریشی کی روایات کو قابل اعتماد ٹھیرالیں تو کچھ خرابی لازم نہیں آتی۔

جبلہ کے اس مفصل واقعہ سے ہمکو بہت سے اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

نتیجہ اوّل

اسلام نے جو مکمل قانون دنیا کے سامنے پیش کیا اُس کی ایک چمکتی ہوئی اور روشن دفعہ اصول مساوات وحریت کی بھی تھی۔ اسلام نے اپنے اُصول میں شریف۔ رذیل۔ امیر غریب۔ حاکم محکوم کو ایک شاہراہ مساوات پر چلایا اور شیر بکری کو ایک گھاٹ پانی پلایا۔ اس مساوات میں مسلم وغیر مسلم کا امتیاز بھی نہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے عہد میں داخل ہو کر غیر مسلموں کے حقوق بھی مسلمانوں

کے حقوق کے برابر ہوجاتے تھے اور اسلام کے یہ اُصول محض نمائشی نہ تھے۔ بلکہ حقیقی تھے جن پر عملدرآمد کرنا خلیفۂ وقت اور اُس کے عمال کا فرضِ عین تھا۔

نتیجۂ دوم

اسلام کے اعلیٰ اور برتر قانون نے جہاں اسکی اجازت نہیں دی کہ کسی کو بزور وجبر مسلمان بنایا جائے وہیں اُس نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ جو شخص قوانین اسلام کو حقارت کی نظر سے دیکھے یا کسی قانون سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھے وہ اُس کے حلقۂ اثر میں رہ سکے۔ اسلام کی حقیقی کسوٹی پر جو پورا اُترتا تھا وہی اُس کے اندر رہ سکتا تھا۔ ورنہ جبلہ کی طرح نکال باہر کردیا جاتا تھا۔

نتیجۂ سوم

صحابہ کو اسلام کی اشاعت کا حکم تھا۔ اور وہ اس حکم کی نہایت رغبت وشوق سے تعمیل کرتے تھے۔ اُن کو اس سے زیادہ کوئی امر محبوب نہ تھا۔ ایک شخص بھی اُن کے ذریعہ سے اسلام میں داخل ہوجائے تو دنیا کی تمام نعمتوں اور راحتوں سے اُس کو بہتر اور مقدم سمجھتے تھے لیکن بایں ہمہ شغف ورغبت احکام اسلام کے بھی اس درجہ پابند تھے (یا آجکل کی اصطلاح میں اسقدر متعصب اور تنگ خیال تھے) کہ اگر دنیا بھی اسلام یا مسلمانوں کے مخالف بنجائے تب بھی کسی ایک حد شرعی کو چھوڑنا یا کسی اسلامی قانون کو بدلنا گوارا نہ کرتے تھے۔

ایک وہ دن تھا کہ جبلہ نہایت احتشام اور عزت کے ساتھ مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ مدینہ کی مرد وعورت بچے بوڑھے اُس کے دیکھنے کیلئے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ کنواری لڑکیاں بھی جھروکوں میں سے اس اسلامی شان کو دیکھنے کے واسطے چھتوں پر چڑھ گئی تھیں حضرت عمرؓ نے بھی اُسکے ساتھ وہی معاملہ فرمایا جو ایک بادشاہ کیساتھ ہونا چاہیئے۔ اُس کے استقبال کیلئے جلیل القدر صحابہؓ بھیجے گئے۔ اور اس احترام وشان کے ساتھ وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور شایان شان اُسکی مہمانی کیگئی۔

لیکن ایک دن وہ آیا کہ اُس نے بادشاہی کی نخوت میں غریب مسلمان کو ذلیل سمجھ کر دست تعدی دراز کیا۔ اور حضرت عمرؓ کے ارشاد للّٰہ مالنا تیرے لئے بھی ہے جو ہمارے یعنی مسلمانوں کیلئے ہے کو یاد کرکر

اپنی رفعت وعزت کو بڑھانا اور دوسرے جملہ علیك ما علینا نجمہ وہی باتیں لازم ہیں جو ہم پر۔ کو
نظرانداز کرکے اپنی برتری کو قائم رکھنا چاہا۔ تو حضرت عمر نے کچھ بھی پروانہ کی اور اُس کے ساتھ مثل عام
رعایا کے معاملہ کرکے برسرمجمع قصاص کے طالب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بدبخت راتوں رات
مع اپنے لشکر کے مکہ معظمہ سے نکل بھاگا اور ہرقل کے پاس جاکر نصرانی بن گیا۔ نار کو عار پر ترجیح
دی۔ ممکن ہے کہ حضرت عمر کے اس تشدد کو کوئی شخص تعصب و تنگ خیالی پر محمول کرے یا ان کو
سوء تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کا مجرم بنانے کو تیار ہو جائے۔ اور یہ کہہ گذرے کہ تھوڑے سے
تشدد پر ایک بادشاہ اور اُس کے ساتھ کے سو مسلمانوں کو اسلام کی دولت سے محروم کر دیا اور
مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے ایک ایسا دشمن پیدا کر دیا۔ جو اُن کا ہم قوم تھا۔ اور جو اُن کے راز اُن کے
طور وطریق اور اُن کے خصائل وعادات پر مطلع تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس سے اسلام کو کچھ بھی ضعف
نہیں پہنچا بلکہ اس اعلےٰ و برتر قانون نے لاکھوں غیرمسلموں کو مائل باسلام کر دیا۔

جبلہ کے مرتد ہو جانے سے جس قدر نقصان متصور ہو سکتا تھا اُس سے ہزار گونہ فائدہ پہنچ گیا
اور اُس وقت سے اس وقت تک اسلام کا قانون مساوات دنیا بھر کے واسطے رہبر بن گیا۔ جو لوگ معاملات
دین پر پختہ کاری اور حدود شرعی سے متجاوز نہ ہونے کو تعصب و تنگ خیالی سمجھتے ہیں اُن کو ذرا غور
وفکر سے کام لینا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر کو جبلہ کے مرتد ہو جانے کا قلق تھا۔ اور جبلہ بھی اسلام کی خوبیوں
سے فی الجملہ آشنا ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے جب جبلہ نے دوبارہ مسلمان ہونیکی خواہش ظاہر کرکے سخت
شرائط پیش کیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ حضرت عمر اپنی صاحبزادی کا نکاح مجھ سے کر دیں تو حضرت عمر نے
کل ایسی شرطوں کو جن سے اسلام کے کسی ایک حکم شرعی پر مضر اثر نہ پڑتا تھا۔ اور عام مسلمانوں کو بدلی
ہوتی تھی قبول فرما لیا۔ مگر بدبختی نے جبلہ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور قبل اُس کے کہ اُس کی شرائط کی منظوری
کی اطلاع پہنچے راہی عدم ہو گیا۔

نتیجہ چہارم

یہ بھی ممکن تھا کہ حضرت عمر فزاری کو مالی معاوضہ لینے یا معاف فرمانے پر آمادہ فرما دیتے اور اس میں

ذرا بھی تردد نہ تھا کہ اگر جبلہ ہمت کرکے قصاص دینے پر...... رضامندی ظاہر کر دیتا تو حضرت عمرؓ اس معاملہ کو بہ تراضی طے فرما دیتے۔ اور نوبت قصاص نہ پہنچتی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ آپکی فہمائش پر فزاری اول ہی معاف کر دیتا اور یہاں تک نوبت نہ پہنچتی مگر آپ اپنی شانِ محدثیت و فراست سے اس امر کو بخوبی جانتے تھے کہ جبلہ میں غرور سلطنت و نخوت کفر ابھی موجود ہے۔ اس کا علاج اگر ابھی نہوا تو یہ مادہ ترقی پذیر ہو کر انجام کار اس سے زیادہ بُری صورت میں ظاہر ہوگا جس کا تدارک دشوار یا ناممکن ہو جائیگا۔ اس لئے آپ نے اُس کو قصاص دینے پر مجبور کیا۔ اگر جبلہ اول ہی مرتبہ اس تلخ گھونٹ کو حلق سے اُتار لیتا تو دین و دنیا کی عزت اُس کو نصیب ہوتی عوام و خواص کی نظروں میں زیادہ وقعت سے دیکھا جاتا اور انجام کار اُس کو پچھتانا نہ پڑتا اور جہانتک حضرت کی فراست و حسن تدبیر کی طرف خیال کیا جاتا ہے یہ یقینی بات تھی کہ جبلہ کو قصاص دینے کی نوبت نہ آتی نفقط اُسکی آمادگی ظاہر ہونے پر فزاری کو معاف کر دینے کا فوراً خیال ہوتا۔ یا آپ کا ایما ہو جاتا۔ اور جبلہ پر کسی قسم کا بدنما دھبہ نہ لگتا۔

جبلہ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے قاصد سے منجملہ شرائط قبول اسلام ایک شرط یہ بھی کی تھی کہ حضرت عمرؓ اپنی صاحبزادی سے میرا نکاح کر دیں۔ اس کا منشاء بظاہر یہ تھا۔ کہ امیرالمومنین کیجانب سے جو قصاص کا حکم اور ارتداد کی سزا کی دھمکی دی گئی تھی جس سے جبلہ نے اپنی ہتک سمجھی تھی وہ اس طرح زائل ہو جائے۔ نکاح کی شرط اول تو فی نفسہ اکثر اوقات ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ایسے شرائط کا پورا ہونا تو درکنار سننا بھی بسا اوقات گرانی سے خالی نہیں ہوتا خصوصاً ایسی حالت میں کہ خود شرط لگانے والا خلیفہ اسلام کے فیصلہ سے روگردانی بلکہ حدود اللہ کو توڑ کر نکل بھاگا ہو۔ اس کیلئے تو یہ شرط جس قدر بھی ناممکن العمل ہوتی کم تھا۔ لیکن فاروق اعظم کا بلا کسی ناگواری کے اس شرط کو تسلیم فرما لینا صاف طور سے اس کو تبلا رہا ہے کہ انہیں اسلام سے بڑھ کر پیاری کوئی چیز نہ تھی یوثرون علی انفسھم کے سچے مصداق اور اشداء علی الکفار رحماء بینھم کے واقعی نشان شان تھے چونکہ اس شرط کا تعلق صرف حضرت عمرؓ کی ذات سے تھا۔ خلافت و امامت سے اسکا کوئی علاقہ نہ تھا

اس لئے حضرت عمر کو یہ گوارا نہوا کہ میرے کسی ذاتی معاملہ کی وجہ سے جبلہ دولت اسلام سے محروم رہے اور وہ جو حدیث میں آتا ہے کہ مومن کامل انسان اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک ماں سے اور باپ سے بیوی سے اور بچوں سے اور کل انسانوں سے زیادہ خدا کے رسول سے محبت نہ کرے۔ اُسے حضرت عمر نے اس واقعہ میں کر کے دکھلا دیا۔ الآن یا عمر تھا یا فلک کی جو بشارت حضرت ترجمان وحی الہی کی زبان فیض نشان سے دی گئی تھی۔ وہ ہو بہو پوری ہوئی۔ اس واقعہ سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ در بارہ دین کسی بڑے سے بڑے کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے وہیں یہ بھی نکلتا ہے کہ دین کی ترقی وعروج کیلئے وہ مال و زر فرزند و زن کی بھی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے اور اُن کے ہر کام میں للہیت نفسانیت پر مقدم رہتی تھی۔

حضرت عمر مسلمانوں کے جسمانی اور روحانی خلیفہ تھے۔ آپ جس طرح اُن کے ظاہری اخلاق اطوار کی پابندی احکام شرع کی نگہداشت کرتے تھے اُسی طرح یہ بھی چاہتے تھے کہ اُن کے باطنی اوصاف و ملکات میں جن پر حقیقتاً اسلام کا مدار ہے۔ نقصان نہ آئے۔ وہ دنیا میں پڑکر اپنے برتر خلاق انسانی کمالات کو نہ کھو بیٹھیں۔ اس لئے آپ مسلمانوں کو برابر ایسی ہدایت فرماتے تھے جن سے اُن کے حقیقی اسلامی کمالات میں کمی نہ آئے۔ اور بجائے اخلاق فاضلہ کے اوصاف رذیلہ متمکن ہو جائیں اور خود بھی اپنے نفس کے ساتھ وہی معاملہ فرماتے تھے۔

آپ اگر ایک طرف جلیل القدر صحابہ کی خدمت میں ہزاروں اشرفیاں بھیجکر اس امر کو آزماتے تھے کہ کہیں دنیا کی محبت تو اُن کے قلب میں جاگزین نہیں ہو گئی۔ اسی طرح ذرا ذرا سی بات پر اپنے نفس سے بھی مطالبہ کرتے تھے۔ اور ہر خطرہ اور اندیشے کے وقت اپنے نفس کا علاج فرماتے تھے۔ ایک دفعہ قبائل عرب کے وفود (ڈیپوٹیشن) اپنے معاملات پیش کرنے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ تمام معاملات کو طے کرنے کے ابعد دربار برخاست ہوا تو خلیفۃ المسلمین حضرت عمر کندھے پر مشکیزہ اُٹھا کر ایک غریب مسلمان کے یہاں پانی بھرنے تشریف لیگئے کسی نے اس خصوصیت کا سبب دریافت کیا کہ آپ بنفس نفیس خود کیوں تشریف لیگئے۔ اگر اُس کے یہاں پانی کی ضرورت تھی تو کسی خادم کو حکم فرما سکتے تھے

فرمایا کہ خود کے آئینے جو ایک قسم کی بڑائی پیدا ہونیکا اندیشہ تھا اُس کے معالجہ اور نفس کی اصلاح کے واسطے ایسا کیا۔

یہ تھی حقیقی سیاست اور تہذیب جس سے فقط معاملات باہمی ہی کی اصلاح مقصود نہ تھی بلکہ اصل مقصود اخلاق و ملکات کی تہذیب تھی جن کی اصلاح پر کل معاملات کی درستی موقوف ہے اور جن کے فاسد ہو جانے پر کل حالات بدلتے اور معاملات بگڑتے جاتے ہیں۔

حضرت عمر خود اپنے نفس کے ساتھ یہ معاملہ فرما کر رعایا کی اصلاح کی فکر فرماتے تھے اور یہی وہ گُر تھا جس سے اسلام نے دلوں پر قبضہ کیا۔

سد مارب یا سیل عرم

اس سے قبل حالات جبلۃ بن الایہم کو بیان کرتے ہوئے سیل عرم کا تذکرہ بھی آیا تھا چونکہ دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ بہت سی حیثیتوں سے عجیب اور عظیم الشان گذرا ہے اس لئے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اُس کا حال بھی بیان کیا جائیگا۔ اگرچہ اُس وقت یہ خیال تھا کہ صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا جس سے ناظرین کو اصل واقعہ کا علم ہو جائے لیکن چونکہ اُس میں اصل مضمون اشاعت اسلام کی تائید بھی ہوگی اس لئے اب ہمارا خیال یہی ہے کہ اسکو کسی قدر تفصیل کے ساتھ عرض کریں۔

زمانہ کے انقلاب اگر سبق آموز ہیں۔ قوموں کا عروج و نزول اگر عبرۃ انگیز ہے۔ دنیا کی تغیرات سے اگر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ ڈھلتے ہوئے سایہ کی طرح ہے کسی کی مستقل جاگیر نہیں ہے اور کسی کیلئے اس کا دوامی پٹہ نہیں لکھدیا گیا ہے تو یہ واقعہ اُسکی بہترین مثال ہے۔

خدا تعالیٰ نے اپنے مضبوط قوانین سے دنیا میں عروج و زوال کو دوش بدوش بنا دیا ہے پست سے پست شئے کو ایک وقت میں عروج نصیب ہو جاتا ہے اور بلند و بالا تر بھی کسی وقت گمنامی و ذلت کے غار میں پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ مال و دولت تخت و تاج سب کی یہی حالت ہے کسی کے گھر کو آباد ہوتے دیکھ کر فوراً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی کا کاشانۂ دولت ضرور ویران ہوا ہے۔ اور کسی پر تاج شاہی نظر آئے تو یہ قیاس کر لینا بجا ہے کہ کسی کو الوداع کہکر یہاں آیا ہے۔ اگر کوئی جگہ اس وقت

گلزار بنی ہوئی ہے تو ضرور وہ کسی وقت کھنڈر تھے۔ اور جو آج خشک میدان ہیں وہ ضرور ایک زمانہ میں سرسبز اور پرفضا گلزار تھے یہ حالت نہ ہوتی تو آج روتہ الکبریٰ کی عظمت کی داستان زبان زد نہ ہوتی اور کسریٰ کا مشہور عالم ایوان یوں وحشیوں کا مسکن نہ بنتا۔ امریکہ کے وحشی تہذیب و تمدن کے اُستاد نہ مانے جاتے اور جاپان جیسا حقیر ٹکڑا روس جیسی باجبروت سلطنت کو نیچا دکھلا کر دنیا کے دول عظام میں شمار نہ کیا جاتا۔

عرب کے شعراء نے اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

ولو دامت الدولات کانوا کغیرهم رعایا ولکن ما لهن دوام

اگر دولت و سلطنت ہمیشہ ایک ہی کے پاس رہا کرتی تو جو بادشاہ ہیں بھی اوروں کی طرح رعیت ہوتے لیکن دنیا کی دولت کو دوام نہیں ہے

دوسرا کہتا ہے:۔

هی المنیة من یوم الی یوم دنیا تنتقل من قوم الی قوم

یہ موت ہی کسی کیلئے آج اور کسی کے لئے کل دنیا ہے جو ایک قوم سے منتقل ہو کر دوسرے کے پاس آتی ہے

متنبی نے ایک مصرعہ میں ساری دنیا کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

مصائب قوم عند قوم فوائد

ایک گروہ کی مصیبت میں دوسرے کے فائدے مضمر ہوتے ہیں۔

لیکن دنیا کی بے ثباتی اقوام کے عروج و نزول آبادی کے بعد بربادی اور حیوۃ مستعار کے بعد قبر کی گوشہ نشینی کو جس موثر اور پردرد طرز ادا میں حضرت اسد اللہ الغالب کرم اللہ وجہہ نے ادا فرمایا ہے اس خوبی سے کسی نے نہ کیا ہوگا۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

باتوا علی قلل الاجبال تحرسهم غلب الرجال فلم ینفعهم القلل

بادشاہان جبال کچھ بھی تو آئے نہ کام وہ قوی ہیکل سپاہی اور وہ اونچے مکان

واستنزلوا بعد عز عن معاقلهم الی مقابرهم یا بئس ما نزلوا

چھوڑ کر عیش و طرب کے سارے سامان ہائے ہائے آپڑے کنج لحد میں بادشاہان جہان

فَاَدَاهُمْ صَارِخٌ مِّنْ بَعْدِ مَا دُفِنُوْا ۔ اَيْنَ الْاَسِرَّةُ وَالتِّيْجَانُ وَالْحُلَلُ

ہو چکے جب دفن تو ہاتف نے اُنسے یوں کہا ۔ تخت طاؤسی کہاں ہیں تاج زریں ہے کہاں

اَيْنَ الْوُجُوْهُ الَّتِيْ كَانَتْ مُحَجَّبَةً ۔ مِنْ دُوْنِهَا تُضْرَبُ الْاَسْتَارُ وَالْكِلَلُ

وہ سہری چھپّر وہ ساز و ساماں کیا ہوئے ۔ ہیں کہاں وہ چہرے جو پردوں میں رہتے تھے نہاں

فَاَفْصَحَ الْقَبْرُ عَنْهُمْ حِيْنَ سَاءَلَهُمْ ۔ تِلْكَ الْوُجُوْهُ عَلَيْهَا الدُّوْدُ تَنْتَقِلُ

قبر بولی پوچھتا کیا ہے سروش غیب سن ۔ ہیں لحد کے کیڑے اُن پاکیزہ چہروں پر دواں

قَدْ طَالَ مَا اَكَلُوْا فِيْهَا وَمَا شَرِبُوْا ۔ فَاَصْبَحُوْا بَعْدَ طُوْلِ الْاَكْلِ قَدْ اُكِلُوْا

عمر بھر کھاتے رہے پیتے رہے اور بعد مرگ ۔ بن گئے روزینہ مار و مور اُف الاماں

وَطَالَمَا كَنَزُوا الْاَمْوَالَ وَادَّخَرُوْا ۔ فَخَلَّفُوْهَا عَلَى الْاَعْدَاءِ وَارْتَحَلُوْا

عمر بھر جس مال کی دُھن میں رہے آشفتہ حال ۔ دشمنوں کو دے کے خالی ہاتھ آئے ہیں یہاں

وَطَالَمَا شَيَّدُوْا دُوْرًا لِّتُحْصِنَهُمْ ۔ فَفَارَقُوا الدُّوْرَ وَالْاَهْلِيْنَ وَانْتَقَلُوْا

چھوڑنے آخر پڑے اُن کو مع اہل و عیال ۔ جو حفاظت کیلئے پختہ بنائے تھے مکاں

اَضْحَتْ مَسَاكِنُهُمْ وَحْشًا مُّعَطَّلَةً ۔ وَسَاكِنُوْهَا اِلَى الْاَجْدَاثِ قَدْ رَحَلُوْا

ہوگیا ویران اور ہو کا مکان وہ شہ نشیں ۔ جب مکیں کنج لحد میں ہو گئے جاکر نہاں

سَلِ الْخَلِيْفَةَ اِذْ وَافَتْ مَنِيَّتُهُ ۔ اَيْنَ الْجُنُوْدُ وَاَيْنَ الْخَيْلُ وَالْخَوَلُ

کوئی پوچھو تو شہ عالم سے جب پائی وفات ۔ کیا ہوئی وہ فوج وہ گھوڑے وہ خادم ہیں کہاں

اَيْنَ الْكُنُوْزُ الَّتِيْ كَانَتْ مَفَاتِحُهَا ۔ تَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ الْمُقْوِيْنَ لَوْ حَمَلُوْا

وہ خزانے ہیں کہاں فرمائیے تو کچھ حضور ۔ تالیاں جن کی اُٹھاتے تھے بمشکل پہلواں

اَيْنَ الْعَبِيْدُ الَّتِيْ اَرْصَدْتَّهُمْ عُدَدًا ۔ اَيْنَ الْحَدِيْدُ وَاَيْنَ الْبِيْضُ وَالْاَسَلُ

کیا ہوئی شانِ امارت ہیں کہاں اب وہ غلام ۔ وہ زرہ وہ خود وہ نیزے وہ ترکش وہ کماں

اَيْنَ الْفَوَارِسُ وَالْغِلْمَانُ مَا صَنَعُوْا ۔ اَيْنَ الصَّوَارِمُ وَالْخَطِّيَّةُ الذُّبُلُ

ہیں کہاں اب وہ سوار اور آپ کے خدمتگزار ۔ ہیں کہاں باریک نیزے اور تیغ خوں چکاں

أَيْنَ الكُمَاةُ أَلَمْ يَكْفُوا خَلِيفَتَهُمْ　　لَمَّا رَأَوْهُ صَرِيعًا وَهُوَ يَبْتَهِلُ

ہیں کہاں مردان کاری کیوں نہ آئے آج کام　　جب پڑا دیکھا زمیں پر شاہ کو زاری کناں

أَيْنَ الكُمَاةُ الَّتِي مَاجُوا لَمَا غَضِبُوا　　أَيْنَ الحُمَاةُ الَّتِي تُحْمَى بِهَا الدُّوَلُ

جوش زن ہوتے تھے غصہ میں کہاں ہیں وہ دلیر　　ہائے ہائے ملک و دولت کے نگہباں ہیں کہاں

أَيْنَ الرُّمَاةُ أَلَمْ تَمْنَعْ بِأَسْهُمِهِمْ　　لَمَّا أَتَتْكَ سِهَامُ المَوْتِ تَنْتَصِلُ

تیر اندازوں کی رکھی رہ گئی تیر افگنی　　جب لگے تیر اجل تم پر برسنے ناگہاں

هَيْهَاتَ مَا صَنَعُوا شَيْئًا وَلَا دَفَعُوا　　عَنْكَ المَنِيَّةَ إِذْ وَافَى بِكَ الأَجَلُ

موت کے چنگل سے بچنا واقعی دشوار تھا　　وائے ناکامی نہ کچھ کام آسکی پیر و جواں

وَلَا الرُّشَى دَفَعَتْهَا عَنْكَ لَوْ بَذَلُوا　　وَلَا الرُّقَى نَفَعَتْ فِيهَا وَلَا الحِيَلُ

دفعہ کرسکتے نہ تھے وہ دیکے رشوت موت کو　　کوئی منتر کوئی حیلہ چل نہیں سکتا یہاں

مَا سَاعَدُوكَ وَلَا وَاسَاكَ أَقْرَبُهُمْ　　بَلْ سَلَّمُوكَ لَهَا يَا قُبْحَ مَا فَعَلُوا

جو مقرب تھے انھوں نے خاک غمخواری نکی　　چھوڑ کر دست اجل میں چل دیے سب مہرباں

مَا بَالُ قَبْرِكَ لَا يَأْتِي بِهِ أَحَدٌ　　وَلَا يَطُوفُ بِهِ مِنْ بَيْنِهِمْ رَجُلُ

فاتحہ خوانی کو کوئی قبر پر آتا نہیں ؟　　شمع بھی افسوس تربت پر نہیں ہے سوز خواں

مَا بَالُ ذِكْرِكَ مَنْسِيًّا وَمُطَّرَحًا　　وَكُلُّهُمْ بِاقْتِسَامِ المَالِ قَدْ شُغِلُوا

اے شہا کو بھول کر بھی آپ یاد آتے نہیں　　مال کی تقسیم میں مشغول ہیں پیر و جواں

مَا بَالُ قَصْرِكَ وَحْشًا لَا أَنِيسَ بِهِ　　يَغْشَاكَ مِنْ كَنَفَيْهِ الرَّوْعُ وَالوَهَلُ

خاص ویرانی کے حصہ میں ہوا دیوان عام　　آپ کا قصر ہمایوں ہوگیا ہو کا مکاں

کنج مدفن میں بجز وحشت نہیں کوئی انیس　　خوف و دہشت کے سوا کوئی نہیں ہے پاسباں

لَا تُنْكِرَنَّ فَمَا دَامَتْ عَلَى مَلِكٍ　　إِلَّا أَنَاخَ عَلَيْهَا المَوْتُ وَالوَجَلُ

موت کا انکار مت کر کھا نہ دنیا کا فریب　　زال دنیا کو غضب کی آتی ہیں عیاریاں

وَکَیْفَ یَرْجُوْ دَوَامَ الْعَیْشِ مُتَّصِلًا | وَرُوْحُہٗ بِحِبَالِ الْمَوْتِ مُتَّصِلُ
روح کی جب موت سے ڈ بھیڑ ہوتی ہے ضرور | آرزو مند بقا کیونکر ہو کوئی نکتہ داں
وَجِسْمُہٗ لِبُنَیَّاتِ الرَّدٰی غَرَضٌ | وَمُلْکُہٗ زَائِلٌ عَنْہُ وَمُنْتَقِلُ
ملک پر غرّہ نہ کر یہ دوسروں کی ارث ہے | جسم انسان ہے ہلاکت کا نشانہ بیگماں

دُنیا کی سب حالتیں منقلب ہونے والی نعمتیں زائل اور حالات بدلنے والے ہیں۔ خواہ موت اُس کو سب جاہ و جلال مال و منال چھوڑنے پر مجبور کرے۔ یا سلب نعمت ہو کر جو دبعد الکون کا مصداق بنے۔

سلب نعمت بہت سخت اور عبرت انگیز ہوتا ہے لیکن اگر وہ بطور ابتلاء و امتحان بغرض رفع درجات ہے جیسا مومن کامل ایمان کو بھی خاص خاص صورتیں میں پیش آجاتا ہے تو بمقابلہ اُن مراتب رفیعہ کے جو اُس کیلئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اور بوجہ اُس طمانیت و انشراح صدر کے جو مومن کو حاصل ہے یہ سلب نعمت کچھ افسوسناک امر نہیں ہوتا بلکہ موجب ازدیاد مسرت ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر بوجہ سرکشی و کفران نعمت یہ سزا دی جائے اور اُس کا ظہور عذاب الٰہی کی صورت میں ملک کے ملک کو تباہ اور عالم کو برباد کردے تو یہ واقعات جیسا کہ موجودہ زمانے کیلئے سخت تازیانہ کا کام دیتے ہیں۔ ایسے ہی آئندہ والی نسلوں کیلئے عبرۃ اور نصیحت حاصل کرنے کیلئے اپنی ہولناک صورت پیش کرتے رہتے ہیں۔

قوم سبا اور شہر مارب کے وہ عجائب حالات جو ہم تک پہنچے ہیں۔ ایسے ہیں جن پر اوّل وہلہ میں یقین کر لینا عقل انسان سے مستبعد تھا۔ مگر کلام الٰہی میں چونکہ ان واقعات کو خاص شان اور اہتمام سے بیان فرمایا گیا ہے۔ اس لئے اب اُن کی تصدیق میں کچھ بھی تامل نہیں ہو سکتا۔

ہمارا خیال ہے کہ اوّل ہم ان واقعات کو مسلسل بیان کردیں اور پھر جو نتائج اُس سے مفہوم ہوتے ہیں اُن کو ظاہر کریں اور آخر میں قوم سبا کے متعلق کلام الٰہی میں جو کچھ ارشاد ہے اُس کے ضروری مباحث بھی درج کردیں امید ہے کہ ناظرین اس مضمون سے بہت کچھ فائدہ حاصل کرینگے۔

زمانہ قدیم میں یمن کا ملک سرسبزی و شادابی میں وہ درجہ رکھتا تھا جو آج بڑے سے بڑے متمدن ملکوں کو نصیب نہیں ہے۔ اُس میں نہایت خوبصورت اور دلربا شہر آراستہ اور عالیشان قصر و

وحمام موجود تھے۔ صنعا بھی ملک یمن کا ایک خوش منظر شہر تھا جو سرسبزی وشادابی عالیشان عمارات خوش وضع مکانات اور ہر قسم کے دلفریب مناظر ومحاسن کے لحاظ سے دمشق کی نظیر سمجھا جاتا تھا۔ اُسکی آب وہوا ایسی صحت بخش اور خوشگوار تھی کہ موسم سرما میں اگرچہ سردی سخت ہوتی تھی۔ مگر ایسی راحت رساں کہ کسی کو کسی قسم کی بھی تکلیف اُس سے نہ پہنچتی تھی۔ اُس کے باشندے لباس وغیرہ امور کے اعتبار سے نہایت تنعم میں گذارتے تھے۔

قصر غمدان بھی ملک یمن کی کمال صناعی کا ایک بے مثل نمونہ تھا۔ یہ محل قحطان جد امجد اہل یمن کے بیٹے ازال کی زیر نگرانی تعمیر ہوا تھا۔ یہ قصر بیس منزل کا بنایا گیا تھا۔ ہر ایک منزل کا ارتفاع بیس ذراع یعنی بقدر دس گز معماری کے تھا اور سب سے اوپر کی منزل موٹے اور رولدار آئینوں سے مسقف کی گئی تھی۔ اس قصر میں سو کمرے تھے۔

یہ ایک قصر کا حال ہے جس کی وسعت اور تکلفات کا اندازہ اس مختصر بیان سے ہوسکتا ہے اسکے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور اور عالیشان قصر محلات اور قلعے تھے جنکی عظمت وخوبصورتی کے افسانے زبانوں پر جاری اور صفحات تاریخ میں درج ہیں۔ مگر ہم اُن کا بیان کر کے طول دینا نہیں چاہتے۔

سبا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان یمن کا سب سے پہلا بادشاہ گذرا ہے اُس نے چارسو چوراسی سال سلطنت کی ہے۔ اُس کا اصلی نام عبد شمس تھا مگر چونکہ اُس نے اقوام عرب میں غلامی کا طریقہ جاری کیا اسلیئے اُسکو سبا کا لقب دیا گیا اور اُسکی شہرت اس لقب کے ساتھ ایسی ہوگئی کہ اصلی نام گویا فراموش ہوگیا۔

مورخین اور بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ سبا مسلمان تھا اور وہ اپنے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہزاروں برس پہلے ہی آپ پر ایمان لے آیا تھا اُسکی طرف جو اشعار منسوب ہیں انمیں ایسا صاف صاف اقرار کرتا ہے۔ ان اشعار میں اول حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بلقیس کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے ساتھ ہوا ہے اور انبیاء میں سے آپ ہی یمن کے بادشاہ ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

سیملک بعدنا ملک عظیم — نبی لا یرخص فی الحرام

ہمارے بعد ایک بڑا بادشاہ مالک ہوگا — جو نبی ہوگا اور کسی فعل حرام کی اجازت نہ دیگا

ویملک بعد ھم منا ملوک
یصیر الملک فینا باقتسام

اور اُن ملوک کے بعد جو حضرت سلیمان کے بعد ہونگے ہم میں سے بہت بادشاہ مالک ہونگے۔ اور ملک باہم تقسیم ہو جائے گا

ویملک بعد قحطان النبی
تقی مخبت خیر الانام

اور قوم قحطان کے بعد ایک نبی مالک ہونگے
جو متقی شب بیدار اور تمام مخلوق سے بہتر ہونگے

یسمی احمد ایا لیت انی
اعمر بعد مبعثہ بعام

اُن کا نام احمد ہوگا۔ اے کاش میں اُنکی بعثت کے ایک برس کے بعد تک زندہ رہتا

فاعضدہ واحبوہ منصری
بکل مدجج وبکل رامی

تو میں اُن کی اعانت کرتا اور اُنکی نصرت کیلئے
ہر مسلح کامل تیر انداز کو لے جاتا

متی یظھر فکونوا ناصریہ
ومن یلقی یبلغہ سلامی

جب وہ ظاہر ہوں تو اُن کا مددگار رہنا
اور جو اُن سے ملے میرا اسلام پہنچائے

شہر مارب جس کے حالات یہاں بیان ہونگے اسی بادشاہ سبا کا بنا کردہ تھا۔ بانی کے نام کی وجہ سے اُس شہر پر بھی سبا کا اطلاق ہوجاتا ہے اور اُس قوم کو جو وہاں موجود تھی سبا کہتے ہیں کلام اللہ میں قوم سبا اور سیل عرم کے واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ۝ فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝

مطلب یہ ہے کہ قوم سبا کیلئے خاص اُنکی بستیوں اور وطن میں خدا تعالیٰ کی قدرت

اور غیر متناہی نعمتوں کی عجیب نشانی تھی۔ اُنکے گرداگرد دائیں اور بائیں باغوں کی دو قطاریں تھیں اُنکو عام اجازت اور ہماری طرف سے بطور امتنان یہ حکم تھا کہ تم کو جو انواع و اقسام کی نعمتیں دی گئی ہیں۔ اُن کو بے تکلف کھاؤ اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔ اُنکا شہر جسمیں وہ رہتے تھے ایک شہر تھا نہایت پاک و صاف ہر قسم کی تکالیف اور موذیات سے خالی۔ اور رب تھا مغفرت کرنے والا۔ لیکن اُنہوں نے شکر گذاری اور اطاعت سے انکار کیا۔ بجائے شکر گذاری کے مرتکب کفران نعمت ہوئے تو ہم نے اُن پر سخت اور برباد کن رو کو مسلط کر دیا اور اُن کے سرسبز و شاداب باغوں کے عوض میں دو باغ دیے گئے جن کے پھل کڑوے بدمزہ تھے اور جن میں کچھ تھوڑے سے درخت بیری کے تھے۔ یہ سزا اُنکو کفران نعمت کی دی گئی اور ہم ناسپاسوں ہی کو ایسی سزا دیتے ہیں۔ اہل سبا پر ہمارے انعام اسی حد تک ختم نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ ہمنے راحت اور آسانی سفر کیلئے اُنکے اور ملک شام کی درمیانی مسافت میں قریب قریب مسافت معین پر گاؤں اور منزلیں بنادی تھیں جس کی وجہ سے وہ رات اور دن امن و اطمینان کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے اس نعمت کی بھی قدر نہ کی بلکہ دعا کی کہ الٰہی ہمارے سفر کی منزلوں میں دوری پیدا کر دے۔ کیونکہ سفر کا لطف بھوک اور پیاس ہی میں حاصل ہوتا ہے اور ایسی خواہش کر کے اُنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ ہمنے اس ناشکر گذاری کی سزا میں اُنکو ایسا تباہ و برباد کر دیا کہ لوگوں کی زبانوں پر صرف اُن کی کہانیاں باقی رہ گئیں اور وہ متفرق و پریشان کر دیے گئے اور تمام واقعہ میں صبر کرنے والوں کیلئے بڑی بڑی علامات اور نشانیاں ہیں ؎

آیات مذکورہ بالا میں قوم سبا کے حالات آبادی کے بربادی اتمام نعمت کے بعد ناسپاسی اور اُسکی سزا کا اجمالاً بیان ہوا ہے مگر جس انداز سے ہوا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دنیا کے عجیب ترین واقعات میں سے ہے اب ہم اُسکی تفصیل مورخین و مفسرین کے اقوال سے منتخب کر کے لکھتے ہیں۔

قوم سبا جن بستیوں میں آباد تھی اُن میں زراعت کیلئے ندی اور نالوں کا پانی کام میں آتا تھا ستر چھوٹے بڑے ندی اور نالے ایسے تھے جن میں خاص اوقات کے اندر پانی کی آمدنی ہوتی تھی - جیسے برساتی نالوں میں ہوتا ہے - اور سال کے سال جو پانی آتا تھا - وہ تھوڑا ہوتا تھا - جس کی تقسیم میں باہم خوب جنگ وجدل اور قتل وقتال تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور جو ایام برسات کے ہوتے تھے اُن میں روکے پانی سے جان ومال عمارت وزراعت کا نقصان ہوتا تھا - ایک زمانہ اسی حالت میں گذر گیا - مگر بلقیس[1] تخت شاہی پر متمکن ہوئی تو اُن کو باہمی مجادلہ اور مقاتلہ سے منع کیا لیکن پانی ایسی حاجت کی چیز ہے جس کے بدون گذارا نہیں ہو سکتا - وہ اپنی حالت میں مجبور رہتے بلقیس کے حکم کی اطاعت نہ کر سکے اور اسی لڑائی جھگڑے میں مبتلا رہے بلقیس نے جب یہ دیکھا تو وہ تخت سلطنت سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گئی اور ملک بے سر رہ گیا اُن لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر ملکہ سے بملاطفہ درخواست کی کہ زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لے - مگر اُس نے صاف انکار کر دیا - جب کسی طرح اُس نے منظور نہ کیا تو ان لوگوں نے دھمکی دے کر کہا کہ یا تو تخت شاہی پر متمکن ہو کر سلطنت کے

---

[1] یہ وہی بلقیس ہے جس کا تذکرہ کلام مجید کی سورۃ نمل میں ان آیات کے اندر کیا گیا ہے -

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ (الی آخرایۃ) وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

خلاصہ مطلب ان آیات کا جس سے ہماری غرض کو تعلق ہے یہ ہے کہ جن و انس اور طیور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں داخل تھے جب آپ سفر کرتے تو یہ تینوں لشکر ہمراہ ہوتے اور ان لشکروں کی ترتیب بالکل علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی ہر ایک لشکر اور جنس کا افسر اعلیٰ اپنے ماتحت حصہ فوج کا ذمہ دار اور اُنکی ترتیب کا جوابدہ ہوتا تھا یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے ٹل جائے یا آگے پیچھے بڑھ جائے جن و انس اور طیور میں سے ہر ایک کیلئے جُدا جُدا خدمتیں معین تھیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام خود اُسکی نگرانی اور پڑتال فرماتے رہتے تھے اسی طرح اس ترتیب اور جلوس کیساتھ آپ نے ایک بار ملک شام سے حجاز کا سفر کیا - مکہ معظمہ میں قیام فرمانے کے بعد ملک یمن کا ارادہ کیا اور صنعا پہنچکر قیام فرمایا -

کام کو سنبھالو ورنہ ہم تم کو قتل کردیں گے۔ ملکہ نے کہا تم عجیب احمق اور بے عقل ہو مجھکو مجبور بھی کرتے ہو اور میری اطاعت بھی نہیں کرتے۔ اسپر سب نے عہد کرلیا کہ ہم ضرور فرمانبرداری کرینگے تب ملکہ نے پھر کاروبار سلطنت کو سنبھالا۔ اور دو پہاڑوں کے درہ کو جس کا طول تین میل اور چوڑائی بھی تین میل تھی بڑی بڑی چٹانوں سیسے اور لوہے کے ذریعہ سے جوڑکر آہنی سد بنادی اور تمام ندی نالوں کے پانی کو باختیار خود بہنے سے روکدیا۔ اس دیوار میں تین دروازے اوپر نیچے ایسے قاعدے اور حساب سے قائم کردیے کہ جب چاہا دروازہ کھولدیا اور جب چاہا بند کردیا۔ اور نیچے ایک بہت بڑا حوض بنادیا پہلے سب سے اوپر کا دروازہ کھولا جاتا تھا اور جبتک پانی اونچا رہتا اُس دروازہ سے حوض میں آتا۔ اور جب نیچا ہوجاتا دوسرا دروازہ کھول دیا جاتا۔ علی ہذا پھر ضرورت ہوتی تو تیسرا کھولا جاتا۔ مگر اسکی نوبت غالباً کم آتی تھی کیونکہ پانی اس کثرۃ سے ہوتا تھا کہ اُسکے کم ہونیسے پہلے دوسری برسات آجاتی تھی۔

مورخین اور مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ تین دروازے اوپر نیچے بنائے تھے۔ لیکن یہ امر قرین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۸) جہاں سے شہر مارب صرف تین منزل رہ جاتا ہے۔ ہدہد کے یہ خدمت سپرد تھی کہ پانی کے مواقع کی جستجو رکھے اور جس وقت ضرورت ہو فوراً بتلادے۔ صنعا پہنچکر آپ کو پانی کی ضرورت ہوئی ہدہد کو طلب کیا تو وہ موجود نہ تھا۔ آپنے ناراض ہوکر فرمایا کہ اگر وہ اپنی غیرحاضری کی معقول وجہ نہ بیان کرسکے تو اُس کو سخت عذاب دیا جائیگا۔ تھوڑی دیر میں ہدہد حاضر ہوا اور اُس نے نہایت جرأت کیساتھ غیرحاضری کیوجہ بیان کی کہ میں ایسی بات دریافت کرکے آیا ہوں جس کی آپ کو اطلاع نہیں ہے میں ملک سبا سے آیا ہوں جہاں ایک عورت حکمران ہے جس کے پاس تمام لوازم سلطنت اعلیٰ درجہ کے موجود ہیں۔ اور نہایت عظیم الشان تخت شاہی ہے۔ مگر با ایں ہمہ بجائے شکرگذاری کے کفر میں مبتلا ہے وہ اور اُسکی تمام فوج آفتاب کی پوجا کرتی ہے اور میری غرض اس عرض سے یہی ہے کہ وہ آپکے ہاتھ پر مسلمان ہوجائے۔ آپنے سُنکر فرمایا کہ ہم اسکی تصدیق کرینگے۔ یہ ہمارا خط لیجاکر اُسکے پاس ڈالدے دیکھیں وہ کیا جواب دیتی ہے۔ ہدہد نے خط لیجاکر ڈالدیا بلقیس نے اپنے اعیان سلطنت کو جمع کرکے سُنایا کہ یہ خط حضرت سلیمان کا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ (بقیہ صفحہ ۲۵۰ پر)

قیاس نہیں ہے کہ اس قدر طویل دیوار میں پانی کا صرف ایک ہی دروازہ ہو۔ اس لئے میرے خیال میں تین دروازوں سے یہ مراد ہے کہ پانی کے نکلنے کے تین درجے مقرر کئے ہر ایک درجے میں اگرچہ کئی منفذ ہوں مگر اُن سب پر ایک ہی دروازہ کا اطلاق کر دیا گیا۔

حوض کے اندر سے بارہ نہریں نکالی تھیں اور اُن میں صناعی اور انجنیری کا ایسا کمال دکھلایا کہ آن واحد میں اگر سب نہروں میں پانی جاری کر دیا جاوے تو ہر ایک نہر کے اندر ایک فاصلہ سے جائے۔ اسکی جانچ اسطرح کی کہ حوض میں مینگنیاں ڈالکر دیکھا گیا۔ اور جب دیکھا گیا کہ یہ سب نہروں کیطرف اُنکی رفتار یکساں نہیں ہے بلکہ کسی سمت کو مینگنی سُرعت کیساتھ گئی اور کسی جانب آہستہ تو زمین کی سطح کو ہر جانب ایسا یکساں ہموار کر دیا کہ یہ فرق باقی نہ رہا۔

ان بارہ نہروں سے تمام ملک سبا کی آبپاشی ہوتی تھی اور اُس میں یہ کمال دکھلایا کہ ہر شخص اپنی زمین کیلئے ایک آن واحد میں پانی لے سکے اور ظاہر ہے کہ پانی کی ایسی عجیب و غریب تقسیم جب ہی ہو سکتی ہے کہ ملک بھر کو نہایت قرینے کے ساتھ مساوی بارہ حصوں پر منقسم کیا گیا ہو اور نہریں

(بقیہ صفحہ ۲۴۹) تم مسلمان ہو کر فوراً یہاں حاضر ہو جاؤ۔ اب تم سب مجھے اس بارہ میں مشورہ دو کیا کروں۔ سبنے کہا ہم بڑی قوت اور شوکت والے ہیں ہم خوب مقابلہ کرینگے لیکن کرینگے وہی جو تمھاری رائے ہوگی۔ ہم سب مطیع ہوں گے۔

ملکہ نے کہا بادشاہ جب کسی شہر کو فتح کرتے ہیں تو اُسکو ویران کر دیتے اور وہاں کے معززین کو ذلیل وخوار کر دیتے ہیں میں ایک تدبیر کرتی ہوں اُنکے پاس قیمتی ہدایا اور تحفے بھیجتی ہوں شاید وہ اس طرح نرم ہو جاویں اور بغیر کسی جھگڑے کے مصالحت ہو جائے۔

یہ ہدایا حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں مال و دولت کا طالب ہوں میرے پاس اس سے بدرجہا زائد اور بہتر موجود ہے ان ہدایا کو واپس لیجاؤ ہم ایسے عظیم الشان لشکر سے چڑھائی کرینگے جسکی تاب مقاومت وہ نہ لا سکینگے اور ذلیل کر کے اُنکو وہاں سے نکال دینگے۔ ملکہ کے پاس جب جواب پہنچا تو وہ سمجھ گئی کہ یہ بادشاہ نہیں بلکہ نبی ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۲۵۱) پر ملاحظہ فرمائیں

ٹھیک حساب کے مطابق بڑے راجبے اور اُس میں سے گولیں اور گولوں میں سے نالیاں اس قرینے سے نکالی ہوں کہ ہر کھیت میں وقت واحد کے اندر پانی پہنچ سکے اور پھر ہر نہر کے اندر پانی اس حساب سے لیا گیا ہو کہ تمام چھوٹے بڑے راجبے کھول دیے جائیں تو سب کیلئے کافی اور ہر ایک میں بقدر اُسکے اندازے کے جاری ہو سکے۔

یہ دیوار یا پانی کا بند جو ملکہ بلقیس نے بنایا تھا۔ اسی کو سد مارب کہتے ہیں۔ اکثر مورخین و مفسرین کا بیان ہے کہ سد مارب ملکہ بلقیس کے زمانہ میں اُسکے حکم سے طیار ہوئی۔ لیکن بعض دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ سد مارب خود سبائیں لیشجب بن لیعرب بن قحطان کی بنائی ہوئی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ لقمان بن عاد نے بنائی تھی جس میں پانی نکلنے کے تیس منفذ تھے اور بعض کہتے ہیں کہ قبائل یمینہ کے جد امجد قحطان نے اسکو بنایا تھا۔

اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ فی الواقع کس نے بنایا تھا مگر حضرت عبداللہ بن عباس اور وہب سے یہی روایت ہے کہ بلقیس نے بنایا تھا۔ اور اس وجہ سے اس قول کو ترجیح دیجا سکتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۰) ہم کسی طرح اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ معہ تمام اعیان سلطنت امراء و وزراء اور لشکر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونیکے لئے روانہ ہوئے جب قریب پہنچ گئے تو آپ کو اطلاع ہوئی آپنے فرمایا کہ کون شخص بلقیس کے پہنچنے سے پہلے اُسکے تخت کو یہاں لا سکتا ہے۔ بقول اکثر مفسرین آصف ابن برخیا نے ببرکت اسم اعظم اور بقول بعض ایک فرشتے نے جو آپکے ساتھ رہتے تھے اُسکو آنکھ جھپکنے سے پہلے لا کر سامنے رکھدیا۔ جب بلقیس پہنچی تو آپ نے فرمایا تمہارا تخت ایسا ہی ہے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہی تخت ہے مگر احتیاط کے طور پر جواب دیا کہ یہ بالکل اُس ہی جیسا ہے۔ اور مجھے اب ایسے معجزے دکھانے کی اب ضرورت باقی نہیں رہی مجھے تو اوّل ہی آپکی نبوت کا احساس اور علم حاصل ہو چکا اور میں تو اسلام لا چکی ہوں۔

یہ مختصر بیان ہے بلقیس کے مسلمان ہونے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونیکا۔ واقعات کی تفصیل اور تشریح کا یہ موقع نہیں ہے البتہ یہ بیان کر دینا کہ مسلمان ہونیکے بعد (بقیہ صفحہ ۲۵۲ پر ملاحظہ فرمادیں)

بہر حال کسی نے بنایا ہو مگر پانی کے اس عجیب و غریب تقسیم اور ہر وقت بلا دقت و مشقت سیرابی نے تمام ملک کو گلزار بنا دیا۔ باشندے نہایت خوشحالی اور اطمینان کی حالت میں بسر کرنے لگے۔ خدا تعالیٰ نے اُن پر اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیے اُنکے ملک کو دنیا میں جنت کا نمونہ بنا دیا انکی بستی کے دونوں جانبوں (شمال و جنوب) میں متصل اور متلاصق باغوں کی قطاریں چلی گئی تھیں جانب شرق و غرب کو اس وجہ سے خالی چھوڑا گیا تھا کہ آفتاب کی گرمی اور دھوپ پہنچنے میں برودت اور رطوبت کے غلبہ کا اندیشہ تھا جسکی وجہ سے مزاجوں کے اعتدال اور جسموں کی صحت میں خلل پڑ جاتا پھلوں اور میووں کی یہ کثرت تھی کہ ایک عورت اگر اپنے سر پر ڈلیا رکھ کر اس طرح گذرے کہ ہاتھ کسی کام میں مشغول ہوں تو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر درخت کو ہلائے ہر قسم کے میووں سے اُسکی ڈلیا بھر جاتی تھی۔ میووں کی طلب اور تحصیل میں ذرا بھی حرکت اور جنبش کرنی نہ پڑتی تھی۔

آب و ہوا ایسی فرحت بخش روح پرور اور صحت افزا تھی کہ کوئی موذی جانور۔ خواہ سانپ۔ بچھو کھٹمل پسو وغیرہ از قسم حشرات الارض ہوں یا درندے اُس میں پیدا ہوتے تھے اور نہ زندہ رہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۵۱) اُسکے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا مناسب ہے۔ اکثر مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فوراً اُس سے نکاح کر لیا اور اُسکو بدستور سلطنت پر برقرار رکھا۔ ہر مہینہ میں ایک بار خود اُسکے پاس تشریف لیجاتے اور تین دن قیام کے بعد واپس تشریف لاتے بلقیس سے آپکی اولاد بھی ہوئی۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ہو جانیکے بعد آپنے اُس سے فرمایا کہ تم اپنی قوم میں سے کسی شخص کو منتخب کر لو جس سے تمہارا نکاح کر دیا جائے اُس نے کہا کہ مجھ جیسا شخص نکاح کر کے کسی مرد کا تابع اور مطیع بنے۔ نہایت نازیبا بات ہے۔ آپنے فرمایا کہ اسلام لانیکے بعد ایسا کرنا ضروری ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر نکاح کرنا ضروری ہے تو آپ میرا نکاح ہمدان کے بادشاہ ذا تبع سے کر دیجیے۔ چنانچہ نکاح کر دیا گیا اور ملک یمن بدستور اُن کے حوالے کر دیا گیا۔ ذا تبع نے سلطنت سنبھالی اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوئی تو انکی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا ان دونوں اقوال میں سے جس کو بھی صحیح مان لیا جائے اُن سے اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان ہونیکے بعد ملکہ بلقیس اپنے ملک میں بحیثیت سلطان مقیم رہی اُس کا ملک زائل نہیں ہوا۔

رہ سکتے تھے۔ اگر کسی نو وارد کے کپڑوں میں پسو کھٹمل یا جوں ہوتی تھی مارب کے حدود میں داخل ہوتے ہی فوراً فنا ہو جاتی تھی۔ باشندوں کو نہ کبھی کوئی مرض پیش آتا تھا اور نہ کسی قسم کا سوء ہضم ہوتا تھا اور نہ ذائقے خراب ہوتے تھے۔ غرض نعمت کے تمام شعبے اُن کو حاصل تھے نہ ایسی عجیب و غریب نعمتوں کے حصول سے کوئی مانع تھا نہ طلب میں دقت اور مشقت لاحق ہوتی تھی۔ اور نہ استعمال کے بعد اُن کو کسی قسم کی ناگواری یا گرانی پیش آتی تھی۔ اور پھر یہ دنیاوی اور جسمانی ہی نعمتیں اُن کو نہیں دی گئی تھیں۔ بلکہ اُس کے ساتھ اس کا بھی اطمینان دلا دیا تھا کہ جس قدر اور جس طرح چاہو ان ہماری نعمتوں اور لذتوں سے فائدہ اُٹھاؤ تم ہر قسم کے مواخذہ سے بری ہو تم سے کچھ پرسش اور باز پرس نہیں ہے۔

البتہ یہ سب دنیا و آخرت کی نعمتیں عطا فرما کر اُن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اپنے رب کو جانتے پہچانتے اور اُسکی شکرگذاری ادا کرتے رہو۔

اس کے علاوہ اُن پر اور بھی قسم قسم کے انعامات خداوندی مبذول تھے۔ اپنے وطن میں مقیم رہکر یہ دولتیں اُن کو میسر تھیں۔ جو دنیا میں کسی قوم اور کسی ملک کو حاصل نہ تھیں۔ اور اگر تجارت و تفریح کیلئے ملک سے باہر جاتے سفر کرتے تو اُس میں بھی اُن پر ایسے ہی انعام مبذول تھے ان لوگوں کو زیادہ تر ملک شام کی طرف سفر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ملک شام کا خطہ اپنی سرسبزی شادابی برکات ظاہری و باطنی میں مشہور و مسلم تھا۔ مارب اور شام کے درمیان کئی مہینے کی راہ تھی اس طویل مسافت میں خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے برابر کے فاصلے اور قرینے کے ساتھ سرسبز و شاداب دیہات کا سلسلہ قائم فرما دیا گویا صحیح پیمائش کے بعد مساوی حصے کر کے ایسی منزلیں بنا دیں جن میں مسافرین کی راحت و آرام کیلئے سرائیں اور ہوٹل موجود تھے۔ صبح سے دوپہر تک چلکر اگر مسافر مقام کرنا چاہے تو اُس کو اتنی مسافت پر ایک اچھی آباد اور پرفضا بستی ملتی تھی جس میں ہر قسم کی ضروریات زندگی اور سامان آسائش مہیا ہوتے تھے۔ علیٰ ہذا دوپہر سے شام تک چلنے والوں کیلئے امن کی یہ حالت تھی کہ راستہ میں نہ کسی درندے کا خوف تھا اور نہ

دشمن کا کھٹکا بلکہ ہر ایک کے اوپر ایسی سکون اور صفائی باطن کی کیفیت طاری ہوتی تھی کہ راستہ میں اگر بیٹا باپ کے قاتل کو بھی دیکھے تو اُس میں کسی قسم کی انتقامی حرکت پیدا نہ ہو۔ ہر جگہ کھانے پینے کا سامان اور آسائش کے سامان مہیا تھے۔ ایک شخص بلا کسی قسم کا توشہ ساتھ لئے تن تنہا بےخوف و خطرات اور دن سفر کرسکتا اور اسی طرح مہینوں کی راہ کو باطمینان طے کرسکتا تھا۔

اسی طرح آرام و آسائش سے ایک زمانہ تک بسر کرتے رہے۔ مگر بالآخر دولت نعمت کا نشہ اُن پر سوار ہوا اُنہوں نے ہر قسم کی بدمستیاں شروع کردیں ان انعامات خداوندی کو اپنا خانہ زاد اور اپنی ذات و ملک کی خصوصیات یا اپنے کسب و کمالات کے ثمرات سمجھ کر خدا کو فراموش کر بیٹھے اور بجائے شکر گذاری کفران نعمت کے مرتکب ہوئے بعض روایات کیمطابق ۱۳ نبی اُن کی ہدایات و اصلاح کیلئے بھیجے گئے۔ مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی اور اُسی اپنے خیال خام پر جمے ہوئے ارتکاب معاصی میں منہمک رہے اور اب ان بے انتہا اور بے مثل نعمتوں کے سلب اور زوال کا وقت آگیا لیکن قبل اسکے کہ ہم اُنکی بربادی کے حالات کو بیان کریں ایک خلجان کو رفع کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

کلام الٰہی کے سیاق سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا ان لذائذ و نعما خداوندی سے متمتع ہونے کیساتھ ایک زمانہ دراز تک خدا تعالیٰ کی عبادت و طاعت میں مصروف اور اُسکی شکر گذاری میں مشغول رہے کیونکہ جملہ رب غفور اس کا مقتضی ہے کہ اُنکی لغزشوں اور خطاؤں سے جو کسی منہمک لذات یا مبتلا التعلقات سے سرزد ہونا غیر اغلب نہیں درگذر کیا جائے اور جو نعمتیں اُن کو دی گئی ہیں اُن پر دینی و دنیاوی مواخذہ نہ کیا جائے۔ اور یہ بغیر اسکے کہ وہ مومن ہوں ممکن نہیں ہے۔ علی ھذا فاعرضوا بھی اسی کو مقتضی ہے کہ اُنہوں نے کچھ عرصے بعد شکر گذاری سے اعراض و انکار کیا۔ اور اسی کی تائید اُس جملہ سے ہوتی ہے جو ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے۔

فعاشوا زمانا من الدھر ثم	(یعنی ایک زمانہ تک اسی حال میں رہے اور پھر اُس کے
انھم عتوا وعملوا بالمعاصی	بعد سرکشی شروع کرکے معاصی کے مرتکب ہوگئے۔

اور بلقیس جو بانی اس سد مارب کی ہے اُس کی نسبت کلام اللہ میں صاف موجود ہے کہ وہ اور

اُسکی قوم آفتاب کی عبادت کرتی تھی۔ لیکن اگر ہم اُن دوسرے اقوال کو ترجیح دیکر یہ تسلیم کریں کہ سد مارب کا بانی سبا بن یشجب یا لقمان یا قحطان تھے تب تو کچھ اشکال ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ موحد مومن تھے سبا کے اشعار تو ہم اوّل نقل کر چکے ہیں۔ جن سے اُس کا مومن ہونا معلوم ہوتا ہی۔ لقمان وہی ہیں جو ہود علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور قحطان کی نسبت گو تصریح نظر سے نہیں گذری۔ مگر سبا جو اُن کا پڑوتا ہوتا ہے مومن تھا۔ تو یا اغلب اور یقینی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مومن تھا۔

البتہ بلقیس کو بانی ماننے میں کچھ اشکال نظر آتا ہے لیکن یہ اشکال بھی تھوڑے سے تامل میں رفع ہو سکتا ہے۔ بلقیس نے سد مارب ایسے وقت میں بنائی کہ وہ شرک کی حالت میں تھی لیکن آخر میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر وہ مسلمان ہو گئی اور مسلمان ہو کر سلطنت کرتی رہی تو اب یہ نتیجہ نکال لینا کچھ دشوار نہیں ہے کہ قوم سبا پر جس قدر انعام واکرام ہوئے جن کا ذکر کلام الٰہی میں ہے وہ بلقیس کے مسلمان ہونے کے بعد ہوئے ہیں اور گو سد مارب بنانیکے بعد اُس ملک کی حالت درست ہو گئی تھی۔ مگر اُس منتہائے درجہ ترقی عروج پر بعد اسلام بلقیس کے پہنچی تھی۔ اور پھر زمانہ دراز تک قوم سبا اسلام پر ثابت قدم عبادت خداوندی میں مصروف اور انعام الٰہی سے شکریہ میں صمیم قلب اور اخلاص قلب سے رطب اللسان رہے ہوں۔ اور اُسکے بعد اُن میں طغیان کفران کا مادہ پیدا ہوا ہو جس نے انجام کار اس تباہی و بربادی تک پہنچا دیا۔

اس خلجان کو رفع کرنے کے بعد اب ہم اصل واقعہ تباہی قوم سبا کیطرف رجوع کرتے ہیں سب مفسرین اور مورخین کا اس پر تو اتفاق ہے کہ سد مارب کے خراب ہونے اور بند کو توڑ سیلاب کے آنے کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ چوہوں نے اُس میں جا بجا نقب لگا کر سوراخ کر دئے تھے مگر واقعات کے بیان اور ترتیب میں اختلاف ہے۔

ابن جریر طبری اور ابن حاتم نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ قوم سبا جب سرکشی اور تمرد میں حد سے گذرنے لگی تو اُن کی ہدایت کو تیرہ (۱۳) نبی بھیجے گئے مگر اُن پر کچھ اثر نہیں ہوا اُن کو سد پر اعتماد تھا کہ سیل وغیرہ اُن تک نہیں پہنچ سکتی۔ البتہ علم کہانت کے ذریعے سے اُن کے

ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ اُن کے آہنی سد کو چوہے خراب کر ڈالیں گے اس سے محفوظ رہنے کی یہ تدبیر کر لی تھی کہ اس دیوار پر جہاں دو چٹانوں کے درمیان کچھ ذرا سا بھی سوراخ دیکھا وہاں ایک بلی کو باندھ دیا تاکہ چوہا اُس میں داخل نہ ہو سکے۔ اور نہ اُسکے قریب آسکے۔ مگر جب اُسکے ٹوٹنے کا زمانہ آیا تو ایک سُرخ چوہے نے بلی پر حملہ کیا جس سے ڈر کر وہ پیچھے کو ہٹی اور چوہے نے اندر گھس کر کھودنا شروع کر دیا۔ یہاں تلک کہ انجام کار سیلاب نے دیوار کو توڑ دیا۔

اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال عام طور پر اُن لوگوں میں پھیلا ہوا تھا کہ اُسکی تباہی چوہوں سے ہوگی اور اس سے محفوظ رہنے کی یہ تدبیر کی تھی۔

اور ایک روایت یہ ہے کہ قوم سبا نے اپنے بے انتہا ترفہ و تنعم کی وجہ سے اعلےٰ درجہ کے تکلفات اختیار کر رکھے تھے اُنکی ایک عام نشست گاہ تھی جس میں سنگ مرمر کا فرش لگا ہوا تھا۔ اس جگہ اُن کا اجتماع ہوتا تھا۔ ایک روز چند نصاریٰ وہاں پہنچے۔ اُنہوں نے اُنکی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ تم لوگ اُس ذات کی شکر گذاری اور عبادت کرو جس نے تمکو یہ تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں اُنہوں نے جواب دیا ہمکو یہ نعمتیں کسی نے نہیں دیں۔ ہمنے جو کچھ پایا ہے وہ ہمارے باپ دادا کا ترکہ ہے غرض کسی نے اُنکی بات پر کان نہ دھرا۔ مگر ذویزن اُس مجلس میں موجود تھا وہ تاڑ گیا کہ یہ بات معمولی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اُس کا نتیجہ نکلنے والا ہے اُس نے اُسی وقت یہاں سے جلا وطن ہو جانیکا قصد کر لیا۔ اور اُسکی تدبیر یہ نکالی کہ اپنے بیٹے سے کہا کہ کل بھری مجلس میں آکر تو میرے چہرے پر تھپڑ مارنا۔ اگر ایسا نہ کریگا تو میں تجھ سے عمر بھر کلام نکرونگا بیٹے نے ایسا ہی کیا اُس نے کہا میں ایسی سرزمین پر جہاں بیٹے نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہرگز رہنا نہیں چاہتا میں اپنی جائداد فروخت کر ڈالنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے اسکو غنیمت سمجھ کر تمام جائداد و مکانات خوب اچھے داموں خرید لئے۔ ذویزن وہاں سے رخصت ہو گیا اور اُس کے بعد چوہوں نے سد کو تباہ کر دیا۔

ایک روایت قتادہ اور عکرمہ سے ہے اور اکثر مورخین نے اسی روایت کو قابل اعتماد

قرار دیا ہے جس کا حاصل باوجود جزوی اختلاف کے یہ ہی کہ عمرو بن عامر جو انصار مدینہ منورہ کے
جدا مجد تھے یا اُن کے بھائی عمران بن عامر دونوں میں سے کسی ایک کا یہ واقعہ ہی اُنکے پاس بقدر
باغات اور جائداد تھی کہ کسی دوسرے کے پاس نہ تھی۔ یہ خود بھی کاہن تھے اور اُنکے یہاں ایک عورت
تھی جسکا نام طریفہ تھا یہ عورت علم کہانت میں کمال رکھتی تھی اس عورت نے اُن کو اطلاع دی کہ سد ٹوٹ
ٹوٹ کر سیلاب عظیم آنیوالا ہے جو ملک کو تباہ کردیگا۔ اور اس کی علامت یہ ہی کہ اس میدان میں
جو سد کے نیچے ہے ایسے بڑے بڑے چوہے نظر پڑیں گے جو اتنی بڑی چٹانوں کو جنکو بہت سے آدمی
بھی ملکر نہیں ہلا سکتے اُٹھا کر پھینکدیں گے۔ یہ سنکر وہ اپنے خواص میں سے چند لوگوں کو لیکر جنگل میں
پہنچا تو دیکھا کہ واقعی ایک چوہا اتنے بڑے پتھر کو جسکو سو آدمی نہیں اُٹھا سکتے سد میں سے نکالکر پھینک دیتا
ہے یہ دیکھکر اُس نے اپنے کنبہ کے تمام سمجھدار لوگونکو جمع کرکے یہ حال بیان کیا اور کہا اس امر کو بالکل
مخفی رکھو ہمارا خیال ہے کہ ہم کسی حیلہ سے اپنی جائداد و باغات اور مکانات فروخت کرکے نکل جائیں
اُس نے اپنے برادر زادہ حارثہ کو بلا کر کہا کہ کل جب مجلس میں اشراف و اعیانِ ملک جمع ہوں تو میں
تمکو کسی بات کا حکم دونگا۔ تم اُسکے ماننے سے انکار کردینا میں تم کو مارونگا تم بھی میرے تھپڑ مارنا بھتیجے نے
کہا یہ کیونکر ممکن ہی کہ بیٹا باپ کو مارے اُس نے کہا ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اسمیں تمہاری اور ہماری مصلحت ہے
اگلے روز جب سردار اور اشراف سلام کی غرض سے حاضر ہوئے تو حسب قرارداد عمران نے حارثہ کو حکم دیا
اُس نے تعمیل سے انکار کردیا۔ عمران نے حارثہ کو لکڑی ماری۔ حارثہ نے بھی حارثہ کے زور سے
تھپڑ رسید کیا اسپر عمران بگڑ گیا اور کہا کہ چھری لاؤ میں اسکو اسی وقت ذبح کرتا ہوں۔ تمام حاضرین نے سفارش
کی کہ جرم بیشک سخت ہی مگر قتل سے درگذر کیجئے اور کوئی سزا چاہے کتنی ہی سخت ہو دیجائے عمران نے
کہا ہرگز نہیں میں اسکو ضرور ذبح کرونگا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ عمران ہرگز نہیں مانتا تو حارثہ کے ننہال میں
اطلاع کردی وہ سب فوراً وہاں پہنچے اُنہوں نے کہا کہ اس جرم کے تاوان ادا کرنے کیلئے ہم ہر طرح سے
حاضر ہیں عمران نے ایک نہ مانی اور ذبح کرنے پر مصر رہا۔ اُن لوگوں نے یہ دیکھا تو کہا کہ ہم سب جبتک مر نہ جائینگے
تو ایسا نہیں کرسکتا۔ عمران نے کہا کہ اگر یہ بات ہی تو میں ایسے ملک میں ہرگز نہ رہونگا۔ جہاں میری توہین

لیگئی ہو۔ میں جاتا ہوں اور اپنی تمام جائداد فروخت کرتا ہوں۔ بنو حمیر نے خوب بڑھ بڑھکر قیمتیں لگائیں اور سب کچھ خرید لیا۔ عمران معہ اپنے قبیلہ اور خاندان کے مارب سے رخصت ہو گیا۔

ان تینوں روایتوں میں اگرچہ بظاہر تعارض و تناقض معلوم ہوتا ہے مگر ان سب کو اگر صحیح مان لیا جائے تو جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ سب سے اوّل عمران بن عامر کو کاہنہ کے ذریعے سے علم ہوا ہو اور وہ اس حیلہ سے ملک چھوڑ گیا ہو۔ اُس نے چوہوں کو بھی دیکھا ہو لیکن وہ کیفیت اس درجہ تک پہنچی تھی کہ دوسرے لوگ بھی اُنکو دیکھ کر متنبہ ہو جاتے۔ تواریخ بھی اس پر شاہد ہیں کہ عمران بند کے ٹوٹنے سے زمانہ دراز پہلے مارب کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن یہ بات قریب ناممکن کے تھی کہ گو عمران نے کیسا ہی اس راز کو مخفی رکھا مگر وہ ایسا پوشیدہ رہا ہو کہ اُسکے چلے جانیکے بعد بھی کوئی اُس پر مطلع نہ ہوتا۔ عمران کے بعد یہ خیال اُن لوگوں میں ضرور پھیلا اور اسکے دفعیہ کیواسطے اُنہوں نے ہر ایسی جگہ جہاں بند میں شگاف نظر آیا بلیاں بندھوا دیں۔ یہ خیال اُن میں ایک درجہ تک ضرور پھیلا ہوا تھا مگر اس درجہ کا تیقن اُن کو نہ تھا کہ عمران کی طرح گھر بار چھوڑ کر چلے جاتے لیکن چند سمجھی لوگوں نے جو دین حق کے متبع اور علم کتاب سے حصہ وافر رکھنے والے تھے ذویزن کی مجلس میں وہ گفتگو کی جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں تو اگرچہ اس میں بند کے ٹوٹنے یا چوہوں کے ذریعے سے ایسی سخت آفت آنیکا تذکرہ نہ تھا مگر اُن کے انداز بیان اور طرز کلام سے ذویزن پر فوری اثر ہو گیا اور وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی ہونیوالی بات ہے اور جو خیال عام طور سے راسخ تھا ذویزن کے نزدیک اب درجہ تیقن کو پہنچ گیا۔ اور چونکہ سمجھی علماء کی گفتگو میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے کسی کو کھٹکا ہوتا اسلئے اُس کا چرچا بھی نہ ہوا۔ اور ذویزن بھی عمران کی طرح اپنی جائداد وغیرہ فروخت کرکے مارب سے ہجرت کر گیا۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمران کا واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے کا ہے ذویزن کا قصہ مارب کی بربادی سے قریب کا۔ اس طرح تینوں روایتیں جمع ہو جاتی ہیں اور اُن کا باہمی تعارض باقی نہیں رہتا۔

الغرض عمران تو اپنے خاندان کو ساتھ لیکر یہاں سے رخصت ہو گئے اور چوہوں نے اُس

ناممکن التسخیر دیوار میں ایسے شگاف ڈالدیے کہ پانی نے اپنا راستہ کرلیا اور اس زور سے سیلاب آیا کہ تمام باغات۔ مکانات۔ زراعات تباہ ہوگئے۔ زمین قابل کاشت نہ رہی۔ ہر جگہ ریت کے تودے لگ گئے اُن سرسبز اور فرحت بخش باغوں کی جگہ نکمے اور ناقابل کار درخت رہگئے اور جو لوگ کہ اُس وقت وہاں موجود تھے وہ ایسے متفرق ہوئے کہ جس کو جہاں موقع ملا وہاں چلا گیا۔ اور اُس وقت سے آج تک عرب میں سبا کی بربادی وتباہی بطور ضرب المثل کے ہے۔ وہ کسی قوم کی بربادی کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں تفرقوا ایادی سبا۔ ایادی کے معنی ہیں اولاد کے مطلب یہ ہے کہ مثل اولاد سبا کے متفرق ہوگئے۔ ایک اسلامی شاعر کثیر عزہ اپنی محبوبہ عزہ کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

أَيَادِي سَبَا يَا عَزَّ مَا كُنْتُ بَعْدَكُمْ　　فَلَمْ يَحْلُ بِالْعَيْنَيْنِ بَعْدَكِ مَنْظَرُ

(اے عزہ جبتک میں تم سے دور رہتا ہوں مثل اولاد سبا کے پریشان رہتا ہوں۔ اور کوئی خوشگوار منظر آنکھوں میں بھلا نہیں معلوم ہوتا)

خدا تعالیٰ نے قوم سبا پر اپنے خاص انعام مبذول فرمائے۔ اور قدرت کے وہ کرشمے دکھلائے کہ کوئی ملک اور کوئی قوم اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی اُنکے باغ جنت کے باغوں کے مشابہ تھے اُنکی سرزمین ایسی پاک وصاف بنائی گئی تھی کہ اُسکو جنت کا ٹکڑا کہنا زیبا تھا۔ مگر جب تباہی کا وقت آیا تو اُس میں بھی قدرت کا تماشا دکھلایا گیا۔ وہ دیوار جس کا عرض ایک فرسخ یعنی تین میل ہو جس میں سیسہ پلایا گیا ہو۔ جس کی بڑی بڑی چٹانوں کو سینکڑوں آدمی بھی ملکر جنبش نہ دے سکیں چوہے جیسے حقیر جانور سے برباد کرادی گئی۔ وہ دو رویہ باغوں کی قطاریں اور وہ عالی شان قصر اور مضبوط حصار آن کی آن میں زمین دوز کردیے گئے۔ وہ قوم جس کیلئے سفر میں بھی یہ راحت کے سامان تھے کہ تھوڑی تھوڑی مسافت پر سرائیں۔ باغات۔ آرام دہ مکانات۔ ہر قسم کی مکلف غذائیں مہیا تھیں اور وہ اُن سے اُکتا کر یہ دعا کرتے تھے کہ ہماری منزلیں دور کردیجائیں۔ ایسے پریشان کردیے گئے کہ ان میں سے ایک اگر پورب گیا تو دوسرا پچھم ایک مشرق کی طرف چلا تو دوسرا مغرب کیطرف گویا اُنکی استدعا کا نتیجہ سزا کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اہل سبا اگر اوّل حالت میں اہل جنت کی طرح ہر قسم کی نعمتوں میں تھے تو کفران وطغیان کی بدولت اہل نار کی طرح سخت عذاب میں مبتلا ہوکر پریشان کردیے گئے۔ اور آج بجز قصہ کہانی کے کچھ باقی نہیں رہا

نہ وہ باغ رہے اور نہ وہ مکانات نہ سڑکیں باقی ہیں اور نہ سرائیں۔ فقط کھنڈر اور ریت کے تودے ہیں۔ یا وہ آبادی یا یہ بربادی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

اس تمام قصہ میں بڑی بڑی نشانیاں اور عبرت کے قابل باتیں ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو خواہشات نفس سے رُکنے والے۔ طاعات وعبادات کی مشقتوں پر صبر کرنے والے اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنے والے ہیں۔

نفس واقعہ تو ختم ہوچکا لیکن اُسکے نتائج بیان کرنے سے پہلے ہم یہ بھی جتلانا چاہتے ہیں کہ قوم سبا یہاں سے اُٹھ کر کہاں گئی اور اس بربادی میں کتنی آبادیاں مضمر تھیں۔ عمران بن عامر کا حال ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ معہ اپنے اقارب کے سیل عرم کے واقعہ سے قبل اپنے وطن کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ عمران کا بھتیجہ ثعلبۃ العنباء بن عمرو بن عامر ماء السماء تو حجاز کی طرف متوجہ ہوا اور و معہ اپنے اہل وعیال کے ثعلبیہ اور ذی وقار کے درمیان فروکش ہوگیا اور جب کچھ عرصہ میں اُسکی اولاد جوان اور حالت درست ہوگئی تو مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ منورہ میں قبائل یہود پہلے ہی سے متفرق طور پر آباد تھے۔

ثعلبہ نے مدینہ منورہ میں قیام کیا اور جب وہاں رہتے رہتے کچھ قوت وشوکت حاصل ہوگئی تو یہود کو خاص مدینہ سے نکالدیا اور وہاں گڈھیاں بنالیں۔ کھجور کے باغات لگائے اور یہ بستی خاص ثعلبہ اور اُسکی اولاد کی ہوگئی۔ ثعلبہ کے بیٹے حارثہ ہوئے اور حارثہ کے دو بیٹے اوس اور خزرج ہوئے تمام انصار مدینہ انہیں دونوں کی اولاد ہیں۔

ثعلبہ کے دوسرے بھائی حارثہ حرم مکہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ مکہ معظمہ میں پہلے قوم جرہم آباد تھی اور یہ وہی قوم ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے وقت یہاں آکر آباد ہوئی تھی لیکن یہ قوم سرکشی اور طغیان میں حد سے متجاوز ہوگئی تھی۔ بیت اللہ کی تعظیم اور حرمت اُن کے دلوں میں باقی نہ تھی اُنہیں میں کے ایک مرد نے جس کا نام اساف تھا اور ایک عورت نے جس کا نام نائلہ تھا خاص بیت اللہ کے اندر زنا کیا تھا جس کی سزا میں وہ مسخ ہوکر پتھر بن گئے اور انہیں عذاب

الٰہی کی زندہ تصویر کو زمانہ دراز کے بعد عمرو بن لحی نے معبود بنا کر تمام اقوام عرب کا خدا بنا دیا تھا
خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ قوم جرہم کا حرم سے اخراج کیا جاوے اُس کا یہ سامان ہوا کہ ثعلبہ
معہ اپنے متعلقین کے وہاں آباد ہوئے۔ اور یہ قوم خزاعہ کے نام سے معروف و موسوم ہو گئی۔
خزاعہ جب وہاں جا کر جم گئے تو انہوں نے جرہم کے ساتھ سخت معرکہ آرائیاں کیں۔ اُن کو حرم سے
حل کی طرف نکال دیا اور خود حرم پر قابض اور متمکن ہو گئے۔ قوم جرہم یہاں سے ویران ہو کر جگہ
جگہ مارے مارے پھرے۔ اور بالآخر اُنکی نسل منقطع ہو گئی۔ اور آج دنیا اُن کے وجود سے
خالی ہے مگر جرہم کو کعبہ سے جلاوطن ہو کر انعامات خداوندی کی قدر یاد آئی اپنی بدافعالیوں
پر پشیمان ہوئے۔ چنانچہ اُن کا شاعر حسرت و یاس کے ساتھ کہتا ہے ؎

كَأَن لَّمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحُجُونِ إِلَى الصَّفَا ۔۔۔ أَنِيسٌ وَّلَمْ يَسْمُرْ بِمَكَّةَ سَامِرُ

گویا کہ حجون اور صفا کے درمیان ۔۔۔ کوئی آدمی تھا ہی نہیں۔ اور مکہ میں کسی نے راتکو بیٹھ کر باتیں کی ہی نہیں

بَلَىٰ نَحْنُ كُنَّا أَهْلَهَا فَأَبَادَنَا ۔۔۔ صُرُوفُ اللَّيَالِي وَالْخُطُوبُ الزَّوَاجِرُ

کیوں نہیں ہمیں تو وہاں کے ساکن تھے۔ ہمیں کو گردش زمانہ اور حوادث عظیمہ نے تباہ کیا ہے۔

وَكُنَّا وُلَاةَ الْبَيْتِ مِنْ بَعْدِ نَابِتٍ ۔۔۔ نَطُوفُ بِذَاكَ الْبَيْتِ وَالْخَيْرُ ظَاهِرُ

نابت کے بعد ہم ہی بیت اللہ کے متولی تھے ۔۔۔ ہم ہی بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور ہم میں کی خیر و برکت ظاہر تھی

جرہم کے بعد ایک زمانہ تک خزاعہ بیت اللہ کے متولی اور کارکن رہے۔ لیکن انہیں میں کے ایک
بدقسمت نے جس کو ابو غبشان کہتے تھے بیت اللہ کو شراب کے ایک مشکیزے کے عوض دیدیا اور بھی
وہاں سے رخصت ہوئے اور بیت اللہ کی تولیت قریش کے سپرد ہو گئی۔ عرب میں یہ منحوس
معاملہ بیع و شرا اور وہ بدقسمت شخص ضرب المثل بن گئے۔ کہا جاتا ہے۔

أَخْسَرُ صَفْقَةً مِنْ أَبِي غُبْشَانَ ۔۔۔ (ابی غبشان سے بھی زیادہ ٹوٹے والا ہے)

خزاعہ پر اس معاملہ کی وجہ سے ایسا دھبہ لگ گیا کہ کسی طرح نہیں دُھلتا۔ چنانچہ ایک
شاعر کہتا ہے۔

وَجَدْنَا فَخْرَهَا شُرْبَ الْخُمُورِ	إِذَا فَخَرَتْ خُزَاعَةُ فِي نَدِيٍّ
فخر شراب پینے کے اندر ہوتا ہے	خزاعہ کسی مجلس میں فخر کریں تو اُن کا
لَعَمْرِي بِئْسَ مُفْتَخَرُ الْفَخُورِ	وَبَاعَتْ كَعْبَةَ الرَّحْمٰنِ جَهْلاً

خدا کے گھر کو اپنے جہل کی وجہ سے فروخت کر دیا قسم ہے اپنی جان کی فخر کرنے والے کے لئے یہ بہت بری بات ہی

ثعلبہ کا تیسرا بھائی عمران بن عمرو بن عامر ماء السماء سب سے جُدا ہو کر عمان کی طرف چلا گیا وہاں پہلے طلسم و جدیس آباد تھے لیکن اُنکی نسل منقطع ہو چکی تھی۔ عمران نے عمان کو وطن بنا لیا اور وہ ازد عمان کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اور اُس کا چوتھا بھائی جفنہ بن عمرو بن عامر ملک شام کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں جا کر مالک بن گئے۔ اور یہی جفنہ جبلۃ ابن الایہم کا جد امجد ہے۔

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ انصار اور جبلۃ بن الایہم ہم جد تھے جس کی طرف ہم جبلۃ کے بیان میں اشارہ کر آئے ہیں۔ اسی تعلق قرابت کی وجہ سے حضرت حسان بن ثابت ملوک جفنہ کے یہاں جاتے۔ اُنکی مدح سرائی کرتے اور مہمان بنتے تھے اور آل جفنہ بھی اسی وجہ سے اُن کا ادب و لحاظ کرتے تھے۔ باقی قبایل یمن بھی اسی طرح جگہ جگہ آباد ہو گئے مگر ہمکو اُنکی تفصیل بیان کرنیکی حاجت نہیں ہے۔ اب ہم واقعہ سیل عرم سے مفید اور اہم نتائج اخذ کر کے بیان کرتے ہیں۔

نتیجہ اوّل۔ قوم سبا کی آبادی۔ انتہائی تنعم اور خوشحالی کا نفس واقعہ کلام الٰہی میں جس قدر اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا گیا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دنیا کے عجیب ترین واقعات میں سے تھا۔ اگرچہ اُسکے تفصیلی حالات ہم تک نہ پہنچے ہوں۔ اور جو پہنچے اُن میں سے بعض حالات صحیح ہوں مگر نفس واقعہ کی صحت تسلیم اور اُس کے منجملہ عجائب قدرت الٰہی ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے تو اُسی کو جو خدا تعالیٰ کی وسیع قدرت کا منکر ہو یا جسکو کتب آسمانی کے تسلیم سے انحراف ہو۔

اس واقعہ کی تفصیل میں جس قدر حالات ہم نے مفسرین و مورخین کے حوالہ سے لکھے ہیں

اُن سے ہم کو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا کے حالات ایک تماشاگاہ کی طرح ہیں جس میں ایک وقت پر ایسا عجیب منظر دکھایا جاتا ہے جس سے حاضرین محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر میں وہ پردہ اُٹھا دیا جاتا ہے۔ اور جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب و خیال بنجاتا ہے۔ اُس کے بعد دوسرا سین سامنے آتا ہے اُسکی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ہم جس وقت کوئی عجیب سے عجیب تماشا دیکھیں تو ہم کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ خوش قسمتی سے یہ ہمارا ہی حصہ تھا۔ ہم سے پہلے جو گذر چکے ہیں وہ اس سے محروم تھے۔ ممکن ہے کہ اس بعد کے تماشہ میں کوئی جدۃ ہو۔ لیکن یہ بالکل واقع اور نفس الامری بات ہے کہ پہلا تماشا اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر اور نفیس گذرچکا ہو تو جائے تعجب نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تماشاگاہ میں ہمیشہ نئے ہی تماشے ہوتے رہیں بلکہ ایک تماشے کو کئی دفعہ دُہرایا جاتا ہے۔ اگرچہ کسی دُہرائے ہوئے تماشے کو سب سے آخر دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ میرے سوا اُسکو کسی نے نہیں دیکھا مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

دنیا میں ہزاروں تماشے ہوئے۔ اور پردۂ عدم میں چھپ گئے۔ لاکھوں کھیل بنے اور بگڑ گئے اگر آثار قدیمہ کے متلاشی کوہ و صحرا اور ہولناک میدانوں کی خاک چھان کر کھوج نہ نکالتے یا تواریخ سے ہمکو اُن کا پتہ نہ لگتا یا کتب سماوی میں ایسے حالات کی طرف اشارہ نہوتا تو یقیناً کوئی شخص ایسے دور از قیاس واقعات کو تسلیم کرنیکے لئے تیار نہوتا اور جس طرح ریل تار وغیرہ کی ایجاد سے پہلے کوئی شخص اُن کو مان لینے کی وجہ سے قابل مضحکہ بن سکتا تھا۔ اسی طرح اُن کے تسلیم میں بھی اُن کو مجنوں و کم عقل کا خطاب دیا جاسکتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دنیا کے پردہ پر ضعیف الخلقت انسان کے ہاتھ سے جس قدر عجائب مقدورات الٰہی کا ظہور ہو چکا ہے اب اُن سے کلیۃً انکار کی گنجایش نہیں رہی۔ گو کسی ایک واقعہ کے خاص اسباب سے تکذیب کر دینا ممکن ہے۔

آج تہذیب و تمدن کا زمانہ ہے صنعت و ایجاد معراج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں۔ فونوگراف ٹیلیفون ہیلوگراف۔ تار وغیرہ ہزارہا ایجادات ایسی ہیں کہ اگر اُن کے موجد دعوۂ نبوۃ کر کے اُن کو اپنے معجزہ میں پیش کرتے تو بہت سے کم عقل حقیقۃ ناشناس۔ تاثیرات اشیاء خواص عناصر سے ناواقف۔ علم

علم طبقات الارض سے جاہل ایمان لانے کو تیار ہو جاتے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ جو اکتشافات اب ظہور پذیر ہوئے وہ سب جدید ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ بعض اکتشافات جدید بھی ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ بعض ان عجائب ایجادات کا جو کسی زمانہ میں صفحۂ روزگار پر جلوہ گر تھے ابھی تک کسی موجد و محقق کو پتہ بھی نہ لگا ہو۔

تمام علوم کی ابتدا انبیاء علیہم السلام سے ہوئی ہے۔ صناعتوں کا وجود اُن کے طفیل ظہور میں آیا ہے خواص اشیاء اور تاثیرات ادویہ سب انہیں کے ذریعے سے معلوم ہوئی ہیں۔ غرض اصول ہر علم کے خواہ علم شرائع و ادیان ہو یا علم ریاضی و ہندسہ ہیئت و طب ہو اُنکے ذریعے سے دنیا میں پھیلے ہیں۔ بنیاد ان علوم کی انبیاء علیہم السلام نے ڈالی اور اُنکی تفصیل حکماء کے ذریعے سے پہلی جنہوں نے ہر زمانہ میں اپنی عمریں اُن کی تحقیق و تفصیل میں صرف کردیں اور آنیوالی نسلوں کیلئے ایسا ذخیرہ چھوڑ گئے جو ہمیشہ کیلئے کارآمد ہو۔ ان علوم میں سے بعض ایسے اُصول تھے کہ اُنکی تفصیل میں بھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ مثلاً ریاضی ہندسہ اور بعض کی تفصیل میں اختلاف پیدا ہوا ہر ایک محقق اور فلسفی نے اپنے لئے جُدا راہ بنائی۔ جیساکہ ہیئت و طب اور دوسرے تجربیات لیکن متاخرین کا جو کمال ہے وہ صرف تفصیل اور تحقیق میں ہے۔ اُنہوں نے اپنی کوشش سے ایک مادہ کو مختلف ترکیبوں کے سانچے میں ڈھال کر ہزارہا صورتیں بنا دیں۔ مگر یہ دعویٰ کرنا کہ تمام یہ اکتشافات بالکل نئے ہیں اب تک کسی کو وہاں تک رسائی نہیں ہوئی۔ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

تواریخ اور آثار قدیمہ کتب سماوی اُسکے خلاف شہادتیں دیتیں اور تصنیفات متقدمین اُسکی تردید کرتی ہیں۔ اسلئے ہمکو یہ سمجھنا نہ چاہیے کہ زمین کے تمام خزانے ظاہر ہو چکے۔ اور اُس کے اندر جو مادے پوشیدہ ہیں بالکل نکال لئے گئے نہیں بہت کچھ نکل چکے اور ابھی بہت کچھ باقی ہیں احادیث اسکی شاہد ہیں۔ اسلئے یہ ممکن ہے کہ بعض اکتشافات بالکل جدید بھی ہوں۔ مگر یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ بعض ایسے عجائب ایجادات زمانہ دیکھ چکا ہے جو حال کے موجدوں کو نصیب بھی نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ جن بعض اکتشافات کو ہم جدید سمجھ رہے ہیں وہ ایک زمانہ میں رواج پاکر پردۂ عدم میں روپوش

ہو گئے ہوں۔ اور اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ اصول اُن کے اوّل سے موجود ہیں۔ مثال کے طور سے دیکھ لیجئے کہ آواز ہوا کے ذریعے سے پہنچتی ہے۔ دھیمی آواز ہے تو تھوڑی دور تک صاف جاتی ہے اور بعد میں منتشر ہو کر گم ہو جاتی ہے۔ بلند آواز ہے تو میلوں اُسی طرح چلی جاتی ہے اس سے اس قدر معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی چیز آواز کو ہوا میں منتشر اور متلاشی ہونے سے محفوظ کرے تو دھیمی آواز بھی اس معتاد حالت سے بہت دور تک جا سکتی ہے۔ اب اسکے ساتھ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ہوا مسخر کر دی گئی تھی۔ جو کوئی کہیں گفتگو کرتا ہوا اُسکو پہنچا دیتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا میں آواز محفوظ رکھنے کی قابلیت موجود ہے یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے خصوصیات میں سے تھی کہ بلا کسی آلہ اور ذریعہ کے آواز دور و نزدیک کی محفوظ پہنچ جاتی تھی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اہل علم و دانش کو اُس علم نبوت سے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا ہوا تھا اُسکے اُصول ضرور معلوم ہو گئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان اُصول سے کام بھی لیا گیا ہو۔ مگر اب وہ بھی زمانہ کے ہزارہا عجائب کیساتھ نسیاً منسیاً ہو گئے ہوں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دُنیا کے صفحات پر قدرت کی عجائب گلکاریاں جو نظر آ رہی ہیں اور اُن سے قدرت خداوندی کے عجائب آشکارا ہو رہے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُنکی نوعیتیں اور صورتیں کچھ متغیر اور متبدل ہوں اور اگرچہ اُن میں بعض صورتیں بالکل نئی بھی ہوں مگر دنیا کی آبادی سے اس وقت تک جس قدر آثار قدرت منصہ ظہور پر جلوہ گر ہو چکے ہیں اُن میں یقیناً بہت سی باتیں ایسی تھیں جو باوجود ہزار کوشش و جانکاہی ابتک کسی کو نصیب نہیں ہوئیں اور بعض ایسی ہیں جن کو ہم جدید سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں وہ جدید نہیں ہیں۔ اور بعض جدید ایسی بھی ہیں جنکی طرف ابتک کسی کی فہم کی رسائی نہیں ہوئی ہو۔ گو اُصول اُن کے اکتشاف و استخراج کے موجود تھے اور خدا تعالیٰ کی وسیع قدرت اور بے انتہا خزائن معلومات کا اقتضا بھی یہی ہے کہ کسی قوم اور کسی زمانہ پر اُس کو تمام نہیں کر دیا گیا۔

کم ترک الاوّل للاٰخر (پہلے پچھلوں کیلئے کس قدر چھوڑ گئے)

زمانہ موجودہ میں علم و فن۔ صناعت و ایجادات منتہائے کمال کو پہنچا ہوا ہے ایک سے ایک اعلیٰ ایجاد سامنے آ کر محو حیرت بنا تا رہتا ہے جس فن کو دیکھئے اُسکو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔ فن انجنیری۔ تعمیر۔

تعبیر آبپاشی ہر ایک کی یہی حالت ہے۔ مگر انصافاً دیکھئے کہ سد مآرب کے بنانے میں انجینئر اور معماری کا جو کمال دکھلایا گیا اُس کا ادنیٰ نمونہ بھی اس ترقی یافتہ زمانہ میں کوئی نہیں دکھلا سکا معلق پل بنائے عالیشان مکانات اور قلعے تعمیر کئے۔ مگر بلقیس کی طرح سد مآرب سے آدھا بند بھی بنایا گیا ہے اور کیا قصر غمدان جیسا کوئی قصر بھی اس وقت موجود ہے۔

بلقیس نے پانی کے نکالنے کیلئے جن ہندسہ و ریاضی کے قواعد سے کام لیکر اُسکو بالکل نئے قابو میں کیا زمانہ حال کے ماہران فن اس سے زیادہ کر کے نہیں دکھلا سکے۔ اور آبپاشی کیلئے جو طریقے اور قواعد اُس نے استعمال کئے اور نہروں کے کاٹنے میں جو کمال اُس نے دکھلایا اُسکی مثال بھی دنیا میں اس وقت موجود نہیں ہے۔

دنیا میں کسی ماہر فن نے کوئی نہر ایسی نہیں نکالی جس سے وقت واحد میں ہر شخص کو پانی مل سکے۔ چہ جائیکہ ایک بڑے حوض سے مساوی درجہ کی بارہ نہریں نکالی جائیں۔ ہر ایک نہر میں پانی کی رفتار و مقدار بھی ایک ہو سب نہروں کا علاقہ بھی بالکل مساوی ہو اور وہ سب وقت واحد میں ہر ایک شخص کو پانی دے سکیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ایسا کرنا امکان میں نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ایسی سعی بلیغ کے آثار کسی جگہ موجود نہیں۔

یہ حالت ہے تو مادہ پرستوں اور مادی ترقیات کے دلدادوں کو ترقیات کی چکا چوند اور اکتشافات و ایجادات کے عجیب و دلپسند مناظر پر مغرور نہ ہونا چاہیئے۔ اور اُن کو ایسی بھول بھلیاں میں پڑ کر ہدایت کے طریق مستقیم کو چھوڑ کر خالق و مالک کی یاد کو بھلانا نہ چاہیئے۔ ہر ایجاد میں اُسی قدرت کا ظہور ہے ہر ایک اکتشاف میں اُسی کی قدرت کے مکنونہ راز ظاہر ہوتے ہیں۔

بجلی کی طاقت کسی کی مخلوق نہیں ہے۔ تمہارا بڑا کمال یہ ہے کہ اُسکے استعمال کے طریقے ایجاد کرو۔ بھاپ کی قوۃ تم نے نہیں پیدا کی ہاں اُس سے کام لینا تم کو بتلایا گیا ہے۔ یہی مظاہر قدرت اگر تھوڑے سے غور سے کام لیتے تو تم کو اُس قدیم لم یزل و لایزال کی ہستی کا پتہ دیتے جس کے وجود سے زمین۔ آسمان۔ آفتاب۔ ماہتاب۔ جمادات۔ نباتات قائم ہیں اور جس کے ذی الشان ارادے پر سب

گردن جھکانیوالے ہیں۔ بلکہ یہی اکتشافات تمہارے لئے بجائے مضل ہونیکے ہادی بن جاتے۔

دیکھو تم سے پہلے کیسے کیسے باقبال و جبروت گذر چکے۔ انہوں نے دنیا میں کیسی کچھ ترقیات کیں۔ کیا کیا ایجادیں۔ اور کیسے دقیق علوم یادگار چھوڑے۔ لیکن آج اُن کا نام ہی نام باقی ہے اور جن قوموں نے اپنی ترقیات پر گھمنڈ کر کے سرکشی و سرتابی کی۔ اپنے خالق و مالک کو بھول گئے اُن کا تو نشان بھی باقی نہیں۔ اگر کچھ ہے تو کہیں کہیں تھوڑے بہت کھنڈر پڑے نظر آتے ہیں۔

یہ حال ہے دنیا کی آبادی۔ سرسبزی و شادابی کا یہ انجام ہے دنیا پر غرور و بدمستیاں کرنیوالوں کا۔

نتیجہ دوم

خیر و شر کا تناسب و تعلق

خیر و شر دو متضاد صفتیں ہیں۔ خیر کا شر کی طرف مقتضی ہونا یا شر سے خیر کا نتیجہ برآمد ہونا بظاہر بعید اور غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کسی قدر تفصیل ہے۔ جس کی تحقیق ہم بیان کرنا چاہتے ہیں۔ خیر محض جو یقیناً خیر ہے جس میں شر کا کچھ بھی شائبہ نہیں ہے شر کی طرف مفضی نہیں ہوتی۔ اور نہ اُس سے بُرا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ ایمان خالص اور معرفۃ حقیقی جس میں ادنیٰ شائبہ کدورت و معصیت۔ نافرمانی و ناسپاسی کا نہ ہو۔ کبھی منجر انجام بد کی طرف نہیں ہوتی۔ علیٰ ہذا شر محض جو حقیقتاً شر ہے۔ مثمر خیر و برکت نہیں ہوتا۔ حقیقی کفر پر نجات مرتب نہیں ہوتی۔ البتہ حقیقی ایمان کے ساتھ کچھ عارضی کدورت معاصی و بداعمالی جمع ہو جائیں تو اُسی قدر بُرا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقی ایمان اُس کو نجات کے نکلانے پر پہنچا کر رہتا ہے۔

کفر حقیقی کیساتھ اخلاق حسنہ۔ نیکوکاری حُسن معاملات جمع ہو جائیں تو اسی قدر حصہ اُسکو بھلائی کا مل سکتا ہے جتنی کہ عارضی اور بالائی خوبیاں تھیں۔ مگر حقیقی نجات اس کو میسر نہ آئیگی۔

اور کبھی ایک شے خیر ہوتی ہے لیکن حدود فعلیۃ سے متجاوز ہو کر وہ شے خیر نہیں رہتی یا جس قدر متجاوز ہوتی ہے اُسکی خیریت میں کمی آجاتی ہے۔ مثلاً رحمۃ و غضب دونوں بجائے خود اپنے اپنے موقعہ پر محمود ہیں اور اسی لئے صحابہ کی شان میں اشداء علی الکفار رحماء بینھم فرمایا گیا

اور مومن جبتک اُس میں یہ دونوں صفتیں ہیں۔ جو دونوں مومن کامل نہیں ہے۔ لیکن اگر شدۃ حد سے متجاوز ہو جائے یا رحمت ہی رحمت کا غلبہ ہو جائے اور شدۃ معدوم یا ضرورت کے موقعہ پر بھی کارآمد نہ ہو تو جس درجہ یہ صفات مغلوب یا معدوم ہو جائیں گی ان محمودہ صفات پر نتائج مترتب ہوتے جائیں گے۔ بعض سلاطین وُلاۃ امر۔ علماء کی غایت نرمی اور درگذر سے بدنتائج کا پیدا ہوجانا اور انجام کار فتن عظیمہ کا آشکارا ہوجانا اسی وجہ سے تھا۔ اور بعض مسلمان بادشاہوں کی جباری اور شدۃ سے انواع واقسام کی خرابیاں دین ومذہب میں پڑجانا اسی کا ثمرہ ہے۔

اور کبھی ایک شے بظاہر شر ہوتی ہے لیکن اُسکے مرتکب کی نیت بخیر اور مطمع نظر کوئی اہم اور ارفع مقصود ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اُسپر اگرچہ ظاہر ایسا ثمرہ مترتب ہوتا ہے جس کا عنوان پسندیدہ نہ ہو لیکن حقیقۃً وہ خیر ہوتا ہے اور اُس کا مرتکب جیسا مقرب بارگاہِ الٰہی تھا ویسا ہی رہتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں شجرہ کو تناول فرمایا۔ جو ارشاد خداوندی کیخلاف تھا۔ لیکن اُنکی غرض اس تناول سے کسی خواہش نفسانی کو پورا کرنا نہ تھا۔ بلکہ رضا باری تعالیٰ اور رویۃ حق کی دائمی نعمت مطلوب تھی کیونکہ جنت میں بڑی نعمتیں رضا الٰہی اور رویۃ حق ہیں۔ ایسی حالت میں اگرچہ تھوڑی مدت کیلئے قیام جنت سے محروم کردیے گئے۔ اور یہ امر اُس وقت خلاف طبع بھی تھا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ مترتب ہوا کہ زمین پر اُن کو خلافت خداوندی کا وہ مرتبہ مل گیا جس کو سُن کر ملائکہ میں غبطہ پیدا ہوا تھا اور بصورت اعتراض اپنے رب سے یہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے۔

اتجعل فیھا من یفسد فیھا۔ (اے رب کیا زمین پر ایسی مخلوق کو خلیفہ بناتا ہے جو اسمیں فساد برپا کریگا)

ایسی ہی کبھی ایک چیز صورۃً خیر ہوتی ہے لیکن اُس کے مرتکب کی نیت بخیر نہیں ہوتی بلکہ خدا اور رسول کا مقابلہ حقیقی خیر کا مٹانا اور محو کرنا مقصود ہوتا ہے۔ منافقین نے مدینہ میں مسجد بنائی تھی جو بظاہر بڑا عمل صالح تھا۔ مگر حقیقۃً اُس سے مسلمانوں کی ایذا رسانی اور اسلام کا نیست ونابود کرنا مقصود تھا۔ اس وجہ سے اُس پر وہی ثمرات مرتب ہوئے جو شر محض پر ہوتے وہ مسجد گرادی گئی اور قیامت تک اُس کا نام مسجد ضرار پڑگیا۔

اور کبھی خیر و شر محض اضافی ہوتے ہیں۔ ایک ہے ایک اعتبار سے خیر ہوتی ہے اور دوسرے اعتبار سے شر ہو جاتی ہے۔ وطن مالوف اہل و عیال کے اندر رہنا جیسا کچھ راحت رساں و راطمینان بخش ہے ظاہر ہے لیکن اگر وہ افلاس اور ذلت کا موجب بنجائے تو سراسر نقصان دہ اور مضر ہے۔ علی ہذا سفر کلفتوں اور مشقتوں کا مجموعہ ہوتا ہے مگر ثروت و غنا، عزت اور عظمت کا سبب بنجائے تو سراسر مفید اور کارآمد ہے۔

کبھی خیر و شر کے سمجھنے میں مغالطہ ہوتا ہے۔ ایک چیز کو آدمی خیر سمجھتا ہے اور وہ حقیقت میں شر ہوتی ہے اور کبھی کسی شے کو شر سمجھتا ہے مگر وہ خیر ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی عسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شر لکم میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم کو خیر و شر کے باہمی ربط و انتاج میں اس قسم کا اشکال پیش آیا تھا اور اسی بنا پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال پیش کیا۔ جس کا وہ جواب آپ نے ارشاد فرمایا ہے جس سے اس ارتباط کی اصل معلوم ہو گئی۔ اور ایک قانون کلی ہاتھ آگیا۔ ہم اس حدیث کو بجنسہ یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان مما اخاف علیکم من بعدی ما یفتح علیکم من زھرۃ الدنیا وزینتھا فقال رجل یا رسول اللہ او یاتی الخیر بالشر فسکت حتی ظننا انہ ینزل علیہ قال فمسح عنہ الرحضاء وقال این السائل وکانہ حمدہ فقال انہ لا یاتی الخیر بالشر وان مما ینبت

(ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس بات سے اپنے بعد تمہارے بارہ میں مجھے اندیشہ ہے یہ ہے کہ دنیا کے مال و متاع زینت و آرائش تمہارے اوپر کھول دی جاویگی۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا خیر اور بھلائی سے بھی شر یا برائی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ نے یہ سنکر کسی قدر سکوت فرمایا جس سے ہم سمجھ گئے کہ وحی نازل ہو رہی ہے تھوڑی دیر میں چہرہ مبارک سے پسینہ صاف کر کے فرمایا۔ سائل کہاں ہے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ اس سوال سے مسرور ہوئے اور جواب میں ارشاد فرمایا کہ خیر سے شر پیدا نہیں ہوتا موسم

الربیع ما یقتل حبطاً او یلمّ الا آکلۃ الخضر اکلت حتی امدت خاصرتاھا استقبلت عین الشمس فثلطت وبالت ثم عادت واکلت وان ھذا المال خضرۃ حلوۃ فمن اخذہ بحقہ ووضعہ فی حقہ فنعم المعونۃ ھو ومن اخذہ لغیر حقہ کان کالذی یاکل ولا یشبع ویکون شھیدا علیہ یوم القیمۃ متفق علیہ (مشکوٰۃ بالرقاق)

ربیع میں اعلیٰ اور عمدہ گھاس پیدا ہوتی ہیں جنکے بکثرت چرنے سے جانور مر جاتے یا قریب مرگ ہیں۔ مگر وہ جانور حد اعتدال کے اندر سبزہ کھائے اور دھوپ میں بیٹھ کر جگال کرنا شروع کرے ہضم ہو جانے پر گوبر اور پیشاب کرے۔ اور جب حاجت ہو پھر کھائے۔ یہ مال و متاع بھی ایسی ہی خوشگوار اور دل کو لبھانیوالی چیز ہے جو شخص اُسکو جائز طور پر حاصل کرے اور موقع پر خرچ کرے تو وہ نہایت مفید اور معین علی الخیر ہے۔ اور جو ناجائز طور پر حاصل کرے اُسکی مثال ایسے شخص کی ہوگی جو برابر کھاتا رہے اور اُس کا پیٹ نہ بھرے۔ اور یہ مال قیامت کے دن اُس کے مقابلہ میں گواہ بن کر آئے گا۔

سائل کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ جب مال بذریعہ حلال حاصل ہوا تو اُس میں اندیشہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے اور اس سے بدنتائج پیدا ہونیکا خوف سمجھ میں نہیں آتا۔ اس بنا پر اُنھوں نے یہ استعجاب ظاہر کیا۔ اویاتی الخیر بالشر (کیا خیر سے شر پیدا ہو سکتا ہی)۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد نے صرف اس سوال ہی کا جواب عنایت نہیں فرمایا بلکہ حقیقت میں اُس کے قواعد کلیہ تبلادیے۔ یہ تو صراحۃً ہی ارشاد فرمایا کہ خیر سے شر حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہی ہم نے اول عرض کیا تھا کہ خیر محض منجر الی الشر نہیں ہوتی۔ اسکے بعد جو مثال ارشاد فرمائی اُس سے اول تو یہ بات ثابت ہوئی کہ امر خیر اگر حد اعتدال سے متجاوز ہو جائے تو اُس سے نتیجہ بد پیدا ہو سکتا ہی مرقاۃ میں بذیل شرح حدیث لکھا ہے۔

المعنی ان الربیع ینبت خیار العشب فیکثر منھا الماشیۃ لاستطابتھا ایاہ حتی ینتفخ بطونھا من مجاوزتھا

(حاصل حدیث یہ ہی کہ موسم ربیع میں عمدہ قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے چوپایہ اُسکو مزیدار سمجھکر اس قدر کھاتے ہیں کہ اُن کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے

حد الاعتدال فينفتق امعائها من ذالك فتموت او تقرب الموت ومن المعلوم ان الربيع ينبت اضراب العشب فهي كلها خير في نفسها وانما يأتي بالشر من قبل افراط الاكل فكذالك المفرط في جمع المال من غير حله ومن الحلال المشغل عن حاله بكثير في التنعم بما له من غير تامل في مآله فيقسو قلبه فيتكبر ويتجبر ويمنع ذا الحق حقه فحيث المال لهلاكه في الدنيا او عقابه في العقبى يصير سبب الوبال وشدة النكال۔

کہ ربیع میں انواع انواع کی عمدہ گھاس پیدا ہوتی ہے اور وہ سب فی نفسہ خیر ہیں برائی جو کچھ پیدا ہوتی ہے وہ حد سے تجاوز ہوکر کھانے سے ہوتی ہے یہی حال ہے ان لوگوں کا جو مال کو افراط کیساتھ غیر حلال ذریعہ سے یا حلال ذریعہ سے اسی طرح جمع کرے کہ اپنے حال سے بدل جائے تنعم میں پڑکر بے تامل بلا فکر انجام اُٹھانا شروع کردے۔ اُس کا دل سخت ہوجائے۔ تکبر و تجبر اُسکی عادت بن جائے۔ اہل حق کا حق ادا نہ کرے تب مال کا انجام دنیا میں ہلاکی یا عقبیٰ کی گرفتاری ہو تو مال خود وبال اور عذاب کا سبب بن گیا۔

اور اسی حدیث کے اشارہ سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اگر ایسے امر میں جو فی حد ذاتہ خیر تھا۔ اور اُس میں قدر قلیل اعتدال سے تجاوز ہوگیا۔ لیکن فوراً اُس کا تدارک کردیا گیا تو اب بھی نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔ چنانچہ اسی حدیث کی شرح میں لکھا ہے۔

وفي قوله امتدت خاصرتاه اشارة الى ان المقتصد ربما يتجاوز حد الاقتصاد لكنه يتدارکه بالبراهين الباعثة على القناعة واليه الاشارة في استقبال عين الشمس

دامتدت خاصرتاها یعنی کوکھیں تنگئیں میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ میانہ رو بھی کبھی حد اعتدال سے متجاوز ہوجاتا ہے۔ لیکن وہ فوراً ایسے امور کا استعمال کرکے جو قناعت پر دال ہیں اُسکا تدارک کرلیتا ہے اور اُس تدارک ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اس لفظ میں کہ وہ جانور آفتاب کی طرف مُنہ کرلیتا ہے۔

الغرض مضمون حدیث سے صراحتہً اور اشارۃً یہ چند اُمور تو معلوم ہوگئے کہ خیر محض نتیجہ شر نہیں ہوتی۔ خیر میں اگر اعتدال سے تجاوز ہوجائے تو نتیجہ بد مرتب ہوجاتا ہے۔ اور اگر تجاوز عن الاعتدال

کا تدارک کر دیا گیا تو وہ اندیشہ رفع ہو جاتا ہے۔ لیکن تھوڑے تامل سے باقی وہ صورتیں بھی جو ہم نے عرض کی ہیں اس سے مستنبط ہو جائیں گی۔

اور جب خیر کی یہ حالتیں ثابت ہو گئیں تو شر کی حالتوں کا قیاس اس پر صحیح ہو گا اور کسی عاقل کو انہیں تامل و تردد کا موقع ہو گا خصوصاً جب نظائر و شواہد سے ہم اسکو محقق کر چکے ہیں

خیر و شر کی اس مختصر تحقیق کے بعد اصلی مدعا کی طرف عود کرتا ہوں۔

قوم سبا کفران نعمت۔ ناسپاسی۔ طغیان و سرکشی کی سزا میں ویران و برباد ہوئے۔ جلا وطن ہوئے۔ وطن مالوف سے اُجڑے۔ اور بہت سے خاندانوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

عمران بن عمرو کلبی اُسی قوم میں کا ایک فرد اور اُن ناشائستہ افعال میں سب کا شریک حال تھا۔ مگر اتنا فرق تھا کہ کاہن کے اقوال یا کسی اور ذریعہ سے اُس کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ قوم سبا ساری کی ساری تباہ اور اُن کی نعمت و دولت زائل ہونے والی ہے۔ وہ عذاب الٰہی سے بچنے کے لئے وقوع حادثہ سے برسوں پہلے ریاست و حکومت۔ دولت و ثروت۔ ناز و نعمت سب کو بخوشی خاطر چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اُس نے اور اُسکے اقربا نے اپنی اپنی پسند کیموافق ٹھکانے بنائے اور جہاں کسی کو موقع ملا آباد ہو گئے۔ جلا وطنی میں اُس کی یہ پیش قدمی جس کا منشا عذاب الٰہی سے بچنا اور محفوظ رہنا تھا مثمر خیر و برکت ہو گئی۔ عمران کا بھتیجہ ثعلبہ مدینہ منورہ میں آباد ہوا اور اُن کے بیٹے حارثہ کے دو بیٹے اوس اور خزرج پیدا ہوئے۔

یہی اوس و خزرج ہیں جن کی اولاد ہیں انصار مدینہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کر کے اپنا نام انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں لکھوایا ہے۔ اور اس طرح سبا کی بربادی کا یہ عمدہ اور بہتر نتیجہ نکل آیا جس کو خدا تعالیٰ کی مکنونانہ قدرت کی شرح کہا جائے تو سراسر بجا ہے۔

مدینہ منورہ میں انصار سے پہلے یہود آباد تھے اور جہانتک تواریخ ہماری رہبری کرتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قوم یہود اہل کتاب تھے اُن کو یہ معلوم تھا کہ نبی آخر الزمان کی جائے ہجرت

ایسی جگہ ہوگی جس کی ساری علامات مدینہ منورہ کے سوا کسی اور جگہ پر صادق نہیں آتی تھیں۔
اس بنا پر یہ یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔

رہی یہ بات کہ کس وقت اور کیونکر یہاں آکر آباد ہوئے اس بارہ میں روایات کے اندر بے انتہا اختلاف ہے۔ اور یہیں کسی ایک روایت کی نسبت اعتماد کرنا سہل نہیں ہے۔ تاہم ایک روایت کا نقل کردینا مناسب ہے۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه بلغنی ان بنی اسرائیل لما اصابهم ما اصابهم من ظهور بخت نصر علیهم تفرقوا وکانوا یجدون محمدا صلی الله علیه وسلم منعوتا فی کتابهم انه یظهر فی بعض هذه القری العربیة فی قریة ذات النخل ولما خرجوا من ارض الشام جعلوا یعبرون کل قریة من تلك القری العربیة بین الشام والیمن یجدون نعتها نعت یثرب فینزل بها طائفة منهم ویرجون ان یلقوا محمدا صلی الله علیه وسلم حتی نزل منهم طائفة بنی هارون ممن حمل التوراة بیثرب فمات اولئك الاباء وهم یؤمنون بمحمد صلی الله علیه وسلم انه جاء ویحثون ابناءهم علی اتباعه فادرکه من ادرکه فکفروا

(ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھکو یہ بات پہنچی ہے کہ بنی اسرائیل پر جب بخت نصر کے غلبہ کی وجہ سے سخت مصیبتیں پہنچیں تو وہ متفرق ہوگئے اُنکی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت وصفت موجود تھی اور یہ بھی موجود تھا کہ وہ ایک ایسے قریہ میں جسکے اندر کھجور کے درخت ہیں ظاہر ہونگے یہود جب بخت نصر کی مصیبت کی وجہ سے ملک کو چھوڑکر نکلے تو شام یمن کے درمیان ہر ایسے قریہ پر جس کے اندر مدینہ کی سی صفت پائی جاتی گذرتے تھے اور ایک جماعت اُس جگہ پر مقیم ہوجاتی تھی یہانتک کہ اولاد ہارون علیہ السلام میں سے ایک جماعت توراۃ کی عالم و عامل تھی خاص یثرب یعنی مدینہ منورہ میں مقیم ہوگئی کچھ عرصہ کے بعد یہ جماعت تو اپنے اسی یقین پر کہ آپ یہاں تشریف لانیوالے ہیں اس عالم سے گذر گئے مگر اپنی اولاد کو آپکی اتباع کیلئے آمادہ کرگئے۔ اسی طرح ایک نسل دوسری کو آمادہ کرتی گئی۔ یہانتک کہ ایک نسل نے آپ کا زمانہ پایا۔ اور باوجود علم اور

وھم یعرفونه ای محمد ام الانصار — حقیقی معرفتہ کے کہ آپ وہی ہیں صرف انصار کی پیشقدمی پر حسد

حیث سبقوھم الیه — کی وجہ سے منکر اور مقابل ہو گئے۔

کلام اللہ سے بھی اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔

وکانوا من قبل یستفتحون — (پہلے) خدا تعالیٰ سے مشرکوں پر فتح چاہتے تھے کہ نبی آخر الزمان کو

علی الذین کفروا فلما جاءھم — پیدا فرما کر مشرکوں کو غارت کر دے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا

ما عرفوا کفروا به فلعنة اللہ — ہوئے جن کو وہ توراۃ کی علامات سے پہچانتے تھے تو از راہ حسد

علی الکافرین۔ — اُن کا انکار کرنے لگے۔ خدا کی پھٹکار کافروں پر)

تفسیر درمنثور میں بروایت ابن اسحاق و ابن جریر و ابن المنذر و ابونعیم و بیہقی عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری سے نقل کیا ہے وہ اپنے بعض بڑے بوڑھوں سے نقل کرتے ہیں کہ سارے ملک عرب میں ہم سے زیادہ کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال و شان کا واقف نہ تھا۔ ہمارے ساتھ یہود رہتے تھے۔ وہ اہل کتاب تھے اور ہم بت پرست تھے جب ہماری طرف سے کوئی رنج دہ بات یہود کو پہنچتی تو وہ کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کا زمانہ بہت قریب آگیا ہے ہم اُن کے ساتھ ہو کر تم بت پرستوں کو عاد ارم کی طرح قتل کر ڈالیں گے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا۔ ہم متبع ہو گئے اور یہود اتباع سے انکار کر کے کفر و عناد پر مصر رہے۔ ہمارے اور یہود کے بارہ میں یہ آیۃ نازل ہوئی ہے۔

اوس و خزرج جو مدینہ میں آباد ہوئے وہ بھی اوّل سے یہ خیال دل میں لئے ہوئے تھے۔ کہ نبی آخر الزمان خاص عرب میں مبعوث ہوں گے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ یہ علم اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ ہم اُن کے جد امجد سبا ابن یشجب ابن یعرب ابن قحطان کے تذکرہ میں لکھ آئے ہیں کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہوئے تھا۔ اُس کے اُن اشعار میں جو اوپر نقل ہو چکے ہیں یہ تمنا موجود ہے کہ کاش وہ اُس وقت تک زندہ رہتا۔ اور آپ کی امداد و نصرت میں حصہ لیتا۔ اور پھر اپنی اولاد کو وصیت کر دی کہ جو اُن کا زمانہ پائے میرا سلام پہنچا دے۔

عرب میں اپنے بزرگوں اور اکابر کی وصیّت جیسی کچھ واجب العمل سمجھی جاتی تھی اظہر من الشمس ہے۔ ایسی حالت میں یہ علم اور یہ وصیت اُسکی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آئی ہو۔ اور مدینہ میں پہنچکر یہود سے میل جول کے بعد اس خیال کی اور بھی تقویت ہوگئی ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہود ہی سے سنکر اُن میں یہ خیال پھیلا ہو۔ مگر قرین قیاس اور مطابق روایت اوّل ہی بات ہے۔ اہل عرب اپنی خاندانی بات کو جتنا مانتے تھے دوسرے کی بات اُن کے نزدیک اتنی باوقعت نہ ہوتی تھی۔ بہرحال کوئی وجہ ہی اوس وخزرج میں یہ خیال راسخ تھا۔ اور روایتی طریقہ پر اَباً عَن جدٍ منتقل ہوتا چلا آتا تھا۔

مورخین نے لکھاہے کہ اوس وخزرج دونوں حقیقی بھائی تھے۔ خزرج کے پانچ بیٹے تھے اور اوس کے صرف ایک بیٹا مالک بن اوس تھا۔ اہلِ عرب میں قوت و شوکت کا مدار اولاد کی کثرت پر تھا۔ اوس جب قریب المرگ ہوا تو اُس کے اقربا نے گرد اگرد جمع ہوکر بطور تحسر کہا کہ ہم آپ سے کہا کرتے تھے کہ دوسری شادی کرلو۔ دیکھو تمہارے بھائی کے پانچ بیٹے ہیں۔ اور تمہارے صرف ایک ہے مالک نے جوابدیا۔

لن یھلك ھالك - ترك مثل مالك

(جس نے اپنا نام روشن رکھنے کے لئے مالک جیسا بیٹا چھوڑا وہ ہرگز نہیں مرا)

مطلب یہ تھا کہ اگر ایک بیٹا بھی مالک جیسا شریف النفس قوی الہمۃ ہو تو باپ کا نام زندہ رکھنے کیلئے کافی ہے۔ اور کم ہمۃ دنی النفس بہت سے بھی ہوں تو کچھ نہیں پھر کہا۔

اِنّ الذی یخرج النّار من الزندۃ قادرٌ علی ان یجعل لمالك نسلاً ورجالاً بسلاً

(جو ذات پاک اس بات پر قادر ہے کہ چقماق میں سے آگ پیدا کردے اسپر بھی قادر ہے کہ مالک کی اولاد پھیلادے اور اُن میں شجاع و بہادروں کی جماعت پیدا کردے)

اور پھر اپنے بیٹے مالک کی طرف دیکھکر کہا۔

ای بنیۃ المنیۃ ولا الدنیۃ

(پیارے بیٹے موت کو اختیار کرلینا مگر ذلت گوارا نہ کرنا)

یہ تھے عرب کے شریفانہ اخلاق جس نے اُن کو دنیا کا مالک بنا دیا تھا۔ خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد اُس نے اشعار ذیل پڑھے۔

لعل الذی اودی ثمود او جرھما ؟ ۔۔۔ سیعقب لی نسلاً علی آخر الدھر

امید ہے کہ وہ ذات جس نے ثمود و جرہم جیسی زبردست قوموں کو فنا کر دیا میرے لئے قیام دہر تک قائم رہنے والی نسل پیدا کر دے

تقربھم من آل عمرو ابن عامر ۔۔۔ عیون الذی الداعی الی طلب الوتر

وہ ذات میری نسل کو اُن لوگوں کی نگاہ میں جو طلب ثار کیلئے بُلاتے ہیں عمرو بن عامر کی اولاد کی پیارا بنا دے۔

الم یات قومی ان اللہ دعوة ۔۔۔ یفوز بھا اھل السعادة والبر

کیا میری قوم کو خبر نہیں ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے صدائے حق بلند ہونیوالی ہے جسکی بدولت اہل سعادت و نیکوکار لوگوں کیلئے ہوگی۔

اذا بعث المبعوث من آل غالب ۔۔۔ بمکة فیما بین زمزم والحجر

جبکہ مکہ کے اندر زمزم اور حطیم کے درمیان غالب بن لوی کی اولاد سے ایک نبی مبعوث ہوں گے۔

ھنالک فابغوا نصرہ ببلادکم ۔۔۔ بنی عامر ان السعادة فی النصر

اُس وقت اے بنی عامر اپنے شہروں میں رہکر اُن کی مدد کرنا۔ کیونکہ سعادت اور فلاح صرف اعانت میں منحصر ہے۔

ان اشعار میں جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں مبعوث ہونیکی بابت اپنے علم کو ظاہر کیا ہے ایسے یہ بھی تبلا دیا کہ تم کو اپنے وطن میں رہکر نصرت کرنا چاہیئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کی جانب ہجرت ہونے اور اپنی قوم کی جان نثاری و خادم بننے کا بھی اُسکو علم تھا۔ اور اسی وجہ سے یہ خطاب صرف اپنی اولاد کو نہیں کیا۔ بلکہ اپنے بھائی کی اولاد کو بھی اُس میں شریک کیا۔

غرض دونوں قومیں یہود اور اولاد حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو بن عامر ماء السماء اوس و خزرج

ف ان لوگوں کے ذہن کس قدر صاف تھے اور وہ قدرت کے مختلف مظاہر شیون کو کیسے خوبی سے سمجھے ہوئے تھے اور اگر قدرت کی ایک نظیر سے دوسرے کیلئے استدلال کرتے تو تناسُل نہ ہوتا جتنا ایک ضد سے دوسری ضد پر

اس تیقن و علم کے ساتھ مدینہ میں آباد ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے منتظر نصرت و امداد پر مستعد و آمادہ تھے مگر قسام ازل نے یہ سعادت صرف انصار کے حصہ میں لکھی تھی یہود باوجود اہل کتاب ہونیکے منکر و معاند بن گئے اور بنی اوس و خزرج باوجود بت پرست اور مشرک ہونیکے یار و مددگار بنے اور انہیں کی استدعا اور الحاح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وطن مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ کو جائے قیام اور وطن اصلی سے زیادہ مالوف وطن بنالیا

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور قوم سبا کی ہلاکت و بربادی۔ جلا وطنی اور پریشانی کا ایک یہ ثمرہ ظاہر ہوا۔

واللہ علی کل شیئ قدیر یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی (اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے وہ مردوں میں سے زندوں کو اور زندوں میں سے مُردوں کو ظاہر فرما دیتا ہے۔

انصار مدینہ کے متعلق ایک اور بھی روایت ہے جس کو ابن اسحاق نے کتاب المبتدا میں ذکر کیا ہے وہ یہ کہ تبع اول جن کا نام اسعد ابن کلیکرب تھا جب اُس کا گذر مدینہ پر ہوا تو اُس کے ہمراہ چارسو عالم تھے ان عالموں نے یہاں پہنچکر باہم عہد و پیان کر لیا کہ اس بستی سے نہ نکلیں گے اور اس کو چھوڑ کر کہیں نہ جائیں گے۔ تبع کو اس کی خبر ہوئی تو اُن سے اس کا سبب پوچھا۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ یہ جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جائے ہجرۃ ہے ہم یہاں اس غرض سے مقیم ہوتے ہیں کہ شاید ہم کو اُن کی خدمت میسر آجائے۔ یہ سُن کر تبع نے اُن کو وہاں آباد ہونیکی اجازت دی۔ ہر ایک کیلئے ایک مکان بنوا دیا اور ہر ایک کی شادی کر کے بہت سا مال اُن کو دیدیا۔ اور ایک تحریر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور اپنے مسلمان ہونیکی لکھ کر اُن کو دیدی اُس تحریر میں یہ دو شعر بھی تھے۔

شهدت علی احمد انه رسولٌ من الله باری النسم

میں احمد کے متعلق گواہی دیتا ہوں کہ وہ خالق کائنات کے رسول ہیں۔

فلو مد عمری الی عمره لکنت وزیرًا له وابن عم

اگر میری عمر اُن کے زمانہ تک رسائی کرتی | تو میں اُن کا وزیر اور چچا کا بیٹا یعنی مددگار ہوتا

اس تحریر پر مہر لگا کر سب سے بڑے عالم کو دیدی۔ کہ وہ یا اُن کی اولاد میں سے جو شخص آپ کا زمانہ پائے یہ تحریر پہنچا دے اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کیلئے ایک گھر بنایا۔ یہ گھر مختلف لوگوں کے قبضہ میں رہا۔ یہانتک کہ آخر زمانہ میں حضرت ابوایوب انصاری کے قبضہ میں آگیا حضرت ابوایوب انصاری اُسی بڑے عالم کی اولاد میں تھے جسکو تبع نے وہ تحریر دی تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو آپکا قیام اُسی گھر میں ہوا بعض کا قول ہو کہ حضرت ابوایوب انصاری کے پاس تبع کی وہ تحریر بجنسہ موجود تھی۔ یہ روایتہ قابل اعتماد اور معتبر نہیں ہے۔ انصار کے نسب اور آبادی مدینہ کے متعلق صحیح وہی روایت ہے جو ہم اول عرض کر چکے ہیں۔

نتیجہ سوم

قوم سبا پر خدا تعالیٰ کی بے انتہا انعام ظاہر و باطن مبذول تھے۔ رزق۔ مال دولت حشمت و ریاست کی یہ حالت تھی کہ ہر شخص کو ہر قسم کی نعمت حاجت سے زیادہ ملتی تھی ضعیف العمر بڑھیا بھی بلا کسی قسم کے تعب و مشقت کے عمدہ سے عمدہ غذائیں کھا سکتی تھی۔ ہر شخص بجائے خود ترفہ و تنعم میں مشغول اور مستقل رئیس بنا ہوا تھا نہ رزق و اسباب تنعم کے بہم پہنچانے میں اُن کو کسی وقت و مشقت کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور ایسی نفیس اور لذیذ غذاؤں کی کثرت استعمال سے جن تکالیف و امراض کا اندیشہ ہو سکتا ہے نہ وہ اُن کو پیش آتی تھیں بستی اُن کی ایسی عجیب الاثر کہ کوئی چھوٹا بڑا موذی جانور وہاں موجود نہ تھا۔ اُن کو مرض کا ذائقہ تک معلوم نہ تھا۔

اور ان سب پر بڑھکر یہ بات تھی کہ اس طرح مال و دولت کو بے محابا اُڑانے کا اُن سے آخروی مواخذہ بھی نہ تھا۔ اُن کو یہ وہ حالت نصیب تھی جو صرف اہل جنت کیلئے مخصوص ہے دنیا میں کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان تمام انعام و اکرام بے انتہا دولت و حشمت ثروت اور ... ہیبت کے مقابلہ میں اُن سے صرف یہ طلب کیا گیا تھا کہ اپنے رب مالک و خالق کو سچا نکر

اُسکی شکر گذاری کریں۔ مگر اُن سے یہ نہ ہو سکا اور یہی انعامات بوجہ کفران نعمت اُنکی تباہی بربادی ہلاکی اور پریشانی کا سبب بن گئے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کسی قوم پر اگر دنیا کی ساری نعمتیں برسنے لگیں مال و دولت اُن کے ناخریدہ غلام بن جائیں ریاست وحکومت اُن کے ساتھ سایہ کی طرح رہیں تو ہرگز یہ تمام باتیں اس بات کی علامت نہیں ہو سکتیں کہ یہ قوم خدا کے یہاں مقبول ہے اور آخرت کی فوز و فلاح میں سے اُس کو کچھ حصہ ملا۔

آدمی کو دنیا میں ہر تین حالتیں پیش آتی ہیں۔

(۱) محض تنعم و ترفہ جاہ و مال حکومت و ریاست جس میں کسی کدورت اور خلاف مزاج کا شائبہ نہ ہو۔

(۲) فقر و فاقہ تنگدستی و افلاس محکومی ذلت۔ دائمی امراض و تکالیف۔

(۳) تنعم کے ساتھ کچھ کدورتیں بھی ہوں۔ مال و دولت ہے تو اُسکے ساتھ امراض جسمانی بھی لگے ہوئے ہیں۔ کبھی فراخی و خوشحالی ہے تو کبھی تنگدستی ہے۔ کبھی امن و راحت نصیب ہے تو کبھی اندیشۂ جان و مال سے دل متفکر اور دماغ پریشان ہے۔ خود تندرست ہیں تو عزیز و اقارب کی تکالیف یا موت سے غمزدہ ہو جاتا ہے۔ غرض راحت کیساتھ رنج اور سکون کیساتھ اضطراب دوش بدوش ہیں۔ ان تینوں حالتوں کے آثار و ثمرات جدا جدا ہیں حالت اولیٰ میں بہت جلد آدمی بدل جاتا مغرور و سرکش ہو جاتا ہے اور وہ نہ صرف اپنے ہمجنسوں اور باقی مخلوق سے بھی اپنے آپ کو بلند و بالاتر سمجھنے لگتا ہے بلکہ اُس تعلق کو بھی جو اُس کے اور خالق کے درمیان میں ہے فراموش کرتا اور بسا اوقات اُس کو منقطع کر دیتا ہے اگر اقوام عالم کے حالات پر ایک صحیح اور ناقدانہ نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ صفحۂ ہستی پر کتنی اقوام پھلے پھولنے کے بعد تباہ و برباد ہوئیں تو ہم کو صاف صاف پتہ چل جائیگا کہ یہ سب وہی تھے جن پر خدا تعالیٰ کے بے انتہا انعام مبذول ہوئے اور یہ انعامات ہی اُنکی سرکشی نافرمانی کفر و کفران کے ذریعے بن گئے۔

دیکھو فرعون نے اسی نخوت سلطنت صحت و عافیت کی بدولت کہ کبھی کوئی تکلیف اور رنجدہ امر پیش نہ آیا دعویٰ خدائی کر دیا۔

قوم عاد اپنی تنومندی عظمت قد و قامت، قوت و شوکت کی بدولت مغرورانہ بول اٹھے۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً (ہم سے زیادہ قوۃ والا کون ہے)

جس کے جواب میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَھُمْ ھُوَ اَشَدُّ مِنْھُمْ قُوَّۃً (کہ وہ نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے اُن کو پیدا کیا ہے وہ اُن سے زیادہ قوۃ والا ہے)

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک معمولی شخص تھا اُس کو اتنا بڑا خزانہ ملگیا جسکی کنجیاں اُٹھانے کیلئے بھی ایک بڑی قوت والی جماعت کی ضرورت پڑتی تھی۔ مگر بجائے شکر گذار ہونے کے مغرور ہو گیا اُس نے سمجھ لیا کہ مجھکو جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی استحقاق اور علم و دانش کا نتیجہ ہے لوگ اُس کو سمجھا کر کہتے تھے۔

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ (تو اس قدرت اکڑ و ناسپاس و مغرور نہ بن اللہ تعالیٰ اکڑنے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھکو دیا اُس سے طالب آخرت کیلیے سامان کر اور دنیا میں بقدر ضرورت حصہ لے اور جس طرح خدا تعالیٰ نے تجھپر احسان کیا ہے تو بھی احسان کر۔ اور زمین پر فساد نہ کر۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔)

اس کا جواب اُس نے نہایت نخوت و استغنا کے ساتھ دیا۔

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (مجکو یہ خزانہ اُس علم کی وجہ سے ملا ہے جو مجھکو حاصل ہے)

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر اور علیٰ علم کے معنی میں اختلاف کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ قارون توراۃ کا بڑا عالم تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس علم کی وجہ سے مجھے یہ استحقاق ہوا ہے

کہ اس قدر بے انتہا مال و دولت مجھکو مل گیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اُس کو علم کیمیا آتا تھا اُس کے ذریعہ سے اُس نے یہ مال حاصل کیا تھا۔ اور یہ علم کیمیا بھی درحاصل حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا طفیل تھا کیونکہ آپ کو من اللہ یہ علم عطا ہوا تھا۔ اور آپ ہی کی تعلیم سے قارون تک پہنچا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کو تجارت و زراعت وغیرہ طریقہ کسب مال کے اُصول و قواعد خوب معلوم تھے اور اسی علم پر غرّہ کرکے یہ سمجھا کہ اُس کے حصول میں کسی کا کیا احسان ہے۔ بہرحال کوئی سا قول صحیح ہو اُسکو غرّہ یہ تھا کہ مال و دولت مجھے میری ذاتی استحقاق اور کمال کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ	(نادان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ
قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ	قرنوں میں سے ایسی جماعتوں کو جو اس سے بھی
مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ	زیادہ قوۃ اور مال والے تھے ہلاک کردیا ہی)

آخر اس بدبخت کا بھی یہی انجام ہوا جوں جوں مال بڑھتا گیا اُس کا غرور اور کفران ترقی کرتا گیا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اذیت رسانی میں ساعی رہتا تھا اور آپ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے مدارات و دلجوئی کرتے رہتے تھے۔ یہانتک کہ زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس بارہ میں بھی اُس سے یہ سہولت برتی کہ ہر ہزار دینار میں سے ایک دینار اور اسی طرح ہزار درہم میں سے ایک درہم ادا کرے۔ مگر اُس نے اس جزو قلیل کا بھی حساب کیا تو کثرتِ مال کی وجہ سے اس کا مجموعہ بھی بہت زیادہ ہوتا تھا جسکے ادا کرنے سے جان چرانے لگا اور آخر اُس نے بنی اسرائیل کے چند آدمیوں کو اپنا ہمخیال بناکر اس پر آمادہ کیا کہ حضرت موسیٰ پر کوئی تہمت لگائی جاوے ایک عورت کو بہت کچھ طمع دیکر آمادہ کردیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تبلیغ و ہدایت کیلئے کھڑے ہوں تب یہ عورت اُن پر بہتان لگائے۔ اگلے روز آپ نے مجمع عام میں زنا کے احکام بیان فرمائے۔ قارون بولا کہ اس حکم سے آپ یا کوئی مستثنیٰ ہے۔ فرمایا ہرگز نہیں مجھپر بھی یہی حکم جاری ہو سکتا ہی۔ اُس نے کہا تو فلاں عورت ایسا کہتی ہے

آپ نے اُس کو بُلا کر اور حلف شدید دیکر دریافت فرمایا۔ اُس نے اصلی واقعہ اغوا کا سچا سچا بیان کر دیا۔ اُس وقت حضرت موسٰی علیہ السّلام نے بد دعا کی قارون اور اُس کا تمام خزانہ اور مکانات زمین میں اُتار دیے گئے۔

بنی اسرائیل کے بعض اچھے خاصے مسلمانوں کو بھی قارون کے پاس مال و دولت کی یہ کثرت دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا تھا چنانچہ جب وہ عید کے روز نہایت احتشام کے ساتھ نکلا اُس کے ارد گرد ہزاروں سوار رنگ رنگ کی سواری رنگ رنگ کے قیمتی رنگین لباسوں میں نکلے تو اُن سے نہ رہا گیا۔ اور کہنے لگے۔

يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنَ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝	(کاش ہمارے لئے بھی ایسا ہی مال ہوتا جیسا قارون کے لئے وہ تو بڑا نصیب والا ہے۔

لیکن جو زیادہ فہمیدہ اور عاقبت بیں اور مال و دولت کے انجام نیز آخرت کی عظمت و جلالت سے واقف تھے اُنہوں نے اُن لوگوں کو جواب دیا۔

وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ	(تمہارے حال پر افسوس ہے۔ تم نہیں جانتے کہ اللہ کے یہاں کا ثواب بہتر ہے اُن لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کئے۔ اور یہ ثواب نہیں دیا جائیگا۔ مگر صبر کرنے والوں کو)

لیکن جب قارون کا یہ حشر ہوا تو وہ لوگ بھی جو اُس کے مال و دولت کو دیکھ کر حرص کرتے تھے بول اُٹھے کہ اللہ جس کو چاہے رزق میں وسعت دیتا ہے۔ اور جس کیلئے چاہے تنگی کرتا ہے اس میں کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے۔ اگر ہم پر خدا تعالیٰ اپنا فضل نہ فرماتا تو ہمارا بھی یہی حشر ہوتا۔

قارون ہی کے مشابہ ایک واقعہ اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی پیش آیا ہے۔

ثعلبہ بن حاطب انصار میں کا ایک شخص تھا وہ آپکی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا

یارسول اللہ میرے لیئے دعا فرمادیجئے کہ مجھے بہت مال ملجائے ارشاد فرمایا۔

وَيْحَكَ يَا ثَعْلَبَةُ أَمَا تَرْضٰى أَنْ تَكُوْنَ مِثْلِي فَلَوْ شِئْتُ أَنْ يُسَيَّرَ رَبِّي هٰذِهِ الْجِبَالَ لَسَارَتْ	(ثعلبہ تمہارے حال پر افسوس ہو۔ کیا تو اس کو پسند نہیں کرتا کہ میری طرح پر رہے۔ اگر میں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ ان پہاڑوں کو میرے ساتھ ساتھ چلائے تو ہو سکتا تھا۔

مطلب یہ ہو کہ میں چاہتا تو ہر قسم کی تونگری حشمت اقتدار اور افتخار ظاہری حاصل ہو جاتا مگر میں نے اپنے لیئے اس کو پسند نہیں کیا۔

ثعلبہ نے پھر کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دعا فرمادیجئے میں اُس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر میرے پاس مال ہو گیا تو تمام ذوی الحقوق کے حق ادا کرتا رہوں گا۔ آپنے پھر ارشاد فرمایا۔

قَلِيْلٌ تَشْكُرُهٗ خَيْرٌ مِّنْ كَثِيْرٍ لَا تُطِيْقُ شُكْرَهٗ	(تھوڑا مال جس کا تو شکر ادا کرتا ہے بہت مال سے بہتر ہو جس کا شکر ادا نہو سکے۔

اُس نے پھر بھی عرض کیا۔ تو آپنے اُس کی وسعتِ رزق و مال کی دعا فرمائی۔ آپ کی دعا مقبول ہوئی۔ اُس نے تجارت کیلئے بکریاں خریدیں۔ اُن کا پھیلا و چیونٹیوں کی طرح شروع ہوا اور اس قدر بڑھیں کہ مدینہ میں گنجائش رکھنے کی نہ رہی۔ تب وہ بمجبوری مدینہ سے علیحدہ جا کر مقیم ہوا۔ وہاں سے دن کی نمازوں کیلئے تو مسجد نبوی میں حاضر ہوتا رہا مگر شب کو نہیں آتا تھا۔ بکریوں کا پھیلاؤ اور بڑھا تو وہاں بھی گنجائش نہ رہی تب وہ اور دور جا کر مقیم ہوا۔ وہاں سے نہ دن کو مسجد نبوی میں نمازوں کیلئے حاضر ہو سکتا تھا اور نہ رات کو البتہ جمعہ کی نماز کیلئے حاضر ہوتا تھا۔ لیکن جب یہ جگہ بھی تنگ ہو گئی تو وہ اور دور جا کر آباد ہوا اور جمعہ اور جنازہ وغیرہ میں بھی آنا متروک ہو گیا۔ صرف اتنا تعلق باقی رہگیا کہ آنے جانیوالوں سے آپکے اور مسلمانوں کے حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ ثعلبہ کسی وقت بھی حاضر نہیں ہوتا تو لوگوں سے اُس کا حال دریافت فرمایا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ مال کی کثرت کی وجہ سے مدینہ میں نہیں

رہ سکا بلکہ دور جاکر مقیم ہوا۔ آپنے ارشاد فرمایا۔

وَیحَ ثعلبۃَ بن حاطب (افسوس ہے ثعلبہ ابن حاطب کے حال پر)

اس کے بعد مسلمانوں پر صدقات مالیہ فرض ہوئے۔ آپنے دو شخصوں کو صدقات وصول کرنے کیلئے مامور فرمایا۔ اور زکوٰۃ کے قواعد وحساب مفصل تحریر فرماکر دیدیے اور اُن لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ثعلبہ بن حاطب اور قبیلہ سلیم کے ایک شخص کے پاس بھی اخذ صدقات کیلئے جاویں یہ دونوں شخص حسب الحکم ثعلبہ کے پاس پہنچے۔ اُس نے کہا مجھکو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دکھلاؤ۔ دیکھ کر کہا یہ تو بالکل جزیہ ہے۔ ابتو تم جاؤ اور جب اپنے کام سے فارغ ہوجاؤ تو میرے پاس آنا۔ یہ دونوں صاحب آگے بڑھے اور اُس دوسرے شخص سلمی کو اطلاع ملی تو اُس نے اُن کا استقبال کیا اور بہترین اموال منتخب کرکے صدقہ دینے کو ساتھ لایا۔ ان دونوں نے کہا صدقہ میں اعلیٰ کا حکم نہیں ہے متوسط کا حکم ہے اُس نے کہا خدا تعالیٰ کے یہاں تقرب حاصل کرنے کیلئے بہترین مال پیش کرنا چاہئے۔

یہ دونوں صاحب لوٹ کر پھر ثعلبہ سے ملے اُس نے پھر تحریر مبارک دیکھی اور دیکھکر یہی کہا کہ یہ تو جزیہ ہے۔ اور کہا ابتو آپ جائیں میں سوچکر جواب دونگا۔

جب یہ دونوں صاحب آپکی خدمت میں واپس آئے تو آپنے اُن کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ویح ثعلبۃ بن حاطب اور اُس سلیمی شخص کیلئے برکت کی دعا فرمائی۔ اُسی وقت ثعلبہ کے بارہ میں آیات ذیل نازل ہوئیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ فَلَمَّا آتَاهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

(اور اُن میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہم کو اپنے فضل سے کچھ مرحمت فرمائیگا تو ہم ضرور صدقات وغیرہ دیا کرینگے اور نیکوکاروں میں سے ہوجائینگے پھر جب خدا نے اپنے فضل سے اُن کو دیا تو وہ اُس میں بخیل بن گئے اور پشت پھیر کر اعراض کرنے لگے۔)

ایک شخص ثعلبہ کے رشتہ داروں میں سے وہاں موجود تھے اُنہوں نے ثعلبہ سے آپکے ارشاد اور

نزول آیات کا حال بیان کیا تب ثعلبہ پشیمان ہوا اور صدقۂ اموال لیکر حاضر خدمت ہوا لیکن آپنے فرمایا کہ مجھ کو تیرے صدقات قبول کرنے سے ممانعت کر دی گئی ہے۔ ثعلبہ نے رونا اور سر پر خاک ڈالنا شروع کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ تیری خود ضد اور ہٹ کا نتیجہ ہے۔ میں تجھ کو منع کرتا تھا۔ مگر تو نے نہیں مانا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ثعلبہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی خدمت میں صدقات لیکر حاضر ہوا اور عرض کیا آپ کو انصار میں میری قدر و منزلت معلوم ہے آپ قبول فرمائیں مگر آپنے بھی قبول سے انکار کر دیا۔

پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حاضر ہوا۔ مہاجرینؓ و انصار ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع بنایا۔ مگر آپنے بھی قبول نہیں کیا اور پھر اسی حالت ذلت و خسران میں راہی عدم ہو گیا۔

حالت ثانیہ میں کہ محض فقر و فاقہ تنگی و تنگدستی تکالیف و محن ہی سے سابقہ رہے۔ اور کبھی راحت و مسرت اطمینان و سکون کی صورت نہ دیکھے۔ یہ حالت بھی بسا اوقات آدمی کو اپنے مرکز سے ہٹا دیتی ہے اور وہ مضطرب ہو کر جادۂ اعتدال سے ہٹ کر باطل پرستوں کی غلامی کرنے لگتا ہے اور طلب رزق و مال میں حق و ناحق کی تمیز نہیں کرتا۔ بلکہ بسا اوقات جب اور اہل دنیا سے اپنی حالت زار کا مقابلہ کرتا ہے تو خداوند عالم کی شان میں گستاخانہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلنے لگتے ہیں۔ اور ہر دو صورت میں دائرۂ کفر میں داخل ہو جاتا یا قریب بہ کفر پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا ہے۔ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا

مگر اول و دوم حالت میں فرق یہ رہتا ہے کہ وہ غرور و نخوت میں جو خدائی کے درجے تک پہنچا دے اور جس کا نتیجہ اپنے سے پست درجہ والوں کا ستانا اور اذیت پہنچانا ہوتا ہے حالتِ اولیٰ میں حاصل ہوتا ہے۔ حالت ثانیہ میں بجائے کبر و نخوت کے عجز و انکسار ہوتا ہے آدمی دوسروں کا دست نگر بن کر اپنے ذاتی اوصاف اور انسانی شرافت کو بھی چھوڑ کر بسا اوقات غلامی کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے اس پر وہ ثمرات مرتب نہیں ہوتے جو حالتِ اولیٰ میں ہوتے ہیں۔ عالم میں جتنی قومیں عذاب کے اندر مبتلا ہوئیں سب کی سب وہی ہیں جو مال و دولت

قوت وشوکت۔ عزت و وجاہت کی بدولت مغرور بنکر ایک جانب خدا سے مقابل بن گئیں دوسری جانب کمزوروں پر ظلم وتعدی کرنے لگیں۔ عاجز وذلیل ہوکر نہ کسی نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ نہ اُسکو ظلم وتعدی کا موقع ملا۔ اس وجہ سے کوئی ایسی قوم عذاب عام میں مبتلا بھی نہیں ہوئی بلکہ اگر حالتِ ثانیہ میں آدمی استقلال واستقامت کے ساتھ اپنے حال پر قائم رہے سختی اور مشقت اُس کو اپنے مرکز سے نہ ہٹا سکے۔ اور وہ صبر کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہے تو اُس کا درجہ یقیناً سب سے بڑھ جاتا ہے۔ مگر چونکہ اتنی ثابت قدمی سوائے اخص الخواص کے نہایت دشوار بلکہ بظاہر ناممکن ہے اس لئے اس سے محفوظ رہنے کی دعا مانگی گئی ہے۔

ہاں اعتدال کا درجہ تیسری حالت میں ہے۔ صبر اور شکر دو ایسے وصف ہیں کہ جبتک کسی میں دونوں نہ ہوں اُس کو ایمان واسلام حقیقی حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لئے کلام اللہ میں جگہ جگہ صبر وشکر کو ملا کر بیان فرمایا ہے۔ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ دونوں حالت میں اپنے مرکز پر قائم نہیں رہتا۔ اگر فقط تنعم وترفہ ہے تو یہ ممکن ہے کہ وہ ایک حد تک۔ ایک زمانہ تک شکر گزار رہے۔ مگر انجام اُس کا ناسپاسی اور کفران نبجاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی قوم سبا کے حالات سے معلوم ہو چکا ہے اور حالت ثانیہ میں گو بعض خواص صبر وسکون سے کام لے سکیں۔ مگر وہ بھی اکثر افراد کیلئے منجر الی الشرک والکفر ہو جاتا ہے۔

یہ خوبی صرف حالت ثالثہ میں ہے کہ اُس میں آدمی اکثر حالات کے اندر اعتدال پر رہتا ہے اُس میں خدائی کی ہوا بھی نہیں بھرتی۔ اور نہ محض عاجز وذلیل بنکر طریقہ کفر اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور یہیں سے اسلامی تعلیم کی خوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ اسلام میں فقر وغنا دونوں کو اُس حد تک پسند کیا گیا ہے جس میں کسی جانب اندیشہ نقصان وطغیان کفران وناسپاسی نہ ہو صبر وشکر دونوں کو جمع کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح کثرت مال اور انہماک دنیا کی جس اثر بدخدا سے بُعد اور اعراض عن الحق ہے۔ مذمت بیان فرمائی ہے ایسی ہی اُس تنگدستی ومحتاجگی کو جو آدمی کو طریق حق سے ہٹا دے ناپسند فرمایا ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت موجود ہے جس میں اُن اُمور کا ذکر ہے جس سے آپ پناہ مانگتے تھے منجملہ اُن کے یہ بھی ارشاد ہے۔

وَشَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَشَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ (الٰہی میں پناہ مانگتا ہوں فتنۂ غنی اور فتنۂ فقر کے شر سے)

ایک دوسری حدیث میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہی۔

قَالَ مَا يَنْتَظِرُ اَحَدُكُمْ اِلَّا غِنًى مُطْغِيًا اَوْ فَقْرًا مُوْلِسًا (اِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْث)

(فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں انتظار کرتے ہو تم مگر غنی کا جو طغیانی تک پہنچا دینے والا ہی یا فقر کا جو اپنی شدت کیوجہ سے مایوس کر دینے والا ہے)

آپ نے اپنے نفس کیلئے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔ ارشاد ہی۔

عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّيْ لِيَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا يَا رَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَاَجُوْعُ يَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ۔

(فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے رب نے مجھپر مکہ کی پتھریلی زمین کو پیش کیا کہ اسکو سونے کا بنا دیا جائے میں نے عرض کیا کہ نہیں بلکہ میری حالت یہی چاہیے کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں جس دن بھوکا رہوں تو تجھکو یاد کروں اور تیرے سامنے تضرع و زاری کروں اور جب پیٹ بھر جائے تو تیری حمد و شکر کروں)

آپ نے ایک جانب اگر غنی کی فضیلت بیان فرمائی ہی اور ارشاد فرمایا ہے۔

مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالًا اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْيًا عَلٰى اَهْلِهٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهٖ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ۔

(جو شخص دنیا یعنی مال کو بذریعہ حلال سوال سے بچنے کیلئے اپنے اہل و عیال کی خبرگیری اور پڑوسیوں پر خرچ کرنیکے لئے طلب کرے تو وہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے ایسی حالت میں جائیگا کہ اُس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوا ہوگا۔)

ایک حدیث میں ام سلیم سے روایت ہی

اِنَّهَا قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَسٌ خَادِمُكَ اُدْعُ اللّٰهَ لَهٗ قَالَ اللّٰهُمَّ اَكْثِرْ

(حضرت ام سلیم والدۂ انس بن مالک خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضور انور کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ انس آپ کا

مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ وَبَارِكْ لَهٗ فِيْمَا اَعْطَيْتَهٗ

خادم ہے اسکے لئے دعا فرمادیجئے آپنے دعا فرمائی الٰہی اسکو مال اور اولاد بہت عطا فرما اور جو کچھ اُسکو ملے اُسمیں برکت عطا فرما

تو دوسری جانب فقر و زہد کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے۔

مسلم میں عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے۔

اِنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِيَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلَى الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا

(فقراء مہاجرین اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوجائیں گے)

فقر و غنا کی باہم فضیلت اور فرق مراتب میں بے شمار حدیثیں وارد ہیں۔ ہماری غرض اس وقت اُن کو نقل کرنے یا اس مسئلہ پر مستقل بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہے اور کوئی موقع ملا تو اس پر تفصیلی بحث کی جائیگی یہاں تو صرف اس قدر مقصود ہے کہ یہ درجہ اعتدال کا ہے اور اسلام کی اصلی تعلیم یہی ہے۔ کسی قوم پر دُنیا کا ٹوٹ پڑنا ہرگز مذموم نہیں ہوتا جبتک کہ اُس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد نہ ادا کئے جائیں۔ اگر غنی موجب ناسپاسی و طغیان ہو جائے۔ تو انجام قوم سبا کی طرح بربادی و تباہی ہے۔ دنیا میں جب کوئی قوم تباہ ہوئی۔ اسی وجہ سے ہوئی ہے۔ طریقۂ اعتدال وہی ہے جس کی تعلیم اسلام نے دی۔

نتیجہ چہارم

واقعہ سیل عرم اور اُس کے نتائج مذکورہ سے یہ نتیجہ بآسانی بلا وقت برآمد ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبی آخر الزمان ہونے کا علم تمام اقوام میں پھیلا ہوا اور علیٰ قدر تفاوت المراتب راسخ تھا۔ قیصر و کسریٰ اور اُن کے اراکین دولت کاہنوں اور منجموں اور بالخصوص رستم کے متعلق تو ہم اوّل لکھ چکے ہیں کہ اُن کے یہاں برابر یہ خیال موجود تھا قیصر کے ملک میں تو اس وجہ سے کہ وہ خود اور اُس کی اکثر رعایا نصرانی تھی اس علم کا راسخ ہونا مستبعد نہیں تھا کیونکہ وہ اہلِ کتاب تھے اور اہل کتاب میں انبیاء کی پیشین گوئیاں اور کتب

الٰہی کی تصریحات برابر موجود تھیں۔ البتہ ملک فارس کسریٰ اور اُس کے آراکین ہیں اس کا علم اس وجہ سے مستبعد معلوم ہوتا تھا کہ وہ آتش پرست تھے۔ اُن کے یہاں نہ سلسلہ انبیا تھا اور نہ کتب آسمانی کا وجود مگر جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اُن کے یہاں بھی اس کا تیقن تھا۔

اب ان واقعات مذکورہ بالا سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ملک سبا میں آپکی بعثت سی ہزاروں سال قبل اس کا علم ویقین تھا۔

اوّل تو خود سبا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان کا آپ پر ایمان لانا مورخین کے بیان سے ثابت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سبا کو یہ علم تھا تو اُس کی اولاد میں سلسلہ بسلسلہ برابر منقول ہوتا چلا آیا ہوگا کہ وہ لوگ بعد میں کافر وطاغی ہوگئے۔ مگر خاندانی روایات کبھی کسی ملک میں مفقود اور معدوم نہیں ہوتیں۔

دوسرے ثعلبہ کے اشعار سے معلوم ہوا کہ اُن کو خود اس کا علم ویقین تھا۔ گو یہ کہنا ممکن ہے کہ یہود کی مجاورت سے اُن کو اس کا علم ہوا ہو۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ اصل علم تو اُن کو اپنی خاندانی روایات سے حاصل تھا۔ البتہ یہود کے اقوال سُنکر وہ اور تازہ اور قابل اعتماد ہوگیا۔

ثعلبہ کے اشعار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہود کے یہاں یہ علم راسخ اور مستحکم تھا اور مدینہ منورہ میں اسی وجہ سے آباد ہوئے تھے کہ یہ آپکی جائے ہجرت ہے جو کوئی آپ کا زمانہ پائے آپ پر ایمان لائے اور نصرت و یاری میں حصہ لے۔

رہے قریش مکہ وہ خود حضرت اسمٰعیل کی اولاد تھے اُن میں اس خیال کا راسخ و مستحکم ہونا قرین عقل و قیاس تھا ان باتوں سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ عرب کی جاہل و وحشی قوموں میں بھی یہ خیال و عقیدہ ایک حدتک پھیلا ہوا اور راسخ تھا۔ گو اُن کے اپنے افعال و حرکات نے اُن کو اتنی دور پہنچا دیا تھا کہ یہ علم اُن کا مغلوب اور تقریباً معدوم ہو چلا تھا۔ مگر اصل علم موجود تھا اور اس علم کے اعتبار سے ملک عرب میں تین قسم کے گروہ موجود تھے۔ ایک یہود مدینہ جو خود اہلِ کتاب اور اس علم پر اس قدر راسخ و مستحکم تھے کہ اوس و خزرج کو اس نام سے دھمکاتے اور کہتے

کہ ہم نبی آخرالزمان کے ساتھ ہو کر تم بت پرستوں کو عاد ارم کی طرح قتل کرینگے۔

دوسرے قریش مکہ کہ اُن کا یہ علم خاندانی تھا۔ اور اُن میں اُس کے جاننے والے موجود تھے مگر جہل اور بت پرستی اس درجہ غالب آگئی تھی کہ گویا یہ علم اب اُن میں باقی نہ رہا تھا۔

تیسرے اوس و خزرج تھے۔ وہ بھی بت پرست و جاہل تھے مگر اصل سے اُن میں یہ علم خاندانی طریقہ سے آیا تھا پھر یہود کی وجہ سے اور تازہ ہو گیا اور یہود کا بار بار دھمکانا اُنکو چونکاتا رہتا تھا۔

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا تو ایک دفعہ کل ملک میں مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی مگر مخالفت کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک جہل و نادانی دوسرے حب جاہ و ریاست۔

جن لوگوں کی مخالفت جہل و نادانی پر مبنی تھی۔ اُنہوں نے گو ایک دفعہ نہایت زور شور کے ساتھ مخالفت کر کے آپ کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں۔ جان و مال عزت و آبرو پر دست اندازی کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی۔ مگر جوں جوں اسلام کا ظہور ہوتا گیا اُن پر اصل علم کا اثر غالب آتا گیا۔ اور وہ بطوع و رغبت داخل حلقۂ اسلام ہوتے گئے۔

انصار مدینہ کیلئے تو یہود کی مخالفت کارگر ہو گئی اُنہوں نے موسم حج پر مکہ میں آکر آپ سے ملاقات کی اور احکام اسلام سے۔ کلام الٰہی سے آشنا ہوئے تو فوراً سمجھ گئے کہ وہ موعود نبی جن کے نام پر یہود ہم کو دھمکایا کرتے ہیں آپ ہی ہیں۔ اور اس اندیشہ سے کہ کہیں یہود سبقت نہ لیجائیں جلدی کر کے خود ایمان لے آئے اور مدینہ کے گھر گھر میں ایک سال کے اندر اسلام اس تیزی سے پھیلا کہ خود آپ کو وہاں تشریف لیجانیکا حکم ہو گیا۔

قریش مکہ اگرچہ آخر تک مخالفت پر تلے رہے مگر رفتہ رفتہ اُن کے سر برآوردہ آپکی تعلیم سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوتے رہے اور بالآخر سوا اُن چند نفوس کے جن کو حب جاہ و ریاست اور حسد و بغض نے اس درجہ پر پہنچا دیا تھا کہ کسی وقت بھی اُن سے انقیاد و اتباع کی توقع نہ تھی باقی سب کے سب مقدم و مؤخر مسلمان ہو گئے۔

مگر یہود مدینہ جو توراۃ کے عالم تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم نبوت

جائے ہجرۃ کا ایسا علم ویقین تھا کہ کوئی تردد کوئی خفا اُس میں باقی نہ تھا اور اتباع کا عزم بالجزم
کرکے مدینے میں آباد ہوئے تھے۔ اُن پر حب جاہ وریاست۔ حسد وبغض کا اس درجہ غلبہ ہوا
کہ نہ اُن کے علم نے کام دیا۔ اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک وصاف تعلیم اُن پر موثر
ہوئی۔ اُنہوں نے ہر ممکن تدبیر سے اسلام کی بربادی وبیخ کنی کی۔ آپ کی ایذارسانی کے لئے
جو کچھ بن پڑا کیا۔ خود جلاوطن ہونا قتل وغارت ہونا گوارا کیا مگر اسلام لانا قبول نہ کیا۔ حالانکہ اپنی
باطل پرستی کا اُن کو علم تھا۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہل کا علاج ممکن ہی۔ مگر ہٹ دھرمی۔ ضد۔
حب جاہ وریاست جہل مرکب کا کچھ علاج نہیں۔

یہود مدینہ میں سے تھوڑے نفوس مثل عبد اللہ بن سلام وغیرہ ایمان لائے۔ باقی اکثروں کا
خاتمہ اسی شقاوت وبدبختی کے ساتھ ہوا۔

اوس وخزرج میں بھی علیحدہ علیحدہ ریاست ونخوت کا مادہ موجود تھا اور یہاں بھی یہ صورت
قریب الوقوع تھی کہ آپ کی بعثت ورسالت کا جو علم اپنی خاندانی روایات سے اُن کو ورثہ میں ملا
تھا۔ یا جو علم ویقین اُس کے متعلق یہود کی مجاورت سے اُن میں پیدا ہوا تھا وہ کچھ بھی کام نہ دیتا۔
اور یہود مدینہ کی طرح آخری دم تک یا قریش مکہ کی طرح ایک زمانہ تک مخالفت پر تلنے رہتے مگر قدرت
نے اُنکی بہتری کے اسباب مہیا فرمادئے۔ اوس وخزرج دونوں حقیقی بھائیوں کی اولاد جب
پھیلی اور اُنہوں نے علیحدہ علیحدہ اپنی بستیاں قائم کرکے قلعے اور گڑھیاں بنالیں تو اُن میں
بھی وہ سمی اثر خانہ جنگیوں کا شروع ہوگیا۔ جو ملک عرب کا خاصہ لازمہ بنا ہوا تھا۔ ان دونوں
قبیلوں میں خوب معرکہ آرائیاں رہیں۔ اور کم وبیش سو برس اسی حالت میں گذر گئے۔ اکثر معرکوں
میں اوس کو شکست ہوتی تھی۔ مگر سب سے آخری معرکہ یوم بعاث ہجرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے
پانچ سال اور عقبہ اولی سے کچھ زیادہ تین برس پہلے ہوا۔ یہ معرکہ نہایت سخت تھا۔ اور اُس میں
اگرچہ فتح اوس کو ہوئی مگر فریقین کے چیدہ اشراف وسردار مقتول ہوگئے۔ اور جن لوگوں سے
اندیشہ ہوسکتا تھا کہ قوت وشوکت نشہ ریاست ونخوت واستقلال اُن کو قبول حق سے بازر

رکھے گا وہ پہلے ہی فنا کر دئے گئے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

کان یوم بعاث قدمہ اللہ لرسولہ فی دخولھم الاسلام (انصار کیلئے یوم بعاث کو قبول اسلام کا سامان اور سبب بنا دیا تھا۔

صرف دو بدبخت باقی رہ گئے تھے۔ ابو عامر فاسق دوسرا عبد اللہ بن ابی۔ ابو عامر نے زمانہ جاہلیت میں ٹاٹ کے کپڑے پہنکر رہبانیت اختیار کرلی تھی اور کہا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا منتظر ہوں۔ اور عبد اللہ بن اُبی جس نے جنگ بعاث کے خاتمہ پر اپنی حسن تدبیر سے اوس و خزرج میں صلح کرادی تھی اور باوجودیکہ دونوں قبیلے اس وقت تک کسی ایک کے تابع نہیں ہوئے تھے۔ مگر عبد اللہ بن اُبی پر دونوں کو اتفاق ہو گیا تھا۔ یہ قرار پا گیا تھا کہ اُس کو دونوں قبیلوں کا بادشاہ یا سردار بنا کر تاج شاہی اُس کے سر پر رکھا جائیگا۔ یہ دونوں اپنی شرافت و سرداری کی بدولت اس نعمت سے محروم رہے۔ اوس و خزرج میں اول تو آپکی رسالت کیمتعلق اپنا خاندانی علم۔ دوسرے یہود مدینہ کے حوالہ سے اس علم کا درجہ یقین تک پہنچنا۔ تیسرے یہود کا اُن کو بار بار دھمکانا کہ ہم نبی آخر الزمان کیساتھ ہو کر تم کو قتل کرینگے۔ چوتھے اُن کا ایسے افراد سے خالی ہو جانا جو اپنی ریاست و حکومت کے زعم باطل میں قوم کو قبول حق سے روکتے یہ اسباب ایسے تھے کہ انصار نے بلا تردد و توقف اسلام قبول کر لیا۔ اور اُن میں ایک سال کے اندر اسطرح اسلام پھیل گیا کہ تیرہ سال کی کوشش سے مکہ میں نہ پھیلا تھا۔

انصار کے اسلام میں راسخ القدم ہو جانیکے بعد گو دیگر قبائل عرب مخالفت کرتے رہے۔ مگر اُنکی مخالفت اتنی قوی نہ تھی جہل کی بدولت کر بیٹھتے تھے۔ اور جب کوئی خوبی اُن کے ذہن نشین ہوئی۔ فوراً مان لیتے تھے۔ ایک طرف اگر قبائل عرب سے خفیف لڑائیاں اور مقابلے بھی ہوئے تو دوسری جانب عرب کے وفود اصل حقیقت سے واقف ہونیکے لئے در دولت پر حاضر ہوتے اور تعلیم اسلام قبول کرتے رہے۔ اور چند ہی سال میں ملک عرب گویا کل کا کل

مسلمان ہوگیا۔ اور جن چند افراد یا بعض قبائل کے اندر کچھ خامی باقی رہی تھی۔ وہ حضرت ابو بکر صدیق کی ابتداء خلافت میں بالکل زائل ہوکر سارا ملک عرب دنیا کے مقابلہ کیلئے تیار ہوگیا۔

حاصل ہمارے اس تمام بیان کا یہ ہے کہ ملک عرب میں بھی آپ کی بعثت و نبوت کا علم صحیح روایات سے شائع ذائع راسخ و مستحکم تھا۔ ہر فرقہ و جماعت میں ایسے لوگ موجود تھے جو آپ کے وجود مبارک کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مخالفت بھی کی مگر وہ زیادہ غلبۂ جہل کی وجہ سے تھی۔ نہ کہ حبّ ریاست و حسد و بغض کی وجہ سے اس لئے جلد یہ مخالفت زائل ہوتی گئی۔ اور قبائل کے قبائل اسلام لاتے گئے۔ اسلام اپنی اصلی عظمت و صداقت کی وجہ سے اُن میں بسرعت پھیل گیا۔ اور کسی طرح کے جبر و اکراہ کو اُس میں دخل نہیں ہوا۔

البتہ جن جماعتوں میں علم یقینی کے ساتھ حسد و بغض حبّ جاہ و ریاست کا مادہ جڑ پکڑ چکا تھا وہ محروم رہے۔ یہود و نصاریٰ زیادہ اس مرض کے شکار ہوئے۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جبتک توفیق الٰہی شامل نہو محض علم کام نہیں دیتا۔ بلکہ زیادہ مضر پڑجاتا ہے۔ انصار کیلئے بہتری مقدر تھی اُن کو کیونکر مادۂ فاسد سے پاک کیا گیا۔ اور یہود کی قسمت میں خرابی لکھی ہوئی تھی۔ اُن کیلئے علم ہی بربادی و شقاوت کا سبب بن گیا۔

واقعات سیل عرم اور اس کے نتائج اور بعض علمی و تاریخی فوائد ذکر کر دینے کے بعد ہم حسب و عدہ مناسب سمجھتے ہیں کہ آیات متعلقہ واقعہ مذکور کے متعلق دو تفسیری بحثیں بھی درج کردیں۔ لیکن قبل اسکے کہ ہم اُس بحث کو شروع کریں آیات متعلقہ سیل عرم کو دوبارہ پورا نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ ناظرین کو فہم میں سہولت رہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا ۖ وَ

هَلْ نُجٰزِیٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

مبحث اوّل متعلق ہے آیات ذیل سے لقد کان لسبأ فی مسکنھم اٰیۃ ۝ جنتٰن عن یمین وشمال کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ ؕ بلدۃ طیبۃ ورب غفور ۝

مبحث اوّل

مفسرین کہتے ہیں کہ جنّتٰن اٰیۃٌ سے بدل ہے یا خبر ہے مبتدا محذوف کی۔ اور معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہیں یعنی قوم سبا کیلئے اُن کے مساکن میں بڑی نشانی تھی اور وہ کیا تھی ۔ دو باغ تھے دائیں بائیں اور چونکہ ایک قرات میں جنّتَیْنِ منصوب بھی ہے اسلئے یہ بھی کہتے ہیں کہ معنی مدح کے جو حالت نصبی میں لئے جاتے حالت رفعی میں بھی ملحوظ رہیں گے۔ اس کے علاوہ جنّتٰن بالرفع اور جنّتَیْنِ بالنصب کی ترکیب میں اور بھی احتمالات ہیں جنکو یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔

حاصل معنی جملہ اولیٰ یہ ہیں کہ قوم سبا کیلئے اُن کی بستی میں خدا تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے فضل و رحمت کی بڑی نشانی تھی ۔ دو باغ تھے اُن کے دائیں بائیں ۔

علامہ زمخشری نے اس موقعہ پر یہ شبہ پیش کیا ہے کہ بستی کے دائیں اور بائیں دو باغ موجود ہونے میں ایسی بڑی آیۃ قدرت الٰہی کی کونسی تھی جو قوم سبا کیلئے مخصوص سمجھی جائے اور جس کیوجہ سے ایسے اہتمام کے ساتھ ارشاد فرمایا جائے ۔ حالانکہ ملکِ عراق میں بہت سے گاؤں ایسے ہیں جن کے گرداگرد بکثرت باغات موجود ہیں ۔

اس شبہ کے جواب میں خود زمخشری نے دو تقریریں کی ہیں ۔

اوّل یہ کہ جنّتٰن سے تثنیہ کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں ۔ یہ غرض نہیں ہے کہ اُنکی بستی کے پاس [illegible]

یمین وشمال میں دو باغ تھے۔ حالانکہ عراق کے تو ایک ایک گاؤں کے گرد بہت سے باغ ہوتے ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس بستی کے یمین وشمال باغوں کے متصل قطاریں میلوں اس طرح چلی گئی تھیں کہ ایک باغ دوسرے باغ سے بالکل متصل اور منضم تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کئی باغ ہیں۔ اور اس طرح ایک جانب کے ہزاروں باغ ایک باغ کے حکم میں تھے۔ دوسری جانب کے بھی کل باغ ایک قطار میں اور متصل ہونے کی وجہ سے ایک ہی باغ کے مثل تھے۔

اس اعتبار سے دو سمتوں کی دو قطاروں کو ایک باغ کا حکم لگا کر تثنیہ کا اطلاق کر دیا۔ سو اب اس شبہ کی گنجایش ہی نہیں رہی کہ قوم سبا کیلئے تو دو ہی باغ تھے۔ اور ملک عراق کے ایک گاؤں کے گرد بہت سے باغ ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ تثنیہ کے حقیقی معنی مراد لیئے جائیں لیکن یہ دو باغ کل بستی سبا یا قوم کے لیئے نہ تھے۔ بلکہ ہر شخص کے مسکن کے یمین وشمال کی جانب دو دو باغ تھے۔ اور یہ امر بالکل مخصوص تھا قوم سبا اور ان کی بستیوں کیلیئے۔

یہ حاصل ہے کلام زمخشری کا۔ اس شبہ اور اس کے جواب کو اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے مگر میں اس شبہ اور اس کے جواب کے متعلق کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

زمخشری کا یہ شبہ بالکل صحیح ہے کہ اگر تثنیہ کے حقیقی معنی مراد لیئے جائیں تو عراق کے دیہات میں دو چھوڑ بہت سے باغات موجود رہتے ہیں اس صورت میں خصوصیت قوم سبا اور اُن پر خاص انعامات بیان کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور اس کی تائید میں صرف دریائے فرات کے متصل دیہات (جن کو سقی فرات کہتے ہیں) کی سرسبزی آبادی کا حال ابن جبیر کے سفرنامہ سے دیکھ لینا کافی ہے۔

اور اس شبہ کا جواب بھی جس قدر دیا گیا ہے وہ واضح ہے کیونکہ اُس میں ثابت کیا گیا ہے کہ باغات کا اس شان سے واقع ہونا خاص قوم سبا کیلئے تھا۔ اور اسی وجہ سے اُس کو عظیم الشان آیۃ فرمایا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں جواب اس سے زیادہ تفصیل چاہتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ قوم سبا پر یہ انعامات اُسی قسم کے تھے جو ہر ایک ایسے سرسبز و شاداب ملک میں

ہوتے ہیں۔ جہاں کی زمین عمدہ اور باشندے فن زراعت میں ہوشیار اور محنتی ہوتے ہوں یا
اُن مقامات میں قوم سبا کے کچھ اختصاصات بھی تھے۔ اور پھر وہ اختصاصات ایسے تھے جو دنیا
میں اکثر قوموں کیلئے بذریعہ استعمال اسباب پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً ایک ملک آب و ہوا۔ ثروت
و غنا اور صحت و تندرستی میں دوسرے ملک سے فائق ہوتا ہے۔

یا اُس کے کم اختصاصات بھی تھے جنہیں اگرچہ بعض باتیں نتیجہ صنع بشری بھی ہوں مگر مجموعی حیثیت سے
اُنکو دیکھ کر ذہن نشین ہو جائے کہ یہ محض خدا تعالیٰ کی قدرت کا ظہور اور اُس کا انعام خاص ہے۔

اگر صورت اوّل ہے اور قوم سبا کیلئے جو کچھ تھا وہ اُنکے کسب و صنعت کا نتیجہ تھا تو اُس وقت اس
خاص صورت کو آیت عظیمہ فرمانا۔ اور اُس کے کفران پر اس عذاب کا نازل ہونا اس وجہ سے تھا
کہ گو زمین اعلیٰ درجہ کی قابل اور پانی چپہ چپہ پر پھرتا تھا باشندے بھی ماہر تھے مگر ان تمام اسباب کے
اوپر ایسے ثمرات کا مرتب ہونا کہ باغ بھی ہوں تو ایسے قرینے سے کہ صرف دو جانب ہوں۔ اور پھر
ہر ایک مکان کیلئے دو باغ ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکانات خود اس قرینہ سے بنائے گئے
تھے کہ ایک جانب میں اوّل ایک مکان اور اُسکے گرد دو باغ پھر دوسرا مکان اور اُسکے گرد دو باغ۔
اس طرح مکانات کی متعدد قطاریں ہوں اور ہر ایک سمت کے باغات باہم متلاصق اور منضم ہوتے
ہوئے میلوں چلے گئے ہوں۔

اور پھر اُن باغوں میں نہ کبھی خزاں آئی نہ کبھی خشک سالی یا دوسرے اسباب کیوجہ سے
پھل خراب ہوں۔ اور پھل بھی اس کثرت سے ہوں کہ کوئی اُن سے محروم نہ رہے جنت کے باغوں کی
طرح اُن کا حاصل کرنا بھی سہل ہو اور اس طرح پر مجموعی حیثیت سے قوم سبا کیلئے یہ انعامات مخصوص
سمجھے جاتے ہوں۔ گو فرادا فرادا ہر ایک چیز ایسی ہو کہ دوسری جگہ اُس کی مثالیں و نظیریں موجود ہوں
زمخشری کے کلام سے اسی کی تائید ہوتی ہے چنانچہ شبہ مذکور کے جواب اوّل کی تقریر کرتے ہوئے
لکھا ہے۔

انما اراد جماعتین من البساتین — (مراد باغوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت اُنکی شہر

جنّتان عن يمين بلدهم وأخرى عن شمالها وكل واحد من الجماعتين في تقاربهما وتضامهما كأنها جنة واحدة كما تكون في بلاد الريف العامرة۔

کے داہنے جانب اور دوسری جانب شمال اور باغوں کی یہ دونوں جماعتیں قرب و اتصال کی وجہ سے مثل ایک باغ کے معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ اکثر سیراب شہروں میں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آباد اور سرسبز شہروں کے ساتھ تشبیہ دینا خود اس کا مقتضی ہے کہ یہ بات دوسری جگہ بھی ممکن ہے اور اسی وجہ سے جملہ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ کو اوپر کے کلام سے علیحدہ کر کے بالکل جملہ مستأنفہ بنایا ہے۔ اور اُسکو شکر گذاری کا سبب قرار دیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ قوم سبا کیلئے دونوں قسم کی باتیں حاصل تھیں۔ وہ بھی جو اسباب کے ذریعہ سے دوسری قوموں کو حاصل ہو سکتی ہیں اور وہ بھی جن میں اسباب اور اُن کے کسب کو کچھ دخل نہ تھا تو یوں کہنا درست ہوگا۔ کہ باغات کی یہ کثرت اور پھلوں کی یہ حالت۔ اتصال اور ترتیب کی یہ کیفیت۔ عمارات کا یہ قرینہ وغیرہ جملہ اُمور ایسے تھے کہ فرادائے فرادائے گو حاصل ہو سکتے ہیں اور بحیثیت مجموعی بھی اُن کا حصول بذریعہ اسباب ممکن ہے۔ مگر مجموعی طور پر جو بات ایک زمانہ دراز تک اُن کو حاصل رہی ہے کہ اس کیفیت میں کچھ بھی فرق نہیں آیا۔ اور برابر ایک حالت تنعم و خوش حالی صحت و تندرستی کی چلی گئی۔ یہ اُن کی خصوصیت تھی۔ اور اُس کے ساتھ کچھ انعام و اکرام ایسے بھی اُن کے اوپر مبذول تھے جن میں اُن کے کسب و صنع کو دخل نہ تھا۔ مثلاً امراض و اکدار سباع و حشرات سے اُن کی سرزمین کا اس طرح پاک ہونا کہ اُن کو کبھی ایذا و تکلیف پہنچی ہی نہ ہو بلکہ کوئی اجنبی بھی اُس سرزمین میں داخل ہو تو وہ اہل سبا کی راحتوں اور کیفیتوں میں حصہ دار بن جائے۔ اُس کے کپڑوں کے پسو وغیرہ سب فنا ہو جائیں۔ صحت کی یہ حالت کہ کبھی کوئی مرض اُس سرزمین میں ہوا ہی نہیں۔ جتنا چاہیں کھالیں۔ بدہضمی۔ یا گرانی و ثقل معلوم ہی نہ ہو۔ اور اُس پر طرّہ یہ ہے کہ اُس اندھا دھند کھانے پینے خرچ کرنے پر کچھ مواخذہ بھی نہیں۔ یہ وہ باتیں تھیں جو اُن کے حد اختیار سے خارج تھیں۔

اس صورت میں جملہ بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَرَبٌّ غَفُوْرٌ کو تتمہ اور تکمیل آیۃ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ثم لما بین حالهم فی مساکنهم وبساتینهم واکلهم اتم بیان النعمة بان لا غائلة علیه ولا تبعة فی المال فی الدنیا فقال بلدة طیبة ای طاهرة عن المؤذیات لاحیة فیها ولا عقرب ولا وباء ولا وخم وقال رب غفور ای لاعقاب علیه ولا عذاب فی الاخرة فعند هذا بان کمال النعمة حیث کانت لذة حالیة خالیة عن المفاسد المالیة۔

حاصل مطلب امام رازی کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُن کے مساکن اور باغات کھانے پینے کی اجازت کا حال بیان فرما دیا تو پھر اُس نعمت کے اتمام تکمیل کو بیان فرماتے ہیں کہ ان نعمتوں کے استعمال میں دنیوی نقصان و تکلیف نہیں ہے اور نہ پاداش مواخذہ اس لئے کہ بستی اُن کی پاک وصاف ہے۔ موذی جانوروں سانپ بچھو وغیرہ سے اور پاک وصاف ہے۔ وبا و بدہضمی وغیرہ سے اور نہ آخرت میں کوئی تکلیف ہے کیونکہ رب مغفرت کرنیوالا ہے۔ اس بیان کے بعد کمال انعام ظاہر ہوا کہ بالفعل تمام نعمتیں موجود تھیں اور وہ تمام مفاسد حالی و مالی سے خالی تھیں۔

روح البیان میں اگرچہ اس وضاحت سے بیان نہیں کیا گیا مگر اُن کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی انعام و اکرام اور خدا تعالیٰ کی نشانی جنتوں ہی پر مقصور نہیں فرماتے۔ وہ کہتے ہیں۔ اٰیۃ ای علامة دالة بملاحظة اخواتها السابقة واللاحقة علی وجود الصانع المختار وانه سبحانه قادر علی ما یشاء من الامور العجیبة۔

یعنی کلام اللہ میں آیۃ سے مراد وہ علامۃ ہے جو سابق اور لاحق حالات کو ملانے سے صانع ... کے وجود پر دلالت کرے۔ اور اس بات پر کہ وہ صانع مختار امور عجیبہ کے پیدا کرنے اور دکھلانے پر قادر ہے لفظ سابق ولاحق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگلے جملوں کو بھی اس کے ساتھ ملایا ہے۔

اور صانع مختار کے وجود اور عجیب قدرت پر دلالت کا ظہور جب ہی ہوتا ہے جب معمولی حالات اور اپنے حد اختیارات و ذرائع سے کوئی شے خارج اور بالاتر ہو۔

مبحث ثانی

مبحث ثانی متعلق ہے آیات ذیل سے وجعلنا بینھم وبین القری التی بارکنا فیھا قری ظاھرۃ وقدرنا فیھا السیر۔ (الی آخر الآیات۔)۔

ہم ان آیات کا مطلب بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی تبلا چکے ہیں کہ قری مبارک سے قری شام مراد ہیں۔

اس وقت ہم اس قدر اور وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ قری مبارک کی مراد میں مختلف اقوال ہیں۔ معتمد علیہ مفسرین کا یہی قول ہے جس کو ہم بیان کر آئے ہیں۔ کہ مراد اُن سے ملک شام کی بستیاں ہیں۔ اُنکے اندر ہر قسم کی خیر و برکات کا وجود ظاہر و باہر بات تھی۔

لیکن عبداللہ بن عباس سے روایات ہے کہ قری بیت المقدس مراد ہیں اور مجاہد سے روایت ہے کہ سراوسہ مراد ہیں۔ اور وہب سے روایت ہے کہ قری صنعا مراد ہیں۔

ابن جبیر فرماتے ہیں کہ خود مارب کی بستیاں مراد ہیں۔

اگرچہ معتمد علیہ اور قابل وثوق روایت اول ہے۔ یہاں تک کہ بعض علماء اُس پر مفسرین کا اتفاق بیان کرتے ہیں۔ مگر ہم نے اُن روایات کو بھی نقل کر دیا ہے تاکہ اختلاف اقوال پر نظر رہنے کے ساتھ بعض فائدے بھی حاصل ہو جائیں۔

اس موقع پر امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک شبہ پیش کیا ہے کہ قری کے درمیان مسافۃ معینہ پر بستیوں کا آباد ہونا۔ اور سفر میں اُن کیلئے سہولتوں کا مہیا رہنا بھی اُن ہی انعامات میں سے ہے جو قوم سبا پر مبذول تھے اور جبکہ انعام کے بعد تبدیل انجام اور جزا ء نا سپاس کا ذکر کیا جا چکا ہے تو اب دوبارہ نعمتوں کا اعادہ بظاہر بے موقع معلوم ہوتا ہے۔

اس شبہ کا جواب خود امام صاحب نے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمتیں بھی کئی قسم کی

اور انکو سزا کی صورت میں مبدل کرنا بھی کئی طرح کا۔ اوّل اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو خاص شہر کے اندر حالت اقامت میں اُنپر مبذول تھیں اور جب اُنکی ناسپاسی ہوئی تو اُن کی سزا بھی ساتھ میں ذکر فرما دیگئی۔ یعنی اُن کے ہرے بھرے گنجان باغوں کو اُجڑے ہوئے باغ اور جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں بدل دیا گیا۔

اور پھر اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اُنکی بستیوں سے باہر حالت سفر میں پیش آتی تھیں۔ اور جب اس نعمت عظمیٰ کی بھی اُنھوں نے ناقدردانی کی۔ بجائے اُسکو غنیمت سمجھنے کے اُلٹا یہ کہنے لگے کہ ہمارے سفر کی منزلوں میں فاصلہ کردیا جائے تو اُسپر جو سزا مرتب ہوئی اُسکو ذکر فرمایا۔ حاصل یہ کہ ہر ایک نعمت اور اُسکی سزا کو ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے جو عین مناسب مقام وحال ہے۔

یہ جواب بالکل صحیح ہے لیکن ذرا تفصیل اور توضیح کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ کی نعمتیں قوم سبا کے اوپر دو قسم کی تھیں ایک وہ جو مخصوص تھیں اُنکے ساتھ۔ دوسری قومیں اُنکے شریک نہ تھیں اور ایک وہ جن میں دوسرے بھی اُن کے شریک حال تھے۔

اول قسم کے انعام کو ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ دو طرح کے تھے ایک وہ جو ظاہری اسباب پر متفرع ہوتے ہیں اور بہت سی قومیں اُن اسباب اور اُن کے ثمرات میں فرادی فرادی طور سے شریک ہوسکتے ہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے کسی کو یہ نعمت حاصل نہیں تھی جیسا کہ قوم سبا کے مساکن اور باغات کا طرز و قوع۔ پھلوں میووں کی کثرت ہر ایک فرد کے عام وشامل ہونیکی کیفیت حصول کی سہولت وغیرہ۔

دوسرے وہ جن کا ترتب اُنکے کسب وصنع پر نہ تھا۔ بلکہ محض قدرت کاملہ کا ظہور تھا جیسے کہ اُس بستی کی حالت جس کو مشرحاً ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

انعام ثانی میں یعنی سفر کی راحت وآسانی میں اہل شام بھی اُن کے شریک حال تھے کیونکہ ملک سبا سے ملک شام تک کئی مہینے کی راہ تھی اُس میں سب ہی پر یہ آسانی تھی۔

صورت اولیٰ کی دونوں قسموں کی سزا ایک تھی۔ اس لئے اُن کو اوّل بیان فرمادیا۔ اور

اُن دو قسموں میں جس قدر باہمی فرق تھا اُسکے لحاظ سے اُن میں بھی ایک جملہ کا فاصلہ کر دیا۔
اور صورت ثانیہ کی سزا علیحدہ تھی اس لئے اوّل انعام اور اُسکی سزا کو بیان کر دینے کے بعد اُس کو بیان فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہر ایک نعمت کے کفران کی سزا اسی طرح ہوتی ہے کہ وہ نعمت سلب ہو کر اُس کے مقابل حالت حاصل ہو جائے۔ باغات و مکانات کی راحت و خوشحالی سے ناسپاسی کرنیکا مقتضا یہ تھا کہ نہ مکانات رہیں اور نہ باغات۔ چنانچہ سیل عرم نے اکر مکانوں کی جگہ تو ریت کے تودے لگادیئے اور باغوں کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ کھڑے کر دیئے۔
سفر کی راحت منزلوں کے قرب۔ امن و اطمینان کی قدر دانی نہ کی تو یہ سزا ملی کہ دور دراز پھینک دیے گئے۔ ایک کہیں آباد ہوا دوسرا کہیں۔
اس تفصیل سے انشاءاللہ تعالیٰ علیحدہ علیحدہ بیان کرنیکی وجہ خوب وضاحت سے معلوم ہو جائیگی۔
لیکن اس جواب کا مبنیٰ تو اس بات پر ہے کہ ہر قسم کے انعامات اور ہر دو سزائیں ایک ہی زمانہ میں ہوئی ہوں۔ اور تمام مفسرین کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت کا حال ہے سیل عرم آنے سے پہلے اُن کو اپنے مساکن میں وہی نعمتیں تھیں جن کا ذکر ہوا۔ اور سفر میں وہی راحت نصیب تھی جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ اور بعد سیل عرم اُن سے سلب ہو گئیں۔
لیکن ایک روایت اور بھی ہے جسکو صحیح مان لینے کے بعد اس شبہ کی گنجایش نہیں رہتی۔
امام ابواللیث نے کلبی سے روایت کیا ہے کہ سیل عرم سے تباہی آجانیکے بعد قوم سبا نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں سے عرض کیا کہ اب ہمکو معلوم ہو گیا کہ یہ جو کچھ تھا خدا تعالیٰ کا انعام تھا۔ اب ہم عہد کرتے ہیں کہ اگر ہماری سابق حالت پھر عود کر آئے تو ہم خدا تعالیٰ کی ایسی عبادت کرینگے جو آجتک کسی قوم نے نہ کی ہو گی۔
انبیاء علیہم السلام نے دعا کی اُنکی تمام سابق نعمتیں عود کرنیکے ساتھ اتنا اور اضافہ ہو گیا کہ وہاں سے ملک شام تک اُنکے سفر میں وہ سہولتیں پیدا کر دی گئیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ لیکن جب پھر کفر اختیار کر کے نعماء الٰہی کی ناسپاسی کرنے لگے تو انبیاء علیہم السلام نے اُن کو سابق عہد و معاہدہ کو یاد دلایا۔

لیکن ایک نہ سنی اور پھر انجام کار ٹکڑے ٹکڑے اور تتر بتر کر دیے گئے۔ اس روایت کیموافق اب شبہ مذکور وارد ہی نہیں ہو سکتا۔

لیکن صحیح اور معتمد روایت سباق و سیاق آیت کیمطابق وہی ہے جس کو ہم اوّل لکھ چکے ہیں اور جس پر اکثر مفسرین کا اتفاق ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

مضمون واقعہ سیل عرم اگرچہ کسی قدر طویل ہو گیا ہے۔ مگر اُس میں بحمد اللہ بہت سے علمی و تاریخی فوائد لکھے گئے ہیں جن کے حاصل کرنے میں بسا اوقات بہت ہی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اور نیز چونکہ اُس میں اصل مضمون اشاعت اسلام کی بھی پوری تائید ہے۔ اس لئے ہم نے اس قدر طول کو گوارا کر لیا۔ اب ہم اصل مضمون کی طرف عود کرتے ہیں۔

خالد بن الولید رضی اللہ عنہ

اسلام کے اُن برگزیدہ و نامآور فرزندان میں جنکی ذات پر مسلمان جتنا فخر کریں کم ہے اور جن کی بے لوث و بے داغ زندگی اور جوہر ذاتی کو دنیا کی تمام اقوام اسی طرح تسلیم کئے ہوئے ہیں جس طرح مسلمان۔ بلکہ یہ کہدینا بھی ممکن ہے کہ خود مسلمانوں میں اس قدر شہرت اُن کے اوصاف و کمالات کی نہیں جسقدر غیر اقوام میں، خالد بن الولید بھی ہیں۔ خالد بن الولید نہ سابقین اوّلین میں ہیں۔ اور نہ عشرہ مبشرہ میں ہیں۔ نہ خلفائے راشدین کے درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں اور نہ اُن برگزیدہ اصحاب میں کہ جنہوں نے ابتداء سن شعور سے آخری دم تک اسلام پر جان فدا کر دی جنکی زندگی کا سب سے بڑا سب سے زیادہ اہم اور ارفع مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گذاری۔ جان و مال کو آپ پر فدا کرنا دین الٰہی کی تبلیغ و توسیع میں آپکے ساتھ مل کر ہر قسم کی مصیبتوں اور دشواریوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ برخلاف خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ایک عرصہ تک اسلام و مسلمانوں کی مخالفت میں تلے رہے اپنی اخلاقی و دماغی قوت شجاعت و مردانگی۔ فنون سپہ گری سب کے سب مسلمانوں کو مٹا دینے میں صرف کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقتدر و معززین کو برباد کرنے میں معین ہوئے۔ کتب سیر و تواریخ کے مطالعہ کرنیوالوں سے مخفی نہیں ہے کہ کتنے ہی کئی مشہور معرکوں میں مسلمانوں کو اُن کے ہاتھ سے سخت نقصان اُٹھانا پڑا ہے لیکن یہ وہی خالد ہیں کہ جب حلقہ بگوش ارادت اسلام ہو گئے۔ انوار اسلام کی شعاعوں نے جہل و کفر کی ظلمت کو

آپکے دل سے دور کرکے اسلام کی حقانیت کو جلوہ گر کر دیا اور خود بخود در دولت پر حاضر ہو گئے اپنے سابقہ افعال و حرکات سے نادم ہوکر بصدق دل توبہ کرلی۔ تو کچھ زیادہ زمانہ گذرنے نہ پایا تھا کہ بارگاہ رسالت پناہ سے سیف من سیوف اللہ کا قابل فخر و مباہات خطاب مل گیا۔ اُنہوں نے اپنی ذات کو مسلمانوں کیلئے سپر بنا کر اسلام کو عرب سے عراق و شام تک پھیلا دیا۔ نامور ناموروں اور مشہور و معروف سپہ سالاروں کو خاک و خون میں لٹا دیا۔ اور اس درجہ پر پہنچ گئے کہ اگر کسی غیر مسلم شخص سے مسلمانوں کے ناموروں کو دریافت کیا جائے تو غالباً وہ سب سے پہلے خالد بن الولید کا نام لے۔

حضرت خالد بن الولید کے حالات میں جس قدر انقلابات اور جتنے تغیرات ہوئے ہیں۔ کم کسی فرد کی ذات واحد میں ہوئے ہونگے۔ کبھی وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں داد شجاعت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی اسلام کی حمایت میں سر بکف میدان کارزار میں دکھلائی دیتے اور اسلام و مسلمانوں کو سخت خطرناک مواقع سے صحیح سالم نکال لاتے ہیں۔ اور اپنی جبلی فراست و دانائی کی بدولت سرداری کا علم اُٹھا کر نفس عصام سودت عصام او عصام۔ کے نفس نے خود عصام کو سردار بنا دیا م کا ثبوت دیتے اور سیف اللہ کا خطاب پاتے ہیں اور کبھی سپہ سالار اعظم کے لباس میں نمودار ہوکر ممالک فارس و روم کو اُلٹ پلٹ کرتے اور اسلامی دائرہ کو وسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی وہی شخص جو حل و عقد کا مالک ہے جس کے ایک اشارہ پر عساکر اسلامیہ حرکت اور ایک آواز پر جدھر وہ لیجائے بلا تامل جانے کو تیار ہیں۔

خلیفۂ وقت کے حکم پر معزول ہوکر جنرل اعظم کے درجہ سے نیچے اُتار کر معمولی سپاہی کے درجہ پر پہنچا دیا جاتا ہے اور پھر اُس کی اطاعت و انقیاد۔ جدوجہد۔ مردانہ وار اور جان نثاری میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ یہ وہ حالات ہیں جن سے ہمارے عنوان پر ایک نہیں بہت سے دلائل قائم ہوتے ہیں۔ اسلئے ہم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے تمام حالات دکھلا کر آخر میں دکھلائیں گے کہ اسلامی تعلیمات کو تقلب خیالات و انقلاب حالات میں کتنی کچھ تاثیر تھی۔ اور اسلام افراد عالم کو آیا بجبر و اکراہ اپنی طرف کھینچتا تھا یا اُسکے جذبات و اثرات صادقہ تھے جس کا ذوق حاصل ہوتے ہی

آدمی سب خیالات سے بالاتر واضح ہو کر اسلام کا شیدائی بن جاتا تھا۔ نہ اُسکے اندر خود بینی باقی رہتی تھی نہ خود آرائی۔ نہ وہ ستائش کا خواہاں رہتا تھا۔ نہ جاہ و عزت کا جویاں۔ نہ ملک داری اُس کو مطلوب رہتی تھی نہ جہانبانی کا ذوق اُسکے دلمیں باقی رہتا تھا۔ اُسکے قلب میں سوائے اسلام اور اُسکے کمالات کے کسی چیز کی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔ ہمیں توقع ہے کہ ناظرین حضرت خالد کے حالات کو تاریخی حیثیت سے نہ دیکھیں گے بلکہ اس نظر سے دیکھینگے کہ اسلام کی تعلیم میں کیا مقناطیسی اثر تھا وہ کس طرح انسان کے تمام قوی ذہنی و دماغی اور تمام اعضاء و جوارح کو اپنا تابع بنا لیتے تھے حضرت خالد کے حالات اسلامی تعلیمات اور اُسکے پاک اثر کے مکمل نمونہ ہیں۔ اور اسی بنا پر ہم آپکے حالات کو چار حصوں پر منقسم کرتے ہیں حصہ اول زمانہ جاہلیت۔ حصہ دوم زمانہ اسلام تا وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حصہ سوم زمانہ امارت و ولایت عساکر اسلامیہ۔ حصہ چہارم معزولی و برطرفی ولایت کا زمانہ۔

ہر چہار حصوں کے حالات چونکہ ہم تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس لئے بعض ایسے واقعات جو ضمناً بیان سابق میں آچکے ہیں مکرر بھی بیان کردیے جائیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔

حصہ اول زمانہ جاہلیت

نسب و شرافت خاندانی

خالد بن الولید قریش مکہ کے اُن خاندانوں میں سے تھے۔ جو اپنی شرافت نسبی و کمال حسبی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ آپ نبی محترم کے رکن رکین۔ ابوجہل بن ہشام بن المغیرہ اور آپ ایک ہی خاندان سے تھے۔ آپ تیسری پشت میں ابوجہل کے ساتھ مل جاتے ہیں کیونکہ آپ خالد بن الولید بن المغیرہ ہیں مغیرہ میں آپ اور ابوجہل دونوں جا ملتے ہیں۔

اس اشتراک خاندانی اور قرب نسب سے اُس عداوت کا اندازہ بھی ہوسکیگا جو خالد بن الولید کو ذات اقدس حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خاندان نبوت سے ہونی چاہیے تھی۔ قریش مکہ تمام قبائل عرب خواہ اولاد ربیعہ سے ہوں یا مضر سے اور جزیرہ نمائے عرب کے کل خطوں کے جسمیں حجاز و یمن و نجد وغیرہ سب ہی داخل تھے مطاع اور واجب التسلیم بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ تمام اقوام عرب کا رجوع اپنے معاملات میں اُن کی طرف تھا موسم حج میں عرب کے تمام قبائل اپنی سب خانہ جنگیوں کو بالائے طاق رکھ کر مکہ کی سرزمین پر

جمع ہوجاتے اور برادرانہ میل جول رکھتے تھے۔ قریش مکہ بیت اللہ کے متولی اور محافظ تھے اور بیت اللہ کی ہی بدولت تمام عرب کو اس قدر امن و اطمینان نصیب تھا کہ چار مہینوں میں جن کو اشہر حرم کہتے ہیں بلا خوف و خطر سفر کرتے تھے اُنہیں مہینوں میں اُن کے بڑے بڑے مشہور بازار لگتے تھے جہاں جمع ہوکر وہ تجارتی کاروبار اور تبادلہ خیالات کرتے ایک قبیلہ دوسرے کے حالات سے واقف ہوتا اور اُسی جگہ مشاعروں کی مجلسیں منعقد ہوتیں اور ہر خطیب و شاعر اپنے فن کا کمال دکھلاتا تھا۔ غرض اگر غور و انصاف سے دیکھا جائے۔ تو ملک عرب کی زندگی اور بقا صرف بیت اللہ اور قریش مکہ کی وجہ سے تھی اگر اُن کو اس قدر امن و اطمینان کے دن بھی سال بھر میں نہ ملا کرتے تو کوئی صورت عرب کی آبادی کی نہ تھی۔ ادھر تو اُن کی وحشیانہ خونخواری اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ہر ایک قبیلہ دوسرے کی صورت سے بیزار دوسرے آمد و رفت کے سلسلے منقطع۔ تجارت درآمد برآمد ہو تو کیونکر۔ پھر اُنکو اسباب معیشت مہیا ہونیکی صورت ہوتی تو کیا ہوتی۔ ان تمام وجوہ سے قریش مکہ کی قدر و منزلت تمام عرب کے قلوب میں جاگزین تھی۔ بیت اللہ تمام عرب کا قبلہ تھا۔ گو عرب کے ہر قبیلہ میں جدا جدا بت موجود تھے جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ مگر خانہ کعبہ سے کوئی مستغنی نہ تھا۔ حج صرف بیت اللہ ہی کا کیا جاتا تھا اور قریش بیت اللہ کے متولی و محافظ ہونے کی حیثیت سے مشائخ اور ائمہ کا رتبہ رکھتے تھے ادھر عقول و تجربہ کے اعتبار سے قابل تقلید تھے اکثر لاینحل معاملات قریش مکہ کے سامنے پیش ہو کر طے ہوتے تھے اور مشکل امور میں عرب کا رجوع قریش کیطرف ہوتا تھا۔ قریش مکہ کو سال بھر میں ایک مرتبہ کل عرب کی میزبانی بھی کرنی پڑتی تھی جسکو وہ نہایت خوشی مسرت اور فخر کیساتھ برداشت کرتے تھے گویا ان تمام اعتبارات سے قریش مکہ کل عرب کے مرجع تھے اور اُنکی روحانی و مادی حکومت تمام قبائل کو شامل و حاوی تھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے حدیث شریف میں الناس تبع لقریش فی ھذا الشان مسلمھم تبع لمسلمھم وکافرھم تبع لکافرھم متفق علیہ (تمام لوگ تابع ہیں قریش کے شان میں یعنی امارۃ وغیرہ کے بارہ میں مسلم تابع ہیں مسلم قریش کے اور کافر تابع ہیں کافر قریش کے) قریش مکہ بہت سے شریف اور عالی خاندانوں میں منقسم تھے اور اُس نے اپنی مذہبی اور ملکی حکومت و اقتدار کو جمہوریت کی ترکیب پر قائم کر رکھا تھا اور اس جمہوریت کی صدارت

بنی ہاشم کے ہاتھ میں تھی جتنی عظیم الشان خدمات اُن کے سپرد تھیں جنسے اُن کا امتیاز و شرف قائم تھا۔ اُن کو باہم تقسیم کر رکھا تھا ایک خاندان دوسرے خاندان سے اس بارہ میں منازعت نہیں کرتا تھا اور اس طرح پر اُن کا نظام نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ قائم تھا۔

تفصیل اسکی یہ ہے کہ قصی بن کلاب ہاشم کے جد امجد کو جب تمام قریش مکہ کی ریاست و حکومت ملکی اُنکی سرداری بلا اختلاف تسلیم کر لی گئی تو قصی کی اولاد میں عبد الدار باعتبار عمر کے سب سے بڑے تھے۔ مگر شرافت ذاتی اور اخلاق کی خوبیوں میں چھوٹے بیٹے عبد المناف و مُطّلِب بہت کچھ فائق تھے باپ نے دیکھا کہ یہ دونوں تو اپنی ذاتی خوبیوں سے برتری حاصل کر لیں گے اور خیال کیا کہ عبد الدار کو ظاہری مناصب دیکر اُن کا ہمسر بلکہ فائق بنا دیا جائے اس بنا پر اپنی تمام مناصب عبد الدار کے سپرد کر دیے قصی کے ہاتھ مناصب ذیل تھے۔ سقایہ حاج یعنی حجاج بیت اللہ کو اپنے ہاتھ سے چاہ زمزم کا پانی پلانا تھا کوئی شخص باختیار خود اپنے ہاتھ سے لیکر زمزم کا پانی نہیں پی سکتا تھا۔ رفادہ یعنی حجاج کی میزبانی موسم حج میں قریش مکہ خاص ٹکیس اس غرض کیلئے قصی کو ادا کرتے تھے اور اُس میں وہی مال دیتے تھے جو بالکل حلال و طیب ظلم و غصب وغیرہ سے حاصل کیا ہوا نہو۔ حجابہ یعنی بیت اللہ کی کلید برداری کہ کوئی شخص بغیر اُن کے اذن کے بیت اللہ میں داخل نہو سکے یہ تینوں منصب مذہبی تھے۔ قیادہ معرکوں کے وقت فوجوں کی کمان کرنا یعنی عساکر قریش کے کمانڈر انچیفی یا سپہ سالاری کا عہدہ۔ لوا یعنی علم برداری۔ معرکوں کیوقت فوجی جھنڈا بھی اُنہیں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ دار الندوہ یعنی مجلس شوریٰ کی قومی عمارت جس کو دار العوام یا پارلیمنٹ کے الفاظ سے تعبیر کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

قریش کے تمام امور عظام اور مہم کام اس مجلس میں طے ہوتے تھے۔ خواہ کسی سے معرکہ آرائی کا مسئلہ ہو یا باہمی معاملات کا تصفیہ یا تمدن وغیرہ کے مسائل۔ کوئی معاملہ جس کا تعلق قریش کے عام افراد سے ہوتا سواء دار الندوہ کے کہیں طے نہ ہو سکتا تھا۔ کوئی شخص اگر بالا بالا کسی معاملہ کو طے کر لیتا تو وہ ناقابل اعتبار سمجھا جاتا تھا۔ قریش میں کسی کا نکاح ہو تو وہ بھی دار الندوہ ہی میں ہوتا تھا۔ لڑکی بالغ ہو جاتی تھی۔ تو دار الندوہ میں حاضر کی جاتی تھی اور اُس کو وہ کرتا پہنایا جاتا جو علامت بلوغ سمجھا جاتا تھا۔

اور اُسکے بعد وہ پردہ میں بیٹھ جاتی تھی۔ محاربات کیوقت علم جنگ بھی اس مجلس کی رائے سے اہل و قابل شخص کے سپرد کیا جاتا تھا غرض تمام ملکی و مذہبی اختیارات کی باگ قصی کے ہاتھ میں تھی جسکو اُس نے اپنے فرزند کلاں عبدالدار کے سپرد کر دیا۔ لیکن یہ نامنصفانہ فیصلہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ عبدالدار کی زندگی میں تو کسی نے منازعت نکی لیکن جب عبد مناف۔ مُطّلِبؔ اور عبدالدار کی وفات ہو چکی تو اُنکی اولاد میں تنازع قائم ہوا۔ عبد مناف کی اولاد ہاشم و عبد شمس اور عبد المُطّلِبؔ کی اولاد ایک طرف ہو گئی اور عبدالدار کی اولاد ایک جانب۔ فریقین نے باہم اپنے اپنے طرفداروں کے ساتھ مل کر معاہدے کئے کہ جبتک فیصلہ نہو جائے ساتھ نہ چھوڑینگے۔ بنی عبد مناف اور اُنکے رفقا بنو زہرہ۔ بنو اسد بنو تیم۔ بنو الحارث مطیبون کہلاتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے خوشبو کا پیالہ درمیان میں رکھ کر اور ہر ایک نے اپنا ہاتھ اُس میں ڈال کر عہد و پیمان کیا تھا۔ اور بنی عبدالدار معہ اپنے حلیفوں بنی مخزوم و بنی سہم۔ بنی جمح اور بنی عدی کے لعقۃ الدم کہلاتے ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے ایک تن کو خون سے بھر کر اور اُس کو چاٹکر معاہدہ کیا تھا۔ لڑائی کے ٹھن جانے میں کچھ کسر باقی نرہی تھی۔ مگر پھر باہم اس پر صلح ہو گئی۔ کہ سقایہ۔ رفادہ۔ قیادہ تو بنی عبد مناف کے ہاتھ میں رہے۔ اور حجابۃ و لواء بنی عبدالدار کے قبضہ میں دار الندوہ مشترک رہی۔ کیونکہ یہ قومی مجلس تھی۔ اسکو کسی کیلئے خاص کرنا مصالح عامہ کے منافی سمجھا۔ اس طرح صلح و صفائی ہونیکے بعد ہر ایک جماعت اپنے اپنے مناصب پر قائم ہو گئی۔ بنی عبد مناف کے جو مناصب متعلق تھے اُن میں قیادہ تو عبد شمس اور اُس کی نسل کے یہاں منتقل ہوتی رہی اور سقایہ و رفادہ ہاشم اور اُنکی اولاد میں اور اُس کے ساتھ بوجہ اُس خاص اقتدار اور مذہبی شرافت اور اخلاق حسنہ کے جو عبد المطلب کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے منصب رفادہ بھی اُن کو حاصل ہوا یعنی سلاطین اور اکابر ملک و ملت کے دربار و میں نیابتاً تمام قریش کی طرف سے جاکر گفتگو کرنا بھی اُن کے سپرد تھا۔ چنانچہ جب ابرہہ اہل مکہ کو تباہ کرنے اور بیت اللہ کی بنیاد اُکھاڑنے کیلئے ہاتھیوں کا لشکر لیکر چڑھا اور اسی وجہ سے وہ اور اُس کا لشکر اصحاب فیل کہلاتے ہیں تو عبد المطلب ہی اس کام کیلئے منتخب ہوئے تھے کہ قریش کے قائم مقام بنکر ابرہہ سے گفتگو کریں۔

قیادۃ کا تعلق بنی عبدالدار سے تھا اُسی کی فروع میں سے قبۃ اور اعنۃ الخیل بھی تھا جو خالد بن الولید کے متعلق ہوگیا۔ گو خالد بن الولید بنی عبدالدار میں سے نہ تھے مگر اُن کے خلفاء یعنی بنی مخزوم میں سے تھے منصب قبۃ کا حاصل یہ تھا کہ قریش کو جب کبھی معرکہ کارزار کا موقع ہوتا تو اُن کو ایک فوجی ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ اور ایک بڑا خیمہ اس غرض کیلئے نصب کیا جاتا تھا کہ اس فنڈ کا روپیہ اسمیں جمع کیا جائے۔ اس خدمت کی سربراہی خالد بن الولید کے سپرد تھی خیمہ کھڑا کرانا۔ روپیہ کا وصول کرنا اُسکو جمع کر کے جنگ کے مصارف میں صرف کرنا انہیں کیمتعلق کیا۔ اور یہ خدمت جس قدر عظیم الشان تھی ظاہر ہے۔ قریش کا اپنی عزت و وقار کو قائم رکھنا دوسرے اقوام دست درازی سے محفوظ رہنا اس پر موقوف تھا۔ اعنۃ الخیل کی خدمت کا حاصل یہ تھا کہ جب لڑائی ٹھن جائے تو کسی منتخب دلیر جوان مرد کے ہاتھ میں فوج سوارہ کی کمان دیدی جائے حقیقت میں یہ دونوں منصب باوجود جلیل القدر ہونیکے منصب قیادۃ کی ماتحت تھیں گویا بنی عبدالدار نے اپنی مفوضہ خدمت کے ایک حصہ کو خالد کے سپرد کردیا تھا۔

اس تشریحی بیان سے واضح ہوگیا کہ خالد بن الولید زمانہ جاہلیت میں کیسا کچھ اقتدار رکھتے تھے اُنکی شجاعت۔ حسن تدبیر۔ فنون جنگ کی تدابیر پر قریش کو کس قدر اعتماد تھا۔

حضرت خالد کے معرکے مسلمانوں کے ساتھ

خالد بن الولید۔ شجاع وجری۔ مدبر و ہوشمند۔ صائب الرائے عالی خاندان سب کچھ تھے۔ اسلام کی مخالفت میں اُنہوں نے دوسروں سے بڑھ کر حصہ لیا۔ مگر اُن میں کمینہ حرکات اور رذیل اخلاق نہ تھے اپنی قوم کا ساتھ دیا۔ اسلام کا مقابلہ کیا مسلمانوں کو چند موقعوں پر نقصان بھی پہنچائے مگر ایسی کمینہ حرکات اُن سے صادر نہیں ہوئیں۔ جیسے کہ قریش کے اور نااہل کرگذرتے تھے۔ اُنکی مخالفت میں بھی ذاتی جوہر نمودار تھے۔ جو کچھ کیا اُس انداز میں جو ایک بہادر اور دلیر دانا دشمن کر سکتا تھا سب وشتم سے زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا اور کوئی دنی و نازیبا حرکت نہیں کی۔

جنگ احد میں خالد کا حملہ

جنگ احد میں حضرت رسول کریم افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے ہمرکاب کل ایک یا دو گھوڑے تھے اور مشرکین مکہ کیساتھ فوج سوارہ کا معقول دستہ تھا جس کی کمان حسب قواعد

مقررہ حضرت خالد کے ہاتھ میں تھی جس وقت میدان جنگ میں خالد بن الولید کے مقابلہ کے لئے
بڑی آن کے ساتھ نمودار ہوئے تو آپ نے سواروں کے حملہ کو روکنے اور خالد بن الولید کے مقابلہ کے
لئے زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا۔ سواروں کے دوسرے دستہ کے مقابلہ کیلئے جو کسی افسر
کے زیر کمان تھا دوسری جماعت کو متعین فرمایا۔ غرض دستہ سوارونکے مقابلہ میں مسلمانوں کے پیادہ دستے
قائم کئے گئے۔ اور تیراندازونکی ایک جماعت کو جس میں پچاس سے زیادہ تیرانداز نہ تھے لشکر اسلام
کی عقب میں ایک گھاٹی پر متعین فرماکر امیر دستہ عبد اللہ ابن جبیر کو ارشاد فرمایا کہ ہم کو فتح ہو یا شکست
مسلمان مال غنیمت بھی جمع کرتے ہوں تب بھی تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ میرے اذن اور حکم کے منتظر رہنا
جبتک تم اپنی جگہ قائم رہو گے ہم کو غلبہ حاصل رہیگا۔

لڑائی سخت گھمسان کی شروع ہو گئی۔ مشرکین مکہ نے بھی داد شجاعت دینے میں کسر اُٹھا نہ رکھی۔
ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ علم جنگ بنی عبد الدار کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ابوسفیان بن حرب کو بدر کی
ہزیمت کا دھبہ مٹانا تھا۔ ہر ممکن طریقہ سے قریش کو آمادہ کیا۔ ابوسفیان نے بنی عبد الدار سے کہا کہ بدر
کی لڑائی میں تمنے علم کو ڈالدیا تھا۔ اسکی وجہ سے جو ہوا تمہیں معلوم ہے۔ لشکر پر جب مصیبت آتی اور ہزیمت
ہوتی ہے تو اصحاب لوا کی بزدلی اور ناواقفی سے پہنچتی ہے۔ اگر تم علم کی حفاظت نہ کرسکو تو ہم کسی اور
کے سپرد کردیں گے۔ بنی عبد الدار نے جھلا کر ابوسفیان کو جوابدیا کہ ہم جو کچھ کرینگے تجھ کو معلوم ہو جائیگا
ابوسفیان کی غرض بھی اتنی ہی تھی کہ وہ علم کی حفاظت میں جان لٹادیں چنانچہ ایسا ہی ہوا علم کو اول
طلحہ بن ابی طلحہ نے سنبھالا۔ وہ قتل کردیے گئے تو اُن کے بھائی عثمان نے لیا۔ اور اُنکے بعد تیسرے
بھائی ابوسعید ابن ابی طلحہ نے وہ بھی قتل کردیے گئے۔ تو طلحہ کے چار بیٹوں مسافع۔ حارث۔ کلاب اور
جلاس نے یکے بعد دیگرے علم کو اُٹھایا اور سب مقتول ہوئے۔ اُنکے بعد ارطاۃ بن شرحبیل۔ شریح بن
قانط نے ہاتھ میں لیا اور وہ بھی مارے گئے۔ پھر ابو زبیر نے اور اُن کے بعد شرحبیل کے بیٹے اور پھر
اُسکے غلام صواب نے ہاتھ میں لیا اور سب کا یہی حشر ہوا۔ غرض قریش نے اپنے لوا کی حفاظت میں کوئی کمی
نہ کی لوا کو گیارہ شخص اُسکو اُٹھاتے اور جان دیتے رہے۔ جب نوبت یہانتک پہنچ گئی کہ لوا کا اُٹھانیوالا

کوئی نہ رہا۔ ادھر مسلمان قریش پر ٹوٹ پڑے۔ تو بھگدڑ پڑ گئی مسلمانوں کو غلبہ تام ہو گیا۔ قریش کو ہزیمت
کلی ہو چکی اور مسلمان اموال غنیمت کے جمع کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے تو تیر اندازوں کی جماعت نے جسکو آپ نے
گھاٹی کی حفاظت پر تعین فرما کر حکم دیا تھا کہ تم کسی حال میں اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ آپس میں کہا کہ فتح کامل
ہو چکی اب ہمارے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہی ہم بھی مظفر و منصور مسلمانوں کے ساتھ غنیمت میں سے حصہ
لیں۔ عبداللہ بن جبیر امیر دستہ نے ہرچند منع کیا مگر دستہ کے اکثر حصہ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ امیر دستہ
کچھ کم دس آدمیوں سمیت وہاں سے نہ ہلے۔ خالد بن الولید کماندار دستہ سواران جیسا مدبر و بہادر ایسے
موقع کو ہاتھ سے کب دے سکتا تھا۔ باوجود قریش کی شکست کامل کے اپنی تدبیر سے نہ چوکے اور فوراً
پہاڑ کے عقب سے آکر اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ امیر دستہ عبداللہ بن جبیر اور اُن کے رفقا نے تو مقابلہ
کر کے جان دیدی۔ باقی مسلمان بےفکر اموال غنیمت کے جمع میں مشغول تھے اس دفعۃً حملہ سے اُنکے پیر اُکھڑ گئے
اُنکی ترتیب میں ابتری پھیل گئی اپنے شعار و خاص علامات کی شناخت بھی نہ رہی مسلمانوں کے کان
میں آواز آئی یا عباد اللہ اُخراکم (اللہ کے بندو اپنے دوسری جانب سے بچو) مسلمان سمجھے کہ دوسری جماعۃ پر
حملہ کرو۔ اور اس بنا پر آپس ہی میں ایک جماعت نے دوسرے پر حملہ کر دیا۔ اور بعض میدان چھوڑ کر مدینہ تک
جا پہنچے۔ غرض ایک دفعہ تو مسلمانوں کو پوری شکست ہو گئی۔ بعض مشرکین نے یہ خبر اُڑا دی کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے اس سے مسلمانوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ بعض
ثابت قدم مسلمانوں کو یہ خبر ہوئی کہ آپ شہید ہو گئے ہیں تو اُنہوں نے آپس میں کہا کہ اگر آپ شہید
ہو گئے ہیں تو اب تم کیا کر رہے ہو کیوں نہیں اُس دین کی حفاظت میں قتال کرتے جس پر آپ قتال کرتے
تھے۔ خدا تمہارا ناصر و مددگار ہے۔ اُنکی ہمت بندھانے سے اور بھی چند نفر انصار کے جمع ہو گئے اور اس
حصہ پر جس میں خالد بن الولید۔ عمرو بن العاص۔ عکرمہ بن ابی جہل ضرار بن الخطاب تھے حملہ کر دیا۔ خالد
بن الولید نے نیزہ سے حملہ کر کے اُنکو قتل کر دیا اور وہ مع اپنے رفقا کے سب شہید ہو گئے۔

مسلمانوں کیلئے یہ نہایت سخت وقت تھا کچھ میدان سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور جو تھے وہ بھی
متفرق تھے لیکن جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر ثابت قدم تھے آپکے قریب مختصر سی

جماعت بھی۔ اس مختصر جماعت میں سعد بن ابی وقاص۔ ابو طلحہ انصاری۔ سہل بن حنیف۔ ابو دجانہ بھی تھے اُن میں سے ہرایک نے جان نثاری کے فرائض اس حد تک ادا کئے کہ کسی فرد نے کسی کے ساتھ نہ کئے ہونگے۔ ابو دجانہ نے اپنے آپ کو آپکے لئے آڑ بنا دی مشرکین کی طرف اپنی پیٹھ کرکے آپکے لئے ڈھال بنگئے جتنے تیر آتے۔ تھے اُن کو لگتے تھے۔ یہانتک کہ اسی طرح آپکے قدم مبارک پر اپنے چہرہ کو رکھکر واصل بحق ہوگئے۔ ان مردوں کیساتھ بعض عورتیں بھی تھیں ام عمارہ مازنیہ نے نہایت جوانمردی و استقلال سے دشمنوں کے حملوں کو آپ پر سے دفعہ کیا۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اُس روز جب اپنے یا بائیں دیکھا تو ام عمارہ کو اپنی حفاظت کیلئے لڑتے دیکھا۔ اُن کو بھی اُس روز بارہ زخم لگے تھے مشرکین میں سے ایک شخص ابن قمۂ نام نے آپکے مونڈھے پر نہایت قوت سے تلوار کا وار کیا۔ آپ کو زخم تو نہیں پہنچا مگر ایک ماہ تک مونڈھے میں تکلیف رہی۔

اُبیّ بن خلف مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو اسقدر دانہ دیتا ہوں اس پر تم کو قتل کرونگا۔ آپ اسکے جواب میں ارشاد فرمادیا کرتے تھے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں ہی تجھکو قتل کرونگا۔

آج مسلمانوں کی اس عارضی شکست سے اُبی بن خلف بھی اپنے خیال فاسد کو پورا کرنے کا موقعہ سمجھ کر آپ کی طرف چلا مسلمانوں نے آپ تک پہنچنے سے روکنا چاہا۔ آپنے فرمایا اُسکو آنے دو۔ آپنے بعض صحابہ سے ایک نیزہ ہاتھ میں لیکر ایسی قوت سے مارا کہ گھوڑے سے گر کر لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ گردن میں خفیف سا نشان زخم کا ہوگیا۔ جو بظاہر کچھ بھی اندیشہ ناک نہ تھا۔ مگر ابی بن خلف چلا اُٹھا قتلنی محمد؟ مجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مار ڈالا۔ لوگوں نے کہا تیری عقل جاتی رہی ہے تجھے تو کچھ گزند کا اندیشہ نہیں ہے۔ تو ایسا بہادر ہے کہ سینہ میں تیر کھاتا تھا اور نکال کر پھینک دیتا تھا کچھ پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس ذرا سے زخم سے کیوں مرا جاتا ہے مگر اُس نے کہا تم نہیں جانتے جتنا زخم آپکے ہاتھ سے مجھ کو لگا ہے اگر اُتنا ہی کل کرۂ ارض کے باشندوں کو ملکر لگ جائے تو سب مرجائیں وہ کمبخت باوجود شدید عداوت کے بھی آپکی حقانیت کو جانتا تھا اور اُس کو اُسی وقت سے اندیشہ تھا۔

جب آپ کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ میں تجھکو قتل کرونگا۔ آخر کئی روز کے بعد مکہ کو واپس ہوتے ہوئے اس زخم کی تکلیف سے مرگیا۔ ابی بن خلف ہی وہ شقی ہی جس کو آپنے اپنے دست خاص سی قتل کیا ہی۔

ابو عامر فاسق نے جو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیل ملائکہ کا باپ تھا اور بوجہ عداوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ چھوڑ کر کفار مکہ سے جا ملا تھا اور جنگ احد میں اُن کو یہ دم دلاسا دیکر لایا تھا کہ جب انصار میرے سامنے آئیں گے اور میں اُنکو آواز دوں گا تو سب میرے ساتھ ہو جائیں گے لیکن یہاں اس مردود کی طرف کسی نے بھی التفات نہ کیا۔ اس ابو عامر کو زمانہ جاہلیت میں بوجہ اس کی عبادت و گوشہ نشینی کے راہب کہتے تھے لیکن اب اُس کا نام فاسق ہو گیا تھا، اُحد کے میدان میں جگہ جگہ گڈھے کھدوا کر چھپا دیے تھے کہ مسلمان بے خبری میں اُن کے اندر جا پڑیں۔ ایک گڈھے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گر گئے اور اس صدمے سے آپ پر بیہوشی طاری ہو گئی گھٹنے چھل گئے ابن قمئہ نے جس نے آپکے مونڈھے پر تلوار ماری تھی اوپر سے پتھر پھینکے۔ ایک دوسرے شخص نے ایک پتھر مارا جس سے دندان مبارک کو صدمہ پہنچا۔ یہاں سے آپ پہاڑ کی گھاٹی میں تشریف لیگئے۔ اور وہاں آپکے زخم کو دھویا گیا۔ گھاٹی میں آپ اصحاب کی مختصر سی جماعت کیساتھ تشریف فرما تھے۔ کہ خالد بن الولید معہ چند مشرکین کے پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے اُسوقت آپنے دعا فرمائی:۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّھُمْ لَا یَنْبَغِیْ لَھُمْ اَنْ یَّعْلُوْنَا (الٰہی ان مشرکین کا ہم سے بلند ہونا لائق نہیں ہم میں

اَللّٰھُمَّ لَا قُوَّۃَ لَنَا اِلَّا بِکَ جو کچھ قوت ہی تیری ہی امداد و نصرت کی ہی)

اس پر حضرت عمر مع ایک جماعت کے مقابلہ کیلئے کھڑے ہوئے اور اُن کو پہاڑ سے نیچے اُتار دیا مسلمانوں پر سخت پریشانی اور خوف کا وقت تھا کہ عین اسی حالت میں اُنپر اونگھ کا غلبہ ہوا۔ جس سے اُنکے ہاتھ میں سے تلوار گر پڑتی تھی۔ اس حالت کے زائل ہو جانیکے بعد خوف بالکل جاتا رہا از سر نو نشاط پیدا ہو گیا۔ بجائے ضعف کے قوت پیدا ہو گئی۔ اور مغلوبی کا جو صدمہ تھا وہ نصرت و فتح کے سرور سے بدل گیا۔ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً (پھر حق تعالیٰ نے اتارا تم پر تنگی کے بعد امن کو اونگھ کہ

نعاسا یغشی طائفۃ منکم (گھیر رہی تھی تم میں سے بعضوں کو)

مشرکین کو اگرچہ بظاہر غلبہ کی صورت حاصل ہوئی تھی مگر قتل وزخم کا نقصان اُن کو بھی اس قدر پہنچ چکا تھا کہ اسوقت کسی طرح مقابلہ کی طاقت اُنمیں باقی نہ تھی۔ بالآخر ابوسفیان نے پہاڑ پر کھڑے ہو کر جھوٹی تعلی و شیخی بگھار کر کہا کہ اب اگلے سال بدر پر مقابلہ ہوگا۔ اور یہ کہکر مکہ کی راہ لی۔

اس معرکہ کے طویل حالات میں سے بقدر ضرورت چیدہ چیدہ حالات بیان کئے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ احد میں مشرکین بالکل مغلوب ہو چکے تھے۔ مال ومتاع چھوڑ کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچا یا مشرکین کیلئے انتقام واقعہ بدر کا جتنا سامان ہوا وہ خالد بن الولید کی تدبیر دانشمندی۔ بے مثل دلیری و شجاعت کا نتیجہ تھا۔

معرکہ خندق میں خالد بن الولید کے کارنامے

زمانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمانوں کو جس قدر معرکہ آرائیاں کرنی پڑیں اُن میں چند ہی ایسی ہیں جن میں اُن کو نقصان زیادہ پہنچا یا خوف وہراس طاری ہوا۔ جنگ احد کے نقصانات اور مسلمانوں کی پریشانی وخوف کا حال تو ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ جنگ حنین میں بھی مسلمانوں کی ایک جماعت کو جن میں زیادہ تر طلقاء (رہا کردہ) تھے عارضی ہزیمت ہوئی تھی غزوہ خندق میں اس قسم کا نقصان جان ومال تو اُٹھانا نہیں پڑا مگر خوف وہراس۔ اضطراب وپریشانی بھوک کی تنگی۔ منافقین کے طعنہ وتشنیع کے اعتبار سے یہ معرکہ سب میں زیادہ تھا۔ درحقیقت مسلمانوں کو اس سے قبل یا اس کے بعد ایسی پریشانی کبھی لاحق نہ ہوئی مشرکین مکہ نے معہ اپنے اعوان غطفان وغیرہ قبائل کے دس ہزار کی جمعیت سے مکمل سازوسامان کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کی تھی۔ یہود بنی نضیر کو جب مدینہ منورہ سے جلا وطن کر دئے گئے اور وہ خیبر میں جا کر آباد ہوئے۔ تو اُن کے سردار حیی بن اخطب (حضرت صفیہؓ زوجہ مطہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ) نے خود مکہ پہنچکر تمام کفار مکہ اور اُنکے مددگار قبائل کو اس پر آمادہ کیا اور یہ پختہ وعدہ کر لیا کہ قریظہ کے یہود جو مدینہ میں آباد اور نہایت سازوسامان والے دلیر وشجاع لڑائی کے آزمودہ کار ہیں تمہارا ساتھ دینگے۔ تم بیرون سے حملہ کرو گے اور وہ اندرون سے آفت ڈھائیں گے اور اس طرح مسلمانوں کی بیخ وبن اُکھاڑ کر پھینک دی جائیگی۔ قریش مکہ اس کے سوا چار ہزار [illegible] تھے۔ اس کثیر جمعیت کے [illegible]

مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے سے مدینہ منورہ کی اُس جانب جدھر سے حملہ کا اندیشہ تھا رات دن محنت کر کے گہری خندق کھودی گئی حیی بن اخطب نے اپنا وعدہ پورا کیا بنی قریظہ کا معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوچکا تھا مکمل تحریر اس مضمون کی موجود تھی کہ بنی قریظہ آپ کے کسی مخالف کا ساتھ نہ دیں گے۔ انصار کے قبیلہ اوس کے ساتھ بنی قریظہ کے تعلقات تھے زمانہ جاہلیت سے اُن میں اور قبیلہ اوس میں یاری و مددگاری باہمی حلف و عہد موجود تھے۔ جس طرح نضیر کا معاہدہ انصار کے دوسرے بڑے قبیلے خزرج کے ساتھ تھا۔ ہر ایک فریق دوسرے کا ساتھ دیتا تھا اور اُسکے مخالف سے وقت ضرورت پر برسرپیکار ہوتا جاتا۔ اسی طرح انصار کے بھی دونوں قبیلے اپنے اپنے حلیفوں کا ساتھ دیتے تھے۔ زمانہ اسلام میں بھی اس عہد و پیمان کی رعایت ہر فریق میں موجود تھی۔ بنی نضیر کے بارہ میں اس معاہدہ کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی خزرجی نے سفارش کی تھی اور باوجود اُس کے منافق شدید النفاق ہونیکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی سفارش منظور کی تھی۔ قریش نے ابن اخطب کو اُس کے وعدے یاد دلائے۔ وہ بنی قریظہ میں پہنچا اور کعب بن اسد (یہ شخص بنی قریظہ کا سردار تھا اور اسکے پاس عہدنامہ صلح موجود تھا) کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کعب نے دروازہ کھولنے سے انکار کیا اور کہا تو ایک منحوس سبز قدم آدمی ہے میرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہوچکا ہے۔ اُنکی طرف سے سوا وفاء عہد۔ سچائی و راستبازی کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی۔ میں ہرگز عہدنامہ کو نہ توڑوں گا۔

حیی بن اخطب نے کہا تو صرف اس خوف سے دروازہ نہیں کھولتا کہ کہیں میں تیری جشیش (موٹا آٹا) میں شریک نہو جاؤں کعب نے مجبور ہو کر دروازہ کھولدیا۔ حیی بن اخطب نے کہا ظالم میں تو ایسی عزت کا سامان لایا ہوں کہ زمانہ میں تیرا نام ہو جائیگا۔ قریش و غطفان کو جمعیت کثیر کے ساتھ لایا ہوں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا استیصال کردیں گے۔ اور جبتک اس مدعا میں کامیاب نہوں۔ یہاں سے نہ ہٹیں گے کعب نے جواب دیا کہ تو عزت کی نہیں بلکہ دنیا بھر کی ذلت کا اور ہر قسم کے خوف و خطرہ کا سامان لایا ہے انی لم ار من محمد الا صدقا و وفاء (میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوا وفا و راستبازی کی کوئی امر نہیں

دیکھا۔حیی بن اخطب کی طرف سے اصرار اور اسکی طرف سے انکار بڑھتا رہا۔آخر حیی نے اسپر حلف کیا کہ اگر قریش وغطفان بغیر مسلمانوں کے تباہ کئے واپس ہوگئے تو میں تیرے ساتھ محصور ہو کر بیٹھ جاؤں گا اور تیری مصیبت میں شریک ہونگا آخر کعب نے معاہدہ توڑدیا عہدنامہ کو پھاڑدیا اور اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کرکے اسکی اطلاع کردی۔سب نے اُسکی رائے سے اتفاق کرکے آپکی مخالفت پر کمر باندھ لی۔اس واقعہ کی اطلاع آپ کی خدمت میں پہنچی تو آپ کو نہایت ناگوار گذرا۔اس وجہ سے نہیں کہ وعدہ نصر خداوندی میں کچھ تردد ہوا۔بلکہ محض اس خیال سے کہ مسلمانوں کے عام طبقہ پر اس کا اثر پڑجانے کا اندیشہ تھا۔آپنے تحقیق حال کے لئے سعد بن عبادہ کو جو بنی قریظہ کی حلیف تھے بھیجا اور اُن کے ساتھ عبداللہ بن رواحہ خوات بن جبیر کو بھی کردیا اور فرمادیا کہ اگر یہ خبر پیمان شکنی کی صحیح ہو تو صراحتاً میرے سامنے بیان نکرنا۔بلکہ کنایہ میں ظاہر کرنا۔خبر حقیقت میں صحیح تھی ان لوگوں نے واپس آکر تعمیلاً لارشاد کنایہ کیا اور کہا۔ عضل والقارہ (یعنی قریظہ نے اس طرح عہد شکنی کی ہے جس طرح قبیلہ عضل و قارہ نے مسلمانوں کی جماعت اصحاب رجیع کے ساتھ کی تھی) مسلمانوں نے عام طور پر تو اُس کو نہ سمجھا مگر آپنے سمجھ لیا اور مسرت کیساتھ اللہ اکبر کہکر فرمایا مسلمانو تمہیں خدا تعالیٰ کی نصرت و امداد کی بشارت ہو۔اس کے بعد آپ چہرۂ مبارک پر کپڑا ڈال کر لیٹ گئے مسلمانوں نے یہ تفکر کی حالت دیکھی تو اور بھی پریشان ہوگئے۔مگر تھوڑی ہی دیر میں آپنے سر اُٹھاکر فرمایا ابشرو بفتح اللہ ونصرہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بشارت دینا بالکل صحیح تھا کیونکہ مشرکین مکہ کی ناکامی کے ساتھ خدا تعالیٰ نے یہود مدینہ کی بقیہ جماعت کے خاتمہ کا بھی سامان فرمادیا۔مگر ظاہری سامان اس بشارت کے مساعد نہ تھے مسلمانوں پر تو غم والم۔تردد و فکر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔دسہزار کا لشکر محاصرہ کئے ہوئے پڑا تھا۔یہود مار آستین کی طرح اندر گھُسے ہوئے تھے کہ مسلمان قریش کے مقابلہ میں مصروف ہوں تو ہم اُن کے زن و بچہ کو تباہ کرکے مسلمانوں کو گھیرے میں لیلیں۔یہی وقت تھا جس کی نسبت کلام اللہ میں ارشاد ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ	جب آئے تم پر اوپر کی طرف سے اور نیچے سے اور جب
مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ	ڈگنے لگیں آنکھیں اور پہنچے دل گلوں تک اور گمان

الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھنالک | کرتے تھے تم شاللہ کے طرح طرح کے گمان وہاں جانچے گئے
ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالاً شدیدا | ایمان والے جھڑ جھڑائے گئے جھڑجھڑانا۔

پھر منافقین مدینہ (جو یہود سے زیادہ عداوت میں بڑھے ہوئے اور مسلمانوں کے ہر کام میں دخیل اور گھسے ہوئے تھے) کا تمسخر وطعن اور ہنسی نمک بر جراحت کا کام دیتا تھا۔ خندق کھودتے ہوئے ایک سخت چٹان نکل آئی جس پر کدال کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا تو آپ نے دست مبارک میں کدال کو لیکر مارا جس سے نرم ہو کر اُس کا ایک تہائی حصہ کٹ گیا۔ کدال کے لگتے ہی چٹان میں سے چمک پیدا ہوئی جس کو دیکھ کر آپ نے فرمایا۔ مجھ پر خدا تعالیٰ نے یمن کو فتح کر دیا۔ اُس روشنی میں میں نے یمن کے مکانات اور آبادی کو دیکھا ہے۔ دوسری دفعہ کدال کو مارا تو ایک تہائی کٹنے کیساتھ روشنی نمودار ہوئی اور آپنے فرمایا۔ شام کا ملک بھی فتح ہو گیا۔ اس روشنی میں شام کے ملک اور اُسکی آبادی مجھکو دکھلادی گئی۔ تیسری دفعہ کدال مارا تو پھر روشنی ظاہر ہوئی آپنے فرمایا فارس کا ملک بھی فتح ہو گیا۔ منافقین ان باتوں کو سُن کر اور بھی تمسخر کرتے اور مسلمانوں پر قہقہے لگاتے تھے کہ یہ بھی عجیب نادان ہیں گھر میں تو امن نہیں ہے کوئی شخص اطمینان سے روٹی نہیں کھا سکتا۔ تنگی کا یہ حال کہ کئی کئی وقت روٹی نہیں ملتی۔ اور اس حالت پر ان جھوٹے وعدوں پر خوش ہوتے ہیں۔

واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم | اور جبکہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلمیں شک ہے
مرض ما وعدنا اللہ ورسولہ الا | کہتے تھے نہیں وعدہ کیا ہم سے اللہ اور اُس کے
غرورا۔ | رسول نے مگر دھوکے کا۔

مسلمانوں کیلئے ایسی ابتلاء وامتحان کا وقت اسسے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ جنگ احد میں بیشک نقصان پہنچا تھا۔ مگر نہ اتنا ڈر اور نہ ایسا خوف وہراس تھا مسلمانوں کو خود اپنی سوء تدبیری وعدم امتثال حکم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ اسی ابتلاء میں ابتلا اور آزمائش پختگی وصدق و اخلاص جوانمردی وجان نثاری کا ایک دوسرا منظر پیش آیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غایۃ شفقت ورحمت رافتہ وعطوفت کا اقتضا یہ ہوا کہ مسلمان جو تقریباً ایک ماہ سے گھر سے بے گھر نہایت خوف وہراس میں مبتلا ہر قسم کی تکالیف

برداشت کر رہے ہیں۔ اُن کو اس بلا سے نجات دیجائے۔ مشرکین کو لطائف الحیل سے اس وقت ٹالدیا جائے
وقت کا ٹالدینا اور کسی دوسرے وقت دشمن سے انتقام لینا بھی تدبیر حرب میں اعلیٰ درجہ کی تدبیر ہوتی ہے
آپ نے عینیۃ ابن حصن فزاری اور حارث ابن عوف مزی کو طلب فرمایا یہ دونوں ابوسفیان سے پوشیدہ
حاضر خدمت ہوئے آپنے ان دونوں سے فرمایا اگر تم اپنی جماعت کو واپس لیجاؤ تو مدینہ کے سال بھر کے
پھلوں میں سے ایک تہائی تم کو دیے جائیں گے۔ اُنہوں نے نصف کا مطالبہ کیا مگر بالآخر ایک تہائی پر
راضی ہو گئے۔ جب یہ دونوں راضی ہو گئے تو انصار کے ہر دو سردار سعد ابن معاذ اوسی سعد بن عبادہ
خزرجی کو بلا کر اس بارہ میں مشورہ فرمایا۔ دونوں نے بالاتفاق عرض کیا۔ اگر اس طرح صلح کرنے کا آپ کو
منجانب اللہ حکم ہے تب تو سوا امتثال چارہ ہی نہیں ہے اور یہ امر خود آپ کو پسندیدہ و مرغوب ہے تب بھی
ہم اطاعت کرینگے۔ اور اگر محض ہماری راحت رسانی اور رفع کلفت و پریشانی کیلئے کیا جاتا ہے تو ہمارے
نزدیک یہ صلح ٹھیک نہیں ہے ہمارے پاس تو ان مشرکین کیلئے سوا تلوار کے کچھ نہیں ہے۔ آپنے ارشاد فرمایا
اگر مجھے خدا تعالیٰ کے یہاں سے حکم ہوتا تو تم سے مشورہ ہی کیوں کرتا میں تو صرف اسی وجہ سے صلح کرتا ہوں
کہ تمام عرب نے ایکا کر کے تم کو ہدف سیف و سنان بنایا اور ہر طرف سے تم پر حملہ ہو رہا ہے اس وقت اس تدبیر سے
اُنکے جتھے کو توڑ دیا جائے پھر جو کچھ ہو گا دیکھ لیا جائیگا۔ دونوں سردارانِ انصار نے یہ سُن کر عرض کیا۔ یارسول
اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) زمانہ شرک میں ان قبائل غطفان کی یہ مجال نہ تھی کہ مدینہ کی ایک کھجور بھی ہم سے نزرانہ
لے سکیں یا خرید کر لیتے تھے یا ہمارے مہمان بنکر کھالیتے تھے اور اب جبکہ ہمکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت
و عزت عطا فرمائی آپکی بدولت ہدایت نصیب ہوئی تو ہم اسقدر پست ہمت بزدل بن جائیں کہ اُن کو ثمار مدینہ
کا ایک ثلث محض حفاظت جان کیلئے دیدیں۔ حالت شرک میں تو ہم اس قدر قوی غیور بہادر و دلیر ہوں
اور اس کرامت و شرافت کے بعد جو ہم کو حاصل ہوئی ہے ایسے بے حمیت کمزور بنجائیں۔ نہیں ہرگز ایسی صلح کی
ضرورت نہیں ہے۔ تلوار ہی سے فیصلہ ہو گا۔ آپنے سُنکر فرمایا تمہاری یہ رائے ہے تو بہتر ہے ہر دو سرداروں
نے بآواز بلند عینیہ اور حارث سے کہدیا جس قدر ممکن ہو ہمارے مقابلہ میں کوشش کرو تلوار ہی سے
فیصلہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح صلح کا نہ منجانب اللہ حکم تھا اور نہ خود پسندیدہ و محبوب تھی۔ بلکہ منجملہ تدابیر

ایک تدبیر تھی۔ اور اُس میں صحابہ کی دلجوئی اور راحت کا خیال تھا۔ مگر جس طرح آپ کی جانب سے محض شفقت و رافت کا ظہور تھا۔ درحقیقت مسلمانوں کیلئے امتحان و آزمایش کی گھڑی تھی اگر انصار اس رائے کو مان لیتے تو کسی طرح قابل ملامت و طعن نہ ہوتے۔ مگر وہ اس تہ کو پہنچ گئے لیبلی المؤمنین بلاءً حسناً کا مضمون پیش نظر ہو گیا اور نہایت ثابت قدمی سے صلح کو نامنظور کیا جب صلح کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ تو مشرکین کے تمام گروہوں نے پوری جدوجہد شروع کر دی۔

خندق کے درمیان ہونے سے پیادہ لشکر کو تو موقع حملہ کا تھا ہی نہیں۔ البتہ سواروں کے دستے متفرق مقامات پر رات دن گشت لگاتے تھے اور چاہتے تھے کہ کہیں موقع مل جائے تو خندق کو طے کر کے مسلمانوں پر جا پڑیں۔ یہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ فوج رسالہ کی کمان ہمیشہ خالد بن الولید کے ہاتھ میں ہوتی تھی اس موقع پر بھی انہیں کی کمان میں تھے۔ خالد رضی اللہ عنہ خود بالطبع ایسے دلیر و جوشیلے نڈر تھے کہ کسی موقع کو ہاتھ سے دینا تو کیا خود متلاشی رہتے تھے۔ مگر خندق کا محاصرہ لمبا ہو گیا تھا ایک شخص سے ناممکن تھا کہ رات دن ہر موقع پر دستہ سواروں کو لیجائے۔ اور مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک آن کیلئے چین و اطمینان حاصل نہ ہو۔ اُنہوں نے رسالہ کو کئی دستوں میں تقسیم کر کے ہر ایک دستہ کی کمان جدا جدا ابوسفیان عمرو بن العاص۔ عکرمہ ابن ابی جہل۔ ہبیرہ ابن ابی وہب۔ ضرار بن الخطاب کے سپرد کی اور ایک دستہ کی کمان خود اپنے ہاتھ میں رکھی اس طرح نمبروار حملے کرتے رہے کبھی کبھی بزور گھوڑوں کو خندق میں لیجانیکا ارادہ کیا مگر کامیاب نہوئے ایک مرتبہ نوفل عبداللہ ابن مغیرہ نے گھوڑے کو خندق پر کدانا چاہا۔ مگر وہ خندق میں گر گیا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ یہ حالات تو ابتدا ہی سے تھے مگر آخر میں جدوجہد کو اور بھی بڑھایا۔ ایک مرتبہ عکرمہ ابن ابی جہل۔ ہبیرہ ابن ابی وہب۔ ضرار بن الخطاب عمرو ابن ود نے گھوڑوں کو خندق کے تنگ رستہ میں جبراً گھسا ہی دیا۔ مگر یہ حملہ بھی عمرو بن ود کیساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابل آنے اور عمرو بن ود (جو نوے برس کا بڈھا تھا مگر دلیری و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے بہادر اُسکے نام سے ڈر جاتے تھے) مقتول ہو جانے پر ختم ہو گیا۔ ایک مرتبہ خالد رضی اللہ عنہ دستہ سواران لیکر نکلے کہ مسلمانوں کو غفلت میں جالیں۔ کنارہ خندق پر اُسید بن حضیر دو سو کی جمیعت سے موجود تھے۔ تھوڑی دیر تک مقابلہ

رہا اور پھر ہٹ گئے۔ ان ہی مصائب و سختیوں میں ایک واقعہ پیش آگیا۔ ایک مرتبہ رات میں مسلمانوں کی دو جماعتیں نکلیں ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ مڈبھیڑ ہو گئی تو ہر ایک نے مشرکین کی جماعت سمجھ کر حملہ کر دیا اور فریقین میں سے کچھ مقتول و مجروح ہوئے مگر جب ہر جماعت نے اپنے اپنے شعار کو ظاہر کیا تو لڑائی بند ہو گئی۔

یہ تمام مصائب گذر رہے تھے اور دن رات دشمن کا مقابلہ علیحدہ بال بچوں گھر بار کی طرف سے بے اطمینانی و پریشانی جدا۔ بھوک پیاس کی تکلیف ان سب کے سوا۔ راتوں کی سردی کی سخت تکلیف اُنکے علاوہ آپنے یہ حالت دیکھ کر احزاب یعنی جماعت ہائے مشرکین کیلئے بددعا شروع کی تین روز تک متواتر دعا قنوت پڑھتے رہے اور مسلمانوں کو بھی دعا کی تلقین فرمائی۔ اور دعاء و تضرع الی اللہ ہی مسلمانوں کا سب سے بہتر سب سے زیادہ کامیاب و مؤثر ہتیار رہے۔ مگر مسلمان نہایت استقامت و استقلال سے جمع ہے کسی قسم کا گھبراہٹ اضطراب ظاہر نہیں کیا۔ نہ رحمت و نصرت خداوندی سے مایوس ہوئے۔ آخر تین روز کے بعد دعا مقبول ہوئی اور وقت آگیا کہ مسلمانوں کا خوف امن سے مبدل ہو جائے۔ دشمن جو محاصرہ کئے ہوئے تھے خائب و خاسر لوٹ جائیں اور یہ نصرت غیبی عجیب پیرایہ میں ظاہر ہوئی۔ ادھر تو جبرئیل علیہ السلام نے قبولیت دعا کی بشارت دی کہ مشرکین مکہ اور اُن کے مددگار و نیز سخت ہوا بھیجی جائیگی۔ ادھر نعیم ابن مسعود اشجعی جو قبائل مشرکین کا بڑا سرگروہ اور ممتاز و سربلند شخص تھا۔ رات کو چھپکر آپکی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ یارسول اللہ میرے دل میں اسلام کی عظمت و محبت گھر کر چکی ہے میں مسلمان ہو چکا ہوں میری قوم ابھی تک بیخبر ہے۔ آپنے فرمایا یہ بات ہے تو جس تدبیر سے ممکن ہو مشرکین میں باہم پھوٹ ڈلوا کر اُن میں اختلاف و بدمزگی پیدا کر دو نعیم نے عرض کیا اگر اس تدبیر میں مجھکو کوئی امر خلاف واقعہ بھی زبان سے نکالنا پڑے تو جائز ہو گا۔ آپنے فرمایا کچھ حرج نہیں ہے الحرب خدعۃ لڑائی حیلہ و تدبیر کا نام ہے۔

یہاں سے رخصت ہو کر نعیم سیدھا بنی قریظہ کے پاس پہنچا اُن سے گہرے تعلقات تھے اُنس و محبت ہمنشینی وغیرہ خصوصیات حاصل تھیں۔ وہاں گیا تو سب خوش ہو گئے مرحبا مرحبا

کہتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کھانے لائے نعیم نے کہا بھائی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں تو تمہاری دردمندی کی وجہ سے اس وقت آیا ہوں۔ اگر تم راز میں رکھو تو کہوں اور جو میرے نزدیک مناسب ہے رائے دوں۔ اُنہوں نے رازداری کا پورا عہد و پیمان کرلیا تو کہا۔ قریش مکہ اور تمہارا حال یکساں نہیں ہے قریش تو دوسرے گھر پر چڑھ کر آئے ہیں۔ کامیاب ہوگئے تو بہتر ورنہ صحیح و سالم اپنے ملک کو لوٹ جائیں گے جہاں اُن کو کسی کا اندیشہ نہیں ہے۔ برخلاف تمہارے کہ تمہارا وطن یہی ہے۔ تمہارے اہل و عیال مال متاع یہیں ہیں۔ تم نے قریش کا ساتھ کس بھروسہ پر دیا ہے۔ اگر قریش ناکام واپس ہوئے اور تمکو یہاں چھوڑ گئے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ تم اپنے مذہب کے دو قبیلوں بنی نضیر اور بنی قینقاع کا حال دیکھ چکے ہو وہ بھی تو تمہاری طرح مدینہ ہی میں رہتے تھے لیکن جب مسلمانوں نے اُن کو جلاوطن کیا تو عرب کا کونسا قبیلہ اُن کی مدد کو آیا تھا۔ قریش چلے گئے تو تمہارا مقابلہ مسلمانوں سے ہوگا وہ جو چاہیں گے تمہارے ساتھ کریں گے پھر تمنے کیا سوچکر کیا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ تم قریش سے پورا پورا عہد و پیمان لیلو اور اُن میں سے ستر اشراف کو بطور رہن کے لو قریظہ نے کہا ہم آپکے بہت مشکور ہیں۔ آپنے بالکل صحیح کہا اور نہایت مناسب رائے دی ہم ایسا ہی کرینگے۔ یہاں سے رخصت ہوکر نعیم قریش کے پاس پہنچے اور کہا تم جانتے ہو میرے تعلقات تمہارے ساتھ کیسے ہیں اور مجھکو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے کتنا بغض ہے۔ مجھے ایک خبر پہنچی ہے اگر تم اُس کا افشانہ کرو تو بیان کروں۔ میری محبت نے گوارا نہ کیا کہ میں اُس کے پہنچانے میں ذرا بھی دیر کرتا۔ قریش نے کہا ہرگز کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔ ضرور کہئے نعیم نے کہا سنو۔ بنی قریظہ نے تمہارا ساتھ دیا مسلمانوں کے ساتھ جو معاہدہ تھا اُسکو توڑ ڈالا مگر اب وہ نادم پشیمان ہیں۔ اور اس فکر میں ہیں کہ اُسکی تلافی کریں۔ اُنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیام بھیجا کہ اگر اپنے قصور کی مکافات کیلئے قریش و غطفان کے ستر شرفا کو قید کرکے آپکے پاس بھیجدیں اور عمر بھر آپ کے ساتھ مشرکین سے لڑتے رہیں تو آپ ہمارا قصور معاف کردیں گے اور ہمارے سابق عہدنامہ کو برقرار رکھیں گے۔ وہاں سے جواب آیا ایسا کروگے تو تمہارے سب جرائم معاف ہوجائیں گے نعیم نے کہا اگر یہود قریظہ تم سے رہن رکھنے کیلئے تمہارے اشراف کو طلب کریں تو ہرگز ایک شخص کو بھی نہ دینا۔

یہاں سے اُٹھ کر غطفان کے پاس پہنچے اور کہا تم تو میرا کنبہ اور برادری۔ دنیا بھر سے زیادہ مجھے محبوب ہو مجھے امید نہیں ہی کہ تم میری رائے کو متہم سمجھو گے۔ سب نے کہا بیشک ایسا ہی کہا پس تو یہ بات راز کی ہے کسی کو خبر نہو۔ اور پھر وہی گفتگو جو قریش سے کی تھی یہاں بھی کی اور نصیحت کی کہ کسی دھوکہ میں نہ آجائیں۔

اس کے بعد شنبہ کی شب میں ابوسفیان اور سرداران غطفان نے عکرمہ (رضی اللہ عنہ) کو معہ چند لوگوں کے بنی قریظہ کے پاس بھیجکر یہ پیام دیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم اپنے ملک و وطن میں نہیں ہیں سفر میں پڑے ہوئے ہر قسم کی تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔ اونٹ گھوڑے وغیرہ سب تباہ ہو گئے اب ڈھیل کا موقع نہیں ہے ایک قطعی اور فیصلہ کن حملہ کا وقت ہی۔ تم بھی تیار ہو جاؤ اور کل تم اندرونی جانب سے اور ہم بیرون حصہ سے حملہ کر کے قصہ کو ختم کر دیں۔ یہود نے جواب دیا کل تو سبت کا دن ہی اُس میں تو ہم لڑ نہیں سکتے۔ البتہ کسی اور دن کا تعین ہونا چاہیے لیکن جبتک تم ہمارے اطمینان کیلئے اپنے پچاس ستر معززین و شرفا کو بطور رہن نہ رکھدو ہم ہرگز تمہارے ساتھ ہو کر نہ لڑینگے۔ قریش و غطفان نے سُن کر کہا۔ بیشک نعیم درست کہتے تھے یہود کا یہ پیام قریش کو پہنچ گیا تو نعیم پھر بنی قریظہ کے پاس پہنچے اور کہا جب تمہارا پیام طلب رہن کیلئے پہنچا تھا تو میں ابوسفیان کے پاس تھا ابوسفیان نے یہ پیام سُن کر کہا کہ اگر بکری کا بچہ بھی وہ ہم سے طلب کرینگے تو ہم نہ دیں گے۔ فریقین کو نعیم کی گفتگو کی تصدیق ہو گئی اور آپس میں اختلاف ہو گیا ایک دوسرے سے بدظن ہو گیا حیی ابن اخطب جو سارے قصہ کا بانی مبانی تھا جو قریش و غطفان کو چڑھا کر لایا تھا۔ جس نے بنی قریظہ سے عہد شکنی کرائی تھی اُس کو پتہ لگا تو قریظہ پہنچا وہاں جا کر دیکھا تو وہ لوگ بالکل ڈھیلے تھے یہ کہتے تھے کہ قریش ہمارے پاس رہن نہ رکھیں گے تو ہم بھی ساتھ نہ دیں گے۔ یہ بدبخت بھی اب کچھ نہ بول سکا اپنا منہ لیکر چلا آیا۔ ادھر تو یہ نااتفاقی اور باہمی اختلاف و بددلی شروع ہوئی۔ اُدھر نہایت تیز و تند سرد ہوا چل پڑی جس نے ڈیرے خیمے اُکھاڑ کر پھینک دیئے۔ چولہوں پر سے ہنڈیاں اوندھی ہو گئیں۔ ایسی سخت پریشانی اور بددلی میں مجبوراً قریش و غطفان کو بجز نیک بینی و دوگوش بھاگنے کے چارہ ہی کچھ نہ تھا۔ ابوسفیان اس گھبراہٹ اور عجلت میں گھوڑے پر سوار ہوا کہ اُسکے پیر کی رسی بھی سوار ہو کر کھولی۔ مگر عکرمہ کے غیرت دلانے پر اُترا اور اونٹ کی

تکمیل پکڑ کر سب کے ساتھ مکہ کو روانہ ہو گیا اور اسطرح احزاب کے سخت ہولناک اور شدید ترین حملہ کا خاتمہ ہوا۔

قریش کے اس سب سے سخت حملہ میں بھی جس قدر کارنمایاں ہوئے سب دستہ سواران سے ہوئے جس کی کمان کبھی خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی کبھی اُن کے نائب کے۔

حدیبیہ کا واقعہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھلایا گیا تھا کہ آپ اور آپکے اصحاب مکہ معظمہ میں امن و سکون کی حالت میں داخل ہوئے بعض محلق یعنی سر کے بالوں کو منڈانے والے ہیں اور بعض مقصر یعنی بال کتروانے والے اور یہ کہ آپنے بیت اللہ کی کنجی لے لی ہے اور آپ نے وقوف عرفات بھی کیا ہے آپنے اس خواب کا تذکرہ صحابہ سے کیا تو سب بڑے انتہا مسرت تھی۔ اسکے بعد آپنے اسی سال عمرہ کا ارادہ کیا۔ صحابہؓ خوش ہو گئے کہ خواب کی تعبیر یہی ہو گی۔ اسی سفر میں سب امور کا جو آپ کو دکھلائے گئے ہیں ظہور ہو جائیگا۔ آپ نے مسلمان قبائل عرب مثل اسلم۔ غفار۔ مزینہ۔ جہینہ کو بھی اس عزم کی اطلاع فرمائی اور یہ کہ وہ بھی شریک ہوں بہت سے قبائل تو شریک ہوئے اور بعض نے خیال کیا۔ جن لوگوں نے خاص آپکے مرکز (مدینہ) پر چڑھائی کر کے استیصال کا ارادہ کیا ہو۔ اُنسے اسکی کیا توقع ہو سکتی ہے کہ مکہ میں کیا گھسنے دینگے۔ اور بلا لڑے بھڑے راستہ چھوڑ دیں گے اور اس بنا پر ادھر اُدھر کے عذر کر کے بیٹھ رہے۔ کلام اللہ میں اُن لوگونکی تکذیب ان آیات میں نازل ہوئی۔

یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم ۔ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو دلوں میں نہیں ہے۔

آپ نے اس سفر میں شروع ہی سے ایسا انداز اختیار کیا کہ مشرکین مکہ یا کسی اور کو یہ واہمہ بھی نہ ہو کہ آپ کا قصد محاربہ کا ہے چنانچہ ذی الحلیفہ سے جو مدینہ سے چند میل ہے احرام باندھا ستر اونٹ ہدی کیلئے ساتھ لئے اُنکے گلے میں قلادے ڈالدیے۔ یہ ایسی علامت تھی کہ عرب کے تمام افراد اُسکو جانتے تھے کوئی شخص بھی محرم کو اور ہدی کو دیکھ کر یہ وہم نہ کر سکتا تھا کہ ان لوگوں کا ارادہ قتل و قتال کا ہے۔ اگرچہ آپکے ہمراہ دو سو گھوڑے تھے جو اس سے قبل کسی معرکۂ قتال میں کبھی نہیں ہوئے۔ مگر آپ نے سامان حرب ساتھ رکھنے کی ممانعت فرمادی تھی۔ صرف اپنی حفاظت کیلئے تلواروں کو ساتھ لیا تھا۔

آپنے ایک شخص کو بغرض تجسس احوال مکہ بھیجا۔ اُس نے خبر دی کہ قریش نے آپکی خبر سُن کر لڑائی کی تیاری کر لی ہے اُن کے ہمخیال قبائل بھی تیار ہیں۔

آپ جس ارادہ سے تشریف لیجاتے تھے اُس کا اظہار اعلان کیساتھ کر دیا تھا۔ آپ کے صدق
اور وفا کو بچہ بچہ تسلیم کرتا تھا۔ مگر قریش پھر بھی اپنے خیال سے باز نہ آئے خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی زیر
کمان ایک دستہ سواران کراع نعیم پر مقابلہ کیلئے آموجود ہوا ادھر سے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
بھی وہاں پہنچ گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ آپنے معہ تمام صحابہ نماز ادا کی۔ خالد بن الولید رضی اللہ نے
کہا کہ ہمیں اچھا موقع حملہ کا تھا۔ مگر اب دوسری نماز کا وقت آئیگا جو اُن کو اپنی جان و مال سے زیادہ عزیز ہے
اُس وقت اسکی تلافی کرینگے۔ اُن کے اس خیال کی اطلاع بذریعہ وحی آپ کو ہو گئی۔ اور صلوٰۃ خوف
پڑھنے کا حکم ہو گیا۔ نماز عصر کبوقت آپنے صلوٰۃ ادا کی۔ ایک جماعت آپکے ساتھ رکوع و سجدہ کرتی تھی
تو دوسری خالد رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں قائم رہتی تھی۔ مشرکین نے یہ دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہمارے قصد کی
اطلاع اُن کو ہو چکی ہے۔ غرض مشرکین باوجود اس اعلان کے کہ آپ محض عمرہ کیلئے تشریف لائے ہیں اپنے
ارادہ سے باز نہ آئے اور اس قسم کی جانبازی اور تہورانہ شجاعت اور سرانجام تدابیر حرب کیلئے حضرت خالد
سے زیادہ کوئی شخص اُن میں نہ تھا۔ فوج سواران کے سپہ سالار بھی وہی تھے۔ وہی اس اہم خدمت کے سرانجام
کیلئے مامور ہوئے۔ مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عزم فرما چکے تھے آپ کا ارادہ نہ تھا کہ بلا
نہایت سخت مجبوری کے تلوار میان سے نکالیں اس وقت آپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے
مشورہ کیا۔ کہ قریش ہم کو عمرہ و طواف سے روکنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کیا کہ ہم محض عمرہ
و طواف کیلئے جاتے ہیں لڑائی کا بالکل قصد نہیں۔ لیکن اگر کوئی ہم کو مکہ میں داخل ہونے طواف کرنیسے
مانع آویگا تو ضرور مقابلہ کریں گے۔ اسی طرح اور صحابہ نے بھی استقلال و عزم راسخ کا ثبوت دیا۔ آپنے
فرمایا افسوس ہے قریش کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ لڑائیوں نے اُن کو ضعیف و بودا بنا دیا ہے پھر بھی وہ اپنی ضد
اور ہٹ پر قائم ہیں۔ اُن کا کیا حرج تھا اگر وہ مجھے اور تمام عرب کو چھوڑ کر خود علیحدہ رہتے اگر میں سب پر غالب آتا
تو وہ بھی اپنی پوری قوۃ اور کثرت کیساتھ اسلام میں داخل ہو جاتے یا مغلوب ہوتا تو پھر میرا مقابلہ اپنی پوری جمعیت
سے کرتے۔ قریش کیا گمان کرتے ہیں میں تبلیغ دین الٰہی سے باز رہوں گا ہرگز نہیں جب تک یہ گردن ہرگز نہیں رک
سکتا۔ اس کے بعد آپنے خالد بن الولید سے پہلو بچا کر نکل جانے کیلئے ارشاد فرمایا۔ کوئی شخص ایسا وقف

بکار ہے جو ہمکو خالد سے بچاکر دوسرے راستے سے لیچلے۔ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا میں لیچلوں گا وہ آپ کو نہایت سخت دشوار گذار راستے سے لیگیا حضرت خالد کو اُس وقت خبر ہوئی جب آپ منزل پر پہنچکر خیمہ زن ہو گئے۔ اور جب اُنہوں نے جاکر قریش سے یہ حال بیان کیا۔ آپ نے اس منزل پر صحابہ کو حکم دیا کہ اُس رستہ سے چلیں جس سے حدیبیہ پر جا اُتریں جب اُس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے حدیبیہ کے میدان میں داخل ہونا تھا۔ آپ کی ناقہ چلتے چلتے بیٹھ گئی۔ ہر چند اُٹھانا چاہا مگر نہ اُٹھی۔ لوگوں نے کہا تھک گئی ہے آپنے فرمایا ہرگز نہیں اُس کو خدا تعالیٰ نے روکا ہے۔ یعنی منشار خداوندی یہی ہے کہ میں اس وقت بزور قوت مکہ میں داخل نہوں۔ پھر فرمایا کہ مجھ کو قریش جس کسی ایسے امر کی طرف بلائیں گے جس میں بیت اللہ کی حرمت وعظمت اور اُنکی صلہ رحمی ہوتی ہو۔ قبول کرونگا۔ یہ سُنتے ہی ناقہ کھڑی ہو گئی۔

حدیبیہ کے حالات وواقعات بہت طویل ہیں اُن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ مگر خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین نے ہرگز کسی پہلو سے آپ کو اجازت طواف ودخول مکہ کی نہ دی۔ آپنے اُن کی سخت سی سخت شرائط کو قبول فرماکر صلح کرلی اور حدیبیہ میں ہی قربانیاں ذبح کر کے حلال ہو گئے۔ صحابہ پر یہ امر نہایت شاق گذرا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ خواب کی تعبیر کے موافق اسی سال مکہ میں باطمینان داخل ہوکر طواف کرینگے یہاں معاملہ برعکس پیش آیا۔ صحابہ کے غم وغصہ کی انتہا نہ تھی۔ ادھر تو خواب کی تعبیر پورا نہ ہونیکا صدمہ۔ ادھر مسلمان ہوکر ایسے کڑے شرائط کو مان کر صلح کرلینا۔ مگر آپنے اُن کو تسلی دی۔ یہ فرمایا کہ خواب سچا ہے اُس کی تعبیر پوری ہوکر رہیگی۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال مکہ میں داخل ہونگے۔ اسکے بعد سورۂ فتح نازل ہوئی اور آیات ذیل میں خواب کی تعدیق فرمادی گئی۔

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا	(اللہ نے سچ دکھایا اپنے رسول کو خواب تحقیق کہ تم
بالحق لتدخلن المسجد الحرام	داخل ہوگئے ادب والی مسجد میں اگر اللہ نے چاہا
انشاء اللہ امنین محلقین رؤسکم و	چین سے بال منڈاتے اپنے سروں کے اور کترتے
مقصرین لا تخافون فعلم مالم تعلموا	بے خطر پھر جانا جو تم نہیں جانتے۔ پھر ٹھیرادی اس سے
فجعل من دون ذالک فتحا قریبا۔	ورے ایک فتح نزدیک۔

حصّہ دوم زمانۂ اسلام تا وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا

وہی سپہ سالار اعظم اور وہی قریش مکہ کا معتمد علیہ خاص دلیر و جانباز اب اُسکے مسلمان ہونے کا وقت آگیا جس کی ابتدا اس طرح ہوئی۔

خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی ولید بن الولید بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ قیدی ہوگئے تھے۔ عبداللہ بن جحش نے اُن کو قید کیا تھا۔ جب یہ فیصلہ ہوگیا کہ معاوضہ لیکر قیدیوں کو رہا کر دیا جائے توخالد اور اُن کے حقیقی بھائی ہشام بن الولید۔ ولید کو چھڑانے کیلئے مدینہ آئے عبداللہ بن جحش نے چار ہزار درہم زر معاوضہ طلب کیا۔ خالد نے انکار کیا ہشام نے کہا اگر ولید تمہارے حقیقی بھائی ہوتے تو تم اس قدر معاوضہ دینے سے انکار نہ کرتے ہیں تو جو کچھ بھی طلب کیا جائیگا دوں گا۔ غرض ولید کو چھڑا کر مکہ لیگئے۔ ولیدؓ ہاں پہنچکر مسلمان ہو گئے۔ لوگوں نے کہا تم وہیں کیوں نہ مسلمان ہوئے۔ زر معاوضہ دلوا کر اور ہم کو ذلیل بنا کر کیوں مسلمان ہوئے۔ ولید نے کہا کہ اگر میں وہاں مسلمان ہو جاتا۔ تو میرا اسلام اس پر محمول ہوتا کہ میں قید کی تکلیف سے گھبرا گیا۔ یہ امر گوارا نہ تھا کہ اسلام جیسی دولت بجائے رغبت و محبت کے کسی دنیوی غرض کی وجہ سے حاصل کرتا۔

ولید کو قید خانہ میں ڈالدیا گیا۔ مگر وہ کچھ عرصہ بعد قید خانہ سے بھاگ کر مدینہ منورہ حاضر ہو گئے اور عمرة القضا میں جو صلح حدیبیہ سے اگلے سال ہوا تھا۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمرکاب مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

قریش مکہ نے صلح حدیبیہ میں آپ کو سال آیندہ عمرہ کی اجازت دی تھی اور یہ شرط کرلی تھی کہ ہم بیت اللہ اور مطاف کو آپ کیلئے خالی کردیں گے۔ آپ تین روز سے زیادہ وہاں نہ ٹھیریں گے۔ لیکن جو لوگ ہم میں سے مکہ میں رہنا چاہیں مسلمان اُن سے تعرض نہ کریں اُن کو نہ ستائیں۔

اس معاہدہ کی بنا پر قریش مکہ آزاد تھے۔ کہ چاہیں ان ایام میں کے اندر خاص مکہ میں رہیں یا باہر چلے جائیں۔ بہت سے تو چلے گئے اور بہت سے وہاں رہے۔ خالد بن الولید بھی اُنہیں لوگوں میں سے تھے۔

جو فرار ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ اسلام کی حقانیت اُن کے دل میں اثر کر چکی تھی۔ مگر اپنے خیال پر قائم تھے ان گوارا نہ تھا کہ آپ سے سامنا ہو۔ یا کسی مسلمان کو مکہ کی گلیوں میں پھرتا۔ یا بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھ سکیں۔ اگرچہ حضرت خالد کے اسلام کے بارہ میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ بعد صلح حدیبیہ عمرۃ القضاء سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر میں اُسی پہلی روایت کی بنا پر واقعات کو لکھتا ہوں۔

حضرت خالد بن الولید اپنے اسلام کی ابتدا یوں بیان فرماتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے خود بخود عقل آئی اور میرے دل میں تجسس پیدا ہوا میں نے سوچا کہ میں نے آپ کے مقابلہ میں بڑی بڑی شدید معرکہ آرائیاں کی ہیں لیکن جب کسی معرکہ سے واپس آیا ہوں تو میرے دل میں یہ آیا ہے کہ تو نے اپنی شجاعت و مردانگی تدبیر و فرزانگی کو بے موقع صرف کیا ہے ان خیالات سے میرے دل میں اسلام کی عظمت و محبت شرک سے یکسوئی تو ہوئی دل میں قابلیت قبول اسلام پیدا ہوئی مگر اپنے عزم پر قائم و راسخ تھا۔

عمرۃ القضاء کے وقت میں بھی مکہ چھوڑ کر روپوش ہو گیا۔ میرا بھائی ولید بھی آپکے ہمرکاب تھا اُس نے مجھے تلاش کیا تو میں نہ ملا۔ تب اُس نے مجھے خط لکھا۔ کہ مجھے اس سے زیادہ کوئی عجیب بات معلوم نہیں ہوتی کہ تم جیسا دانشمند آدمی اسلام جیسی چیز سے متنفر ہو اُسکی حقیقت نہ سمجھے اسلام ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی ذی عقل اُس سے بےخبر رہے۔ یا اُس کی طرف مائل نہ ہو۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تمہارا حال دریافت کیا تھا میں نے عرض کر دیا خدا تعالیٰ اُس کو آپکی خدمت میں لے آئیگا آپ نے ارشاد فرمایا کہ خالد ایسا شخص نہیں ہے جو اسلام سے جاہل اور بےخبر رہے۔ اگر وہ اپنی شجاعت و دلیری کو مسلمانوں کی امداد میں استعمال کرتے۔ تو اُن کیلئے بہتر ہوتا۔ اور ہم ان کو اوروں سے ان معاملات میں مقدم کرتے۔ ولید نے یہ بھی لکھا کہ اب بھی تم تلافی مکافات کرو بہت سے عمدہ مواقع خدمت اسلام کے کھو چکے ہو۔

حضرت خالد فرماتے ہیں کہ دل میں اسلام کی محبت تو جم ہی چکی تھی۔ اس خط نے میرے اندر اور تحریک پیدا کر دی اور جو خیالات انقباض یا شرم و حیا مجھکو روکتے تھے وہ زائل ہو کر بجائے اُن کے انشراح

ونشاط پیدا ہو گیا۔ اس درمیان ہی میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں نہایت تنگ و تاریک خشک و قحط ناک آبادیوں میں سے نکل کر سرسبز و شاداب وسیع و پرفضا شہروں میں پہنچ گیا ہوں۔ جب یہ عزم پختہ ہو گیا اور میں نے مکہ سے مدینہ جانے کا تہیہ کر لیا۔ تو صفوان سے میری ملاقات ہوئی میں نے کہا بھائی تم دیکھتے نہیں کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) عرب و عجم پر غالب آ گئے کیا اچھا ہو تا کہ ہم بھی ان کی خدمت میں پہنچکر اتباع کرتے صفوان نے کہا بھائی میرے سوا ساری دنیا مسلمان ہو جائے اور میں تنہا رہ جاؤں جب بھی اُن کا اتباع نہ کروں گا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اس شخص کے باپ اور بھائی بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو چکے ہیں۔ اسکے دل میں غم و غصہ عداوت، بغض و حسد، کینہ اور جوش انتقام باقی ہیں پھر عکرمہ ابن ابی جہل سے ملے اُن سے بھی وہی تقریر کی جو صفوان سے کی تھی اُنہوں نے بھی وہی جواب دیا جو صفوان نے دیا تھا۔ میں نے کہا خیر مگر تم اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ پھر میری ملاقات عثمان بن طلحہ سے ہوئی۔ وہ میرے دوست تھے دلمیں آئی کہ اُن سے بھی وہ مضمون کہوں۔ پھر خیال کیا کہ اس کا باپ چچا تین بھائی اُحد میں مسلمان قتل کر چکے ہیں۔ اُس سے کہنے میں کیا فائدہ۔ مگر میں نے کہا ذکر کر دینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے اُن سے سب حال بیان کیا۔ یہ بھی کہا کہ ہمارا حال لومڑی کا سا ہے اگر اس کے سوراخ میں چند ڈول بھی ڈال دیے جائیں تو وہ فوراً اندر سے باہر نکل آئے۔ میں نے صفوان و عکرمہ کی گفتگو بھی نقل کر دی لیکن عثمان نے فوراً میری بات کو مان لیا اور یہ ٹھہر گئی کہ فلاں مقام پر مل جائیں گے۔ صبح ہونے سے پہلے وہ مجھ سے آکر مل گئے اور ہم جانب مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب ہم ہدہ (جگہ کا نام ہے) پر پہنچے تو وہاں عمرو بن العاص سے ملاقات ہو گئی عمرو نے دیکھتے ہی کہا۔ ابو سلیمان (حضرت خالد کی کنیت ہے) کہاں کا ارادہ کیا۔ میں نے کہا بات واضح ہو گئی۔ ثابت ہو گیا کہ آپ نبی ہیں۔ پھر کبتک ہم ہٹ کرتے رہیں گے۔ میں تو اس لئے جاتا ہوں کہ مسلمان ہو جاؤں۔ عمرو نے کہا میں بھی اس ارادہ سے جاتا ہوں۔ ہم تینوں ساتھ ہو کر مدینے پہنچے آپ کو ہماری اطلاع پہنچی تو بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو تمہاری طرف پھینک دیا ہے۔ ہم نے اونٹ بٹھلا کر اپنے کپڑے بدلے اور آپکی خدمت میں روانہ ہوئے۔ راستہ میں میرے بھائی

ولید ملے انہوں نے کہا آپ منتظر ہیں۔ ہم جلدی جلدی چل کر خدمت مبارک میں پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میرے اوپر پڑی تو برابر تبسم فرماتے رہے۔ میں نے پہنچتے ہی سلام عرض کیا۔ نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ میں نے کلمہ شہادت پڑھا۔ آپنے فرمایا خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے تم کو ہدایت فرمائی۔ میں تمہارے اندر وہ فرزانگی پاتا تھا جس سے مجھے توقع تھی کہ وہ تمکو خیر کیطرف پہنچا دیگی۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جن معرکوں میں آپکے مقابلہ پر آیا ہوں اُنکی مغفرت کی دعا فرمادیجئے ارشاد فرمایا اسلام سب پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ میرے بعد عمرو و عثمان مسلمان ہو گئے۔

حضرت خالد بن الولید کی مسلمان ہو جانیکی توقع آپ کو لگی ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ کیسی کیسی نمایاں خدمات اسلام کی اُن کے ہاتھ سے ہونگی مسلمان ہونیکے بعد آپنے اُن کی اُس اقتدار وعظمت کو جو مکہ میں حاصل تھا قائم رکھا۔ معرکہائے جنگ میں اُنکی تدابیر سے کام لیا جاتا تھا اور مسلمانوں کی فوج سواروں کی کمان اُنکے سپرد کردی گئی۔ حضرت عمرو بن العاص بھی جو اُسی وقت حضرت خالد کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے وہ فرماتے ہیں کہ اُسی وقت سے معاملات حرب و معرکہ آرائی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اور خالد بن الولید کو مشورہ میں مقدم فرماتے تھے اور اس قسم کی تدابیر میں ہماری رائے قابل توجہ سمجھی جاتی تھی۔

زمانہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں حضرت خالد کے کارنامے

مسلمان ہو جانیکے بعد حضرت خالد نے اسلام کی خدمات اُسی جانفشانی جدوجہد عرقریزی و جان نثاری سے کیں جیسی کہ اُنکی جبلی شجاعت و دلیری شرافت خاندانی اور سربلندی و امتیاز کا مقتضی تھا۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اُن کوششوں کا مبنیٰ اگر قومی غیرت اور فقط نام و نمود تھا تو اب اسلام کی محبت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خداوند عالم جل مجدہ کی رضا محرک تھی اسکے علاوہ اُن کو اپنے بے سود و مضر مساعی کی تلافی بھی کرنی تھی۔

غزوہ موتہ

سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عظیم الشان وہولناک معرکہ موتہ کا تھا جس میں کہ حضرت خالد نے شریک ہو کر اپنے تفوق و امتیاز کو ثابت کر کے سیف من سیوف اللہ کا درخشاں خطاب بارگاہ رسالت پناہ سے حاصل کیا۔

موتہ ملک شام میں ایک مقام ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث بن عمیہ ازدی کو ایک خط دیکر روم وشام کے بادشاہ ہرقل کے پاس بھیجا تھا۔ شرجیل بن عمرو الغسانی شام میں ہرقل کا گورنر و نائب السلطنت تھا۔ حارث جب موتہ پہنچے تو شرجیل کو معلوم ہو گیا اُس نے حارث سے پوچھا شاید تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قاصد و سفیر ہو کہا ہاں شرجیل نے اُن کو قتل کر دیا۔ اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے سفیر و قاصد تھے جو قتل کئے گئے آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت شاق گذرا۔ آپ نے تین ہزار مسلمانوں کی ایک جمعیت کو ملک روم کے مقابلہ کیلئے تیاری کا حکم دیا۔ زید ابن حارثہ امیر لشکر مقرر کیے گئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر ابن ابی طالب امیر بنا دیے جائیں۔ جعفر شہید ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ یہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جن کو پسند کریں امیر بنائیں۔ ایک یہودی بھی اس مجلس میں موجود تھا اُس نے کہا اگر آپ نبی ہیں تو سب شہید ہوں گے۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں جب کبھی اُن کے نبی نے ایسا کہا ہے تو سب کے سب شہید ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہودی نے زید بن حارثہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا تم کو جو وصیت کرنی ہے کر دو اب تم کو مدینہ آنا نصیب نہ ہوگا آپ نے ثنیۃ الوداع پر اس لشکر کو رخصت کیا اور چند نصیحتیں فرمائیں منجملہ اُن کے یہ بھی تھیں کہ تم کو کچھ لوگ کلیساؤں میں ملیں گے اُن کو قتل نہ کرنا۔ کسی لڑکے بچے عورت بوڑھے اور بیمار کو بھی قتل نہ کرنا۔ یہ لشکر روانہ ہو کر شام کی حدود میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ملک روم نے اُنکے مقابلہ کیلئے ایک لاکھ فوج جمع کی ہے۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہی کہ ایک لاکھ کے علاوہ عرب متنصرہ دوہ قبائل عرب جنھوں نے دین عیسائی قبول کر لیا تھا) میں سے ایک لاکھ اور ہیں۔ غرض تین ہزار کی قلیل جماعت کا مقابلہ ایک لاکھ یا دو لاکھ سے تھا۔ دشمن کی کثرت اور اپنی قلت۔ اُنکے سامان حرب اور اپنی بے سامانی کو دیکھ کر مسلمانوں کو تردد ہوا۔ باہمی مشورہ ہوا بعض کی رائے ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا جائے۔ اور جواب آنے تک کچھ نہ کیا جائے۔ عبد اللہ بن رواحہ نے فرمایا تردد کی کیا بات ہی جس بات سے تم گھبراتے ہو اُسی کی طلب میں تو نکلے ہو ہم نے تو کبھی اپنی کثرت عدد

اور سامان پر بھروسہ کر کے مقابلہ نہیں کیا۔ ہم تو اس دین حق کیلئے لڑتے ہیں۔ آخر مقابلہ کی ٹھہر گئی
موتہ کے مقام پر فریقین کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو موتہ میں داخل ہونے سے منع فرمایا تھا مسلمان بھی اس عزم پر راسخ تھے
کہ موتہ میں داخل نہوں گے مگر اثنا سیر میں دھوند کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا اور مقام موتہ پہنچ گئے
وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

زید بن حارثہ علم اسلام لیکر آگے بڑھے اور شہید ہو گئے جعفر نے علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اٹھالیا اور داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اب عبداللہ بن رواحہ کا نمبر آیا انہوں نے بھی
اپنے دو رفیقوں کی پوری تقلید کر کے انہی کا ساتھ دیا۔ یہ وقت تھا کہ دونوں لشکر باہم مل گئے تھے
اور گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی اس وقت لشکر اسلام کے بلا سردار رہجانے اور دشمن کے بے انتہا
ہجوم سے قریب تھا کہ بعض مسلمانوں کے پیر اکھڑ جاتے اس وقت ثابت بن ارقم نے علم کو بلند کر کے
مسلمانوں سے کہا کہ کسی ایک شخص کا انتخاب کر کے اس کے سپرد کر دیا جائے۔ لوگوں نے کہا آپ ہی
اسکے لئے موزوں ہیں کہا نہیں۔ آخر خالد رضی اللہ پر اتفاق ہو گیا حضرت خالد نے علم اٹھا کر مدافعانہ
طرز اختیار کیا اور اس روز شام تک اسی انداز سے مقابلہ کیا شام کو بلا کسی ہزیمت و شکست کے دونوں لشکر
اپنے اپنے خیمہ گاہ کو واپس ہو گئے۔ اگلے دن حضرت خالد نے اپنی دانشمندی سے لشکر کی ترتیب بدل دی
میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ کر کے برسر مقابلہ ہوئے لشکر روم نے یہ دیکھ کر سمجھا کہ مسلمانوں کیلئے تازہ
امداد آگئی ہے۔ ان پر رعب طاری ہو گیا میدان سے بھاگ نکلے اور اس حالت میں ہزاروں کھیت رہے
یہ معرکہ سات روز تک رہا حضرت خالد فرماتے ہیں کہ موتہ کے معرکہ میں نو تلواریں میرے ہاتھ میں ٹوٹ
گئیں۔ کوئی تلوار نہیں ٹھہرتی تھی۔ آخر ایک یمانی تلوار میرے ہاتھ میں ٹھہری۔ یہاں تو یہ معرکہ ہو رہا
تھا اور مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر میدان جنگ اور معرکہ قتل کا نقشہ سامنے ہو گیا
تھا۔ آپ نے صحابہ کو بترتیب مذکور تینوں سرداروں کے حملے اور شہادت کی خبر سنادی۔ اور فرمایا
ان سب کے بعد خالد بن الولید نے جھنڈا ہاتھ میں لیا گو امراء معینہ میں سے نہ تھے۔ مگر خود امیر بن گئے

وہ ایک تلوار ہیں۔ خدا تعالیٰ کی تلواروں میں سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ پر فتح فرما دی۔
یہ پہلا دن ہے جبکہ آپ کو سیف من سیوف اللہ کا خطاب ملا۔ اُسکے بعد سے آجتک وہ اسی
لقب وخطاب سے پکارے جاتے ہیں۔

فتح مکہ مکرمہ

اسی سال جبکہ موتہ میں حضرت خالد کو سیف من سیوف اللہ کا خطاب ملا۔ فتح مکہ مکرمہ کا
عظیم الشان واقعہ ہوا اس وقت اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ مقابلہ وقتال کا نہ تھا مگر
قریش کے انداز وحرکات ایسے نہ تھے کہ آپ مامون ومطمئن ہو جاتے اور اسی بناء پر درگاہ خداوندی
سے آپ کو ایک دن کی چند ساعات کیلئے اجازت قتال ملگئی تھی۔ آپکے ہمراہ دسھزار کی جمعیت تھی
جسمیں مہاجرین وانصار کے علاوہ عرب کے مسلمان قبائل بھی شریک تھے۔ ہر قبیلہ کا سردار اور
ان کا علم جدا گانہ تھا۔ اس وقت میمنہ ومیسرہ کے دو بڑے حصوں میں سے ایک کی کمان حضرت
خالد کی سپردگی میں تھی اور اُن کو حکم تھا کہ نیچے کی جانب سے مکہ میں داخل ہو جائیں اور تاوقتیکہ اہل
مکہ کی طرف سے خود ابتداء قتال نہو اپنی طرف سے کسی پر حملہ نہ کریں حضرت خالد نے حسب ارشاد داخل
ہونا چاہا۔ تو قریش کے چند اشرف نے جن میں عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ بھی تھے مع ایک
جماعت کے اُنکی مزاحمت کی۔ حضرت خالد نے حملہ کر کے اُن کو ہٹا دیا۔ اس موقعہ پر مشرکین میں سے
چند آدمی مقتول ہوئے۔ باقی بھاگ نکلے اس جماعت میں ایک شخص تھا۔ جو اس سے قبل ایک روز
تیر بنا رہا تھا۔ اسکی بیوی نے کہا کیا کروگے۔ کہا میں نے سُنا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ پر چڑھائی کا
ارادہ کر رہے ہیں اُن کے مقابلہ کی تیاری کر رہا ہوں تمہیں بھی اُن کے ساتھیوں میں سے ایک قیدی لاکر
دوں گا۔ بیوی نے کہا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر سر چھپانے کی
جگہ تلاش کرتے پھروگے۔ یہ شخص جب حضرت خالد کے مقابلہ سے بھاگا۔ تو بیوی سے کہا کوئی چھپنے کی
جگہ ہے۔ اُس نے کہا میرا خادم کہاں ہے مرد نے کہا اس مذاق کو چھوڑ مجھے جگہ بتا دے اور پھر یہ شعر پڑھے۔

انک لو شهدت یوم الخندمہ ۔۔۔ اذ فر صفوان و فر عکرمہ

تو اگر چند دن مقام پر مقابلہ ہوا تھا کے دن موجود ہوتی ۔۔۔ جبکہ صفوان اور عکرمہ بھاگ کھڑے ہوئے

واستقبلتنا بالسیوف المسلمة — یقطعن کل ساعد وجمجمة

اور مسلمان ہمارے مقابل تلواریں لیکر آگئے — کاٹتی تھی وہ تلواریں پہنچوں اور کھوپریونکو

ضرباً فلا تسمع الا غمغمة — لھم نہیب حولنا وھمھمة

مسلمان اس طور سے مارتے تھے کہ سوائے گنگناہٹ کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا — ہمارے گرد انکے سانس اور سینہ کی خوفناک آوازیں تھیں

لا تنطقی فی اللوم ادنی کلمة

ایسی حالت میں ملامت و طعن کا ذرا سا کلمہ منہ سے بھی نہ نکال

فتح مکہ میں اس قدر معرکہ و خونریزی بھی بالکل آپ کے خلاف منشا تھی مگر چونکہ اسکی بادی خود اہل مکہ تھے اور حضرت خالد مجبور تھے اس وجہ سے آپنے اُن کو کچھ نہیں کہا اور سکوت فرمایا۔

حنین میں حضرت خالد کی جان نثاری

حنین کا وہ عظیم الشان معرکہ ہے جو فتح مکہ معظمہ کے بعد پیش آیا جس میں مسلمانوں کو جبکہ وہ اخیر رات میں منزل طے کر رہے تھے مشرکین کے کمین گاہ سے نکل کر اچانک حملہ کر دینے سے عارضی ہزیمت ہو گئی تھی حضرت خالد نے نہایت بیجگری سے داد شجاعت دی تھی۔ اس معرکہ میں آپ سخت زخمی ہو گئے تھے جب معرکہ ختم ہو گیا۔ اور اُن کے سخت مجروح ہونیکا حال معلوم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اُنکی قیامگاہ پر تشریف لیگئے حضرت خالد زخموں سے چور سہارا لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اُٹھنے کی طاقت نہ تھی آپ نے اُن کے زخموں پر لب مبارک لگا دیا جس سے وہ بالکل چنگے ہو گئے اور زخم کی تکلیف باقی نہ رہی۔

عزیٰ کے گرانے کیلئے حضرت خالد کا مامور ہونا

عمرو بن لحی نے جب مکہ میں بت پرستی کی بنیاد ڈالی تب ایک لات اور ایک عزیٰ بھی اُس نے قائم کر کے عرب کو اُن کی عبادت کی طرف جھکا دیا۔ خانہ کعبہ کی عظمت تو تمام عرب کے قلوب میں مرکوز تھی ہی۔ مگر ان دونوں بتونکی عظمت بھی کچھ کم نہ تھی۔ ان پر بھی ایسے ہی چڑھاوے چڑھتے تھے۔ جیسے خانہ کعبہ پر۔ عمرو بن لحی نے اُن کو یہ سمجھا دیا تھا کہ خدا تعالیٰ جاڑے کا موسم تو لات میں بسر کرتا ہے۔ لات کا صدر مقام طائف میں تھا اور گرمی کا زمانہ عزیٰ میں گذارتا ہے۔ اس باطل خیال نے جو اُن کے پیشرو مقتدا نے جما دیا تھا عرب کے دل دونوں بتونکی

عظمت و محبت سے معمور و لبریز تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ سے فارغ ہو چکے تو تیس سواروں کے ساتھ حضرت خالد کو اسکو گرا دینے اور برباد کر دینے کیلئے مامور فرمایا۔ حضرت خالد اُس کو گرا کر اور مسمار کر کے واپس آئے تو آپنے دریافت فرمایا۔ تم نے وہاں کچھ دیکھا بھی۔ عرض کیا کچھ نہیں۔ فرمایا تو پھر جاؤ۔ حضرت خالدؓ غصہ میں بھرے ہوئے تلوار سونتے ہوئے اس مقام پر پہنچے۔ تو اُس جگہ سے ایک عورت برہنہ سیاہ اور پراگندہ بال سر پر خاک ڈالتی ہوئی نکلی۔ مجاوروں نے چلا کر کہنا شروع کیا۔ عزیٰ توان کو کانا کر دے۔ اُن کے حواس میں خلل ڈالدے۔ حضرت خالد نے ایک تلوار مار کر نصف نصف کر کے دو ٹکڑے کر دئے اور فرمایا۔

إني رأيت الله قد أهانك	يا عزّ كفرانك لا سبحانك
میں دیکھتا ہوں خدا نے تجھکو ذلیل و خوار کیا ہے	عزیٰ میں تیرا کفران کرتا ہوں سبحانک نہیں کہتا

واپس ہو کر یہ ماجرا خدمت اقدس میں سُنایا تو فرمایا عزیٰ یہی تھی۔

فائدہ۔ اس واقعہ اور مشرکین عرب کے تمام حالات اُن کے عقائد و تمام معاملات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی باوجود مشرک و بت پرست ہونیکے معبود حقیقی۔ خالق سموات وارضین صرف خدا ہی کو سمجھتے تھے۔

اگر تم اُن سے پوچھو گے آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو جواب دیں گے اللہ نے۔	ولئن سألتهم من خلق السموات والارض ليقولن الله

اپنے اصنام کو نہ خالق سمجھتے تھے نہ مالک و مستقل با اختیار۔ اُن کے عارضی اختیارات کے قائل تھے اور معبود حقیقی کا مظہر جان کر تعظیم مفرط میں مبتلا تھے اور اسی بنا پر مشرک ہو گئے اور اسی شرک کی بیخ کنی کیلئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ یہی تعظیم مفرط ہے جس کا انجام شرک ہو جاتا ہے

بنی حذیمہ عرب کا ایک قبیلہ تھا جو درحقیقت مسلمان ہو چکا تھا۔ مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اُن کے مسلمان ہونیکی اطلاع نہ پہنچی تھی	حضرت خالد کا بنی حذیمہ کیطرف بھیجا جانا

یہ قبیلہ بہت ہی شریر و فسادی تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کو لعقۃ الدم کہا جاتا تھا۔ حضرت خالدؓ کے ساتھ تین سو پچاس مہاجرینؓ انصار اور قبیلہ بنی سلیم کی جمعیت تھی۔ زمانہ جاہلیت میں بنی جذیمہ نے حضرت خالد کے چچا فاکہ بن مغیرہ اور فاکہ کے ایک بھائی کو قتل کیا تھا۔ قبیلہ سلیم میں سے مالک بن الشرید اور اُسکے دو بھائیوں کو بھی ایک ہی جگہ قتل کیا تھا بنی جذیمہ نے یہ دیکھا کہ ہمارے لئے خالد بن الولید مع بنی سلیم کے بھیجے گئے ہیں۔ تو اُن کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہ ہم سے پُرانی عداوت نکالیں گے وہ بھی ہتھیار لگاکر تیار ہو گئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر امیر لشکر کو جب وہ کسی قوم پر بھیجے جاتے تھے عام حکم ہوتا تھا کہ اول یہ دریافت کرلیں کہ وہ مسلمان تو نہیں ہیں اگر وہ اقرار اسلام کریں یا اذان کی آواز وہاں سے آجاوے تو خونریزی اور حملہ سے باز رہیں حضرت خالد کو بھی یہی حکم تھا۔ مگر ادھر تو بنی جذیمہ کا مسلح ہونا خود شبہ میں ڈالتا تھا ادھر حضرت خالدؓ نے اُن سے مسلمان ہونیکو دریافت کیا تو بجائے اسلمنا صبانا صبانا کہنے لگے۔ صبانا ایسا لفظ ہے جس کے معنی دین سے پھر جانیکے آتے ہیں حضرت خالد کو شبہ ہوا اور اُن کو ہتھیار ڈالدینے کا حکم دیا۔ اور جب اُنہوں نے ہتھیار ڈالدیئے تو اُن کو مشکیں باندھ کر لشکر میں تقسیم کردیا اور آخر رات میں حکم دیدیا کہ جس کے پاس جو اسیر ہے وہ اُس کو قتل کردے۔ بنو سلیم نے تو قتل کردیا مگر مہاجرین وانصار نے ایسا نہ کیا۔ آپ کی خدمت میں اس کی اطلاع پہنچی۔ تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور ہاتھ اُٹھاکر تین مرتبہ فرمایا۔

اللھم انی ابرء الیك مما صنع خالد	الٰہی میں خالد کے اس فعل سے بری ہوں۔

آپنے یہ بھی فرمایا کہ کسی نے خالد کی اس بات پر اظہار کراہیت بھی کیا۔ اُس شخص نے جو خبر لیکر آیا تھا عرض کیا کہ دو شخصوں نے ایک تو زرد رنگ اور میانہ قد کے شخص نے دوسرے سرخ رنگ طویل القامت نے حضرت عمرؓ نے سُن کر فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ان دونوں کو سمجھ گیا ایک تو میرا بیٹا عبداللہ ہے دوسرا سالم مولی ابی حذیفہ کا۔

اس کے بعد آپنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بہت سا مال اونٹ وغیرہ دیکر بھیجا کہ مقتولین کی دیت اور نقصان مال کا معاوضہ دیدیں۔ حضرت علیؓ نے نہایت فراخدلی سے ہر چھوٹی بڑی چیز کا معاوضہ

دیدیا یہاں تک کہ کتے کے پانی پینے کا برتن ٹوٹ گیا تھا اُس کا بھی۔ اور پھر بھی کچھ مال بچ گیا تو اُسکو انھیں پر تقسیم کر کے راضی کر دیا۔ واپس آکر ساری کیفیت خدمت مبارک میں عرض کی تو آپ نے فرمایا خوب کیا۔

اسی واقعہ کے سبب حضرت عبد الرحمٰن بن عوف میں (جو سابقین اولین عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) اور حضرت خالد میں تیز کلامی ہو گئی۔ حضرت عبد الرحمٰن سے فرمایا تم نے یہ فعل زمانہ جاہلیت کا سا کیا۔ خالدؓ نے کہا میں نے تو تمہارے باپ کا بدلہ لیا ہے (عبد الرحمٰن بن عوف کے والد عوف کو بنی جذیمہ نے قتل کیا تھا۔ عبد الرحمٰنؓ نے فرمایا میں تو اپنے باپ کے قاتل کو قتل کر چکا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے فرمایا ایک شخص کے بدلے میں جو بحالت شرک اور زمانہ جاہلیت میں قتل ہوا تم مسلمانوں کو قتل کرتے ہو۔ حضرت عبد الرحمٰن کے دونوں جواب درست تھے وہ اپنے باپ کے قاتل کو قتل بھی کر چکے تھے اس وجہ سے بھی اب بدلہ کی ضرورت نہ رہی تھی اور قتل بھی نہ کرتے تو کافر کے بدلے جو زمانہ جاہلیت میں قتل ہوا ہو مسلمانوں کو کسی طرح قتل کرنا جائز نہ تھا۔ حضرت عبد الرحمٰن نے یہی فرمایا کہ اگر تم نے بدلہ لیا ہے تو اپنے چچا کا لیا ہے اس نزاع اور گفتگو کی اطلاع ... ہوئی تو آپ نے ناخوش ہو کر فرمایا۔

مهلا یا خالد دع عنک اصحابی فو اللہ لو کان لک احد ذھبا فانفقتہ فی سبیل اللہ ما ادرکت غدوۃ رجل منھم ولا روحتہ

خالد ٹھیرو میرے اصحاب کو کچھ نہ کہو قسم ہے خدا تعالیٰ کی اگر تمہارے پاس احد پہاڑ کی برابر سونا ہو اور تم اُس سب کو خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالو تو میرے اصحاب کے ایک روز فی سبیل اللہ صبح کے کوچ کرنے کی برابر نہیں ہو سکتا۔ نہ شام کے کوچ کی۔

حضرت خالد نے جو کچھ کیا در حقیقت زیادہ سے زیادہ رائے کی غلطی تھی اُنہوں نے یہ سمجھا کہ یہ قوم مسلمان نہیں ہوئی۔ ادہر اُنکی تیاری نے اُن کو شبہ میں ڈالدیا۔ ایک سپہ سالار مدبر کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر ممکن صورت سے اپنے لشکر کی حفاظت کرے اُنکو ضرور یہ کھٹکا ہوا کہ یہ ہم کو غافل کر کے حملہ نکر بیٹھیں یا اور کوئی قبیلہ اُن کی معاونت پر آمادہ ہو جائے تو ممکن ہے۔ اگر در حقیقت اُن کو مسلمان سمجھ لیتے تو کبھی ایسا نہ کرتے ہرگز ہرگز اُن کو بدلہ لینے کا خیال نہ تھا نہ حضرت عبد الرحمٰنؓ کے والد کا اور نہ اپنے چچا کا۔ ہاں فرمایا کہ میں نے تمہارے باپ کا بدلہ لیا اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ میں نے بدلہ لینے کو قتل کیا ہے۔ بلکہ جس

وجہ سے بھی وہ قتل کئے گئے کافر سمجھ کر کئے گئے اور جب قتل ہو گئے تو بدلہ ہو گیا گو اس نسبت سے نہ حضرت عبدالرحمٰن بھی اسکو خوب سمجھتے تھے۔ مگر انہوں نے ظاہر لفظوں کا جواب دیا کہ تم کو مسلمانوں سے کافر کا بدلہ لینا جائز ہی کب تھا۔ درانحالیکہ وہ کافر بھی زمانہ جاہلیت میں قتل کیا گیا ہو۔ ظاہر ہے اور بالکل ظاہر ہے کہ اگر حضرت خالد کا یہ مطلب ہوتا کہ میں نے بدلہ میں قتل کیا ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خالد سے ایسے معاملہ میں کیونکر درگذر فرما سکتے تھے۔ غرض یہ انکی رائے کی غلطی تھی۔ اور اسی غلط رائے کو آپ نے تسلیم کر کے اپنی برارت خدا تعالیٰ کے یہاں ظاہر فرمائی۔ اور مقتولین کا خون بہا دیا اُن کے نقصانات کی تلافی فرمائی۔

ایک شبہ کا جواب | جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد دع عنک اصحابی سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت خالد رضی اللہ کو اصحاب میں شمار نہیں کیا حالانکہ وہ باتفاق امۃ جلیل القدر صحابی ہیں۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ بیشک حضرت خالد جلیل القدر صحابہ میں سے ایک ہیں اور وہ شخص ہیں کہ جنپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورا اعتماد فرماتے اور امور عظام اُن کے سپرد فرماتے تھے سیف من سیوف اللہ کا خطاب اُن کو عطا فرمایا تھا۔ وہی شخص ہیں جنہوں نے شام اور روم کا تخت اُلٹا ہے اور دنیاء اسلام میں اُن کے کارنامے زریں حروف سے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر بایں ہمہ سابقین اولین سے نہیں ہیں۔ عمرۃ القضا کے بعد اسلام لائے ہیں۔ مصائب کا زمانہ گذر کر شوکت اسلام کا دور شروع ہو گیا تھا۔ وہ وقت باقی نہ رہا تھا۔ جبکہ صحابہ کو اپنی جان کا بچانا دشوار تھا۔ عزیز و اقارب کے طعن اور انکی سنگدلی کے شکار جُدا۔ فقر و فاقہ کی تکلیف علیحدہ۔ جلا وطنی کے مصائب جدا گانہ ان سب مشکلات کو برداشت کر کے آپ پر جان کا فدا کرنا۔ اپنی جان کو آپکی آڑ بنا دینا۔ آپکے پسینہ کی جگہ خون بہا دینا۔ یہ باتیں صرف سابقین اولین کی حصہ میں آئی تھیں۔ اور حضرت عبدالرحمٰن رض بن عوف انہی افراد کاملہ میں سے تھے۔ انہی شاندار خدمات کا صلہ تھا۔ کہ دنیا میں اُن کو جنت کی بشارت مل گئی تھی۔ پس گویا باوجود اس عظمت و مرتبت کے جو حضرت خالد کو حاصل تھی اور اس شفقت و رحمت کی جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے آپ کے حال پر مبذول تھی۔ بمقابلہ عبدالرحمٰن رض غیر اصحاب میں شمار کئے گئے۔

اس میں ایک جانب اگر فرق مراتب کی طرف اشارہ ہے کہ صحابہ باوجود صحابہ ہونیکے ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں ایسا فرق ہے کہ نیچے کا طبقہ بمقابلہ اوپر کے طبقے کے گویا غیر صحابہ میں داخل ہے اور یہ فرق ظاہر بھی ہے۔ کیونکہ صحابہ کی شرافت و مقبولیت عند اللہ شرف صحبت سے ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ تابعین میں بعض علم و عمل کے اعتبار سے صحابہ کے درجے سے بھی اوپر کا درجہ رکھتے مگر صحابہ کی شرافت و فضیلت کو نہیں پاسکتے۔ اور شرف صحبت فقط جمال مبارک کی زیارت یا چند ساعت ہم نشینی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اُسکے لئے ایمان شرط ہے پھر ایمان کے بعد لوازم ایمان و مدارج جان نثاری و خدمتگذاری جس میں زیادہ ہوں گے اُسی میں یہ شرف بھی زیادہ ہوگا۔ اور ان مدارج کے اعتبار سے نیچے کا درجہ خالی ہوگا۔ اور اس اعتبار سے بمقابلہ طبقہ اعلےٰ نفی صحابیت درست ہوجائیگی ورنہ اگر نفس شرف صحبت سے سب افراد برابر ہوجاتے تو جس طرح حضرت خالد نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کو جواب دئے تھے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بھی اُن کو ایسا ہی سخت کہا تھا۔ یہ فرق مراتب طبقہ اعلیٰ یعنی سابقین اولین میں بھی ملحوظ ہے۔ دیکھو ایک موقع پر آپنے حضرت صدیق اکبر کے مقابلہ میں تمام صحابہ کو ارشاد فرمایا ہے۔

هل انتم تارکوا لی صاحبی	تم میرے دوست اور صاحب کو میرے لئے چھوڑو گے نہیں۔

بمقابلہ صدیق اکبر تمام صحابہ کو غیر صاحب سے تعبیر فرمایا کیونکہ وہ مرتبہ جو اُنکو حاصل تھا دوسرونکو نہ تھا۔ تو دوسری جانب حضرت خالد کو تادب اور مرتبہ شناسی کی پوری پوری ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تمکو اپنے تقرب اور اخلاص ایمانی پر غرہ نہ کرنا چاہئے۔ اپنے سے برتر لوگوں کا ادب ملحوظ رکھنا چاہئے۔

دوسرا شبہ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ لا تسبوا اصحابی۔ تم میرے اصحاب کو بُرا نہ کہا کرو۔ اسمیں یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس کلام کے مخاطب صحابہ ہیں۔ اور وہ کُل کے کُل شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ پھر ان کو خطاب کرکے فرمانے کا کیا مطلب ہے۔

جواب اس کا دو طرح پر ہے اول تو یہ کہ گو مخاطب صحابہ ہی ہیں۔ اور گو اُن میں فرق مراتب بھی ہے۔ مگر کسی کو اجازت نہیں ہے کہ ایک دوسرے کو سب کریں یعنی اُنکے عقائد و اعمال میں بُرا بھلا کہنے کیلئے نقص نکالیں۔ جو شخص ایسا کریگا۔ وہ اس حالت کے اندر غیر صحابہ میں داخل ہوگا اور اس طرح

ارشاد سے صحابہ کی شان کو محفوظ و ممتاز رکھنا مقصود تھا۔ اور اس میں اہتمام تھا اس امر کا کہ جب خود صحابی کو باوجود ہمسری یہ ارشاد ہے تو مابعد صحابہ کو اُن کے ساتھ کس قدر تادب رکھنا اور حفظ مراتب کا لحاظ رکھنا۔ اور شرف صحابیت کو تمام شرافتوں پر فائق و برتر سمجھنا ضروری ولازم ہوگا۔ اور اس کو نظر انداز کرنے سے وہ کس درجہ پر پہنچ جائیں گے۔ کیونکہ جب صحابہ کو اس قدر ممانعت ہے اور اس حالت میں درجہ صحابیت سے نیچے اُتر آتے ہیں۔ تو دوسروں کی کیا حالت ہوگی اور یہ حقیقت میں انسداد اُس حالت کا تھا جو اُمت میں پیش آنیوالی تھی۔

رہا صحابہ میں باہم بطور امر بالمعروف یا نصح وہمدردی کسی امر کا اظہار یا انکار۔ یا امور سیاسی انتظامی میں خلفاء کا تنفیذ احکام کرنا اس میں داخل نہیں ہے۔ صحابہ معصوم نہ تھے کہ اُنسے کوئی لغزش یا کسی قسم کی فروگذاشت نہ ہوتی۔

دوسرے یہ کہ مخاطب اسکے صحابہ نہیں بلکہ امت ہے۔ اور غیر حاضرین کو حاضرین کے مرتبہ میں رکھکر یہ عام فرمان جاری فرمایا گیا ہے اور یہ محض عام حکم ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اسکی طرف ایما ہے کہ امت کے بہت سے افراد اس میں مبتلا ہونیوالے ہونگے۔ اور یہ مہلک مرض اُن کو برباد و تباہ کریگا۔ اسی پیش بندی اور دلسوزی اُمت کی بناء پر یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اسی دوسرے مطلب کو شیخ تاج الدین ابن عطاء اللہ نے نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی تجلیات پیش آتی تھیں بعض تجلیات میں آپکے سامنے تمام اُمت پیش ہوئی اُن میں وہ بھی تھی۔ جو سب اصحاب میں منہمک و مشغول تھے۔ آپنے اُن کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا۔ لاتسبوا اصحابی۔

شیخ کی اس تقریر کے موافق یہ خطاب بطور مجاز یعنی غیر موجود غیر حاضر کو موجود و حاضر فرض کرکے نہوگا بلکہ حقیقی ہوگا۔ کیونکہ اس میں انہیں لوگوں کو خطاب ہے جو حاضر و موجود ہیں۔

رہی یہ بات کہ جب وہ لوگ آپ کے سامنے موجود و مشاہد ہیں۔ تو خطاب صرف اُن کو ہی جو اس زبون حالت میں مبتلا اور اس شنیع امر کے مرتکب ہیں۔ یا سب موجودین کو عام ہے اس میں دونوں احتمال ہیں

خطاب صرف اُنہیں کو ہی جو مبتلا ہیں لیکن حکم عام ہے تنبیہ سب کو ہے یا مصرع سے خطاب ہی عام ہے۔

حضرت خالد کا دومتہ الجندل کیطرف بھیجا جانا

دومتہ الجندل ایک مقام تھا جہاں پر اکیدر بن عبد الملک حکومت کرتا تھا۔ یہ شخص نصرانی تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو چار سو بیس سواروں کے دستہ کیساتھ اسکی فتح کیلئے مامور فرمایا۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم اسکو یعنی رئیس و حاکم کو نیل گائے کا شکار کھیلتے ہوئے پاؤ گے۔ حضرت خالد روانہ ہوئے اور دومتہ الجندل کے قلعہ کے سامنے پہنچگئے۔ چاندنی رات تھی۔ وہاں یہ پیش آیا کہ ایک نیل گائے آکر قلعہ کے دروازے سے اپنے سینگ رگڑنے لگی۔ اکیدر معہ اپنی بیگم کے بالاخانے کی چھت پر تھا۔ بیگم نے کہا یہ عجیب اتفاق ہے۔ ایسا کبھی بھی کسی نے دیکھا ہے۔ کیا یہ چھوڑ دینے کے قابل ہے۔ نواب نے کہا ہرگز نہیں۔ وہ تو سوار ہو کر معہ چند ار دلیوں کے نیل گائے کے شکار کو نکلا۔ ادھر سے حضرت خالدؓ نے آدبوچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہو بہو صادق آیا۔ اکیدر کا بھائی تو مقابل ہو کر مقتول ہوا۔ اور اکیدر نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو حضرت خالد کے حوالے کر دیا۔ آپ اُسکو لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے مصالحت کر کے اُس کو رہا کر دیا۔

یہ وہ کارنامے ہیں جو حضرت خالد نے زمانہ حیات حضرت رسول کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم میں دکھائے اور جن کی بدولت اُن کا رسوخ و اقتدار بارگاہ نبوت اور عامہ مسلمین میں نہایت بلند پایہ ہو گیا اور یہی اُن کی مساعی جمیلہ اس امر کی محرک ہوئیں کہ حضرت صدیق اکبر نے اُن پر کامل اعتماد کر کے امور لاینحل کی عقدہ کشائی سپرد کی۔

حصہ سوم زمانہ امارت و ولایت عساکر اسلامیہ

اب ہم اُن واقعات کو بھی بیان کرنا چاہتے ہیں۔ جو زمانہ شیخین رضی اللہ عنہما میں پیش آئے۔

فتنہ ارتداد عرب میں حضرت خالد کی نمایاں خدمات

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب میں چاروں طرف مرتد اور اسلام سے برگشتہ ہونیکی ہوا چل پڑی۔ ریاست کی ہوس نبوت و رسالت کی ادعا کا ذریعے عرب میں بہت سے نواب رئیس۔ نبی و رسول پیدا کر دیئے۔ مرد تو مرد عورتوں میں ادعا نبوت کا

خبط سما گیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمال وحکام بہ تبلیغ دین اسلام۔ قاضی ومفتی۔ ملک حجاز ویمن۔ بحرین ویمامہ وغیرہ میں جابجا مامور تھے۔ ملک میں ارتداد کا سمی مرض پھیلا تو اُن لوگوں کو اپنی جان بچانی دشوار ہوگئی۔ مرتدین کے حوصلے یہانتک بڑھے کہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے خیالات فاسد دماغ میں چکر لگانے لگے۔ مسلمانوں کی حالت نہایت نازک تھی۔ دشمنوں کا مقابلہ کریں یا گھر کو سنبھالیں مگر حضرت صدیق اکبر کا ثبات واستقلال سب پر غالب آگیا۔ آپنے ایک منٹ کیلئے اس غوغا اور دھوم دھام کی پروانہ کی۔ نہایت استقلال اور اُولو العزمی سے احکام نافذ کیے اور ہر موقع ومقام کے مناسب فتنے فرو کرنے کا انتظام کیا۔ مدبر اور فرزانہ امراء مقرر فرمائے۔ اس فتنہ کے استیصال میں بہت زیادہ حصّہ حضرت خالد بن الولید نے لیا۔ سب سے پہلے اُن کو طلیحہ مدعی نبوت کے مقابلہ کیلئے بھیجا گیا۔ اور یہ حکم دیا گیا کہ اُس سے فراغت ہو جائے تو بطاح پہنچکر مالک بن نویرہ سے مقابلہ کریں۔ اس تجویز کے موافق حضرت خالد اوّل طلیحہ کی جانب روانہ ہوئے اسکی جمعیت بہت زیادہ ہوگئی تھی قبیلہ طی کے چند قبائل بھی اُسکے ساتھ ہوگئے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عدی بن حاتم طائی کو حضرت خالد کی روانگی سے قبل بھیجا تھا کہ اُنکو سمجھا دیں۔ چنانچہ اُنکی فہمایش سے قبیلہ طی کے جو لوگ طلیحہ کے پاس جانے کو تیار تھے وہ رُک گئے اور جو جا چکے تھے وہ واپس آئے اور اس طرح عدی بن حاتم ایک ہزار سوار اس جماعت کے لیکر حضرت خالد سے جا ملے۔ کچھ زور تو طلیحہ کا اس طرح ٹوٹا۔ اور پھر جب عین قتال کا وقت تھا تو عینہ ابن حصن جو اُسکے جانباز بہادروں میں سے تھا لڑتے لڑتے تھک گیا اور طلیحہ نے جو جھوٹے وعدے اُس سے کر رکھے تھے اُس میں سے کسی کو پورا ہوتے نہ دیکھا تو یہ کہکر معہ سات سو سواروں کے واپس ہوگیا۔

یا بنی فزارۃ اُنصرفوا فانہ کذاب	اے بنی فزارہ واپس چلو یہ جھوٹا ہے۔

طلیحہ نے اپنے بھاگنے کا سامان پہلے ہی کر رکھا تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی سمیت بھاگ گیا۔ مگر تقدیر کا اچھا تھا۔ اُسکو بعد میں اسلام نصیب ہوا۔ اور فارس کے معرکوں میں دادِ شجاعت وجان نثاری دے کر اس دھبہ کو مٹا دیا والحمد للہ علیٰ ذالک۔

مالک بن نویرہ کا واقعہ	حضرت خالد فزارہ۔ غطفان۔ اسد وطی اور طلیحہ کے قصہ سے فارغ ہو کر حسب ہدایت

صدیق اکبر مالک بن نویرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مالک بن نویرہ نے مرتد ہو کر خلاف و مقابلہ کا عزم کر لیا تھا۔ مگر مسلمانوں کے غلبہ اور دوسرے قبائل کے انجام کو دیکھ کر ہوش آ گئے تھے وہ بجائے خود دل میں تو نادم ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تردد و توقف کی حالت میں تھا۔ حضرت خالد کی خبر ملی تو اُس نے قوم کو ہدایت کی کہ ایسی قوم کا مقابلہ جس کی تائید کے سامان غیب سے ہوتے ہیں ٹھیک نہیں تم سب دین اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ لوگ متفرق ہو گئے حضرت خالد نے پہنچکر اسلامی دستوں کو جا بجا پھیلا کر حکم دیا۔ کہ جو شخص قبول اسلام سے انکار کرے اُس کو گرفتار کر لائیں اور جو اطاعت و انقیاد سے انکار کر کے مقابلہ کا ارادہ کرے اُس کو قتل کر دیں حضرت صدیق اکبر کا حکم تھا کہ جس قبیلے سے اذان کی آواز آئے اُن سے ہاتھ روک لیں۔ اور جہاں سے اذان کی آواز نہ آئے۔ اُن پر اسلام کو پیش کریں اگر اسلام قبول کر لیں تو زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کا سوال اُن کے سامنے پیش کریں اگر ادائے زکوٰۃ کو قبول کر لیں تو فبہا ورنہ پھر اُن پر حملہ کریں۔ ادائے زکوٰۃ کو منجملہ تمام فرائض کے اسلئے مقدم کیا کہ اہل عرب اسی کو اپنے لئے موجب ننگ و عار سمجھتے تھے۔ ایک دستہ نے مالک بن نویرہ کو مع چند ہمراہیوں کے گرفتار کر لیا۔ اس دستہ کے لوگوں نے مالک کے بارہ میں اختلاف کیا بعض کہتے تھے ہم نے اذان کی آواز سُنی بعض انکار کرتے تھے۔ حضرت خالد نے اس اختلاف کو دیکھ کر کوئی حقیقی فیصلہ نہ کیا۔ بلکہ اُن کو قید میں رکھنے کا حکم دیکر قیدیوں کو مسلمانوں پر تقسیم کر دیا کہ اُنکی حفاظت کریں سردی کی رات تھی حضرت خالد نے اعلان دیا۔

دافئوا اسراکم — اپنے اپنے اسیر کو سردی سے بچاؤ۔

کنانہ کی زبان میں اسکے معنی قتل کر دینے کے تھے۔ لوگوں نے اُن کو قتل کر دیا۔ شور کی آواز حضرت خالد کے کان میں پڑی اور باہر نکلے تو قصہ ہی دوسرا دیکھا۔ فرمایا۔

اذا اراد اللہ امرا اصابہ — خدا کسی بات کو چاہتا ہے تو وہی ہوتا ہے۔

مالک کا قتل خواہ غلطی رائے سے ہو یا غلط فہمی سے صحابہ میں اسکی وجہ سے ایک قسم کی تشویش اور حضرت خالد کی جانب سے بدظنی پیدا ہو گئی۔

حضرت عمرؓ نے صدیق اکبرؓ پر زور دیا کہ اُنکو معزول کر دیا جائے آپ نے فرمایا جس تلوار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میان سے نکالا ہے میں اُسکو میان میں نہ کرونگا۔ حضرت عمرؓ کا اصرار زیادہ بڑھا تو فرمایا۔ اُنسے رائے میں غلطی ہوئی ہے عمداً کچھ نہیں کیا۔ اسکے بعد آپ نے مالک کا تو خون بہا دیا اور خالدؓ کو حاضر ہونیکا حکم بھیجدیا۔ حضرت خالدؓ حاضر ہوئے۔ تو حضرت عمرؓ نے بہت کچھ فرمایا۔ چپ سنتے ہوئے چلے گئے۔ صدیق اکبرؓ کی خدمت میں حالات واقعی عذر بیان کر دیے۔ جو قبول کر لئے گئے اور معاملہ ختم ہو گیا۔

مسیلمہ کذاب کا واقعہ | مسیلمہ کذاب کا قصہ جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ آپکی وفات کے بعد اُس نے بہت زور پکڑا۔ بنو حنیفہ اور اُن کے اعوان کی کثیر جمعیت اُس کے ساتھ تھی جھوٹے کرشموں اور بیہودہ لاف زنیوں پر لوگ اُس کے ساتھ ہوتے تھے حضرت صدیق اکبرؓ نے جس طرح اور مرتد قبائل کی سرکوبی کیلئے افسروں کو مامور فرمایا تھا مسیلمہ کی سرکوبی کے لئے عکرمہ بن ابی جہل کو مامور فرمایا تھا۔ اور شرجیل بن حسنہ کو اُن کی مدد پر روانہ فرمایا تھا۔ مگر عکرمہ نے شرجیل کا انتظار کئے بغیر مسیلمہ سے مقابلہ کیا اور پس پا ہوئے۔ مدینہ منورہ اطلاع دی تو صدیق اکبرؓ نے لکھا تم اپنی صورت مجھے نہ دکھلاؤ۔ یہاں لوٹ کر نہ آؤ۔ اگر آؤ گے تو مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائینگی بلکہ تم حذیفہ اور عرفجہ کے ساتھ ملکر اہل عمان سے مقابلہ کرو۔ اور شرجیل کو لکھا کہ پیش قدمی کرنے میں خالدؓ کا انتظار کریں حضرت خالدؓ مالک بن نویرہ سے فارغ ہو کر صدیق اکبرؓ کی خدمت میں صفائی و معذرت کر کے مسیلمہ کی جانب روانہ ہوئے۔ صدیق اکبرؓ نے مہاجرین و انصار کی کثیر جماعت کو آپکے ساتھ کیا اور پھر سلیط کو حضرت خالدؓ کی امداد کیلئے بھیجا کہ وہ پشت کی جانب سے مسلمانوں کو دشمن کے حملہ سے بچائیں مگر شرجیل نے بھی بغیر انتظار حضرت خالدؓ کے مسیلمہ سے مقابلہ شروع کر دیا اور وہ بھی پس پا ہوئے حضرت خالدؓ پہنچے تو سخت ملامت کی وراب پوری قوت سے فریقین کا مقابلہ ہوا۔ غلبہ کبھی ادھر کا ہوتا تھا کبھی اُدھر کا۔ ایک مرتبہ بنو حنیفہ نے مسلمانوں کو اس قدر پیچھے ہٹا دیا کہ حضرت خالدؓ کے خاص خیمے تک پہنچ گئے اور اُن کو بھی تھوڑی دیر کیلئے جگہ چھوڑ دینی پڑی لیکن پھر حضرت خالدؓ نے زور کا حملہ کر کے اُن کو دور تک ہٹا دیا معرکہ اسی زور شور سے جاری رہا حضرت خالدؓ نے خیال کیا کہ

جبتک مسیلمہ نہ مارا جائیگا۔ لڑائی بند نہو گی۔ خود میدان میں نکل کر مسیلمہ کو مقابلہ کیلئے بلایا۔ وہ آیا تو اُسپر چند باتیں پیش کیں وہ ہر بات کا جواب دینے کیلئے منہ پھیر کر اپنے شیطان سے رجو اُس کو تلقین کرتا تھا) مشورہ لیتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت خالد موقعہ پا کر اُسکے اوپر چلے اور وہ بھاگ نکلا اور مع اپنی قوم کے حدیقہ (قلعہ یا حصار) میں پناہ لی۔ آخر براء بن مالک نے ہمت کر کے دیوار قلعہ پر سے کود کر دروازہ کھول دیا مسلمان داخل ہوئے مسیلمہ مارا گیا۔ اور معاملہ ختم ہوا۔

حضرت خالد کی پیشقدمی عراق کی جانب

یمامہ کی فتح اور مسیلمہ کے قتل سے فراغت ہو چکی تو حضرت صدیق اکبر کا حکمنامہ پہنچا کہ عراق کی جانب روانہ ہو جائیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یمامہ سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور وہاں سے عراق کو روانہ ہوئے اُن سے پہلے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے حضرت صدیق اکبر سے عرض کر کے عراق کی طرف پیش قدمی کی اجازت لیلی تھی اور دو چار مڈبھیڑ ہوئی بھی تھیں۔ مگر اصل سلسلہ فتوحات عراق کا حضرت خالد سے ہی شروع ہوتا ہے۔ مثنیٰ بن حارثہ کو بھی یہی حکم پہنچا کہ خالد کے ساتھ جا کر مل جائیں۔ حضرت خالد ملک عراق میں داخل ہوئے۔ چند مقامات کو بصلح زیر نگین کیا۔ اور بعض پر سخت مقابلہ ہوا اور تھوڑے سے عرصہ میں مغیشیا تک پہنچ گئے اور اسکی فتح کی اطلاع صدیق اکبر کی خدمت میں ہوئی۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

عجزت النساء ان یلدن مثل خالد — عورتیں خالد جیسے کو جننے سے عاجز ہیں۔

ان سب مقامات کو عرصہ قلیل میں فتح و مسخر کرتے ہوئے آپ حیرہ پہنچ گئے۔ حیرہ ملوک مناذرہ (منذر) کا پایہ تخت تھا اور اس وقت ایاس بن قبیصۃ الطائی وہاں کا والی تھا جو بعد نعمان بن المنذر کی حکومت پر بیٹھا تھا۔ اہل حیرہ نے اوّل اوّل صلح سے انکار کیا۔ مگر بعد میں خود سوچ سمجھ کر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ امیر حیرہ ایاس اور عمرو بن عبد المسیح جس کو ابن بقیلہ کہتے تھے گفتگو صلح کرنے نکلے ابن بقیلہ بیانائیا گفتگو کرتا تھا۔ اُس کی عمر کئی سو برس کی تھی۔ حضرت خالد نے خیال فرمایا کہ یہ حواس باختہ بڈھا کیا بات کریگا۔ اور کیا سمجھے گا۔ اور اسی وجہ سے بربنار تعجب اہل حیرہ سے کہا تم بڑے ہوشیار مکار۔ چالاک ہو پھر تم نے اپنی باگ ایسے شخص کے ہاتھ میں کیوں دیدی جس کو اپنی جان کی بھی خبر نہیں مگر جب

ابن بقیلہ سے چند سوالات کر کے معقول اور برجستہ جواب سُنے تو فرمایا۔

القوم اعلم بما فیھم — قوم اپنی اندرونی حالات کو خود زیادہ جانتی ہے

ابن بقیلہ کے خادم کے ساتھ تھیلی میں زہر تھا۔ حضرت خالد نے اُس کو لیکر زہر ہتیلی پر رکھ کر ابن بقیلہ سے دریافت کیا کہ زہر کیوں ساتھ رکھا۔ کہا اس وجہ سے کہ اگر میں تمہارے حالات اچھے نہ دیکھتا اور تمکو اپنے اندازہ کیخلاف پاتا تو زہر کھا کر مر جاتا۔ کیونکہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی ہے۔ حضرت خالد نے فرمایا موت تو کسی کے اختیار میں نہیں۔ وقت معین سے پہلے کوئی شخص نہیں مر سکتا۔ زہر کھانا نا کھانا برابر ہے۔ اور پھر آپنے بسم اللہ خیر الاسماء رب الارض والسماء الذی لا یضر مع اسمہ داء الرحمن الرحیم پڑھکر زہر کو نگل لیا ابن بقیلہ نے کہا۔ بیشک جبتک تم لوگوں کی یہ حالت ہے تم اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہو گے اس گفتگو کے بعد اہلِ حیرہ سے بھی صلح ہو گئی۔ حیرہ کے گرد و پیش اور اس نواح میں جسقدر دیہات و قصبات واقع تھے وہاں کے چودھری نمبردار و رئیس سب کے سب حیرہ کے انجام کو دیکھتے تھے جب حیرہ بصلح فتح ہو گیا تو اس نواح کے تمام نمبرداروں اور چودھریوں اور زراعت پیشہ لوگوں نے آکر صلح کر لی اور اس طرح حضرت خالد کیلیے رستہ صاف ہو گیا۔ آپنے چند تجربہ کار افسروں کے ہمراہ کچھ دستے دیکر حکم دیا کہ پیشقدمی کریں۔ چنانچہ یہ لوگ دجلہ کے کنارے تک پہنچ گئے۔ فارس میں اگرچہ اس وقت عزل و نصب اور قتل ملوک کا دور دورہ تھا۔ باہم اختلاف کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مگر حضرت خالد کی خبر پہنچی تو مدعیان ملک پر اتفاق کر کے سخت مقابلہ کی ٹھان لی۔

حضرت خالد پوری ترتیب اور سامان کے ساتھ انبار تک پہنچ گئے یہاں کا سپہ سالار ساباط کا گورنر شیرزاد تھا۔ اُس نے اوّل اوّل تو مقابلہ کیا۔ مگر انجام کار صلح کر لی اور شیرزاد بہمن جاذویہ سے جا ملا حضرت خالد نے انبار و کلواذا کے گرد و پیش مقامات سے بھی صلح کر لی اور انبار کو زبرقان ابن بدر پر چھوڑ کر خود عین التمر کی طرف کوچ کیا۔ یہاں بہرام چوبین کا بیٹا مہران معہ نہایت عظیم الشان لشکر فارس کے پڑا ہوا تھا اور قبائل عرب نمر و تغلب و ایاد کی بھاری جمعیت زیر کمان عقہ ابن ابی عقہ اُسکی امداد

و معاونت کیلئے موجود تھے عقبہ نے مہران سے کہا عرب کا مقابلہ عرب ہی خوب کر سکتے ہیں۔ تم ہیں اور خالد کو چھوڑ دیجئے ہم دیکھ لیں گے۔ اُس نے منظور کیا عقبہ پورے ساز و سامان کیساتھ حضرت خالد کے مقابل ہوا۔ عقبہ ابھی لشکر کی ترتیب میں مشغول صف بندی کر رہا تھا کہ حضرت خالد نے بہ نفس نفیس اُس پر حملہ کر کے بغل میں دبا لیا۔ اُس کا لشکر تو بغیر لڑے بھڑے فرار ہوا جس میں سے بہت سے قیدی بنائے گئے اور عقبہ اسیر ہو کر لشکر اسلام میں آ گیا۔

مہران کو اس ہزیمت کی خبر پہنچی تو وہ بھی قوم سمیت چلتا بنا۔ اور اس طرح عین التمر کی فتح سے بھی فراغت ہوئی۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے عیاض بن غنم کو ایک دوسرے حصۂ لشکر کی کمان دیکر حکم دیا تھا کہ عراق کی جانب سے داخل ہو کر حضرت خالد سے جا ملیں۔ عیاض بن غنم حسب ہدایت مطیع و منقاد بناتے ہوئے اس طرف کو قدم بڑھائے تھے کہ ایک جگہ انکو عظیم الشان جمعیت سے مقابلہ ہو گیا۔ حضرت خالد عین التمر کی فتح سے فارغ ہوئے تھے کہ حضرت عیاض کا طلب امداد میں پیام پہنچا عیاض دومۃ الجندل کے مقابلہ میں پڑے تھے۔ اور انکے مقابل دومۃ الجندل کی حفاظت اور مدافعت کیلئے قبائل بہرا، کلب، غسان، تنوخ، ضجاعم پڑے ہوئے تھے۔ دومۃ الجندل دو رئیسوں پر منقسم تھا۔

اکیدر بن عبد الملک اور جودی بن ربیعہ۔ اکیدر تو وہی ہے جس کو حضرت خالد نے پہلے ایک دفعہ گرفتار کر لیا تھا اور بعد عہد و پیمان شدید صلح کر کے رہا کر دیا تھا۔ حضرت خالد جب عیاض کی امداد کو روانہ ہوئے اور اکیدر کو اطلاع ملی تو اُس نے قبائل کو صلح کی رائے دی جب کسی نے نہ مانا تو چپکے سے نکل بھاگا حضرت کو اسکی اطلاع ملی تو اُسکو راستہ میں سے گرفتار کر لیا اور بد عہدی و نقض صلح کی بنا پر اُسکو قتل کر دیا۔ اسکے بعد دومۃ الجندل کا محاصرہ کر لیا۔ ایک جانب حضرت عیاض اور دوسری جانب حضرت خالد تھے آخر جودی قید ہوا اور دومۃ الجندل بھی بعد محاصرہ فتح ہو گیا۔ آپ کچھ عرصہ تک یہاں مقیم رہے تو اہلِ فارس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ ادھر عقبہ کے قتل سے قبائل عرب میں جوش انتقام اُٹھا تھا۔ مل جُل کر زرمہر اور روزبہ دو سرداران فارس کی زیر کمان بھاری لشکر نے انبار کی طرف

پیش قدمی کی۔ قعقاع بن عمرو جو حضرت خالد کے نائب تھے۔ اُنھوں نے اعبد بن فدکی اور عروہ بن الجعد کو مقابلہ کیلئے آگے بھیجا کہ حصید پر ان کو روکدیں۔ حضرت خالد کو خبر پہنچی تو فوراً حیرہ پہنچے اور پھر خود قعقاع مقام حصید پر پہنچ گئے۔ زرنہ اور روزبہ سے سخت مقابلہ ہوا اور یہ دونوں مقتول ہوئے۔ عجمی لشکر یہاں سے فرار ہوکر خنافس پہنچا جن کے تعاقب میں ابو لیلی پہنچے۔ خنافس میں مہبوذان امیر افواج تھا اُسکو ابو لیلی کی آمد کی خبر ہوئی تو شکست کھا بیٹھا۔ یہاں ہذیل بن عمران اپنی جمعیت کیساتھ موجود تھا حضرت خالد کو مقامات مذکورہ کی فتح کی خبر ہوئی تو حیرہ سے روانہ ہوکر اپنے افسران فوج سے رات کو مقام مضیح پر جاملے اور رات ہی کو ہذیل پر سوتے میں حملہ کردیا۔ ہذیل بمشکل جان بچاکر چند لوگوں کیساتھ بھاگا۔ ہذیل کیساتھ عبدالعزیٰ ابن ابی رہم اور لبید بن جریر بھی تھے یہ دونوں حقیقتاً مسلمان ہو چکے تھے کسی مجبوری یا جبر کی وجہ سے ہذیل کے ساتھ تھے یہ دونوں بھی اس معرکہ میں مقتول ہوئے۔ حضرت صدیق اکبر کو اطلاع ملی تو آپنے اُن کے ورثہ کو دیت دیدی۔

حضرت عمر کو مالک ابن نویرہ کے قتل پر جو ناراضی حضرت خالد سے تھی اس واقعہ سے اور بھی بڑھ گئی۔ مگر صدیق اکبر یہ فرما کر اُن کی ناراضی کو دفع فرماتے تھے کہ جو شخص دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہے اُسکو ایسے واقعات سے سابقہ ضرور پڑتا ہے۔

مضیح سے فراغت پاکر حضرت خالد ثنی اور زمیل کی طرف بڑھے۔ جو رصافہ کی جانب شرق آباد تھے۔ یہاں ربیعہ ابن بجیر تغلبی عقہ کے انتقام کیلئے جمعیت کثیر موجود تھا اور اُس نے زرمہر روزبہ اور ہذیل سے معاہدہ کرلیا تھا۔ حضرت خالد ان سب سے عہدہ برآ ہوچکے تو آپنے حکم دیا کہ ربیعہ پر حملہ کیا جاوے ربیعہ ثنی میں تھا اُسکو تین طرف سے ایسا لیا کہ ایک متنفس بھی نہ بچ سکا۔ ہذیل مضیح سے بھاگ کر زمیل میں آگیا۔ اسپر بھی حضرت خالد نے تین جانب سے شب خون مارکر قصہ تمام کردیا۔ زمیل سے آپ رضاب پہنچے وہاں ہلال بن عقہ خیمہ زن تھا۔ مگر وہ خبر سنتے ہی بھاگ گیا۔

رضاب سے آپنے فراض کا رُخ کیا۔ یہاں شام۔ عراق۔ جزیرہ کی حدود ملتی تھیں۔ یہاں ایک طرف اہل شام و روم میں حمیت وغصہ کی آگ مشتعل تھی۔ دوسری جانب اہل فارس زخم خوردہ ہوکر

اندمال کی فکر میں تھے۔ اور پھر قبائل عرب تغلب و ایاد و نمر بھی اُنکے ساتھ ہوگئے۔ غرض عرب و عجم روم و شام کی مجتمعہ قوت سے مقابلہ تھا۔ مگر سخت مقابلہ اور نقصان اُٹھانیکے بعد مجتمعہ عساکر کو ہزیمت ہوئی حضرت خالد نے دس یوم فراض پر قیام کرکے حیرہ کی طرف واپسی کا حکم دیا۔ ساقہ لشکر کی کمان شجرہ بن الاعز کے سپرد کی اور عام طور پر ظاہر کردیا کہ میں خود بھی ساقہ میں ہونگا۔ مگر آپ خفیہ فراض سے بقصد حج مع چند معتمدین کے مکہ کو روانہ ہوگئے اور قبل اسکے کہ آپکے تشریف لیجانیکی خبر پھیلے آپ حج کرکے واپس آگئے حضرت صدیق اکبر کو اسکی اطلاع پہنچی تو آپ ناخوش ہوئے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت خالد بن الولید جیسا مدبر و تجربہ کار جری و جانباز سپہ سالار ہرگز کسی ایسے امر کے ارتکاب کو جائز نہ سمجھ سکتا تھا جس میں اندیشہ نقصان ہوتا وہ ہر قسم کا کامل انتظام کرکے تشریف لیگئے تھے۔ فوج کو موقعہ بموقعہ تقسیم کرکے ہر ایک حصہ پر تجربہ کار دلیر افسروں کو مقرر کردیا تھا پھر اسکے ساتھ اس کا بھی پورا انتظام کیا تھا نہ اسلامی لشکر میں بھی یہ خبر نہ پھیلے اور روانہ بھی ایسے وقت ہوئے کہ عین وقت حج پر پہنچکر فوراً واپس ہوگئے۔ تیز رو سواری کا بھی کامل انتظام تھا۔ مگر خلیفۃ الاسلام کی نظر غایت تھی حضرت خالد کی ہر حرکت و سکون پر اُنکی نظر تھی دشمن کے ملک اور اُسکی اہمیت کا نقشہ پیش نظر تھا۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ حضرت خالد اخبار کی پوری بندش کرکے تشریف لیگئے تھے مگر ایسی خبر کا باوجود انتظام شدید پھیل جانا کچھ مستبعد نہ تھا۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ ہمیشہ اس سے بھی زیادہ رازدارانہ خبریں پھوٹ جاتی ہیں مسلمانوں کا تو ایک فرد بھی اُس وقت ایسا نہ تھا جس سے سازش کا اندیشہ ہوتا۔ مگر جس طرح مسلمان جاسوسی کے ذریعے سے دشمن کے گھر کی خبر لاتے تھے اسی طرح کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ادھر کے جاسوس اس خبر کو لے اڑتے اور دشمن اچانک حملہ کر بیٹھتا ان سب کے علاوہ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ناگہانی طور پر جنگ پیش آجاتی اور مسلمان جو حضرت خالد کے تشریف لیجانے سے بیخبر تھے اپنے سپہ سالار کو نہ دیکھکر سخت مضطرب الحال و پریشان ہوتے اُن میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوتیں جس کا انجام پست ہمتی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا خلیفۃ المسلمین کی یہ دوربینیاں تھیں جن کے باعث حضرت خالد پر عتاب ہوا۔ صدیق اکبر جو حضرت عمر کے بار بار اصرار پر بھی حضرت خالد کو معزول نہ کرتے تھے اس خلاف مصلحت اسلام امر پر ناراض ہوگئے لیکن اُنکی ناراضی میں بھی عین مصلحت مضمر تھی۔

عراق میں تو متواتر فتوحات سے مسلمانوں کا سکہ جم چکا تھا۔ لیکن شام میں عساکر اسلام ابھی داخل ہی ہوئے تھے۔ وہاں بجز ایک دو جگہ کے کوئی بڑی لڑائی نہ ہوئی تھی اور نہ کوئی بڑا شہر فتح ہوا تھا۔ کئی مسلمان سردار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ مختلف راستوں سے ملک شام میں بڑھ رہے تھے۔ جس کے مختصر واقعات یہ ہیں کہ ۱۳ہجری یعنی خلافت صدیق اکبر کے سال دوم کے آخر میں آپ نے خالد بن سعید العاص کو سب سے پہلے ملک شام کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا اور ایک لشکر کا امیر بنا کر علم سرداری سپرد کیا۔ اور بعض روایات کیموافق اس سے قبل یعنی جبکہ حضرت خالد عراق کی جانب روانہ کئے گئے۔ خالد کو ملک شام کی کوچ کا حکم ہوا تھا۔ لیکن خالد بن سعید سے خلافت صدیق اکبر کے کیوقت غلطی رائے سے ایک ناموزوں بات پیش آ چکی تھی جب خلافت صدیقی تسلیم ہو چکی تو خالد ابن سعید نے دو مہینے تک بیعت نکی اور اس درمیان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو کہا اے بنی عبد مناف تم مغلوب کر دیے گئے حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا۔ مغالبہ (یعنی زبردستی) ہے یا خلافہ حضرت صدیق اکبر نے تو اُنکی اس حرکت پر کچھ خیال نکیا۔ مگر حضرت عمر کو ناگوار تھا جب عساکر شامیہ کی کمان اُن کے سپرد کی گئی تو حضرت عمر نے اسکے برخلاف اصرار کیا اور وہ اس عہدہ سے معزول کر دیے گئے اور اُن کو یہ حکم ملا کہ تیماء پر مسلمانوں کی تقویت کیلئے مقیم رہیں۔ بغیر حکم کے وہاں سے نہ ہلیں عرب قبائل میں سے اُن لوگوں کو جنہوں نے فتنہ ارتداد میں حصہ نہیں لیا جمع کر لیں۔ اور جبتک دشمن حملہ نکریں یا مقابلہ سے پیش نہ آئیں کسی سے نہ لڑیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہاں جا کر مقیم ہو گئے۔ بعض چھوٹے چھوٹے معرکے بھی اُن سے ہوئے۔ اسکے بعد صدیق اکبر نے پیش قدمی کا حکم دیا۔ مگر اس طرح کہ اندرون ملک میں نہ گھسیں۔ بلکہ اس طرح پیش قدمی کریں کہ دشمن کو پیچھے سے دبانیکا موقع نہ ملے۔ مگر آہستہ آہستہ اقدام کا نتیجہ بھی یہی ہوا کہ شام کی فوجیں مقابلہ کیلئے بڑھنے لگیں۔

خالد نے صدیق اکبر کی خدمت میں امداد کیلئے لکھا۔ اب یہاں بھی اس کا اہتمام ہوا عمرو بن العاص کو ایک لشکر کے ساتھ خاص راستہ سے فلسطین جانیکا حکم ہوا اور ولید بن عقبہ کو دوسرے لشکر کے ساتھ اردن پہنچنے کا۔ اسی طرح یزید بن ابی سفیان کو جمعیۃ کثیر کے ساتھ روانہ کیا۔ اور سب کے بعد

حضرت امین امۃ ابوعبیدۃ ابن الجراح کو بھاری لشکر کے ساتھ حمص جانیکا حکم ملا۔ سب کے سب معینہ راستوں سے روانہ ہوئے راستہ میں کہیں کہیں معمولی لڑائیوں اور کہیں صلح سے بعض شہر اور قلعہ بھی فتح ہوئے۔ عساکر اسلامیہ اسی طرح اپنے اپنے افسروں کی ماتحتی میں پیشقدمی کرتے ہوئے چلے گئے حضرت ابوعبیدۃ تو جابیہ پہنچ گئے اور یزید ابن ابی سفیان نے بلقاء کے سامنے خیمے نصب کئے شرحبیل اردن پر پہنچے اور عمرو بن العاص نے عربہ کے آگے جھنڈا نصب کیا۔ امراء ان مشہور مقامات ملک شام تک پہنچ گئے تو اب ملک دم میں ایک عام حرکت پیدا ہو گئی۔ اتفاق سے ہرقل شاہ روم و شام اسوقت بیت المقدس میں تھا اُسکو ان حالات کی اطلاع دیکر مدافعہ و مقاتلہ کی خواہش کی گئی ہرقل نے (چونکہ پیش آنے والے حالات کا علم اُسکو کتب سابقہ سے تھا) کہا میرے نزدیک تو مسلمانوں سے صلح کر لیں تو روم کا تمام ملک اور شام کا نصف باقی رہ جائیگا۔ ورنہ کل کا کل دے بیٹھیں گے۔ اسپر سب نے بالاتفاق انکار کیا۔ تو بادشاہ بیت المقدس سے روانہ ہو کر حمص آیا اور یہاں پہنچکر فراہمی فوج میں مشغول ہو گیا اُس نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کے ہر دستہ فوج کے مقابلہ میں لشکر بھیجدیا جائے۔ اُن کو اسقدر مہلت نہ دی جائے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر امداد پہنچا سکیں اور اس طرح مسلمانوں کی قوۃ کو پامال کر دیا جائے اپنے حقیقی بھائی تذارق کو نوے ہزار فوج کے ساتھ عمرو بن العاص کی مٹھی بھر جمعیت کے مقابلہ کیلئے مامور کیا۔ قیقار کو ساٹھ ہزار کیساتھ حضرت ابوعبیدہ کے مقابلہ کیلئے اور اسی طرح جرجہ کو یزید۔ اور دراقص کو شرحبیل کے ساتھ معرکہ آرائی کیلئے۔ اس تدبیر کا مسلمانوں پر سخت اثر پڑا۔ وہ بجائے خود خائف و حیران رہ گئے مسلمانوں کی کل جمعیت تیس ہزار بھی نہ تھی اور یہاں ہر ایک کے مقابل کئی کئی گنا روم و شام کی فوجیں آموجود ہوئیں اِس وقت سب نے عمرو بن العاص سے مشورہ کیا۔ اُنہوں نے کہا اچھا تو یہی ہے کہ ہم سب ایک مقام پر مجتمع ہو جائیں اجتماع کی حالت میں ہم مغلوب نہیں ہو سکتے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت میں اطلاع دیگئی تو وہاں سے بھی یہی جواب آیا جو عمرو بن العاص نے کہا تھا۔ آپنے یہ بھی تحریر فرمایا کہ تم مسلمان قلۃ عدد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے ہاں ارتکاب معاصی کیوجہ سے کثیر التعداد ہونیکی صورت میں بھی مغلوب ہو سکتے ہو۔ اس سے پرہیز رکھنا چاہیے۔

تم سب مقام یرموک پر اکٹھے ہو جاؤ۔ ہر ایک امیر اپنے اپنے دستے کا مستقل سردار رہے اور اپنے دستہ کو نماز پڑھائے۔ جب اس رائے پر اتفاق ہو گیا تو سب کے سب مقام یرموک پر جمع ہو گئے۔ دوسری طرف عساکر روم و شام بھی زیر کمان تذارق یرموک پہنچ گئے۔ اور ایسے مقام پر نازل ہوئے کہ نشیب دریا اُن کیلئے خندق کا کام دیتا تھا۔ مسلمان اس خندق کیوجہ سے اُنپر حملہ نہ کر سکتے تھے اور وہ خود اُس سے نکلتے نہ تھے۔ کبھی نکلے تو معمولی چھیڑ چھاڑ کے بعد واپس ہو گئے۔ تین ماہ کامل اسی طرح گذر گئے۔ مسلمانوں نے یہ دیکھا تو حضرت صدیق اکبر کی خدمت میں امدادی لشکر کی درخواست کی۔ یہ وہ وقت تھا کہ خالد بن ولید بلا اطلاع حج کر کے آئے تھے اور آپ اس حرکت پر اُن سے کبیدہ تھے اس نامناسب حرکت پر آپ اُنکو متنبہ کرنا چاہتے تھے۔ جسکی بہترین صورت یہ تجویز فرمائی کہ ملک عراق سے جسکی فتوحات کا سلسلہ خالد بن الولید کے ہاتھ ہی شروع ہو کر اسدرجہ پہنچ گیا تھا کہ عراق کے بڑے حصہ میں مسلمانوں کا عمل دخل ہو چکا تھا حضرت خالد کی شجاعت و مردانگی۔ دانائی و فرزانگی کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور وہ تمام عساکر عراقیہ کے قاعد عام سپہ سالار تسلیم کر لئے گئے تھے عساکر شامیہ کی امداد کیلئے روانہ ہو جانیکا فوری حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایک اول درجہ کے سپہ سالار افواج کو ایک امدادی دستہ کا امیر مقرر کر کے بھیجنا ایسا امر ضرور تھا جس سے اُن کا تنزل سمجھا جاتا تھا اور جہاں بھیجے جاتے ہیں وہاں معرکہ ہائے حرب کی ابتدا اور مقابلہ بھی ایسے عظیم الشان لشکر سے جس میں اُن کو سابق نیکنامی پر بھی دھبہ لگنے کا اندیشہ تھا۔ مگر صدیق اکبر کو ایک جانب اگر بصورت تنزل تنبیہ کرنی مقصود تھی تو دوسری جانب اُنکی دوربین نظر نے تاڑ لیا تھا کہ ملک شام کا عقدہ بغیر خالدؓ جیسے سپہ سالار کے حل نہ ہوگا۔ حضرت خالدؓ بلا چون و چرا عراق کی افواج کا نصف حصہ لیکر روانہ ہو گئے اور اس مخلصانہ اطاعت حکم کا نتیجہ یہ ملا کہ ملک شام کی عام قیادت اُن کو مل گئی۔ اُنکی نیکنامی کو چار چاند لگ گئے۔

حضرت خالد اپنی جمعیت کیساتھ لق و دق میدانوں کو طے کرتے۔ اور متفرق مقامات پر قبائل سے مقابلہ کرتے اور منہزم کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ قبیلہ سرارا اپنے چشمہ پر جس کا نام سوی تھا مجتمع تھے۔ لہو و لعب کے مزے اُڑا رہے تھے۔ شراب نوشی کا دور ہو رہا تھا گویا گا رہا تھا۔ حضرت خالد اچانک ایسے وقت اُنکے سر پر پہنچے کہ گویا اشعار ذیل کہہ کر پڑھ رہا تھا۔

الا علّلانی قبل جیش ابی بکر — لعل منایانا قریب ولا ندری

ہاں مجھکو شراب سے سیراب کردو ابو بکر کے لشکر کے آنے سے پہلے کیونکہ شاید ہماری موتیں قریب آگئی ہوں اور ہمکو معلوم نہو

الا علّلانی بالزجاج وکررا — علیّ کمیت اللون صافیة تجری

ہاں مجھکو گلاس بھر کر سیراب کرو اور بار بار میرے پاس لاؤ شراب ارغوانی جو صاف وشفاف ہونیکے ساتھ بہ رہی ہو۔

الا علّلانی من سلافة قهوة — تسلّی هموم النفس من جید الخمر

ہاں سیراب کرو مجھکو اُس متوالی شراب سے جو غم غلط کرے۔ اور شرابوں میں بہتر سے بہتر ہو۔

اظن خیول المسلمین وخالدا — ستطرقکم قبل الصباح مع النسر

میں خیال کرتا ہوں کہ مسلمان سوار اور خالد سویرے۔ صبح سے پہلے ہی مقدمۃ الجیش کے ساتھ تمہارے پاس پہنچینگے

فهل لکم فی السیر قبل قتالکم — وقبل خروج المعصرات من الخدر

کیا تمہاری رائے ہے کہ لڑائی سے پہلے نکل چلو اور اس سے پہلے کہ مراہق لڑکیاں پردوں سے باہر نکل پڑیں

بیچارہ ان اشعار کو دوہرا ہی رہا تھا کہ ایک مسلمان نے بڑھ کر گردن پر تلوار ماری اور اس کا خون شراب کے برتن میں گرا یہ ایک عجیب اتفاق تھا جو پیش آیا۔

حضرت خالد اسی طرح بصریٰ تک پہنچے وہاں کچھ مقابلہ کے بعد دشمن نے صلح کر لی اور یہ ملک شام کا پہلا شہر ہے جو حضرت خالد کے ہاتھ سے فتح ہوا۔ یہاں سے روانہ ہو کر یرموک پہنچے۔ یرموک کے لشکر کی تعداد کل ستائیس ہزار تھی اب حضرت خالد کے پہنچنے پر چھتیس ہزار ہو گئی۔ وہاں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں عساکر اسلامیہ کسی ایک قاعد عام کے ماتحت نہ تھے ہر ایک امیر اپنے دستہ کا مستقل فرمدار تھا۔ اور اسی طرح جُدا جُدا ہر امیر اپنی جمعیت سے مقابلہ کرتا تھا۔

حضرت خالد کے پہنچنے پر ایک ماہ کامل اس طرح گذر گیا کہ پادری اور راہب عساکر روم وشام میں جانبازی ومدافعت ملک وملت کی روح پھونکتے رہے۔ اور جب وہ ہر طرح سر بکف ہو کر میدان کارزار میں نکلے۔ مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے کیلئے تیار ہو گئے تب جمادی الاخریٰ میں فیصلہ کن لڑائی کیلئے خندق سے نکلے اور ایسی شان وشکوہ صف بندی اور ترتیب کے ساتھ اُن کے دستے آگے بڑھے کہ

مسلمانوں کو اس سے قبل کسی ایسے عظیم الشان اور آراستہ اور سامان حرب و ضرب سے مکمل افواج
کیساتھ سابقہ نہ پڑا تھا۔ ادھر مسلمانوں کے پاس نہ ایسا سامان تھا نہ ایسی ترتیب اور پھر ہر ایک دستہ جُدا کسی
ایک حکم کے تابع نہیں۔ یہ حالت سخت خطرناک تھی جس کا احساس حضرت خالد نے فوراً کر لیا اور بڑھکر
امرائے عساکر سے کہا کہ آج کے دن کسی کو اپنی بڑائی۔ فخر اور افسری کا خیال نہ رکھنا چاہیئے۔ یہ تمہارے
کارنامے تاریخوں میں لکھے جائیں گے۔ دوسرے لوگ تمہارے افعال کو سند بنائیں گے۔ تم ایک ایسی
قوم سے جو نہایت آراستہ ہے اس طرح جُدا جُدا مقاتلہ کیلئے نکلے ہو جو کسی طرح دانشمندانہ فعل نہیں ہو سکتا
اور نہ تم جیسے مخلصین اور طالبین اجر و ثواب کیلئے کسی طرح مناسب ہے۔ جس امر میں خلیفۂ وقت کی طرف سے
کوئی خاص ہدایت نہیں کی گئی اس میں تم کو اپنی رائے سے کام لینا چاہیئے۔ سب نے کہا آپ فرمایئے کیا رائے
ہی کہا تو سمجھ لو کہ صدیق اکبر نے ہم کو ایک مقام پر جمع ہونیکا حکم صرف اس لئے دیا ہے کہ ہم ملکر بسہولت
کام کرینگے اور اگر اُن کو تمہاری حالت کا اندازہ ہوتا تو جمع ہونیکا حکم نہ دیتے۔ تمہاری یہ حالت مسلمانوں
کیلئے دشمن کی کثرت اور شوکت سے زیادہ مضر ہے۔ آج اگر ہمنے مل جُل کر اُن کو خندق تک دھکیل
دیا تو پھر کبھی ہمت نہ کرینگے میری رائے تو یہ ہے کہ ہر ایک دستہ کا سردار نمبروار ایک ایک دن کل لشکر
کا قاعد عام بنجائے اور اُس کے زیر کمان ساری فوج نقل و حرکت کرے۔ یہ رائے پسندیدہ ہو تو
آج تمام فوج کی کمان میرے ہاتھ میں دیدو۔ سب نے بخوشی منظور کر لیا۔ دشمن تو یہ سمجھ رہے تھے کہ جیسے اور
دن مقابلہ ہوتا تھا آج بھی ہو گا مگر یہاں رنگ پلٹ چکا تھا۔ حضرت خالد نے ترتیب ہی بدلدی
تھی۔ اور اس طرح لشکر کو ترتیب دیا تھا کہ اس سے پہلے ایسی ترتیب نہ دی گئی تھی۔ معرکہ یرموک کا انجام
جو کچھ ہوا تواریخ اُس سے لبریز ہیں ہماری غرض اس وقت کسی معرکہ کی تفصیل سے بحث کرنا اور اُس کے
نتائج کو منظر عام پر لاکر رکھدینا نہیں ہے۔ ہمارے اس سلسل کلام کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد
عساکر عراقیہ کے قاعد عام تھے اور وہاں سے صرف شام کے عساکر کو تقویت و امداد دینے کیلئے
تشریف لائے تھے۔ افسر اعلیٰ تھے تو اُسی دستہ کے جو اُن کے ہمراہ تھا۔ مگر یرموک پہنچکر اپنی قابلیت
اور ذاتی جوہر حسن تدبیر اور فراست کی بدولت مجتمع افواج کے سپہ سالار اعظم بن گئے۔ اور اسی

حسن تدبیر کا نتیجہ تھا کہ اُس روز سے آپ بحیثیت قاعدعام تسلیم کر لئے گئے۔

حصہ چہارم معزولی و برطرفی امارت عساکر کا زمانہ

حضرت خالد کی پہلی معزولی

اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خالد کی اوّل معزولی کس مقام پر ہوئی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معرکہ یرموک میں اور عین اُس وقت جبکہ سپہ سالاری کا علم اُن کے سر پر لہرا رہا تھا۔ دشمن کی بے جگرانہ مدافعت کرتے ہوئے اُنکو خندق کے مقبرہ میں دفن کر رہے تھے مدینہ منورہ سے قاصد نے آکر صدیق اکبر کی وفات۔ فاروق اعظم کی خلافت اور اُسکے ساتھ ہی اس انقلاب عظیم کی خبر سُنائی کہ حضرت خالد کو معزول کر کے بجائے اُن کے امین الامۃ ابوعبیدہ ابن الجراح قاعدعام بنائے گئے۔ بارگاہ خلافت کا یہ حکم نامہ اول امین الامۃ ہی کے ہاتھ میں دیا گیا۔ مگر اُنہوں نے اُس کو بمصلحت حضرت خالد سے مخفی رکھا اور دوسرے روز اُسکی اطلاع کی۔ اور بعض روایات سے ثابت ہے کہ یرموک کے بعد محاصرۂ دمشق کیوقت معزول کئے گئے ہیں۔ دمشق کے محاصرہ میں بھی حضرت خالد سے فوق العادت دلیری و شجاعت اوّل درجہ کی حسن تدبیر کا ظہور ہوا تھا۔

آپ میں شجاعت و جانبازی۔ فوق الفطرت قوۃ و طاقت۔ بیدار مغزی و فرزانگی سب ہی اوصاف موجود تھے محصورین دمشق نے شہر پناہ کے دروازہ بند کر کے سنگین پہرہ قائم کر دیا تھا فصیل کے بُرجوں اور مورچوں پر فوجیں معین تھیں۔ اندر کی حالت اور کسی قسم کے واقعہ کی اطلاع ملنی ناممکن تھی۔ مگر حضرت خالد ہی ایک ایسے شخص تھے کہ اس سخت بندش کے بعد بھی رتی رتی کی خبر رکھتے تھے گورنر دمشق کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور مجالس عیش و عسرت ترتیب دیگئیں۔ فوج کو مع افسران دعوت دی گئی، کھانے کے بعد مے نوشی کا دور ہوا۔ اور بدمست ہو کر دونوں عالم سے بیخبر ہو گئے۔

حضرت خالد جیسے بیدار مغز سے یہ حال کیونکر مخفی رہ سکتا تھا۔

کان لا ینام ولا ینیم — نہ سوتے تھے نہ سونے دیتے تھے۔

ایسے ہی موقعوں کیلئے رسیوں کی سیڑھیاں بنا رکھی تھیں جن کو فوراً فصیل کے کنگروں میں

پھینک کر اُنکے سہارے سے چڑھ گئے اور عین دروازہ کے اندر کود کر دروازہ کھولدیا۔ اسلامی لشکر داخل ہوگیا۔ اہل دمشق کو خبر ہوئی تو ایسے بدحال تھے کہ دوسرے دروازہ سے نکلکر حضرت ابو عبیدہ سے صلح کی درخواست کی آپ کو حضرت خالد کے واقعہ کی اطلاع نہ تھی اُن سے صلح کرکے قاعدہ عام سے صلحاً داخل دمشق ہوئے۔ دوسری طرف سے حضرت خالد بزور داخل ہوکر لڑ رہے تھے۔ ادھر حضرت ابو عبیدہ داخل ہوئے۔ اور اس طرح آدھا دمشق بزور اور آدھا بصلح فتح ہوگیا۔ عین اس محاصرے کے وقت فاروق اعظم کا حکمنامہ اُن کے عزل اور امین الامت کے تقرر و نصب کا پہنچا جس کو اُس وقت ظاہر کرنا خلاف مصلحت سمجھ کر صلح دمشق کے بعد ظاہر کیا گیا۔

بہر حال کوئی سی روایت صحیح ہو مگر اسقدر یقینی ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی حضرت خالد کو معزول فرمایا تھا۔

معزولی کے بعد کے حالات اس معزولی کا کوئی اثر حضرت خالد کے اوپر نہیں ہوا۔ وہ جس طرح بحیثیت سپہ سالار اعظم کام کرتے تھے اُسی طرح ایک ماتحت افسر کے لباس میں جانبازی کرتے رہے اگر انکا عزل یرموک میں ہوا ہے تب تو اس کے بعد فتح دمشق میں جو کارنامے اُن کے ہاتھ سے ظہور پذیر ہوئے تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں ایسے واقعات گنتی ہی کے پیش آئے ہونگے اور عین محاصرہ دمشق میں معزولی ہوئی ہے تو اس معرکہ کا انصرام اُنہی کے ہاتھوں ہوا۔ اور اُسکے بعد مقام فحل میں اسی انداز سے جانبازانہ داد شجاعت دی۔

بعد ہ امین الامۃ کیساتھ حمص کو روانہ ہوئے اور مقام ذی الکلاع پر منزل کی۔ ہرقل کو اس کی اطلاع ملی تو توذر کی کمان میں بھاری فوج روانہ کی۔ مرج الروم میں مقابلہ ہوگیا۔ توذر حضرت ابو عبیدہ کے مقابلہ پر ایک حصہ فوج کو زیر کمان شنش رومی کے چھوڑ کر خود دمشق کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکالنے کی فکر میں رات کو چلدیا یزید ابن ابی سفیان دمشق کے والی تھے انکو اطلاع پہنچی تو توذر کے مقابلہ کیلئے نکلے اور ایک موقعہ پر معرکہ کارزار گرم ہوگیا۔ عین اس حالت میں عقب سے حضرت خالد نے آدبایا اور اس زور سے حملہ کیا کہ دشمن کے بہت کم آدمی جان بچاکر جا سکے

تو ذر بھی مقتول ہوا۔

اس معرکہ کے بعد امین الامتہ کی ہمرکاب بعلبک۔حمص۔حماۃ۔سلاذقیہ وغیرہ کو صلحاً یا مقابلۃً فتح کرتے چلے گئے اور ان مقامات کے بعد حضرت امین الامتہ نے آپ کو ایک دستہ فوج دیکر قنسرین کی فتح کیلئے بھیجا۔ابھی مقام حاضر ہی پہنچے تھے کہ روم کا عظیم الشان لشکر حضرت خالد کے مقابل آگیا۔یہ رومی لشکر زیر کمان میناس تھا میناس اس پایہ کا شخص تھا کہ ہرقل کے بعد دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا۔میناس کیساتھ سخت مقابلہ ہوا۔روم کے لشکر نے بھی داد شجاعت دینے۔جانبازی کرنیمیں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔اور اسی وجہ سے وہ سب کے سب میدان جنگ میں فنا ہو گئے۔میناس قتل ہوا اس معرکہ کے بعد ہرقل قیصر روم و شام۔شام و الیشیا رکوچک کی حفاظت سے مایوس ہو کر قسطنطنیہ جانے پر مجبور ہوا۔سابق معرکوں کے بعد قنسرین کے عظیم الشان معرکہ اور قیصر روم کے قسطنطنیہ چلے جانیکی خبر اور حضرت خالد کے نمایاں کارناموں کی حالت معلوم ہوئی تو حضرت عمر نے فرمایا

امر خالد نفسہ یرحم اللہ ابا بکر — خالد نے خود اپنے آپکو سپہ سالار بنالیا۔اللہ تعالیٰ ابو بکر پر رحم فرمائے

ھو کان اعلم بالرجال منی — وہ کام کے آدمیوں کو مجھ سے زیادہ پہچانتے تھے۔

حضرت عمر نے شام میں حضرت خالد کو معزول کر کے حضرت ابو عبیدہ کو سپہ سالار اعظم بنایا تھا اور فتوحات عراق کے مدار اعظم مثنیٰ ابن حارثہ کو جو بعد حضرت خالد کے عساکر عراقیہ کے قائد اعظم تھے معزول کر کے حضرت سعد ابن ابی وقاص کو سپہ سالار مقرر فرمایا تھا حضرت مثنیٰ بن حارثہ کے حالات و واقعات اُنکی یا فوق الفطرت شجاعت اور اُن کی مخلصانہ سعی وجانفشانی اُنکی برکات ظاہری و معنوی کے حالات سے ناظرین کرام بیانات سابقہ میں باخبر ہو چکے ہیں۔

اس موقعہ پر حضرت عمر نے حضرت خالد کی تعریف کرتے ہوئے ان دونوں سپہ سالاروں کی معزولی کی وجہ (جس پر عقل ظاہر بین ناعاقبت اندیشی یا عدم قدردانی یا خوف فتنہ و اختلاف کا الزام لگا سکتے تھے) بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

انی لما اعزلھما — میں نے ان دونوں کو کسی تہمت اور بدظنی کی وجہ سے

عن ریبۃ ولکن	معزول نہیں کیا۔ بلکہ لوگوں کے دلوں میں
الناس عظموھما	انکی عظمت انکی تدبیر و شجاعت پر اس قدر اعتماد
فخشیت ان یوکلو	ہو گیا تھا جس سے اندیشہ تھا کہ خداتعالیٰ سے نظر اٹھا کر
الیھما	فتوحات کا انحصار انہیں کی ذات پر نہ سمجھ لیں۔

حضرت فاروق اعظم نے ان دونوں بزرگوں کو معزول کیا جس کے اسباب میں علاوہ بعض مآل اندیشانہ احکام شرعیہ و سیاسیہ کے ان مصالح کا بھی دخل تھا جن کو اس موقع پر ظاہر فرمایا۔ مگر دونوں نے عزل کے بعد وہ نمایاں خدمتیں کیں جن سے ثابت ہو گیا۔ کہ خطا آمارۃ و لذت حکومت و نام آوری کو اُن کے کاموں میں کچھ دخل نہ تھا اور اسی تجربہ و آزمایش کے بعد آپ کا خیال دونوں کی طرف سے بدل گیا جس کا اقرار علی رؤس الاشہاد آپنے کیا۔ اور گو اس اقرار کے بعد وہ اپنے سابق درجہ پر واپس نہ کئے گئے۔ اور حاجت بھی نہ تھی کیونکہ اُن کے کارنامے دونوں حالت میں یکساں تھے۔ پھر کسی جدید تغیر کی کیا ضرورت تھی۔ تاہم آپنے اپنی رضامندی اور اُنکی عظمت و وقار کا اعلان فرمادیا جس سے اُن قلوب کو جن کو بمقتضائے عقل ظاہری کچھ تردد یا خلجان ہونا ممکن تھا اطمینان ہو گیا۔

قنسرین کے بعد حضرت خالد کے ہاتھ پر مرعش فتح ہوا۔ اور اسی طرح بہت سے مواقع میں اپنی تدبیر و شجاعت کے جوہر دکھلاتے ہوئے بیت المقدس کے محاصرہ کیلئے پہنچ گئے اور یہاں سے حضرت عمر کی خدمت میں لکھا گیا کہ بیت المقدس کی فتح آپکے دستِ مبارک پر ہو گی۔ آپ نے مدینے سے بیت المقدس کا قصد فرمایا اور امراء عساکر کو اطلاع دے دی کہ اپنے لشکر پر قائمقام چھوڑ کر ہم سے جابیہ میں آ کر ملیں۔ سوا عمرو بن العاص اور شرجیل بن حسنہ کے کہ وہ تو اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ کیونکہ اندیشہ سخت تھا۔ باقی تمام افسرانِ اعلیٰ جابیہ پر پہنچ گئے۔ سب سے اول یزید ابن ابی سفیان۔ ابو عبیدہ ابن الجراح۔ اور اُن کے بعد خالد ابن الولید گھوڑوں پر سوار آپ کے سامنے اس شان سے آئے کہ حریر و دیباج کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عمر یہ حالت دیکھ کر سواری سے اُتر پڑے اور پتھر اُٹھا کر امراء عساکر کو مارنا شروع کیا اور فرمایا کہ تمہاری حالت میں کس قدر

تغیر آیا اور تم اپنے خیالات سے اتنی جلد بھر گئے۔ تم اس ہیئت میں میرے سامنے آتے ہو۔ ابھی تو دو ہی برس سے تم کو اس طرح کا عیش نصیب ہوا۔ اگر دو سو برس کے بعد بھی تم میں تغیر آتا تو میں تمہاری جگہ دوسروں کو مامور کرتا۔ غرض حضرت عمر کو یہ شان ترفہ و تنعم کی ہیئت نہایت مکروہ اور ناپسند معلوم ہوئی اپکو خیال ہو گیا کہ شام و روم کی عیش پرستی کا اثر ان میں بھی آگیا۔

حضرت عمر کی ناراضی کی جب یہ حالت دیکھی تو اُمراء عساکر نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔

امیر المؤمنین یہ لباس تو محض دکھلاوے کے ہیں۔ ورنہ ہم تو مکمل ہتھیار لگائے ہوئے ہیں حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا اگر یہ بات ہی تو مضائقہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جابیہ پر قیام فرمایا اور اسی مقام پر بیت المقدس بصلح مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔

جب بیت المقدس پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا اور شام کا ملک مسلمانوں کے زیر نگین آگیا تو بڑے بڑے شہر امراء عساکر کی ماتحتی و نگرانی میں دیدیئے گئے۔ خود سپہ سالار اعظم امین الامۃ ابو عبیدہ تو حمص پر مقیم تھے اور آپکی ماتحتی میں حضرت خالد قنسرین پر۔ یزید ابن ابی سفیان دمشق پر۔ معاویہ ابن ابی سفیان اردن پر علقمہ بن مجزز فلسطین پر اور ساحل بحر پر عبد اللہ ابن قیس۔ غرض حضرت ابو عبیدہ ملک شام کے تمام صوبوں پر مشہور افسروں کو معین فرما کر خود حمص میں مقیم تھے۔

ہرقل ملک شام و روم میں مسلمانوں کی فتوحات کا رنگ دیکھ کر قسطنطنیہ چلا گیا لیکن جب حضرت ابو عبیدہ فتح بیت المقدس سے فارغ ہو کر حمص میں مقیم ہوئے تو اہل جزیرہ نے ہرقل کے پاس قسطنطنیہ پیام بھیجا کہ اگر شام کو واپس لینے کیلئے فوجیں بھیجیں تو ہم بھی معین و مددگار رہیں گے۔ ہرقل کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اور اُس نے ایک بھاری لشکر کو مقابلہ کیلئے بھیجا۔

حضرت ابو عبیدہ کو اسکی اطلاع ہوئی تو آپنے امراء عساکر کو حمص پر جمع ہونیکا حکم دیا حضرت خالد بھی قنسرین سے وہاں پہنچے۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ اور اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جمعیت بہت کم تھی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو عبیدہ کو تردد ہوا اور آپنے افسران افواج سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے آیا ہم خود اُن پر حملہ کر کے لڑائی کی ابتدا کر دیں یا قلعہ بند ہو کر امداد کا انتظار کریں۔ حضرت خالد نے مشورہ دیا

کہ نہیں ہم کو فوراً اُن پر حملہ کرکے، لڑائی کی ابتدا کر دینی چاہیے۔ مگر باقی افسروں نے یہ رائے دی کہ ہمکو قلعوں میں محفوظ رہکر امیر المومنین سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور جو حکم آئے اُس کی تعمیل کیجائے کثرتِ رائے اس جانب تھی اور احتیاط کا پہلو بھی اسی میں تھا اسلیے حضرت ابو عبیدہؓ نے اسی رائے پر عمل کیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی کمال دوربینی و مآل اندیشی سے موقع بموقع اسی طرح رسالکی چھاؤنیاں ڈال دی تھیں کہ جس سمت اور جس نواح میں امداد کی ضرورت ہو فوراً فوج رسالہ پہنچ جائے۔ کوفہ میں چار ہزار سوار موجود تھے۔ آپکی خدمت میں حضرت ابو عبیدہؓ کا اطلاعی خط پہنچا تو آپ نے حضرت سعد ابن ابی وقاص کو تحریر فرمایا کہ کوفہ سے قعقاع کو فوراً ابو عبیدہؓ کی امداد کیلیے روانہ کردیں وہ دشمنوں کے نرغہ میں محصور ہیں۔

اہل جزیرہ ہی اس ساری لڑائی کے بانی مبانی ہرقل کو اکسانیوالے تھے جب ہرقل نے اپنی فوجیں حمص کی طرف بڑھادیں تو اہل جزیرہ بھی حسب وعدہ مقابلہ کیلیے تیار ہوئے اُن میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔

حضرت عمر نے اہل جزیرہ کی روک تھام کیلیے حضرت سعد کو تحریر فرمایا کہ سہیل ابن عدی کو رقہ کی طرف روانہ کریں اور عبداللہ ابن عتبان کو نصیبین کی طرف۔ ولید ابن عقبہ کو عرب جزیرہ کے قبائل ربیعہ و تنوخ کے مقابلہ کیلیے روانہ کریں اور عیاض ابن غنم کو بھی اُنکے مقابلہ کیلیے بھیجیں۔ اگر اہل جزیرہ سے لڑائی کی نوبت آئی تو عیاض ابن غنم افسر اعلیٰ تمام افواج کے ہونگے۔ غرض اس طرح حضرت عمرؓ ہر جانب کا بند و بست کرکے اور تمام ہدایات بھیجکر خود بھی حضرت ابو عبیدہ کی امداد کیلیے مدینے سے روانہ ہوکر جابیہ تک پہنچ گئے۔

یہاں یہ ہوا کہ جب اہلِ جزیرہ نے اپنے گرد و پیش عساکر اسلامیہ کی خبریں سنیں اُن کے تو ہوش اُڑ گئے سب وعدے بھول گئے رومی لشکر کو بیچ میں چھوڑکر ادھر اُدھر متفرق ہو گئے۔ ابھی تک قعقاع بن عمرو حمص تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ اہل جزیرہ کی متفرق ہوکر بھاگ نکلنے کی خبریں حضرت ابو عبیدہ تک پہنچیں اور اُس جانب سے اطمینان ہو گیا۔ آپنے حضرت خالد سے مشورہ کیا کہ اب جارحانہ حملہ کریں۔ حضرت خالد نے مشورہ دیا کہ ضرور کرنا چاہیے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اس مشورہ پر کاربند ہوکر حملہ کر دیا مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ قعقاع ابن عمرو تازہ امداد لیکر تین دن بعد فتح کے پہنچے۔ اس میں گفتگو ہوئی کہ

وہ مال غنیمت میں شریک کیے جائیں یا نہ کیے جائیں۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھا گیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ ضرور شریک کیے جائیں۔

اہل جزیرہ جب مقابلہ سے کنارہ کر کے منفرق ہو گئے تب مسلمانوں کو جزیرہ کی فتح کا خیال ہوا۔ اُدھر تو حضرت سعد ابن ابی وقاص سپہ سالار عراق نے عساکر اسلامیہ کو جزیرہ کی طرف بھیجنا شروع کیا اُدھر حضرت ابوعبیدہ سپہ سالار شام نے عیاض ابن غنم کو اُدھر روانہ کیا اور اس طرح جزیرہ و آرمینیا فتح ہو گئے۔ اس فتح کے متعلق صحیح روایت یہی ہے کہ عساکر شامیہ عیاض ابن غنم کی زیر کمان فتح جزیرہ کیلئے آئے تھے۔ مگر بعض روایتوں سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد ابن الولید بھی عیاض کے ہمراہ تھے۔ یہ روایت اوّل تو روایات صحیحہ کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت خالد کا سوا حضرت ابوعبیدہ کے کسی اور افسر کی ماتحتی میں کام کرنا ثابت نہیں ہے۔

حضرت خالد کی دوسری مرتبہ معزولی۔ پہلی معزولی تو باختلاف روایات باعین معرکہ یرموک کے وقت ہوئی جبکہ حضرت خالد تمام عساکر اسلامیہ کے قاعد عام بنکر کثیر التعداد لشکر روم کو زیر و زبر کر رہے تھے۔ یا عین محاصرۂ دمشق کے وقت جس میں حضرت خالد کی حسن تدبیر و بیداری کے وہ جوہر ظاہر ہوئے جنکی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ بہرحال اُن کی معزولی کسی جگہ ہوئی۔ مگر ہوئی ایسے وقت جبکہ وہ عظیم الشان ذمہ داری کا کام اپنے اوپر لئے ہوئے مسلمانوں اور اسلام کیلئے سپر بنے ہوئے تھے لیکن آپنے اس معزولی کے بعد بجائے شکستہ دل ہونیکے پہلے سے زیادہ چستی و جانبازی دکھلائی جس کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ تو ارشاد فرمایا

عجزۃ النساء ان یلدن مثل خالد — عورتیں خالد جیسے شخص کے جننے سے عاجز ہیں۔

اب دوسری معزولی کا وقت آتا ہے جو پہلی معزولی سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔

حمص کے معرکہ کے بعد حضرت خالد و عیاض ابن غنم دونوں افسروں نے سرحد روم کی جانب حملہ کیا اور وہاں سے اُن دونوں کو بہت سا مال غنیمت ملا۔ اس خبر کا چرچا ہوا تو بہت ذی حاجت لوگ حضرت خالد کی خدمت میں آکر طالب امداد ہوئے۔ ان طالبین میں بعض شعراء بھی تھے اشعث ابن

قیس بھی اُن لوگوں میں تھے حضرت خالد نے اُنکو دس ہزار درہم عطا فرمائے۔

حضرت خالد کی اس طرح دریادلی کے ساتھ انعام و اکرام کرنے کی خبریں فوراً حضرت عمر کی خدمت میں پہنچیں۔ ادھر ایک واقعہ ور پیش آیا کہ حضرت خالد حمام میں غسل کیلئے تشریف لیگئے۔ وہاں جو اُبٹنا بدن کو ملا اُسکی نسبت معلوم ہوا کہ اس میں شراب ملی ہوئی تھی۔ یہ خبر بھی حضرت عمر کی خدمت میں پہنچی۔ کیونکہ آپکی عمال کی ایک ایک حرکت پر نظر رہتی تھی اور اُنکی کوئی چھوٹی بڑی بات مخفی نہ رہ سکتی تھی۔ ہزارہا میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایسی نگرانی فرماتے تھے کہ گویا وہیں موجود ہیں آپنے حضرت خالد کو حمام کے واقعہ کے متعلق لکھا۔ جس کا جواب اُنہوں نے دیا کہ وہ اُبٹنا ایسا ہوا تھا۔ شراب رہا تھا غرض ان دونوں واقعوں کا اثر یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے امیر عساکر حضرت امین الامتہ ابو عبیدہ کو لکھا کہ خالد کی مشکیں اُنکے عمامے سے باندھ کر اور کلاہ سر پر سے اُتار کر مجمع عام میں کھڑا کریں اور اُن سے دریافت کریں کہ یہ انعامات کہاں سے دیئے ہیں۔ مال غنیمت میں سے یا اپنے مال سے۔ اگر وہ یہ جواب دیں کہ اموال غنیمت میں سے دیئے ہیں تب تو صریح خیانت ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ اپنے مال میں سے دیئے ہیں تو یہ اسراف اور مال کا ضائع کرنا ہے اور ہر حال میں اُن کو امارت سے معزول کر کے اُنکے متعلقہ کام کو اپنی نگرانی میں لیلیں حضرت امین الامتہ نے بہ تعمیل احکام خلیفۃ الاسلام حضرت خالد کو قنسرین سے طلب فرماکر ایک عام جلسہ کیا۔ خود ممبر پر بیٹھے حضرت عمر کے یہاں سے جو صاحب حکمنامہ لیکر آئے تھے وہ کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے حضرت خالد سے سوال کیا کہ اشعب کو انعام کہاں سے دیا۔ حضرت خالد نے کچھ جواب نہ دیا حضرت ابو عبیدہ ساکت و صامت منبر پر بیٹھے تھے۔ آخر حضرت بلالؓ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر حضرت خالد سے فرمایا کہ امیرالمومنین کا حکم آپکے بارہ میں یہ ہے۔ اور کلاہ اُتار کر نیچے رکھی اور اس کے بعد اُن کو کھڑا کر کے عمامے سے باندھا۔

یہ سب کچھ کیا گیا۔ مگر حضرت خالد نے احکام خلافت کی حرمت اور اطاعت کے لحاظ سے کسی بات سے اُن کو نہیں روکا جب کلاہ اُتار چکے اور عمامے سے اُن کو کس دیا گیا تو کہا اب بتلاؤ کہ اشعب کو انعام کہاں سے دیا۔ اپنے مال میں سے یا غنیمت میں سے حضرت خالد نے جواب میں

کہا غنیمت میں سے نہیں بلکہ اپنے مال میں سے دیا۔ یہ جواب سنکر حضرت ابو عبیدہ نے اُن کو کھولدیا۔ اور اپنے ہاتھ سے کلاہ سر پر رکھی۔ اور اپنے ہاتھ سے اُن کا عمامہ باندھا اور اور ارشاد فرمایا

نسمع ونطیع لولاتنا ونفخم ونخدم موالینا	ہم اپنے والی اور خلفاء کے حکم کو سنتے اور اطاعت کرتے ہیں اور اپنے بزرگ لوگوں کی تعظیم کرتے اور اُن کی خدمت کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ تو ہو چکا۔ مگر حضرت ابو عبیدہ نے تو اُن کی عظمت اور بزرگی کے لحاظ سے معزولی کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ حضرت خالد کو یہ حیرانی پیش تھی کہ اب میں کیا کروں۔ معاملہ اسی پر ختم ہو چکا کہ اب مجھکو اپنے مستقر پر جاکر ابو عبیدہ کے کاموں کو سرانجام دینا چاہیئے۔ یا اسکے بعد معزول بھی ہو چکا ہوں۔ ایک عرصہ اسی تحیر میں گذر گیا۔ آخر جب مدینہ منورہ حاضر ہونے میں دیر ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ نے از روئے فراست سمجھ لیا کہ اُن کو معزولی کی اطلاع نہیں دی گئی۔ تب آپ نے براہ راست اُنکو مدینے چلے آنیکے لئے لکھا۔ حضرت خالد کو اپنی معزولی اور واپسی مدینے کا حکم ملا تب اول تو آپ قنسرین تشریف لیگئے۔ وہاں مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور سب کو رخصت کیا۔ اسکے بعد حمص تشریف لائے اور وہاں بھی عام جلسہ میں خطبہ پڑھکر سب کو الوداع کہا اور مدینے منورہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

یہاں پہنچکر حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔

قد شکوتك الی المسلمین فباللہ انك فی امری لغیر مجمل	میں نے آپ کا شکوہ مسلمانوں سے کیا۔ قسم ہے خدا کی آپ میرے معاملہ میں اچھا سلوک کرنے والے نہیں ہیں۔

حضرت عمر نے فرمایا اس قدر مال کہاں سے آیا۔ اور یہ ثروت کیونکر نصیب ہوئی۔ عرض کیا مال غنیمت کے سہام سے ساٹھ ہزار سے جو زائد ہو وہ آپ لے لیجیئے۔ تخمینہ کرایا گیا تو ساٹھ ہزار سے بیس ہزار زائد تھا اُسکو لیکر بیت المال میں داخل کر لیا گیا۔ اسکے بعد حضرت خالد سے خطاب کر کے فرمایا۔

یا خالد واللہ انك علی لکریم وانك الی لحبیب	اے خالد قسم ہے اللہ کی تم مجھے بہت ہی عزیز اور محبوب ہو۔

اور پھر تمام امصار و بلاد کے مسلمانوں اور والیوں کو عام اطلاع بدین مضمون فرما دی۔

انی لم اعزل خالدا عن سخطة ولا خیانة و
لکن الناس فخموہ وفتنوا به فخفت ان
یوکلوا الیه فاحببت ان یعلموا ان الله
هو الصانع والایکونوا بعرض فتنة

میں نے خالد کو ناراضی یا خیانۃ کی بنا پر معزول نہیں کیا لیکن لوگوں کے
دلوں میں اُنکی عظمت زیادہ ہوگئی ہے اور وہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے
مجھے اندیشہ ہو گیا تھا کہ اُنہیں پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں اسلئے میں نے
پسند کیا کہ وہ جان لیں کہ کرنیوالا محض اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں

اسکے بعد بیس ہزار کی رقم جو حضرت خالد سے لیکر بیت المال میں داخل کی تھی وہ اُنکو واپس فرما دی۔
معزولی اور حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہونے پر حضرت خالد کے اُن کارناموں کا جن سے
دنیا متحیر تھی اختتام ہوتا ہے۔ اسکے بعد حضرت عمر نے اگرچہ بار بار اصرار فرمایا کہ وہ کوئی عہدہ ولایت
ملک یا سپہ سالاری افواج قبول فرمائیں۔ مگر انکار کرتے رہے اور کسی عہدہ کو قبول نہ فرمایا۔ عزلت و یکسوئی
کی حالت میں بقیہ عمر کو گذار دیا۔ ۲۱ھ میں بمقام حمص (ملک شام) یا مدینہ منورہ میں وفات پائی۔
حضرت خالد کو حسرت تھی کہ میدان کارزار میں اُن کی وفات ہوتی بلکہ بزدلوں یا کاہل اور سست
لوگوں کی طرح بستر راحت پر جان دی۔ وہ اپنی آخری حالت میں فرماتے تھے کہ ہر موقع پر اپنے قتل و موت
کا متلاشی رہا۔ مگر نصیب نہ ہوا اور آج میں بستر پر جان دیتا ہوں۔ یہ بھی فرمایا کہ میں سو معرکوں میں شریک
ہوا ہوں اور میرے بدن پر بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں جس میں تلوار یا نیزہ یا تیر کا زخم نہ لگا ہو۔ مگر آج
اونٹ کی طرح بستر پر مرتا ہوں۔ خدا بزدلوں کی آنکھ کو لذت سے آشنا نہ کرے۔ یعنی بزدل اور راحت پسندوں
کو راحت و عیش نصیب نہ ہو۔

حضرت خالد کے اُن حالات کی طرف جو ایک مومن کامل صاف باطن آلائش کدورات نفسانی
سے طاہر و مطہر ہو چکا ہو اور جس کے جسم و روح اوصاف کمال سے متصف جلال و جمال خداوندی کے
سامنے اپنے اختیار و ملکات سے منسلخ ہو چکی ہوں ہمارے بیان مذکورہ میں کافی اشارہ ہو چکا ہے۔
اُن کے علاوہ اور بھی واقعات ایسے ہیں جن سے آپکی مقبولیت عنداللہ اور حب دنیا و ما فیہا سے
کامل یکسوئی کا پورا ثبوت مل سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانیکے بعد ہی سے آپ اپنا تعلق دنیا کی لذتوں اور راحتوں مال

و دولت اولاد و رفقاء سے منقطع کر چکے تھے۔ یہانتک کہ وہ ضروری اسباب معیشت کو جنکی ہر متنفس کو ضرورت ہوتی ہے اور اُس سامان حرب ضرب کو جو عرب کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا اور بالخصوص اُس شخص کیلئے جو اپنی جان کو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کیلئے سپر بنائے ہوئے ہو نہایت ہی لازمی تھا استعار حیثیت سے زیادہ رکھنا پسند نہ فرماتے تھے۔

اصابہ میں صحیحین سے حضرت ابوہریرہ کی حدیث نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خالد نے اپنی زرہ اور سامان کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے یعنی اپنی ملکیت سے نکال دیا اور بطور متولی اپنا قبضہ باقی رکھا جس کا حاصل یہی ہے کہ مملوک مال میں وراثت جاری ہوتی ہے نہیں ہوگی۔ یہ تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کا واقعہ ہے جو حضرت خالد کے اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لیکن اسکے بعد بھی آپ اپنا سامان اسی طرح فی سبیل اللہ وقف کرتے رہے سیاق حالات اسکی شہادت دیتا ہے کہ آپنے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ سب سے بہتر اور مرغوب نفس اشیاء کو اپنے ملک میں باقی نہ رکھیں۔ وفات کیوقت گھوڑا اور آلات حرب جو اُنکی ملک میں تھے اُن کو بھی وقف فرما دیا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بسری اولاد موجود تھی مگر دنیا سے یکسوئی اور بے تعلقی نے یہ رنگ دکھلایا کہ تھوڑے ہی زمانہ بعد سلسلہ اولاد منقطع ہو گیا۔ اور آج اُس نام آور شہ مرد اور فدائے اسلام کی کوئی یادگار موجود نہیں اُن کا قلب جس طرح دنیا سے بے لگاؤ تھا۔ اسی طرح اُن کے تعلقات جسمانی بھی روئے زمین سے منقطع کر دیے گئے اور سواء اُس اصل اُصول تعلقات اسلامی اور مذہبی قوی علاقہ کے کوئی علاقہ باقی نہ رہا اور یہی وہ علاقہ ہے جسکی وجہ سے آج اُنکی یاد دلوں میں اسی طرح تازہ ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بے اختیارانہ کرامات کا صدور بھی ہوا مثلاً زہر کی ڈلی کو نگل جانا جس کا بیان گذر چکا ہے یا شراب کا سرکہ بنجانا۔ ایک شخص شراب کا مشکیزہ لئے ہوئے آپکے سامنے آیا۔ دریافت کیا اس میں کیا ہے اُس نے کہا یہ سرکہ ہے آپنے فرمایا۔

جعله الله خلا (خدا تعالیٰ اسکو سرکہ بنادے)

دیکھا تو وہ سرکہ ہی تھا۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب آپکی دعا سے شہد بنگئی۔ ممکن ہو کہ واقعات متعدد ہوئے ہوں ایک موقع پر شراب کا سرکہ بنگیا ہو اور ایک موقع پر شہد اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ ایک ہی ہو اور یہ اختلاف روایت کا اختلاف ہو بہرحال نفس قبولیت دعا میں شک کی کوئی وجہ نہیں ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپکو معزول ضرور کیا اور وہ معزولی جیسا کہ وہ خود فرما چکے ہیں کسی بدظنی کی وجہ سے نہ تھی اور نہ حضرت خالد پر کوئی الزام تھا۔ اگر ظاہری طور پر الزام تھا بھی تو اُن کے پاس ایسا جواب موجود تھا جس کو سُن کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مان لیا تھا اور باوجود حضرت عمر کے اصرار کے معزول نہ کیا تھا۔ معزولی کے اسباب کو حضرت عمر نے مختلف مواقع میں خود ظاہر فرمایا ہی اور سب سے بڑے سبب کو ہم ابھی حضرت عمر کے الفاظ میں نقل کرچکے ہیں لیکن آپکو ان سے وہی تعلق باقی تھا اور وہی محبت قلب میں مرکوز تھی جو صادق الایمان افراد میں ہوتی ہے اور جو حضرت عمر جیسے صاحب فراست مدبر اور صاحب باطن کو حضرت خالد جیسے بہادر اور کارگذار وجان نثار کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی۔ معزولی کے بعد قبول عہدہ پر اصرار اسی کی دلیل ہی حضرت خالد نے وقت وفات حضرت عمر کو اپنا وصی مقرر کیا۔ جو اسکی کافی شہادت ہی کہ حضرت خالد کے دل میں اس معزولی کا جس کا ظہور ظاہر بینوں کے خیال میں بے عنوانی یا بانفاذ دیگر ہتک آمیز طریقہ سے ہوا تھا کچھ اثر باقی نہ تھا۔ بلکہ جن حکم اور مصالح کو حضرت عمر سمجھتے تھے اُن کو حضرت خالد بھی خوب جانتے تھے۔ آخر سب کے سب ایک اُستاذ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شاگرد۔ ایک مرشد کے حلقہ بگوش ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ایک ہی خانقاہ کے فیضیاب تھے۔ کیوں نہو ارشاد جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی۔

اصحابی کالنجوم بایھم	(میرے اصحاب ستاروں جیسے ہیں جس کا اقتداء
اقتدیتم اھتدیتم	کروگے ہدایت پاؤگے)

حضرت خالد کو معرکہائے قتال سے یہ شغف اور خدمت اسلام کا یہ ذوق وشوق جو خود فرماتے

ہیں کہ کلمہ توحید شہادت کے بعد کوئی عمل میرے نزدیک اس رات سے زیادہ کارآمد اور موجب اجر نہیں کہ میں اندھیری رات میں جبکہ آسمان سے بارش بھی ہو رہی ہو ڈھال تلوار لگائے صبح کا انتظار کر رہا ہوں اور پھر کسی ایسی خدمت کو قبول نہ کرنا جس میں انکی دلی تمنائیں پوری ہوں۔ خود اسی کی دلیل ہے کہ معاملہ عزل میں جن حکمتوں اور مصلحتوں پر حضرت عمر کی نظر تھی اُن کو حضرت خالد بھی ایسا ہی سمجھے ہوئے تھے۔

حضرت خالدؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ نے کمال اندوہ وملال کا اظہار فرمایا۔ خاندان بنی مخزوم کو ایسے نامور فدائی اسلام کی مفارقت کا قلق اور بے انتہا قلق ہونا لازمی اور ضروری امر تھا اُنکے خاندان کی عورتیں سب کی سب اس جانگداز صدمہ پر حزن وملال کیلئے جمع ہو کر ماتم کر رہی تھیں حضرت عمر وہ شخص ہیں کہ صدیق اکبر کی وفات پر اُن کے پسماندوں نے کچھ اضطراب کا اظہار کیا تو اُسی وقت بشدت روک دیا اور گو اُن کا اضطراب حد جواز میں داخل ہو مگر آپ نے صدیق اکبر کے گھر میں اسکو بھی پسند نہ کیا اور آج جبکہ نساء بنی مخزوم خالد جیسے شیر مرد پر رونے اور آنسو بہانے کیلئے جمع ہوئیں تو آپ نے صرف اتنا فرمایا

ما علیھن ان یبکین ابا سلیمان ما لم یکن نقع او لقلقۃ	کیا حرج ہے اگر وہ ابو سلیمان پر روئیں بشرطیکہ آوازیں بلند نہوں۔ ماتم کی صدائیں سے شور برپا نہو۔

حضرت عمر نے ایک شخص کو رجز میں حضرت خالد کے اوصاف ومدائح کرتے سنا تو اسکو حد نوحہ میں داخل نہ سمجھا اور نہ ممانعت فرمائی۔ بلکہ خود بھی زبان مبارک سے فرمایا۔

رحم اللہ خالداً	(اللہ تعالیٰ خالد پر رحمت نازل فرمائے)

حضرت طلحہ ابن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے آپکی زبان سے انکا ذکر خیر سنا تو بطور تمثیل یہ شعر پڑھا۔

لا الفینک بعد الموت تندبنی وفی حیاتی ما زودتنی زادی	(ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد مجھے یاد کرو اور زندگی میں مجھے میرے توشہ اور ما یحتاج واجبی سے بھی محروم رکھا)

اسمیں اشارہ تھا کہ زندگی میں تو آپ نے اُن کے ساتھ بیرخی اور اعراض کا معاملہ کیا اور اب اُن کے اوصاف سُنتے اور بیان کرتے ہیں حضرت طلحہ ابن عبید اللہ کا یہ فرمانا جو عشرہ مبشرہ میں ایک فرد اور کامل ومکمل درجہ کے صحابی تمام رموز واسرار شریعت سے واقف اور حکم ومصالح انتظامی کے محرم راز تھے۔

حضرت عمر کی ایمانی فراست اور دوربینی و دوراندیشی کو بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے بطور اعتراض ہرگز نہ تھا بلکہ بطور مزاح اور خوش طبعی تھا حضرت عمر بھی اسکو اعتراض نہ سمجھتے تھے۔ تاہم آپ نے حضرت خالد کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کو مناسب سمجھا اور فرمایا۔

انی ما عتبت علی خالد لا فی تقدمہ وما کان یصنع فی المال	(میں نے خالد پر سوا اسکے کسی بات پر عتاب نہیں کیا کہ وہ استقلال آئے سے کام کر بیٹھتے تھے اور مال کو بھی اپنے اختیار سے صرف کرتے تھے)

فتوحات اسلام کی توسیع اور اسلام کی تقویت و تائید میں حضرت خالد کی بےجگرانہ شجاعت و بسالت اور فوق الفطرۃ شہادۃ وقوۃ کے حالات اکثر باخبر حضرات سے مخفی نہیں ہیں اور جیسا کہ تقضار عقل تجربہ ہے یہ حالات اُن کے ذاتی اوصاف و ملکات کی طرف منسوب ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں جبکہ وہ خود ہادی برحق سے برسر مقابلہ ڈھال تلوار لئے ہوئے تھے اُنکی شجاعت کے کارنامے سب ہمچشموں سے فائق و برتر تھے اسلام نے اُنہیں ملکات و قوی میں ایمان کی تازہ روح پھونکدی تھی۔ اُنکے وہ ملکات جو دنیا اور جاہ و ریاست کی طلب و تقویت میں صرف ہوتے تھے اب تلوثات بشری سے معرا و منسلخ ہو کر خدا کی راہ میں صرف ہونے لگے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے اور اسکو اسی طرح مان لینا چاہیئے۔ مگر حضرت خالد اپنی تمامتر کامیابیوں کو موئے مبارک کی برکت کا ثمرہ سمجھتے تھے جو اُنکی کلاہ میں ٹکے ہوئے تھے جسکو سر پر رکھکر میدان کارزار میں نکلتے تھے۔ ایک بار میدان یرموک میں یہ کلاہ گم ہوگئی۔ حضرت خالد کے قلق و اضطراب کی کوئی انتہا نہ تھی لوگوں کو اُسکی تلاش پر مامور کیا نہ ملی۔ تو پھر تاکید کی کہ جس طرح ہو سکے تلاش کر کے لاؤ۔ خود بھی اسی جستجو میں برابر گشت کرتے رہے۔ آخر مل گئی لوگوں نے اسقدر اضطراب اور فکر کا سبب پوچھا۔ فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایکبار عمرہ میں فرق مبارک کے بال منڈائے لوگ اُنکے لئے دوڑے مگر میں نے سب سے آگے بڑھکر لیلیا۔ اور اپنی ٹوپی میں رکھ لیا۔ اسکے بعد جب کسی معرکہ میں شریک ہوا ہوں تو یہ ٹوپی میرے ساتھ رہی ہے اور اُسکی برکت سے نصرۃ و فتح کے آثار نمایاں ہوتے رہے ہیں۔

یہ تھا صحابہ کا ایمان کامل اور اپنے ہادی کے ساتھ عقیدت و محبت کا حال ایک شیر دل جانباز مدبر و فرزانہ جس کی ساری عمر انہیں بہادرانہ کاموں میں گذری ہو۔ جو معرکہائے جنگ و قتال کو بچوں کے

کھیل سے زیادہ نہ سمجھتا ہو۔ نور ایمانی نے اُسکے دلمیں حقائق اور ممکنات کے راز کو منکشف کر دیا اور اب کسی فعل کو اپنی ذات یا صفات کی طرف سے نہیں سمجھتا۔ اس زمانہ کے روشن خیال تو اسکو توہم پرستی یا عامیانہ عقیدت پر محمول کر سکتے ہیں۔ مگر حقیقت الامر یہی ہے جو وہ سمجھے اور ہر مومن کامل کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے

حضرت خالد کے تینوں زمانوں کا حال مختصراً اس بیان میں آچکا ہے۔ ہم اسوقت اُنکی تاریخ لکھنے کے درپے نہیں ہیں ورنہ اور بھی کچھ حالات لکھ سکتے تھے۔ ہمارے اس بیان میں اُنکے دوبارہ معزولی کے حالات بھی گذر چکے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ اُنکی معزولی کے اسباب کو تفصیل سے بیان کر کے ایک تنقیدی نظر ڈالیں جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ اصلی سبب اُس کا کیا تھا۔

حضرت خالد ایک دلیر اور جانباز سپاہی تھے اور ایسے شخص سے بمقتضا جرأت بعض افعال ایسے بھی سرزد ہو جاتے ہیں جو بظاہر تدبّر انجام بینی کے خلاف معلوم ہوتے ہیں حضرت خالد معاملات حربیہ کے اندر تدبّر میں بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ گذشتہ بیانات سے اس کا ثبوت مل چکا ہے۔ تاہم اُن سے بعض ایسے امور بھی صادر ہوئے۔ جو خود جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی منشا مبارک کے خلاف اور مصلحت اسلام کے منافی تھے سب سے پہلا واقعہ تو وہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی جذیمہ کیطرف انکو بھیجا۔ انکو دعوت اسلام کیلئے بھیجا گیا تھا نہ مقاتلہ کیلئے، لیکن وہاں پہنچکر مقتضاء حالات حضرت خالد نے بنی جذیمہ کے چند افراد کو قتل کر دیا۔ جسکی خبر پہنچنے پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کیطرف ہاتھ اُٹھا کر فرمایا

اللھم انی ابرء الیک مما صنع خالد	(الٰہی میں خالد کے اس فعل سے بری ہوں)

لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اس اظہار ناراضی کے اُنکی اس حرکت کو غلطی رائے کے سوا کسی امر پر محمول نہیں فرمایا۔ اور اسی وجہ سے اُنکو پھر بھی ایسی ہی اہم خدمات کیلئے مامور فرماتے رہے۔ چنانچہ دومۃ الجندل کے نواب اکیدر ابن عبدالملک کے مقابلہ کیلئے بھیجے گئے اور وہ اُسکو قید کر لائے اس طرح نجران کیطرف قبیلہ مذحج کی ہدایت و تبلیغ اور درصورت عدم انقیاد و تسلیم مقاتلہ کیلئے بھیجے گئے۔ آپ وہاں گئے۔ اُن کو دعوت اسلام دی وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور آپ اُن کو ..... ارکان اسلام کی تعلیم دینے کیلئے خود تو وہاں اقامت پذیر رہے۔ مگر ان حالات کی اطلاع تحریری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت مبارک میں بھیجدی جس پر ارشاد صادر ہوا کہ خود معہ اُن لوگوں کے جو آنا چاہیں یہاں حاضر ہو جائیں آپ ایک جماعت کو لیکر حاضر خدمت ہو گئے۔

اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک برابر خدمات انجام دیں اور ہر ممکن سعی سے آپکی رضا حاصل کرتے رہے۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ سب حالات پیش نظر تھے۔ ایک طرف آپ حضرت خالد کے جوہر ذاتی سے واقف دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد کا جو اُن پر تھا حال جانتے تھے۔ بارگاہ رسالت پناہ سے جو خطابات اُن کو عطا ہوئے تھے اُن کا بھی علم تھا۔ اس لئے مسند خلافت حقہ پر متمکن ہوتے ہی صدیق اکبر نے بھی مہمات اسلامیہ کے سرانجام کیلئے اُنپر اعتماد فرمایا۔ فتنہ ارتداد کا انسداد مسیلمہ کذاب جیسے سخت اور قوی ترین دشمن اسلام کی سرکوبی انکے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ مگر اس زمانہ میں بھی اُن سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جنکی اگر صحیح تاویل نہ کی جاتی تو وہ مورد اعتراض بن سکتے تھے۔

مالک ابن نویرہ بھی اُنھیں لوگوں میں تھا جس نے خلافت صدیق اکبر میں فتنہ ارتداد کے اندر حصہ لیا تھا حضرت خالد نے مختلف اقوام و قبائل کو سیدھا کرتے ہوئے موضع بطاح کیطرف جہاں مالک ابن نویرہ کا قیام تھا رُخ کیا تو اب مالک کو فکر ہوئی۔ وہ اپنی حرکت پر نادم تھا اُسنے اپنی قوم کو جمع کر کے نصیحت کی اور کہا بہتر ہے کہ ہم اپنی حرکت کا تدارک کر کے حلقہ بگوش بنجائیں۔ یہاں تو مشورہ کے بعد طے ہوا اُدھر حضرت خالد نے بطاح کی طرف بڑھنا چاہا تو انصار نے متابعت سے بدیں وجہ انکار کیا کہ قبیلہ بزاخہ سے فراغت کے بعد ہمکو بارگاہ خلافت سے یہ حکم ہے کہ تا صدور حکم ثانی اسی جگہ مقیم ہیں حضرت خالد فرماتے تھے کہ اوّل تو مجھکو پیش قدمی کی اجازت مل چکی ہے اور اگر اجازت بھی نہ ملتی اور میری رائے میں یہی امر مناسب ہوتا تب بھی مجھے کرنا چاہیئے تھا ہمکو وقت فرصت ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

یہ واقعہ بھی اُنھیں امور میں داخل ہو سکتا ہے جو حضرت خالد بتقضائے مصلحت وقت بلا استفسار اجازت اپنی رائے سے کر بیٹھتے تھے اور ایسے ہی اُمور کو حضرت عمر نے تقدم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت خالد تو روانہ ہو گئے۔ انصار اول تو رُکے لیکن بعد میں وہ بھی جاکر شریک ہو گئے مالک فی الحقیقت اپنے خیالات کو ترک کر چکا تھا۔ ادھر سے حضرت خالد کا لشکر پہنچگیا اور کچھ سوار مالک کو مع ہمراہیوں کے اسیر کر لائے جو رات کو حضرت خالد کے حکم سے قتل کر دیے گئے۔ مالک کے قتل کے بعد حضرت خالد نے اُسکی زوجہ سے نکاح کر لیا۔

ادھر تو مالک کا قتل اُدھر اُسکی زوجہ سے نکاح کر لینا یہ دونوں امر ایسے تھے جس پر اکثر صحابہ کے خیالات انکی طرف سے بدل گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناراضی انتہا کو پہنچگئی آپ نے صدیق اکبر سے اُنکو معزول کر دینے پر اصرار کیا۔ مگر صدیق اکبر نے حضرت خالد کے عذر اور تاویل کو صحیح مان کر معزولی سے انکار فرما دیا اور یہ فرمایا میں اُس تلوار کو کیونکر میان میں کردوں جسکو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعداء اسلام کیلئے میان سے نکالا ہی۔

دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کیوقت سے وفات تک تمام زمانہ سرفروشی و جان نثاری میں دو معاملے اُن سے ایسے سرزد ہوئے تھے جنمیں وہ متہم ہو کر قابل عزل سمجھے جا سکتے تھے۔ ایک بنی جذیمہ کا قتل جو خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا جس پر آپنے اظہار ناخوشی بھی فرمایا۔ اور اسی واقعہ کی وجہ سے اُن میں اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف میں تیز کلامی اور مناقشہ بھی ہوا جسکی تفصیل گذر چکی ہے دوسرا یہ واقعہ جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں پیش آیا۔ اول واقعہ میں تو اُنپر یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اُنھوں نے بنی جذیمہ کو اپنے چچا فاکہ ابن المغیرہ کے عوض قتل کیا ہی اور دوسرے میں یہ گمان ہو سکتا تھا کہ مالک ابن نویرہ کو معہ رفقاء کے اس وجہ سے قتل کرا دیا کہ اُسکی حسین و جمیل بیوی سے نکاح کرنا تھا اور یہ دونوں باتیں ایسی سخت تھیں کہ اُن سے کسی طرح درگذر نہو سکتا تھا یہی وجہ بھی کہ دونوں واقعوں میں مہاجرین و انصار نے اُنکا ساتھ نہ دیا بلکہ بگڑ بیٹھے۔ مگر باوجودیکہ یہ دونوں فعل نہایت ہی ناگوار تھے اور وہ عمداً انہیں اغراض کی تحصیل کیلئے کئے جاتے جیسا کہ ظاہراً گمان ہو سکتا تھا صادر ہوتے تو اُن سے کسی طرح درگذر نکیا جاتا۔ مگر حضرت خالد نے جو کچھ کیا اُس میں اُنکی غرض کو ہرگز دخل نہ تھا۔ بنی جذیمہ کا قتل صرف اسوجہ سے ہوا کہ اُنھوں نے اپنے اسلام کو ایسے الفاظ میں ظاہر کیا جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ وہ اسلام سے پھر گئے

ایسی حالت میں اُن کا قتل جائز تھا۔ ہاں توقف اور تامل کیا جاتا اُن سے اُنکے مطلب کی توضیح کرائی جاتی تو بہتر اور مقتضاء احتیاط تھا یہی وجہ تھی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اُنکے اس فعل سے براءت ظاہر فرمائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ بہت سامال بھیجکر سارے قبیلہ کا خون بہا اور نقصان مال ادا کیا۔ مگر حضرت خالد کو بھی معذور سمجھا۔

اور گو اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ظاہری صورت سے بہت ہی متاثر حضرت خالد سے ناخوش و کبیدہ تھے۔ مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت شناس نظر میں ایک جانب تو حضرت خالد کا عذر صحیح تھا۔ دوسری جانب وہ خدمات اسلام بھی پیش نظر تھیں جو اُنکے ہاتھ سے سرانجام ہونے والی تھیں۔

مالک ابن نویرہ اور اُسکے رفقاء کا قتل عمداً نہیں ہوا۔ بلکہ حضرت خالد نے حکم دیا تھا کہ اُن کو سردی سے محفوظ کر دیا جائے لغت اور زبان کے فرق سے غلط فہمی ہوئی اور وہ قتل کر دئے گئے قتل ہونیکے بعد ہر مسلمان کو جائز تھا کہ مقتول کی زوجہ سے عقد نکاح کر لے مقتضاء احتیاط یہ ضرور تھا کہ موضع تہمت سے بچنے کیلئے حضرت خالد ایسا نہ کرتے۔ مگر کر لیا تو اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مالک کو قتل ہی اس وجہ سے کرایا تھا۔ ظاہری صورت ایسی تھی کہ صحابہ جیسے پختہ کار شریعت واحکام اسلام پر مٹے ہوئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اسلام کا فرض اولین سمجھنے والے کیونکر اسکو ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتے تھے خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہم جن کی شان واشدھم فی امر اللہ عمر (خدا کے کام میں سب سے زیادہ پختہ اور مضبوط عمر ہیں) تھی کیسے سکوت کر سکتے تھے۔ اُنکے معزول کر دینے پر اصرار کیا۔ مگر بارگاہ خلافت میں یہ درخواست منظور نہوئی حضرت خالد کے عذر تسلیم کر لئے گئے اور اُنکو اُسکے بعد بھی اہم مہمات اسلام کی سرانجامی کا عظیم الشان کام سپرد کر دیا گیا۔

اس معاملہ میں صدیق اکبر نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو اسی قسم کے ایک واقعہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختیار فرما چکے تھے جضرت عمر نے گو اُس سے اختلاف کیا اور مقتضاء سد باب فتنہ دانش و تدبیر و سیاست و انتظام تھا۔ مگر جب صدیق اکبر کی رائے کو ایک جانب اُستوار و محکم دیکھا تو سوا سکوت

وتسلیم چارہ نہ تھا۔

یہ حالات تو زمانۂ رسالت مآب و زمانۂ خلافت صدیق اکبر کے تھے جس کے دیکھنے اور سمجھنے سے صاف ظاہر ہی کہ گو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور حضرت عمر کو اُنکے یہ افعال کھٹکے۔مگر انکی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر کے نزدیک وہ قابل عزل نہ سمجھے گئے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اُن کو معزول کیا اور اُسکی اصل وجہ کیا تھی۔

ہمارے سابق بیانات سے واضح ہو چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اُن کو دو بار معزول کیا۔اول مرتبہ مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی جبکہ حضرت خالد میدان یرموک میں اپنے سے اضعاف مضاعف دشمن سے برسر مقابلہ ترتیب صفوف اور حملہ کی تیاری میں مصروف تھے دوسری مرتبہ جبکہ حضرت خالد نے اس معزولی کو ٹھنڈے دل سے قبول کر کے وہ نمایاں خدمات انجام دیں کہ حضرت عمر کو بھی اُنکی شاندار کارنامے دیکھ کر امّر خالد نفسہ رحم اللہ ابا بکر ھو کان اعلم بالرجال منی فرمانا پڑا۔

اوّل معزولی کی وجہ تو وہی واقعات ہو سکتے ہیں۔جو اُن سے زمانۂ خلافت صدیق اکبر میں پیش آئے دوسری معزولی اور میدان کارزار سے یک لخت طلب کر کے مدینے منورہ بلا لینے۔اسلامی عسکر کو ایک ایسے جری۔مدبّر۔صاحب فراست۔جانباز کی خدمات سے محروم کر دینے کے وجوہ وہی واقعات ہو سکتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے یعنی شاعر کو انعام دینا وغیرہ۔لیکن کیا حقیقت میں بھی یہی وجوہ معزولی کی تھیں۔یہ امر غور طلب اور قابل تحقیق ہے۔

اس بارہ میں اوّل تو ہم کو واقعات کی حقیقت۔صدیق اکبر کی رائے اور حضرت عمر کی شان کو دیکھنا چاہیئے اور پھر خود حضرت عمر کے اقوال کو پیش نظر رکھ کر نتیجہ نکالنا چاہیئے۔

قابل الزام واقعات اور اُن کے باوصف حضرت صدیق کی رائے مبارک کا حال معلوم ہو چکا ہے ادھر حضرت عمر کی شان انقیاد للحق اور انخلاع از شوائب نفسانیت کا حال بھی معلوم ہی۔

اکثر مورخین اسلام نے واقعات عزل کو بترتیب حالات نقل کر دینے پر قناعت کی ہی اور زمانۂ حال کے تاریخ نویسوں کا میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزل کے اصلی وجوہ یہی واقعات ہیں جو حضرت خالد سے

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یا زمانہ خلافت صدیقی یا خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آئے لیکن میرے خیال میں اس کا فیصلہ کرنا زیادہ غور و فکر کا مقتضی ہے اور مجھے قبل اسکے کہ اس معاملہ میں اپنے خیال کا اظہار کروں بطور تمہید چند امور کا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مقربین اور کامل افراد سے بھی لغزش ہو جاتی ہے اور ایسے امور جو بظاہر قابل گرفت ہوتے ہیں سرزد ہو جاتے ہیں اور اُن سے درگذر اور عفو بھی ہوتا ہے۔ اُن کی تاویل حسن بھی کی جاتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو کوئی فرد بھی ایسا نہ نکلے گا جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ اور اُسکو خدمات دین کی سرانجامی کا اہل سمجھا جائے ہاں لغزشوں میں باعتبار صدور تاثیر و باعتبار شذوذ و تکرار فرق ہوتا ہے کبھی ایک لغزش و خطا کے اسباب صدور ایسے ہوتے ہیں جنکی وجہ سے اُس شخص کی معذوری ظاہر ہوتی ہے اور وہ شخص باوجود اس تقصیر کے مردود و متعوب دائمی نہیں بنتا اور کبھی اُس کے اسباب و علامات ایسے ہوتے ہیں کہ اُنکی وجہ سے اُس شخص کے بارہ میں آرا کا اختلاف ہو جاتا ہے کوئی اُسکو معذور سمجھتا ہے تو دوسرا متہم۔

علیٰ ہذا ایک بار کسی لغزش کا صدور ہو جانا اس قدر قابل گرفت نہیں ہوتا جتنا بار بار اُسی قسم کی خطاؤں و لغزشوں کا۔ اصرار سے گناہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے اور ندامت و پشیمانی کے بعد کبیرہ بھی ہلکا بنکر قابل عفو ہو جاتا ہے۔

(۲) کسی ایک معاملہ میں جو اپنے اندر دونوں پہلو منفعت و مضرت کیلئے ہوتا ہے مجتہدین کی رائے میں اس وجہ سے اختلاف ہو جاتا ہے کہ ایک مجتہد کو ایک جانب پیش نظر ہوتی ہے اور دوسرے کو دوسری جانب احکام فقہیہ میں مجتہدین امتہ کے اختلاف کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ایک کی نظر عزمیت پر ہوتی اور دوسرے کی رخصت پر یہ دوسرا امر ہے کہ عند اللہ کسی معاملہ میں عزمیت کو ترجیح ہو اور کسی میں رخصت کو۔

(۳) احکام اجتہادیہ میں ایک مجتہد کو دوسرے کی تقلید ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ مجتہدین کے درجات اجتہاد و فور علم۔ دقتہ نظر میں فرق ہو۔ مگر ہر ایک مجتہد اپنے اجتہاد پر عمل کر سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صاحبین امام اعظم سے۔ امام شافعی امام مالک سے۔ امام احمد شافعی سے علی ہذا یہ سب مجتہدین امام اعظم سے کسی مسئلہ میں اختلاف نہ کرے۔

(۴۷) ایک حکم کی بہت سی علتیں اور ایک واقعہ کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں اور اس حکم کو مستقلاً ایک ایک علت وسبب کی طرف منسوب کرنا جائز ہوتا ہے۔ گو حکم لگانیوالے کے علم میں یہ فرق ملحوظ ہو کہ ان سب علتوں اور اسباب میں باعتبار تاثیر کیا فرق ہے وہ اس حکم ظاہری اور حقیقی علت میں فرق سمجھتا ہو۔ مگر اسکو مصلحتِ وقت اور مناسبتِ مخاطب یہ اختیار ہے کہ اس حکم کو کبھی ظاہری علت کی طرف منسوب کردے اور کبھی حقیقی کی طرف کبھی ایک سبب کو بیان کردے کبھی دوسرے کو۔

جب یہ امور ممہد ہو چکے تو اب سنئے کہ حضرت خالد کی عظمتِ شان۔ جلالتِ قدر۔ کمال تقویٰ وتدین۔ بے انتہا شجاعت وبسالت۔ اعلیٰ تدبر و فراست تو ایسے تسلیم شدہ ہیں کہ کوئی شخص اُن سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اُن سے کسی لغزش کا سرزد ہو جانا مستبعد نہیں اور نہ اُن کے درجہ کو گھٹا سکتا ہے اگر کسی سے احیاناً کسی لغزش کا سرزد ہو جانا مرتبے سے گرا دینے کیلئے کافی ہو تو اب ہر شخص کو مشکل ہو جائیگی خصوصاً ایسی لغزشوں سے جن کا تعلق حظوظ نفسانیہ سے نہو بلکہ رائے وتدبیر یا فہم مرادسے ہو۔

حضرت خالد سے بھی بعض ایسے امور صادر ہوئے جن کا تعلق ظاہراً تو رائے واجتہاد سے تھا لیکن اُن میں گنجایش سوءِ ظن کی بھی تھی۔ سب سے پہلی بات تو بنی جذیمہ کے قتل کی تھی۔ حضرت خالد تو فرماتے تھے کہ میں نے اُنکو مسلمان سمجھ کر قتل نہیں کیا۔ بلکہ اُنھوں نے صبأنا کہا تھا۔ جس کے صاف معنی دین سے پھر جانیکے تھے۔ گو اُن کی مراد یہ ہو کہ ہم اپنے دین سابق بت پرستی وشرک سے پھر کر دین اسلام میں داخل ہو گئے مگر عرف عام کے مطابق اُس کے معنے دین حق سے پھر جانیکے تھے چنانچہ کلام مجید میں بھی صائبین کا استعمال اسی معنی میں ہوا ہے۔ صحابہ میں سے بعض بڑے درجے کے افراد کا بھی خیال اُس طرف گیا کہ اُنھوں نے اپنے حظ نفس کی وجہ سے اُن کو قتل کیا۔ اور لفظ صبأنا کو اس کا بہانہ بنایا۔

چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اُن پر یہ الزام لگایا کہ تم نے اپنے چچا فاکہ ابن المغیرہ کے قصاص میں قتل کرکے دیرینہ عداوت نکالی ہے۔ حضرت خالد کا عذر بالکل صحیح تھا۔ اور منشاء اُنکے اس فعل کا ہرگز وہ اثر نہ تھا جس کی جانب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا خیال رجوع ہوا اسی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے عذر کو تو تسلیم فرمالیا اور بنی جذیمہ جو فی الحقیقت

مسلمان ہوکر مسلمانوں کے ہاتھوں سے بوجہ غلطی رائے کے قتل ہوئے تھے بیت المال سے اُن کا
خونبہا عطا فرما دیا۔ ادھر حضرت خالد کی یہ پہلی بات تھی۔ اور ایک ذمہ دار شخص سے جو دین کی اشاعت
کیلئے نکلا ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام جس کے سپرد ہو ایسے اُمور کا پیش آجانا کچھ
مستبعد نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر حضرت خالد کا خیال صحیح نکلتا۔ اور اُنکو اس حالت میں" کہ
بنی جذیمہ مشہور شریر اور جنگجو قبیلہ تھا" امن دیکر مسلمانوں میں خلط ملط ہونیکی اجازت دیدی جاتی۔ تو
ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا۔ اور اُسکے ساتھ ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو وہ فتوحات اسلام میں بھی پیش نظر تھیں جو اُنکے ہاتھوں ظہور پذیر ہونیوالی تھیں۔ اس لئے
آپنے اس سے بالکل درگزر فرمایا۔ اُنپر کسی قسم کا عتاب نہیں فرمایا۔ اور وہ ایسی ہی خدمات دین کے
سرانجامی پر مامور رہے لیکن چونکہ اس واقعہ میں وہ احتمال بھی تھا جسکی جانب حضرت عبدالرحمن کا
خیال گیا۔ کیونکہ حضرت خالد کے چچا بنی جذیمہ کے ہاتھ سے قتل ضرور ہوئے تھے اور کم از کم اتنا ضرور
تھا کہ حضرت خالد نے اُنکے قتل کرانے میں عجلت کی۔ اگر اُن سے مکرر استفسار کر لیا جاتا تو ممکن تھا
کہ وہ اپنے مطلب کو وضاحت سے بیان کر سکتے جس سے اُنکے حقیقتاً مسلمان ہونے پر اعتماد ہو جاتا
اور اس طرح وہ قتل سے اور حضرت خالد شائبہ تہمت سے محفوظ ہو جاتے۔ اس لئے جناب رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک جانب تو درگاہ خداوندی میں حضرت خالد کے فعل سے اپنی برارت
ظاہر فرمائی اور دوسری جانب حضرت عبدالرحمن ابن عوف پر عتاب نہیں فرمایا کہ تم ایک مسلمان کے
سو ظن کیوں کرتے اور ایک بری کو متہم کیوں بناتے ہو۔ بلکہ جب دونوں میں تیز کلامی ہوئی تو
خالد ہی کو مہلاً یا خالد دع عنک اصحابی فرما کر گفتگو سے روکدیا اور حضرت عبدالرحمن
کے ادب و احترام کو قائم رکھنے کا حکم دیا۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ واقعہ بالکل
نسیاً منسیاً ہو گیا۔ صحابہ کی ایک جماعت بالخصوص وہ مہاجرین و انصار جو باوجود حضرت خالد کے
زیر کمان ہونے کے بنی جذیمہ کے قتل میں شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ اس فعل کو مکروہ و قابل اعتراض
سمجھتے تھے ابتداءً اس واقعہ کیوجہ سے ناراض ضرور تھے۔ مگر اب سب کے دل صاف ہو گئے تھے۔

اسکے بعد حضرت خالد سے دوسری بات خلافت صدیقی میں مالک ابن نویرہ کے قتل اور اُسکی زوجہ سے نکاح کی پیش آئی یہ واقعہ پہلے بچند وجوہ اہم تھا۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ ایک ہی قسم کی یہ مکرر غلطی تھی کیونکہ پہلے واقعہ میں اگر بنی جذیمہ نے ایسے لفظ استعمال کئے تھے جو دونوں معنوں کو محتمل تھے۔ تو اس موقعہ پر حضرت خالد نے مالک ابن نویرہ اور اُسکے رفقاء کو سردی سے بچانے کیلئے ایسے لفظ ادفئوا اسراکم کا استعمال کیا جس کے دوسرے معنی کنانہ کی زبان میں قتل کر دینے کے تھے اور ظاہر ہے کہ ایک قسم کی غلطی کا مکرر واقع ہونا خیالات میں زیادہ انقلاب پیدا کر دیتا اور قبول عذر کو مشکل بنا دیتا ہے ایسے ذمہ دار شخص کو اس قسم کے امور سے پرہیز نہایت ضروری ہوتا ہے۔

دوسرے اس وجہ سے کہ یہاں مظنہ تہمت بہ نسبت اُس واقعہ کے بڑھا ہوا تھا۔ بنی جذیمہ کے قتل میں اگر مظنہ تھا تو بہت ضعیف کیونکہ اوّل تو حضرت خالد بنی جذیمہ سے اپنے چچا کا بدلہ لے چکے تھے اب دوبارہ بدلہ لینے کی کیا ضرورت باقی رہی تھی ظاہر ہے کہ کسی ایک فرد کے عوض ساری قوم کو قتل نہیں کیا جاتا۔ دوسرے گفتگو اُن کی نیت میں تھی کہ کس نیت سے قتل کیا۔ اور ظاہر ہے کہ نیت عمل قلب ہے نیت کا حال آثار سے معلوم ہو سکتا ہے اور آثار ایسے نہ تھے جن کی وجہ سے اُنکی نیت پر شبہ کیا جاتا۔

واقعہ ثانیہ کی اہمیت نے صحابہ کے خیالات میں تغیر پیدا کر دیا۔ بنی جذیمہ کا بھولا ہوا واقعہ بھی تازہ ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اُن کے معزول کر دینے کیلئے عرض کیا۔ اور صرف بطور اظہار رائے ہی عرض نہیں کیا بلکہ اس پر اصرار فرمایا۔ اور جب حضرت خالد اس معرکہ سے فارغ ہو کر بارگاہ خلافت میں فاتحانہ حیثیت سے شترمرغ کے پروں کا طرہ عمامہ پر لگائے ہوئے حاضر ہوئے اور حضرت عمر پر گذر ہوا تو آپ کو اُن کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اور فوراً سر پر سے عمامہ و طرہ کو اُتار پھینکا حضرت خالد نے نہایت صبر و سکون سے تحمل کیا۔ اور خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت صدیق اکبر نے

اس معاملہ میں اُن سے جواب طلب کیا تو واقعی حال عرض کر دیا۔ آپ نے اُن کے عذر معقول کو تسلیم فرمالیا اور کسی قسم کا عتاب کئے بغیر اُن کو عزل پر اسرار فرمایا۔ تو فرمادیا اُن سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی ہے میں اُس تلوار کو کیونکر میان میں کردوں جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعداء دین کیلئے میان سے نکالا ہو۔ صدیق اکبر و فاروق اعظم میں یہ اختلاف رائے مجتہدین کا اختلاف تھا۔ حضرت صدیق اکبر کو ایک پہلو سرانجامی خدمات انجام پیش نظر تھا اور آپ خیال فرماتے تھے کہ احیانی و اتفاقی لغزش جس کا وقوع مواقع حرب میں مدبرین سے بالکل ممکن ہے اُسکی بناپر اُن کی اعلیٰ قابلیت سے کیوں چشم پوشی کی جائے۔ اور آپ کا یہ فیصلہ بالکل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق تھا۔ آپکی دوربین نظر میں وہی حالات تھے جن کی بناپر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے واقعہ میں حضرت خالد سے کسی قسم کی بازپرس نہیں کی تھی اور فاروق اعظم کو دوسرے پہلو پیش نظر تھے تیسری بات حضرت خالد سے یہ پیش آئی کہ مقام مضیح میں قبیلہ ہذیل سے اُن کا مقابلہ ہوا تو دو مسلمان شخص عبدالعزیٰ ابن ابی رہم اور لبید ابن جریر جو باوجود مسلمان ہونیکے ہذیل کے جبر سے اُنکے ساتھ شریک ہوگئے تھے قتل ہوگئے۔ حضرت صدیق اکبر کو اُنکے قتل کی خبر پہنچی تو اُنکے ورثہ کو دیت دی۔

یہ واقعہ فی الحقیقت کچھ زیادہ اہم نہ تھا کیونکہ دو مسلمان اگرچہ بمجبوری ہی سہی کفار کے ساتھ تھے مخلوط جماعت میں اُن کی حفاظت سہل بات نہ تھی۔ مگر حضرت عمر کو واقعۂ قتل مالک کی ناخوشی باقی تھی۔ اس واقعہ نے بے احتیاطی کے الزام کو جو سابق دو واقعوں میں حضرت خالد پر لگ چکا تھا تازہ کر دیا۔ حضرت صدیق اکبر نے اُس وقت بھی یہ فرماکر "جو شخص دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہے اُس کو ایسے واقعات سے ضرور سابقہ پڑتا ہے" قصہ رفع دفع ہوگیا۔

حضرت صدیق اکبر کا یہ ارشاد بالکل صحیح تھا حضرت خالد اس معاملہ میں بالکل معذور تھے یہی وجہ تھی کہ پہلے کی طرح حضرت عمر نے بھی اُن کے عزل پر اصرار نہیں فرمایا۔

خلافت صدیقی ختم ہونیکے بعد خلافت فاروقی کا زمانہ آیا۔ اُس وقت حضرت خالد عراق

میں نمایاں فتوحات کا سلسلہ قائم کرکے ملک شام کے میدان یرموک میں عساکر اسلامیہ کی کمان اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے عظیم الشان جنگ کی تیاری میں مشغول تھے۔ اور اسی حالت میں اُنکے پاس معزولی کا حکم بارگاہ فاروق اعظم سے یا باختلاف روایت عین اُس وقت جبکہ بحیثیت سپہ سالار اعظم دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے داد جانبازی دے رہے تھے۔ ایک اور بھی روایت ہے کہ معرکہ یرموک اور محاصرہ دمشق کے درمیانی زمانہ میں عزل کا واقعہ ہوا۔ اور میرے خیال میں باعتبار درایت یہ جانب قوی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی اول معزولی محاصرۂ دمشق کے وقت ہوئی کیونکہ اس معزولی کا جہانتک تواریخ سے ہم کو ثابت ہوتا ہے حاصل یہ ہے کہ وہ قیادت عامہ سے معزول کئے گئے۔ اگر وہ اس طرح معزول کئے جاتے کہ کسی حصۂ فوج کے قاعد بھی نہ رکھے جائیں تو حضرت ابو عبیدہ اس حکم کی خلاف ورزی کیسے کرسکتے تھے جس طرح معزولی ثانی کے بعد ہر قسم کی افسری سے معزول ہوئے تھے۔ اب بھی کسی دستۂ فوج کی کمان اُنکے سپرد نہ رہتی حالانکہ روایات سے ثابت ہے کہ جس طرح حضرت عمرو بن العاص۔ شرجیل بن حسنہ۔ یزید بن ابی سفیان وغیرہ علیحدہ علیحدہ جیوش کے مستقل سپہ سالار تھے۔ اسی طرح حضرت خالد بھی ایک مستقل جیش کے امیر عسکر تھے۔ فتح بیت المقدس کے وقت جب فاروق اعظم خود تشریف لیگئے اور یہ حکم دیا کہ امرائے عساکر ہم سے مقام جابیہ ملاقات کریں تو منجملہ امراء عساکر حضرت خالد بھی تھے اور حضرت خالد کی قیادت عامہ کی ابتدا معرکۂ یرموک میں بھی عین اُس روز ہوئی جبکہ تمام عساکر اسلامیہ نے مجتمع ہوکر رومی عساکر پر حملہ کرکے اُن کو خندقوں سے نکالنا چاہا تھا۔ ابھی تک انکی قیادت عامہ تسلیم ہی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ تجویز یہ ہوئی تھی کہ باری باری ہر امیر عسکر قاعد عام بنایا جائے۔ پھر جبکہ بارگاہ خلافت سے اُن کی قیادت عامہ کی بابت کوئی حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ امراء عساکر نے ابھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ تجویز میں کوئی خصوصیت حضرت خالد کی نہ تھی۔ تھی تو صرف اس قدر کہ اول دن کل افواج کی کمان اُنکے ہاتھ میں دی گئی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس غیر تسلیم قیادۃ عامہ کی خبر مدینہ منورہ پہنچ بھی جاتی اور وہاں سے عین معرکہ میں اُنکے عزل کا حکم بھی صادر ہو جاتا۔ ہاں یہ بات بالکل ممکن اور قرین قیاس

ہے کہ معرکہ یرموک میں گو یہ تجویز ہوئی تھی کہ ہر امیر عسکر باری باری ایک ایک دن کل افواج کی کمان کرے مگر اوّل ہی دن کی قیادت عامہ کے نتائج کو دیکھ کر پھر کسی امیر عسکر نے اس کو پسند نہ کیا کہ موافق تجویز سابق کوئی دوسرا قاعد عام بنایا جائے اور اس طرح معرکہ یرموک اُنکی قیادت عامہ میں انجام کو پہنچا اور اسکے بعد دوسرے معرکوں میں بھی بحیثیت قائد عام کام کرتے رہے۔ یہانتک کہ باضابطہ بھی یہ جلیل القدر عہدہ اُن کیلئے تسلیم ہوگیا۔ اور اوّل مرتبہ فاروق اعظم نے اسی قیادت عامہ سے اُن کو معزول فرمایا۔

یہ ایک ضمنی بحث تھی جس کو ہم نے اس وجہ سے لکھا ہے کہ روایات میں اختلاف ہے اور مورخین نے ان واقعات کے جمع کر دینے پر کفایت کی ہے۔ ترتیب کی بابتہ کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ البتہ زمانہ حال کے مصنف علامہ رفیق بک عظیم نے اشہر مشاہیر اسلام میں اسکو ترجیح دی ہے کہ اُنکی پہلی معزولی محاصرہ دمشق کے وقت ہوئی مگر وجوہ ترجیح کو تفصیل کیساتھ اُنھوں نے بھی بیان نہیں کیا۔

اس ضمنی بحث سے فراغت کے بعد ہم اصل مدعا کی طرف عود کرتے ہیں

یہ بات تو کھلی ہوئی ہے کہ حضرت عمر بوجوہ چند در چند حضرت خالد سے ناخوش تھے آپ کے خیال میں حضرت خالد کے اندر ایک قسم کی تعجیل بھی تھی۔ جس کے نتائج چند واقعات میں ظاہر بھی ہو چکے تھے۔ اور ساتھ ہی ایک قسم کا استقلال رائے بھی تھا کہ بہت سے معاملات میں بلا انتظار حکم منصب خلافت اپنی مستقل رائے سے کام کر بیٹھتے تھے۔ اس ناخوشی کا علم صدیق اکبر۔ تمام صحابہ اور امراء عساکر اسلامیہ کو تھا۔ چنانچہ مثنیٰ ابن حارثہ جو حضرت خالد کے بعد عساکر عراقیہ کے سپہ سالار اعظم تھے اور جن کے ہاتھ پر عراق کا حصہ کثیر فتح ہو کر مسلمانوں کا سکہ بیٹھا تھا۔ مدینہ منورہ صدیق اکبر کے حضور میں بدیں غرض حاضر ہوئے کہ حالات و واقعات ملک عراق و معرکہ قتال زبانی عرض کر کے یہ درخواست کریں کہ مرتدین عرب کے اُن افراد کو جن کے صدق و اخلاص خالص و بے لوث توبہ کا ثبوت مل چکا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ صدیق اکبر نے مرتدین کے بارہ میں یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ عساکر اسلامیہ میں شریک کر کے دشمنانِ دین کے مقابلہ کیلئے نہ بھیجی جائیں۔ ابتک داخل عساکر نہیں ہوئے تھے۔

معرکہائے قتال ہو، شرکت کی اجازت دی جائے کیونکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اُن میں جوشِ حمیت اسلام کی آگ بھری ہوئی ہے اور وہ نہایت ذوق و شوق سے مجاہدین کے ساتھ ہوکر لڑنے مرنے کو تیار ہیں۔ تو آپ ایسے وقت مدینے منورے پہنچے کہ صدیق اکبر جیوۃ کی آخر منزل طے کر کے سفرِ آخرت کے تہیۂ میں تھے۔ مگر اسی حالت میں صدیق اکبر نے فاروق اعظم کو بدیں الفاظ وصیت فرمائی۔

انی لارجوان اموت یومی ھذا فاذا مت فلا تمسین حتی تندب لناس مع المثنی ولا تشغلکم مصیبۃ عن امر دینکم و وصیۃ ربکم فقد رایتنی متوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما صنعت وما اصیب الخلق بمثلہ واذا فتح اللہ علی اھل الشام فاردد اھل العراق الی العراق فانھم اھلہ وولاۃ امرہ واھل الجراءۃ علیھم۔

مجھے اُمید ہے کہ میری وفات آج ہی ہوگی۔ میری وفات کے بعد شام ہونے سے پہلے لوگوں کو مثنی کے ساتھ جانیکے لئے تیار کر دینا۔ کوئی مصیبت تم کو دین کے معاملات اور خداوند عالم کے احکام کی تعمیل سے مشغول نہ کرے۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات کیوقت کیا کیا۔ حالانکہ مخلوق پر اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی ہے۔ پھر جب خدا تعالیٰ ملک شام کو فتح کر دے تو اہل عراق کو دمراد وہ امدادی لشکر ہی جو عراق سے حضرت خالد کے زیر کمان عساکر شامیہ کی امداد کیلئے بھیجا گیا تھا، عراق میں واپس کر دینا۔ کیونکہ کفار عراق پر جری اور وہاں کے لائق وہی ہیں۔

فاروق اعظم نے صدیق اکبر کے دفن سے فراغت پاکر لوگوں کو مثنی کے لشکر میں شریک ہونیکے لئے آمادہ کیا اور فرمایا۔ قد علم ابوبکر انہ یسوءنی ان اؤمر خالدا فلھذا امرنی ان ارد اصحاب خالد او ترک ذکرہ معہ۔

ابوبکر صدیق کو معلوم ہے کہ میں خالد کے امیر بنانے کو ناپسند کرتا ہوں۔ اسی لئے آپ نے خالد کے لشکر کو عراق واپس کر دینے کا حکم تو دیا۔ مگر خالد کا ذکر نہیں فرمایا۔

فائدہ - حضرت صدیق اکبر اپنی وفات کی خبر ان الفاظ میں دیتے ہیں انی لارجو (میں امید کرتا ہوں) یہ نہیں فرماتے انی لاخشی انی لاخاف (مجھے اندیشہ ہے) اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا قلب شوق لقاء اللہ۔ وحضوری دربار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسقدر معمور تھا کہ ایک لحظہ بھی دار دنیا میں قیام کو پسند نہیں فرماتے تھے اور اُس وقت کے انتظار میں امید کی گھڑیاں گن رہے تھے۔

یہ ہے شان صدیق اکبر کی اور یہی ہے مضمون حدیث شریف من احب لقاء اللہ احب اللہ لقائہ (جو شخص خدا کی ملاقات کو (جو بعد موت حاصل ہوتی ہے) دوست رکھتا ہے خدا تعالیٰ بھی اُسکی لقاء کو محبوب سمجھتا ہے) لیکن اس حالت وجد و شوق میں کہ ایک منٹ دنیا میں رہنا گوارا نہ تھا۔ اور اس حالت وجد میں اپنی جسمانی تکالیف کی طرف بھی مطلق التفات نہ تھا۔ دین کی فکر اسقدر غالب تھی کہ آخر دم تک اُسی میں انہماک رہا۔ وہی فکر سب فکروں سے غالب تھا۔ مومن کی شان یہی ہونی چاہیئے۔ کہ سرور و حزن۔ فراخی و تنگی۔ ترقی و تنزلی صحت و مرض سب حالتوں میں دین کا خیال غالب رہے۔ اُسی کا استحکام پیش نظر رہے کوئی خیال اُس پر غالب نہ آئے

غم دین خور کہ غم غم دین است ہمہ غمہا فروتر از دین است

حاصل یہ کہ حضرت عمر کی ناخوشی حضرت خالد سے ظاہر و باہر تھی۔ ایسی حالت میں اس معزولی کو بجز اُس ناخوشی کے کسی اور سبب پر محمول کرنا مشکل ہے۔ اور اسی وجہ سے مورخین اس عزل کو ثمرۂ کبیدگی سابق بتلاتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہی تو کچھ جائے اعتراض بھی نہیں کیونکہ حضرت خالد سے بعض ایسے اُمور سرزد ہوئے تھے جن سے عام ناخوشی پھیلنے کے ساتھ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی باوجود حضرت خالد کے عذر کو تسلیم فرمانے اور اُن کو معذور سمجھنے کے عند اللہ اپنی برأت اُس فعل سے برأت کرنے کی نوبت آئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ بات ناپسندیدہ تھی ہاں چونکہ حضرت خالد نے عمداً نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ بھی معذور تھے اور صدیق اکبر کے نزدیک بھی وہ امور جو باعث کبیدگی فاروق اعظم تھے ضرور قابل گرفت تھے۔ چنانچہ اُن کی

استقلال رائے، تعجیل، و جرأت کو کہ اسلامی عساکر کو بلا سردار چھوڑ کر خفیہ طرح حج کر آئے ناپسند فرمایا۔ اور اس طرح تنبیہ فرمائی کہ قیادۃ عامہ عراق سے معزول کر کے ایک دستہ فوج کے ہمراہ شام جانیکا حکم دیا۔

اور اگرچہ بارگاہِ صدیق اکبر سے برخلاف رائے فاروق اعظم حضرت خالد کی امارت عساکر پر برقرار رکھنے کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا اور اس وجہ سے شاید کسی کو خلجان پیدا ہو کہ حضرت فاروق نے اُس حتمی فیصلہ کو کیسے مسترد فرما دیا۔ مگر پھر بھی یہ بات قابل اعتراض نہیں۔ اول تو صدیق اکبر فاروق اعظم دونوں مجتہد مستقل تھے۔ اور ہر ایک کی رائے و اجتہاد کیلئے وجہ وجیہ موجود تھی۔ زمانہ خلافت صدیقی میں حضرت عمر کا درجہ وزیر اعظم کا تھا۔ اُن کا فرض تھا کہ حکمنامہ خلافت کے سامنے گردن جھکا دیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُنھوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا اسلئے جب وہ مستقل خلیفہ ہوئے تو اُن کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا ضروری ہو گیا۔ علاوہ بریں ایک حکم جو کسی وقت صادر ہوتا ہے یہ ضرور نہیں کہ ہمیشہ کیلئے باقی رہے۔ ممکن ہے کہ صدیق اکبر جنہوں نے باوجود اصرار فاروق اعظم حضرت خالد کو معزول نہیں کیا تھا کسی دوسرے وقت اُن اُمور کی بنا پر جو لوگوں کی نظر میں کھٹکتے تھے یا کسی اور غایر و دقیق مصلحت کی بنا پر معزول کر دیتے۔

مگر میرے خیال میں عزل اول کی وجہ صرف یہی ناخوشی و کبیدگی نہ تھی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تصریح فرما دیتے کہ کسی ایک دستہ کی کمان بھی اُن کے سپرد نہ کی جائے۔ ظاہر ہی کہ امین الامت پہلے ہی سے ایک جیش کے امیر عسکر تھے۔ اُن کا تقرر امارت عسکر پر اب جدید نہ تھا۔ جو یوں خیال کیا جاتا کہ حضرت خالد کے دستہ کی امارت اُن کو دی گئی ہے بلکہ اُن کو قائم کرنیکے یہ معنی تھے کہ قیادت عامہ جو حسب تسلیم امرا اجناد و تسلیم خلیفہ ارشد اُن کے سپرد ہے وہ اُن سے لیکر امین الامۃ کو دیدیجائے اور جب امارت عسکر پر وہ قائم رکھی گئی تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ فقط اس ناخوشی کی بنا پر معزول کئے گئے۔ کیونکہ وہ اُمور تو ایسے نہیں تھے کہ اُن کے بعد کسی قسم کی افسری پر وہ قائم رہ سکتے زمانہ صدیق اکبر میں تو اُن امور کی وجہ سے اُن کی کلیتہً ہر قسم کی افسری سے معزول کرنے کا اصرار فرمائیں اور اب

امارت عسکر پر قائم رکھیں۔ فاروق اعظم جیسے شدید فی امر اللہ سے تو ایسی مداہنت کی توقع کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اور یہ خیال کہ آپ نے تو اُن کو مطلقاً معزول فرما دیا تھا۔ مگر امین الامۃ نے ایک جیش کی کمان اُن کے ہاتھ میں دیدی کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ وہ زمانہ ایسا نہ تھا کہ صحابہ خلیفہ راشد کے حکم کو معمولی سلاطین کا حکم سمجھ کر اُسکے خلاف کو جائز سمجھتے۔ حالانکہ سلاطین دنیا کے احکام کیخلاف بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ بات ہے تو ہر مسلمان کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ معزولی کی وجہ فقط وہی سابق امور نہ تھے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا اثر اور دخل اس معزولی میں ضرور تھا لیکن اُن کے ساتھ وہ پہلو بھی جو حضرت صدیق اکبر کے پیش نظر تھا۔ اور حضرت عمر کے بار بار اصرار کے بھی عزل سے مانع تھا متمثل ہو کر سامنے آگیا تھا یعنی ادھر تو حضرت خالد کے ہاتھ سے فتوحات عراق کی بنیاد مستحکم ہو چکی تھی ادھر شام کے عظیم ترین معرکوں کا انجام اُنہیں کی تدابیر حرب و جانبازی کا نتیجہ تھا۔ بڑے بڑے شہر و قلعے اہم مقامات اُنہیں کے ہاتھ سے فتح ہوئے تھے۔

حضرت عمر نے جہاں اُنکی عظیم الشان فتوحات اور نمایاں کارنامے ملاحظہ فرمائے اُسکے ساتھ ہی آپکو یہ بھی احساس ہوا کہ مسلمانوں کے قلوب میں اُنکی عظمت و عزت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ ان تمام فتوحات اور اسلام کی بسرعت تمام ترقیات کو حضرت خالد کی جدوجہد اُنکی تدبیر و فراست شجاعت و بسالت کا نتیجہ سمجھنے لگے ہیں جس سے آپکو یہ اندیشہ ہوا کہ خاص افراد و جلیل القدر صحابہ پر تو کچھ اثر ہونا مستبعد ہے مگر عوام اور بالخصوص جدید الاسلام افراد اور اسی طرح قرون مابعد میں اگر یہ خلجان پھیل کر راسخ ہو گیا تو خداوند عالم کے فضل و رحمت پر سے نظر اُٹھ کر اسلام کے سارے کرشمے اور اُس کے تمام نمایاں آثار و برکات انسانی تدابیر پر منحصر ہو جائیں گے۔ اور یہ سخت رخنہ ہو گا جو ایک طرف تو مسلمانوں کے اصلی عقیدے کو کہ "سوا خداوند عالم کوئی دوسرا کارساز نہیں ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے اُسی کے حکم سے تدبیر کے موافق ہوتا ہے۔ تدابیر کی یہ تاثیرات نہیں ہیں۔ تدابیر ایک ذریعہ اور بہانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں" بدل دیگا۔ ادھر جب مسلمانوں کے خیالات فاسد ہونگے تو خدا تعالیٰ کی رحمت بھی اُن کی طرف متوجہ نہ رہیگی۔ اور اسلام کا یہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ نہ اسلام رہیگا۔ نہ مسلمان اور نہ پھر

فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوگا۔ نہ ظہور دین کا غلبہ بلکہ یہی حالت رہی تو جو ممالک فتح ہوئے ہیں وہ بھی نکل جائیں گے۔

اس امر کا احساس ہوتا ہی۔ آپ کو مسلمانوں کے سنبھالنے فساد عقیدہ اور ترک توکل و اعتماد علی اللہ سے بچانے اسلام کو تھامنے کی فکر ہو گئی۔ آپکے متوکل دل نے جس میں فراست ایمانی کیساتھ نصح و ہمدردی خلق خدا کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور آپکے عزم راسخ اور ہمت بلند کے آگے دشوار کام بھی سہل ہو جاتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے کام میں آپ کو لوم لائم وطعن طاعن کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔ یہ ٹھان لی کہ اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ اُنکو قیادۃ عامہ کے منصب سے معزول کر کے محض قیادۃ جیوش کی صورت میں رکھا جائے۔ قیادۃ عامہ کی صورت میں جو فتح ہوتی تھی۔ یا اسلام کی ترقی و استحکام کا جو کام بھی ہوتا تھا وہ صرف اُنہیں کے نامزد ہوتا تھا۔ قیادت جیش کی حالت میں اگر اُن کے نامزد ہو گا بھی تو وہی کام جو اُن کے دستہ فوج سے خاص اُن کے ہاتھ کسی مخصوص صورت میں صادر ہو آپ کو اس جانب سے اطمینان کلی تھا کہ مسلمانوں میں کے خاص تو کیا عوام افراد بھی ایسے نہیں کہ احکام خلافت کی تسلیم میں کچھ چون وچرا کو دخل دیں گے۔ اُن کو حضرت خالد سے کیسی ہی محبت ہو۔ اُنکی عظمت دلوں میں کیسی ہی کچھ کیوں نہو اسلام کی فتوحات انکی مساعی جمیلہ کا ثمرہ کیوں نہ سمجھتے ہوں مگر حکم کی تسلیم میں اور وہ بھی برضا تسلیم میں کسی کو تردد نہو گا۔ اس لئے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت خالد کی معزولی کا حکم صادر فرمایا جو بلا انکار و تردد تسلیم کر لیا گیا۔ کسی کے دل میں بمقتضاء عظمت خالدی یا عدم علم حکمت عزل کا کھٹکا ہو مگر کچھ چرچا نہوا۔ عام طور پر اس عزل کا سبب وہی امور سمجھے گئے جو باعث ناخوشی فاروق اعظم تھے مگر درحقیقت یہ بات نہ تھی اور اگر حقیقتاً یہ بات ہوتی تو جو شخص ایسے امور میں متہم ہو وہ قیادۃ جیوش کے قابل کیونکر ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً تو وہی خیال تھا کہ عام قلوب میں اُنکی عظمت خارج از اعتدال خدا تعالیٰ کی رحمت و فضل سے محرومی کا سبب نہ بنجائے۔ مگر چونکہ عام قلوب میں اس خیال کی ابھی ابتداہی تھی اس لئے آپ نے اسی قدر کو کافی سمجھا کہ قیادۃ عامہ سے معزول کر کے قیادۃ جیوش پر قائم

رکھا اور امور سابقہ کی بنا پر بھی جس قدر احتیاط مناسب تھی اُس کیلئے بھی اسقدر انتظام کو کافی خیال فرمایا۔ اور چونکہ اس حکم میں دونوں پہلو ملحوظ نظر تھے اس لئے آپنے عام مخاطبین کے خیال سے تو وجہ عزل اُسی ناخوشی کو بیان فرمایا۔ لیکن خواص کی تسلی واطمینان اور حضرت خالد کو تہمت و سوء ظن سے بچانے کیلئے اصلی و حقیقی وجہ کو وانشگاف کر کے بیان فرمایا۔

ہم اوّل بیان کر چکے ہیں کہ ایک چیز کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی ایک سبب ظاہری تھا اور ایک حقیقی۔ دونوں کو بجائے خود عزل میں دخل تھا۔ مگر حقیقی سبب امر آخر تھا۔ دیکھیے مثنیٰ ابن حارثہؓ قائد عام عراق بھی معزول کئے گئے۔ مگر اتنا فرق ضرور تھا کہ عام قلوب میں اُن کا وہ اثر نہ تھا جو حضرت خالد کا تھا۔ نہ سلسلہ فتوحات اُن کے ہاتھوں سے اس قدر قائم ہوا تھا جس قدر اُنکے ہاتھ سے اس لئے آپ کو اُن کے عزل کیلئے کسی سبب ظاہری کے بیان کرنیکی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ ہاں ان کو اتہام اور سوء ظن سے محفوظ رکھنے کیلئے یا اُنکی دل شکنی کو رفع کرنیکے لئے جو ممکن ہے کہ عزل سے پیدا ہوئی ہو اصلی اور حقیقی وجہ کو بیان فرما دیا۔

اس ہمارے بیان سے معزولی اوّل کی وجہ حضرت عمر کے بیانات کا تطابق بخوبی معلوم ہو گیا ہمیں امید ہی کہ اسکے بعد کسی ذی عقل و فہم کو نہ حضرت عمر کے اختلاف بیان میں خلجان رہیگا۔ نہ اصلی اور ظاہری اسباب کے جمع کرنے میں دقت پیش آئیگی۔ نہ حضرت خالد کو کسی معاملہ میں قابل اعتراض سمجھنے کی جرأت ہو سکیگی۔ یہانتک تو معزولی اوّل کا بیان تھا اب دوسری معزولی کے متعلق سُنئے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصلاح خیالات اور احتیاط ظاہری کیلئے ان کو قیادہ سے معزول کر دینا کافی خیال فرمایا۔ مگر حضرت خالد کی حسن تدبیر فطرۃ بلند ایسی واقع نہ ہوئی تھی کہ اس حالت میں بھی اُن کی برتری سے کوئی انکار کر سکتا اُنھوں نے ایک جیش کی افسری میں بھی اپنے آپکو قائد عام ثابت کر دیا۔ امین الامتہ قائد عام تھے مگر حضرت خالد کی خدمات نے آپ کا اعتماد و اطمینان اس درجہ بڑھا دیا تھا کہ سب کام اُنہیں کی رائے سے ہوتے تھے اور گویا حقیقتاً سپہ سالار اعظم حضرت خالد ہی تھے اسی حالت کو دیکھکر حضرت عمر نے ارشاد فرمایا امّر خالد نفسہ آہ۔ یعنی ہم نے تو خالد کو معزول

کیا تھا۔ مگر اُن کے کارناموں نے خود اُن کو امیر بنا دیا۔

جب یہ انتظام کافی نہوا۔ بلکہ حضرت خالد کے ساتھ جو حسن عقیدت مسلمانوں کو تھا یا جو اعتماد اُنکی حسن تدبیر۔ فراست و دانائی پر تھا پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ اور اس بے نفسی اور لوجہ اللہ جانفروشی نے اور بھی اُنکی عظمت بڑھادی کہ معزولی سے متاثر ہونیکی بجائے اور زیادہ چست و چالاک ہو گئے۔

جب مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی عظمت و اقتدار کو اعتدال سے زیادہ بڑھتے دیکھا اور وہی فتنہ جس سے بچنے کیلئے آپنے اُن کو اوّل مرتبہ معزول فرمایا تھا۔ اب پہلے سے زیادہ مہیب صورت میں ظاہر ہونے لگا تو آپ کو اس کے انسداد کی فکر پہلے سے زیادہ ہوئی اور ضرور ہوا کہ اُن کو تمام خدمات سے معزول کر کے واپس بلا لیا جائے۔ اس وقت چونکہ مسلمانوں کے قلوب میں سابق سے زیادہ اُنکی محبت قائم ہو چکی تھی اور بلا وجہ عزل میں عام تشویش پھیل جانے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ادھر جب مسلمانوں میں اُنکی یہ عظمت و محبت تھی جس کے آثار کا ظہور یعنی عساکر کی جانب سے اُن کی تعظیم و تکریم کا ہونا لازمی امر تھا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ حضرت خالد میں بھی کوئی مضمون اپنے نفس پر اعتماد کا یا اُن خدمات جلیلہ کا اپنی طرف منسوب سمجھنے کا پیدا ہو جائے۔ اسلئے ایک طرف اگر مسلمانوں کو ورطۂ ہلاکت سے بچانا ضرور تھا تو دوسری جانب حضرت خالد کو بھی کسی خطرۂ موہومہ سے محفوظ رکھنا مدنظر تھا۔ معزولی اوّل کے بعد حضرت خالد سے اُس قسم کی تو کوئی بات پیش آئی نہ تھی جیسے بنی جذیمہ یا مالک ابن نویرہ کے قتل کی پیش آچکی تھی۔ صرف دو واقعے پیش آئے تھے ایک تو کسی شاعر کو انعام میں کثیر رقم کا دیدینا دوسرے حمام میں جاکر ایسے اُبٹنے کا استعمال جس میں شراب ملی ہوئی تھی۔ ان دونوں واقعوں کو سابق واقعات قتل بنی جذیمہ و قتل مالک بن نویرہ وغیرہ سے کیا نسبت مسلمانوں کا قتل غلطی رائے سے ہو یا غلطی فہم سے سخت اور عظیم الشان امر ہے اور یہ دونوں امر ایسے نہ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگر شاعر کو انعام دینا اسراف میں داخل سمجھا تو حضرت خالد کے خیال میں وہ اسراف نہ تھا۔ خود جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صاحب قصیدہ بانت سعاد کو ردائے مبارک انعام میں عطا فرمائی تھی۔ رہی مقدار انعام دینے والے کی ہمت و وسعت اور وسیع المبالی کا

ثرہ ہے۔ کسی سائل کو ضرورت و حاجت سے زیادہ دینا جائز ہے۔ تو شاعر کو بھی جو منزلہ ایک سائل کے ہوتا ہے جائز ہے اور پھر اُس میں ایک دوسری وجہ اتقار شر یعنی اُسکی بدزبانی سے اپنی عزت و آبرو کو بچانا بھی موجود ہوسکتی ہے۔ اس لئے رقم کثیر بطور انعام دیدینے میں اُنکے نزدیک کچھ حرج نہ تھا۔

عباس ابن مرداس نے جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کچھ اشعار کہے تو ارشاد فرمایا:- اقطعوا عنی لسانہ قالوا بما ذا یا رسول اللہ فامر لہ بحلۃ قطع بہا لسانہ (اُس کی زبان کو قطع کرو۔ عرض کیا کس چیز سے قطع کریں ارشاد ہوا کہ اس کو ایک حلہ یعنی دوچادریں دیدیں جس سے اس کی زبان بند ہو جائے)

حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہ نہایت سخی و کریم تھے کسی سائل کے سوال کو رد کرنا جانتے ہی نہ تھے اور نہ عطا و جود اور اجرار امداد کا سلسلہ جو کسی کے ساتھ ہوتا تھا منقطع فرماتے تھے ایک مرتبہ آپنے ایک شاعر کو انعام میں رقم کثیر عطا فرمادی کسی نے اعتراض کیا۔

اتعطی شاعرا یعصی الرحمٰن ویقول البہتان (کیا آپ شاعر کو اس قدر رقم دیتے ہیں جس کا شیوہ حق تعالیٰ کی نافرمانی اور مخلوق پر بہتان بندی ہی)

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

ان خیر ما بذلت من مالک ما وقیت بہ عرضک وان من ابتغاء الخیر اتقاء الشر (جن مواقع میں تو اپنا مال خرچ کرتا ہی اُن سب میں بہتر آبرو کی حفاظت کا موقع ہے۔ شر سے محفوظ رہنا بھی طلب خیر میں داخل ہے)

مروی ہے کہ ایک شاعر نے آپکی مدح کی آپنے انعام میں بھاری رقم عطا فرمادی۔ اسپر لوگوں نے ملامت کی تو فرمایا:- اترانی خفت ان یقول لست ابن فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ ولا ابن علی ابن ابیطالب ولکنی خفت ان یقول لست کرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا کعلی رضی اللہ عنہ فیصدق ویحمل عنہ ویبقی مخلدا فی الکتب محفوظا علی السنۃ الرواۃ فقال الشاعر انت واللہ یا ابن رسول اللہ اعرف بالمدح والذم منی

(کیا تمہارے خیال میں مجھکو اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ یہ کہتا کہ آپ فاطمۃ الزہرا یا علی ابن ابی طالب کے صاحبزادی نہیں ہیں۔

نہیں مجھکو اس امر کا اندیشہ تھا کہ وہ یہ کہتا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے یا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مثل نہیں
ایسا کہتا تو یقیناً وہ سچا ہوتا۔ بایں ہمہ یہ بات روایت ہو کر پھیل جاتی کتابوں میں مدون ہوتی۔ راویان اخبار کے السنہ میں
محفوظ ہو جاتی۔ شاعر بھی اس گفتگو کو سُنتا تھا۔ اُس نے کہا قسم ہے خدا کی آپ مدح وذم کی حقیقت کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں)

حاصل یہ ہے کہ اگر شاعر کی حیثیت کو دیکھا جائے کہ دن رات معاصی میں منہمک افترا و بہتان میں
مصروف ہے تو اُس کو ایک پیسہ بھی دینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اُنکی تقویت و اعانت اعانت علی المعصیۃ
ہے لیکن جب اُن کو انعام دینے سے مقصود اتقاء شر یعنی عزت و آبرو کی حفاظت ہے تو اتقاء شر بعینہ
طلب خیر اور داخل اعمال حسنہ ہے تو اس کو دینا اور انعام میں بھاری رقم دینا دونوں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن
اور بعض اوقات درجہ ضرورت تک پہنچ جاتے ہیں۔ پس بعینہ اسی طرح حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے انعام
کو خیال فرمالیجیے۔

فائدہ۔ یہاں ایک قوی شبہ پیدا ہو سکتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر شاعر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی
نسبت لست کرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا کعلی رضی اللہ عنہ کہتا جو حقیقتاً
بھی صحیح تھا کہ آپ کا درجہ نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برابر تھا اور نہ حضرت علی رضی اللہ
عنہ کی۔ اور آپ بھی اُسکو صحیح جانتے تھے تو اس میں مذمت اور کسر شان کیا نکلتی تھی جسکے منقول
اور مروی ہونیکا آپ کو اندیشہ تھا اور جس سے بچنے کیلئے آپنے اُس قدر مال کو بلا ضرورت صرف کردیا۔
جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ بیشک شاعر کا یہ کہنا صحیح ہوتا اور آپ بھی اُسکو صحیح جانتے تھے اور اس میں
آپکی کسر شان و توہین بھی نہ تھی۔ مگر یہ اُسی وقت جبتک کہ ظاہری الفاظ کے مطابق مطلب سمجھا جاتا۔
یعنی آپ مرتبہ اور درجہ یعنی فضائل و کمالات ذاتی و اکتسابی خیرات و میراث میں اُنکے ہم پلہ نہیں ہیں۔
لیکن اہل عرف و عادت اُس سے دوسرا مطلب بھی سمجھ سکتے تھے وہ یہ کہ آپ اُس طریقہ پر نہیں ہیں اور اُن
جیسے نہیں ہیں یعنی آپ اپنے سلف کے صحیح خلف اور جانشین نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی اگرچہ الفاظ
کے صراحتاً مدلول نہیں ہیں۔ مگر عرفاً مفہوم ہو سکتے ہیں اور شاعر کی مراد بھی یہی ہوتی۔ تو یقیناً ہجو میں
داخل ہوتا اور اس سے اتقاء کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپکی تقریر سُن کر شاعر بھی حیران رہ گیا۔ اور

بے ساختہ بول اُٹھا کہ ہجو اور مدح کو آپ مجھ سے یعنی شعراء سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے موقع میں اگر صراحتاً ہجو کی جائے یا کہدیا جائے کہ آپ حضرت فاطمہ زہرا یا حضرت علی رضی اللہ کے صاحبزادے نہیں ہیں تو سُننے والا اُس کو افترا و بہتان خیال کریگا۔ البتہ ہجو ایسے پیرائے میں کہ ظاہر اُس کا غلط نہو اور اشارہ تنقیص مرتبہ کی طرف ہو جائے یہ ایسا امر ہے جس سے اُس عصر کے سُننے والے بھی اشتباہ میں پڑ سکتے ہیں اور بعد کے آنے والے جنہوں نے آپکے حالات خود مشاہدہ نہیں کئے جب اس قسم کے خیالات سنیں گے تو اُن کو خیال ہو سکتا ہے کہ شاید آپ نے اپنے سلف کا اتباع چھوڑ کر اہل دنیا کی طرح دنیوی مشاغل کی طرف توجہ فرمائی ہو۔ یہی وہ باریک پہلو تھا جس کو آپ اپنے لئے کسر شان توہین اور مذمت سمجھتے تھے اور جس سے اتقاء کو عین خیر خیال فرماتے تھے۔

اس درمیانی فائدہ کے بعد پھر ہم اصل مطلب کی طرف عود کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت خالد کا یہ فعل نہ حرام و مکروہ تھا اور نہ اسراف میں داخل۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس معاملہ میں گرفت کی تو اُس کا مطلب نہ تھا کہ اس فعل کو حقیقتاً اسراف خیال فرماتے تھے۔ بلکہ میرے خیال میں آپ کو انتظاماً ایسے امور کا سدباب کرنا منظور تھا۔ مثلاً یہ فعل حضرت خالد سے صادر ہوا آپ تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایک ممتاز اور برگزیدہ فرد تھے اُن کی نسبت یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ اسراف جیسے کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوں اور نہ یہ کہ سلاطین دنیا کی طرح مدح کرانے کیلئے انعام عطا فرمائیں بلکہ تھا تو یہ کہ ایک سائل تھا جس کو آپنے اپنے حوصلے و ہمت کیموافق عطا فرمایا اور اُسکی بدزبانی سے بچنا بھی پیش نظر تھا۔ مگر اسی قسم کے افعال جاہ طلب لوگوں کیلئے حجت ہوجاتے ہیں اور جہانتک ہمنے تواریخ و سیر کو دیکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیاست عامہ کیساتھ افراد کے اخلاق و آداب کی اصلاح بھی فرماتے تھے اور کسی ایسے معاملہ میں بھی جو بظاہر مہتم بالشان معلوم نہوتا ہو مگر اُسپر کسی وقت بھی دوسرے قسم کے ثمرات مرتب ہوجانیکا اندیشہ ہوتا تھا سختی سے محاسبہ و دارو گیر فرماتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے کوفہ میں گھر بنا کر دروازہ لگالیا تو حضرت مسلمہؓ کو بھیجکر جلوا دیا۔ کیا

کیا دروازہ کا لگانا بھی ناجائز امور میں تھا مگر آپ کی غرض یہ تھی کہ امراء وولاۃ کا دروازہ مظلومین و اہلِ حاجت کیلئے ہر وقت کھلا رہنا چاہیئے اور اگر بندش اور دربانوں کی روک کی ابتدا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں پڑ گئی تو دوسرونکو حجت قوی ہاتھ آجائیگی وعلیٰ ہذا بہت سی نظائر ایسی ملیں گی کہ ایک مباح اور جائز امر کے انسداد میں بھی امور محرمہ کی طرح اہتمام فرمایا۔ علیٰ ہذا اُبٹنے میں اگر شراب بھی اور مان لو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں ایسے اُبٹنے کا استعمال ناجائز تھا تب بھی یہ ایک مسئلہ اجتہادی تھا حضرت خالد کے نزدیک اُس کا استعمال جائز تھا۔ کیونکہ شراب کی صورت وحقیقت مستحیل ہو چکی تھی۔ یعنی بدل چکی تھی۔ پس جو احکام صورت وحقیقت شراب پر متفرع ہوتے ہیں وہ ایسے نہوں گے جیسا شراب کو سرکہ بنا لینے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ صابون میں اگر ناپاک چربی ملی ہوئی ہو تو اُس کا استعمال جائز ہے کیونکہ چربی اگرچہ ناپاک ہے مگر وہ مستحیل ہو چکی ہے لہذا حکم بدل گیا اور ایسے اجتہادی مسائل میں کسی ایک مجتہد کو دوسرے پر الزام کا کوئی حق نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر نے اس جواب کو سنکر انکار نہیں فرمایا۔ غرض ان دونوں معاملوں کی جن پر آخر کی معزولی مرتب ہوئی یہ حقیقت تھی اور ہم دعوے کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ معزول کرنے کی وجہ یہ امور نہ تھے بلکہ انکی وجہ سے حضرت عمرؓ کے قلب مبارک میں حضرت خالد کی جانب سے کوئی سوء ظن بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اگر گرفت تھی تو انتظاماً سد باب کیلئے دیکھئے حضرت عمر نے بحلف فرمایا واللہ انك علی الکریم وانك الی الحبیب اور امراء ولایت کے نام عام گشتی جاری فرمائی۔

انی لم اعزل خالد اعن سخطۃ ولاخیانۃ۔ سخطہ اور خیانۃ نکرہ ہیں جو نفی کے تحت میں واقع ہوئے ہیں۔ یعنی کسی ادنی شائبہ ناخوشی وخیانۃ کی بنا پر معزول نہیں کیا۔ حضرت عمر کی اس شدومد سے حلف اور برات کے بعد بھی اگر کوئی شخص وجہ عزل انہیں امور کو سمجھے تو یہ اسکی خوش فہمی یا ہٹ دھرمی ہوگی۔ حضرت عمرؓ جیسا راستباز تو بحلف شدید انکار کرے اور یہ اب بھی یہی کہے تو نہایت جرأت وبیباکی کی بات ہے۔ مجھ کو تو اب اس ارشاد سے اپنی سابق معروض کی معزولی اول کی وجہ بھی وہ امور سابقہ نہ تھے ایک اور تائید مل گئی۔ وہ یہ کہ کسی بات پر ناخوش ہونے سے یہ لازم نہیں آتا

کہ وہ قابل عزل بھی سمجھی جائیں۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں آخری امر حضرت عمرؓ کو ناپسند ہوں اور آپکی شان احتساب وانتظام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہونے چاہئیں مگر عزل میں ان کو دخل نہیں تھا۔ لیکن بااینہمہ کہ دونوں معاملے ایسے خفیف تھے۔ کہ معزولی کیوقت اُن سے وہ معاملہ کیا گیا جو ایک حقیقی مجرم سے بھی نہیں کیا جاتا۔ ایک قائد حبش کے سر پر سے عمامہ اُتار کر مشکیں باندھی جائیں اور سر مجمع مجرمانہ حیثیت سے جواب طلب کیا جائے۔ یہ اس قسم کی توہین ہے جو مستوجب حدود شرعی کے ساتھ بھی نہیں کی جاتی۔ ماعز بن مالک پر حد زنا جاری کیگئی مگر جس شخص نے اُنکی توہین کی تھی اُس کو روک دیا گیا۔ اور پھر اول مرتبہ تو باوجودیکہ وجوہ ناخوشی قوی تھیں صرف قیادۃ عامہ سے معزول کرنے پر اکتفا کی گئی اور اس مرتبہ اُن کو عام افراد کی طرح جہاد میں حصہ لینے سے بھی باز رکھا گیا۔ بلکہ واپسی کا حکم دیدیا گیا۔

جب ہم اس معزولی کے اسباب اور طریقۂ عزل پر نظر غائر ڈالتے ہیں تو سوا اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ معزولی ثانی میں ان امور کو مطلقاً دخل نہ تھا۔ اگر معزولی اول میں ناخوشی سابق کو ظاہراً دخیل سمجھ لینا ممکن تھا تو اب اتنی وجہ بھی موجود نہ تھی۔ کیونکہ یہ معاملے ایسے نہ تھے اور پھر حضرت عمرؓ بحلف اس سے انکار فرماتے ہیں۔ بات تھی تو صرف یہی کہ قلوب میں اُنکی عظمت حد اعتدال سے متجاوز ہوتی جاتی تھی تدابیر پر بھروسہ بڑھتا جاتا تھا۔ خدا تعالیٰ پر سے نظر اُٹھتی جاتی تھی۔ ادھر حضرت خالدؓ میں جاہ و علو واعتماد علی النفس پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا کیونکہ آپ معصوم نہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جانب تو عام خیالات وعقائد کی اصلاح فرمائی کہ اُنکو عہدہ جلیلہ قیادۃ جیوش سے معزول فرمایا اور تبلادیا کہ اصل وجہ فتوحات اسلام رحمت وفضل خداوندی ہے وہی صانع وکارساز ہے۔ کسی کی کسی تدبیر و شجاعت۔ سیاست وفرزانگی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ بعد معزولی اگر وہ دوسرونکی طرح عام غزاۃ میں رہتے تب بھی اس خیال عام کا استیصال ممکن نہ تھا کیونکہ جس معرکہ میں وہ شریک ہوتے اگرچہ کسی حیثیت سے ہوتے عام خیالات کا رجوع اُنھیں کی طرف ہوتا اور نصرت وفتح کو اُنکے وجود اُنکی رائے وتدبیر کی طرف منسوب کیا جاتا۔ رائے ٹھیک دینی۔ تدابیر حرب تبلانے کیلئے قائد وافسر ہونا ہی کچھ ضرور نہیں ہے بعض اوقات ایک معمولی سپاہی سے وہ نمایاں خدمات صادر ہو جاتی ہیں جنکی بدولت وہ سپاہی سے دفعۃً جرنیل کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ

شخص جو وقتاً فوقتاً عام قیادۃ جیوش کے مدارج پر رہا ہو۔ جسکی تدبیر و فرزانگی کے ثمرات برکات و مرات مشاہدہ ہو چکے ہیں اُس سے نہ کوئی سپہ سالار مستغنی ہو سکتا ہے نہ عام افراد کے قلوب میں سے اُس کی عظمت و اقتدار کم ہو سکتی ہیں۔ اسلیئے اس کا علاج تھا تو صرف یہی تھا کہ ان کو میدان ہی سے طلب کر لیا جائے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو عظیم خطرات و مہلکات سوء اعتقادی و اعتماد علی غیر اللہ سے بچا لیا جائے اور دوسری جانب خود حضرت خالدؓ کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ اگر کوئی حظ نفس پیدا ہو چکا ہو یا ہو جانیوالا ہو تو وہ بھی دل سے نکل جائے اور بمقتضاء بشریت جن غوائل نفس کا اندیشہ ہو سکتا ہے اُس سے محفوظ ہو جائیں۔ نفس کے غوائل اور امراض ایسے سخت و صعب ہیں کہ اُن سے بچنا اور مبتلا ہو کر صحیاب ہونا افراد انسانی کی قدرت اور طاقت سے خارج ہے۔ اُن سے وہی محفوظ رہتے ہیں جن کے قلوب کو خداوند عالم نے پاک و صاف بنایا۔ یا اُن کا کامل تزکیہ و تصفیہ فرمایا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک (تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے پہلو میں ہے)

حضرت یوسف صدیق اس رفعت شان اور عظمت مرتبہ پر فرماتے ہیں۔

وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی (میں اپنی نفس کو بری نہیں کرتا۔ نفس بڑا حکم کرنیوالا ہے برائی کیلیئے سوائے اُن لوگوں کے جنپر خدا تعالیٰ رحم فرمائے)

غرض حضرت عمرؓ کی شان فاروقی نے اسکو گوارا نہ کیا کہ امت مرحومہ کسی مرض عام اعتماد علی غیر اللہ و ترک توکل میں مبتلا ہو کر تدبیر ہی کو مایۂ اعتماد بنالے یا حضرت خالد میں ہی کسی قسم کا حظ نفس و حب جاہ و امارت پیدا ہو جائے اُسکے معالجہ کیلیئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی۔ جہاں حضرت خالدؓ کو برسر مجمع مجرمانہ حیثیت سے جواب طلب کر نہیں شوکت نفس کو توڑنا تھا ایسے ہی اُنکے عزل کو ظاہری اسباب کی طرف منسوب کر کے ایک طرف عام مسلمانوں کی روک تھام تھی جن کے دلوں میں حضرت خالدؓ کی عظمت اس درجہ تھی کہ کہیں اُسکے مقابلہ پر احکام فاروقی میں کلام نہ ہونے لگتا۔ ادھر حضرت خالدؓ کو جن خطرات و مفاسد سے بچانا تھا اُسکے اندر بھی اسکو زیادہ دخل تھا۔ خلاصہ ہمارے تمام بیان کا یہ ہے کہ صورت ظاہری میں عزل

اوّل کیلئے واقعات سابق کو اور عزل ثانی میں واقعات مابعد کو سبب بنایا گیا۔ اور پھر ان دونوں میں فرق تھا۔ عزل اوّل میں حضرت عمرؓ کی ناخوشی واقعات سابقہ کی وجہ سے ایک ظاہر امر تھا اور اس لئے انکی مداخلت بھی اُس عزل میں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر عزل ثانی میں اس قدر مداخلت بھی نہ تھی لیکن حقیقتاً عزل کی یہ وجہ نہ تھی بلکہ اُمت کو فتنہ و فساد عقائد کے ابتلاء سے اور حضرت خالدؓ کو حب جاہ و شوکتِ نفس کے مہلک مرض سے محفوظ رکھنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اوّل عزل کے بعد بھی آپ نے حقیقۃ الامر کو بیان فرماتے ہوئے صاف ظاہر کر دیا کہ خالدؓ و مثنیٰ کو کسی ریبہ یا تہمت کی وجہ سے معزول نہیں کیا گیا۔ بلکہ خوف فتنہ اس کا باعث ہوا۔ اور عزل ثانی میں بھی جب حضرت خالدؓ نے ایسی بے عنوانی کا جو اُن کے ساتھ برتی گئی شکوہ کیا تو حلف کے ساتھ اس حسن ظن اور محبت کا اظہار فرمایا جو آپ کو اُن کے ساتھ تھے۔ ادھر بذریعہ گشتی عام امراء و عساکر و ولاۃ امصار کو اطلاع دی کوئی شخص حضرت خالدؓ کو کسی اشتباہ یا ریبہ کی طرف منسوب نہ سمجھے۔

یہ ہی حقیقۃ الامر عزل خالد کی۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ اس بیان کے اہم مقاصد کو محفوظ رکھے اور اس کے دل میں نہ حضرت خالد کی جانب سے سوء ظن کا خطرہ ہو۔ نہ حضرت عمرؓ کی جانب اس امر کا کہ ایک نامور فاتح کی خدمات سے سلمانوں کو کیوں محروم فرمادیا۔

فوائد

واقعہ عزل خالد سے چند اہم فوائد ہم کو حاصل ہوئے ہیں جنکا بیان کر دینا بھی مزید افادہ کا ذریعہ ہو گا۔

فائدہ اوّل۔ تقدیر و تدبیر کا جمع کرنا عام افہام و عقول میں دشوار ہو رہا ہے۔ توکل کو بیکاری سکھلانے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور دوسروں پر اپنا بار ڈال کر خود اپاہج معطل بننے کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ فلسفہ اور سائنس کے دلدادہ اُسکی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تجربیات و مشاہدات سے عجائب و غرائب صنائع و ایجادات سے عالم کو متحیر کر دیتے ہیں۔ مگر اُن کا دائرہ علم صرف مشاہدات و محسوسات تک محدود ہے اور سچ پوچھیئے تو اُن کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اُس میں سے بھی صرف اتنی بات

اخذ کرتے ہیں جس کا تعلق آثار و ثمرات سے ہی وہ حقائق اشیار کی کنہ تک نہیں پہنچتے اور نہ پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے انہیں مادیات و تاثیرات کو اصل الاصول سمجھ کر اُن پر اس درجہ اعتماد کرلیا ہی کہ اُس سے ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا ارادہ نہیں کرتے۔ اور کیونکر کر سکتے ہیں۔ جب حقیقت شناس بصیرت سے اُنکو حصہ ہی نہیں ملا اس حقیقت کو اسلام نے روشن کر دیا اور تبلا دیا کہ تقدیر و تدبیر دونوں بخوبی جمع ہو سکتی ہیں اسلام نے ایک طرف ایمان بالقدر کو اگر ایمان کا جزو و لازم قرار دیا ہے تو دوسری جانب تدبیرات و اسباب سے متمتع ہونے کی بھی اجازت دی ہی۔ بلکہ بعض مواقع میں ضروری تبلایا ہے۔

تقدیر و تدبیر کا انکشاف عقل و استدلال سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ اگر اُسی عقل کنہ رس کو جو خداوند عالم نے ہر انسان کے اندر ودیعت کر رکھی ہی محض محسوسات و مشاہدات ہی کے بھول بھلیاں میں برباد کر کے اسکی ترقی کو محصور و محدود نہ کر دیا جائے۔ بلکہ اُس کی بلند پرواز فطرت کو کلیات میں صرف کیا جائے اور سب سے پہلے اس مرحلے کو طے کر لیا جائے کہ عالم کی گوناگوں نقش و نگار قسم قسم کے تغیرات و انقلابات کسی زبردست و مضبوط ہاتھ میں ہیں جو تمام اشیا کا خالق۔ اسباب و مسببات کا ترتیب دینے والا ہے جس کے اشارہ اور حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اسباب جس کے اشارہ کے مطیع و منقاد ہیں۔ اُس کا ارادہ اور اُسکی مشیت اسباب کے پابند نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ دنیا کے ممتاز امم اور اصل مذاہب میں تسلیم شدہ ہی تمام عالم باستثنار دہریئین اسکے قائل ہیں۔ مگر باوجود اسکو تسلیم کر لینے کے اسباب کے دلدادہ افراد کو اس جانب سے ذہول ہو جاتا ہے۔ ہاں کبھی کسی نہایت شدید دہریئے و ملحد کی پشت پر کوئی سخت تازیانہ عبرت لگا دیا جائے تو یہ علم و اذعان پھر تازہ و مستحکم ہو جاتا ہے۔

اور جب یہ مرحلہ طے ہو چکا تو اس کے بعد تمام اسلامی معتقدات تقدیر و توکل وغیرہ اہم مسائل کا تسلیم کرنا ضروری و لازمی ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ارباب عقول اپنی پرزور استدلال و قیاسات سے سر ملحد و دہریے کو منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنی قوی و روشن دلائل کے سامنے کسی کی بھی چلنے نہیں دیتے۔ مگر در حقیقت اُن کا اصل علم اُنہیں کو ہوتا ہی جن کو حقائق منکشف ہو جاتے اور وہ برائے العین خالق و مخلوق کے ربط اسباب و مسببات کے تعلق کو مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ ان کا مرتبہ محجہ و استدلال

بہت کچھ اوپر پہنچ جاتا ہے اور ان کو استدلال و حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ اپنے اندر ایسا ایک روشن دل لئے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں حقائق ممکنات کا انکشاف تام ہوتا ہے اور وہ اپنی معرفت و بصیرۃ کا قوی اثر ڈال کر دوسروں کو بھی بلا وساطت دلیل و برہان منوا سکتے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض صحبت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حقایق اشیاء اور غامض علوم کا انکشاف اس طرح کر دیا تھا کہ اُن کو کسی دقیق سے دقیق مسئلہ میں کسی قسم کا خفا باقی نہیں رہتا تھا۔ ہر غامض و ادق مسئلہ کو بصیرۃ ایمانی سے ادراک کرتے تھے اُن کو ہر مشکل اور متعسر الفہم مسائل میں برد قلب حاصل ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اُصول دین میں متفق تھے کبھی ان میں اختلاف نہیں ہوا اور جب کبھی کوئی مسئلہ چند اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مختلف مجالس و مقامات میں دریافت کیا گیا تو جواب کے الفاظ تک بھی ایک ہی ہوتے تھے۔

دیکھئے تقدیر کا مسئلہ جس کے فہم سے اکثر اہل دانش و فہم عاجز ہیں چند صحابہ سے علیحدہ علیحدہ مجالس میں دریافت کیا گیا تو جواب کے الفاظ تک متفق تھے ابن سلمی کہتے ہیں میں نے حضرت ابی کعب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ تقدیر کے مسئلہ میں مجھے کچھ خلجان ہے آپ کچھ ارشاد فرمائیں تو شاید یہ خلجان رفع ہو جائے۔ فرمایا

لو ان اللہ عز وجل عذب اھل سموٰتہ و اھل ارضہ عذبھم وھو غیر ظالم لھم و لو رحمھم کانت رحمتہ خیر لھم من اعمالھم و لو انفقت مثل اُحد ذھبا فی سبیل اللہ ما قبلہ منک حتی تؤمن بالقدر و تعلم ان ما اصابک لم یکن لیخطئک و ما اخطاک لم یکن لیصیبک و لو مت علی غیر ھذا لدخلت النار۔

(اگر خداوند عالم تمام زمین و آسمان والوں کو عذاب دے تو وہ ظالم نہ ہوگا۔ اور اگر رحم فرمائے تو اسکی رحمت اُنکے اعمال سے زیادہ مفید اور بہتر ہوگی۔ اور اگر تو احد پہاڑ کی برابر فی سبیل اللہ سونا خرچ کر ڈالے تو جبتک تقدیر پر ایمان نہ لائے اور یہ نہ جان لے کہ جو کچھ تکلیف تجھ کو پہنچنے والی ہے کسی تدبیر سے ٹل نہیں سکتی اور جو نہیں پہنچنے والی وہ پہنچ نہیں سکتی۔ اگر تو اس عقیدہ کے سوا کسی اور عقیدہ پر مر گیا تو جہنم میں داخل ہوگا۔

ابن دیلمی کہتے ہیں کہ اسکے بعد میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کی خدمت میں گیا۔ اُنہوں نے بھی

یہی فرمایا۔ پھر حضرت حذیفہ کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا۔ پھر حضرت زید ابن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے بھی اسی مضمون کی میرے سامنے روایت کی۔

اور یہی وجہ تھی کہ اگر کسی معاملہ میں صحابہ کے اندر اختلاف بھی ہوا تو چند کلموں میں بات صاف ہو جاتی تھی۔ طول طویل استدلال کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

اور جب مسئلہ تقدیر کو مان لیا گیا اور اسکو اسکی حقیقت کی موافق سمجھ لیا گیا تو خدا تعالی پر بھروسہ اور توکل کرنا ہر مسلمان کے ذمے لازم ہوگا۔ درجہ اعتقاد میں تو یہ فرض ہوگا کہ ہر ایک فعل کا فاعل حقیقی اسکو سمجھے۔ اگر ایسا نہ سمجھے اور سوا خداوند عالم کے کسی اور کو بھی فاعل و خالق سمجھے۔ یا کسی غیر کا خواہ اپنا نفس ہی ہو اس میں دخل جانے تو اسکو مشرک کہنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ قدریہ کو جو عباد کو خالق افعال سمجھتے ہیں اسی وجہ سے مجوس ھذہ الامۃ فرمایا گیا ہے۔ اور اگر درجہ اعتقاد سے ترقی کر کے یہ عقیدہ اس کا حال بنگیا۔ اور اسکی نظر غیر اللہ سے اٹھ گئی تو یہ اعلی مقام سمجھا جاتا ہے جو سوا صدیقین و اہل معارف دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ صحابہ کے تمام افراد باوجود تفاضل مراتب اس حال کے ساتھ متصف تھے۔ انکو کشفاً و عیاناً یہ مراتب و حالات حاصل تھے۔ اُن کے اندر وہ سکون و طمانیت موجود تھی جو سالہا سال کی ریاضت و تزکیہ و تصفیہ باطنی سے حاصل نہیں ہوتی یہی وجہ تھی کہ صحابہ کا ہر ایک فرد قرون مابعد کے تمام افراد سے افضل مانا گیا ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اکثر افراد حالات کے اعتبار سے اسباب و تدابیر کو مضبوط ہاتھوں سے تھامے ہوئے نظر آتے تھے وہ کسب و اسباب میں مشغول رہتے تھے۔ جنگ و صلح کے وقت وہ ایسی تدابیر کرتے تھے جن سے منہمک فی الاسباب وزرار و سلاطین بھی عاجز تھے۔ انکی تدابیر کو دیکھ کر دنیا متحیر رہجاتی تھی۔

ظاہر بین نظریں سمجھتی تھیں کہ اُن کو محض اپنی تدابیر پر اعتماد ہے۔ مگر درحقیقت ایسا نہ تھا وہ سب کچھ کرتے تھے مگر اُن کا علاقہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ اسقدر قوی تھا۔ اُن کی نظر غیر اللہ سے ایسی اٹھی ہوئی تھی کہ قوی سے قوی کارآمد و مفید تدبیر کو بھی منتج نہ سمجھتے تھے اور سوا خداوند عالم کسی کو فاعل و صانع مختار نہ جانتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مختلف شیون و حالات پر اگر آپ ذرا سلامت صدر کیساتھ نظر ڈالیں تو آپ کو اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی توقف نہ ہوگا کہ تدابیر کا استعمال توکل کے منافی نہیں توکل و تدبیر نہایت سہولت سے جمع ہوجاتے ہیں دیکھئے ایک جانب تو آپ انی لاجھز الجیش و انا فی الصلوٰۃ میں نماز میں لشکر کی آراستگی و روانگی کا سامان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں دوسری جانب عام خیالات و اعتقادات کی اصلاح کیلئے حضرت خالد جیسے نامور جلیل القدر مدبر و شجاع کی خدمات سے استغنا فرماتے۔ اور دکھلاتے ہیں کہ تم تدبیر کرنے کیوقت بھی اُس پر اعتماد نکرو کارساز حقیقی کوئی اور ہے۔ نہ خالد ہیں۔ نہ عمر۔ یہی اسلامی صحیح و بے لوث تعلیم اور یہی وہ خطرناک گھاٹی و مسئلہ جبر و قدر کی جس کے طے کرنے میں ہزارہا مدعیان عقل و دانش تباہ و برباد ہوگئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جملہ

لیعلموا ان الصانع ہو اللہ | (تاکہ جان لیں کہ کارساز صرف اللہ ہی)

فرماکر تمام اشکالات کو رفع فرمادیا اور تمام صحابہ نے بلا نکیر و تردد اُس کو تسلیم فرمالیا۔ کیوں کہ سب کے قلوب صافیہ میں یہ حقیقت منکشف تھی قرن صحابہ میں اس مسئلہ کے اندر اختلاف ہی نہیں ہوا۔

اسلام کے بیشمار فرقوں میں سے اہل سنت والجماعت کثرہم اللہ تعالیٰ نے اس راز کو سمجھا۔

لاجبر ولا قدر ولکن امر بین بین (نہ جبر محض ہے کہ انسان مجبور ہو۔ اُسکے اختیارات کو افعال میں کچھ دخل نہ ہو۔ اور نہ قدر ہے کہ وہ خود اپنے افعال کا خالق اور ان پر قادر ہو۔ بلکہ جبر و قدر کے درمیانی بات ہے۔ یعنی بعض وجوہ سے وہ قادر مختار ہے اور بعض وجہ سے مجبور)

کو جزو ایمان قرار دیا۔ اس اعتقاد حق کے سوا جس فرقہ نے کوئی دوسری راہ اختیار کی وہ خود بھی تباہ ہوا۔ دوسرونکو بھی تباہ و برباد کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر مسلمان کو صراط مستقیم پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کم عقلی۔ کج بحثی۔ اپنے خیالات کی پابندی۔ احکام شریعت کو اپنی ناقص عقلوں کے معیار پر اُتارنا۔ تباہ و برباد کردیتی۔ قعر جہنم کا ایندھن بنادیتی ہیں۔

عصمنا اللہ تعالیٰ وجمیع المسلمین منہ واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم

جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے خواہشمند ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ سوا اُن اُصول کے کسی اور طریقہ پر ترقی نہیں کر سکتے۔

فاروقی خلافت میں اسلام کی جو شان و شوکت تھی مسلمانوں کی عزت و عظمت کا سکہ جسقدر دنیا میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بعد کے کسی قرن میں حاصل نہیں ہوا۔ ممالک اسلامیہ ضرور وسیع ہوئے مگر اسلام کی حقیقی ترقی کا زمانہ یہ تھا۔ اور یہ اُن صحیح اُصول و عقائد کا ثمرہ تھا۔ اب بھی جس قدر ترقی ہو گی انہیں اُصول کی پابندی سے ہو گی۔

فائدہ ثانیہ۔ سلطنت و نبوت دو جداجدا منصب ہیں سلطنت تو عالم کے نظام ظاہری کو قائم رکھنے عدل و انصاف امن و اطمینان پھیلانے افراد رعایا میں توازن و مساوات برقرار رکھنے۔ اجراء حدود و قصاص۔ حفظ حدود ممالک و سرانجامی معرکہ ہائے قتال وغیرہ کیلئے ہوتی ہے۔

اور نبوۃ تعلیم شرائع و احکام الٰہی استیصال شرک و فساد اعتقاد و اعمال و اصلاح معاد تزکیہ نفوس۔ تطہیر اخلاق و محو آثار نفسانی کیلئے۔

یہ دونوں امر اگرچہ متعانق ہیں کیونکہ فرائض نبوت جبھی پوری طرح ادا ہو سکتے ہیں کہ شوکت و رعب قوت تنفیذ احکام الٰہی اُسکے ساتھ ہو علیٰ ہذا فرائض سلطنت اُسی وقت بوجہ اتم ظہور پذیر ہو سکتے ہیں کہ سلطان وقت کسی شریعت منزل من اللہ کا پابند ہو بوجہ اتم کی قید ہم نے اس لئے لگائی ہے کہ بہت سے سلاطین ایسے بھی گذرے ہیں اور اب بھی ہیں جو باوجود کسی شریعت منزل من اللہ کے تابع نہ ہونیکے نظام عالم کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اُن کو سلطان عادل اور منتظم کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ یہ خود ساختہ قانون کے پابند ہوتے ہیں اس لئے حقیقی قوانین کی طرف اُن کو ہدایت نہیں ہوتی۔ اور چونکہ اُن کا علم بالکل محدود ہوتا ہے وہ رعایا کے حقیقی نفع و نقصان کو نہیں سمجھ سکتے اسلئے اُسکے ثمرات بھی اگرچہ ایک حد تک بھلے معلوم ہوں مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو بہت سی مضرتیں اپنے اندر لئے ہوتے ہیں۔ اور اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ در اصل سلطان عادل وہی ملوک ہیں جو کسی خدائی قانون کی ماتحتی میں نظام عالم کو قائم کرتے ہیں اور اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ سلطنت و نبوت دونوں متعانق ہیں۔

یکن یہ کچھ ضرور نہیں کہ دونوں منصب ایک ذات کے اندر جمع کر دیئے جائیں انتظام ظاہری اور اصلاح معاد کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ منصب نبوت سے کوئی سرفراز کیا جائے اور زمام سلطنت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیجائے جو نبی کے احکام کا تابع ہو کر اپنے فرائض ادا کرے۔

ہم امم ماضیہ کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں تو ایک ذات کو دونوں منصب عطا کر دیئے گئے ہیں اور کبھی اُن کو بالکل جدا رکھا گیا ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک خاندان کے اندر نبوت ہوتی تھی اور ایک میں سلطنت۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد اسباط کے نام سے موسوم تھی اُن میں سے یہودا ابن یعقوبؑ کی اولاد میں ملک و سلطنت منتقل چلے آتے تھے اور لاوی بن یعقوبؑ کی نسل میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح پر بنی اسرائیل میں ایک زمانہ تک مالک حکم کوئی ہوتا تھا اور مہبط وحی و تنزیل کوئی دوسرا۔

طالوت کی سلطنت و مملکت کا حال کلام اللہ میں مذکور ہے۔ باوجودیکہ بنی اسرائیل میں نبی موجود تھے مگر انتخاب سلطان کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ انتخاب طالوت کے نام نکلا۔ دیکھیے ارشاد خداوندی۔

وقال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكاً قالوا انى يكون له الملك علينا ونحن احق بالملك منه ولم يوت سعة من المال قال ان الله اصطفاه عليكم و زاده بسطة فى العلم والجسم والله يوتى ملكه من يشاء	(اُن کے نبی نے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اُسکو ہم پر بادشاہت کا حق کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ ہم اُن سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں اور اُنکی تو مال میں بھی وسعت نہیں ہے۔ نبی نے کہا کہ اللہ نے اُنکو تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اُنکے علم اور جسم میں وسعت دی ہے۔ اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہے دیتا ہے۔

بنی اسرائیل کو اس میں تو کچھ خلجان تھا کہ مملکت کو سلطنت سے جُدا کر کے ایک مستقل بادشاہ کیوں بنایا گیا۔ کیونکہ وہ اُسکے خوگر تھے۔ اُنکو دونوں منصبوں کے فرائض کی تقسیم معلوم تھی وہ جانتے تھے کہ دونوں کی اطاعت کس طرح جمع کی جاسکتی ہے۔ ایک کی فرمانبرداری دوسرے کے ساتھ ارتباط و انقیاد سے مانع نہیں ہے

اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ حقیقی سرداری نبی ہی کی ہوتی ہی۔ بادشاہ بھی اُن کے احکام کا متبع اور اُن کے اشارہ و حکم کا منتظر رہتا ہی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ بادشاہ کا درجہ باوجود اُن وسیع اختیارات اور حکومت عام کے زیادہ سے زیادہ وزیر تفویض[۵] یا والی تفویض کا ہوتا تھا۔ ان وجوہ سے ان کو اس متعارف امر کی تسلیم میں تو تامل نہ ہوا۔ ہاں تامل و خلجان یا انکار و نزاع ہوا تو اس میں کہ طالوت کو اس منصب جلیل کیلئے

---

[۵] امام و خلیفہ کو تمام ولایات پر اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ تمام ممالک و صوبے اس کے زیر نگین اور ہر ایک صیغہ و شعبۂ ملک بلا استثنار اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن شخص واحد تنہا کبھی کسی وسیع سلطنت یا ملک کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اس کو ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے اختیارات کو نائبوں اور قائم مقاموں کے ذریعے سے نافذ کرے اسی لئے امام کے واسطے نائبین کا ہونا لازم ہے۔ نائب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وزرار۔ دوسرے والی ممالک۔ وزرار کا اصل فرض تو یہ ہے کہ خلیفہ یا سلطان کا مشیر رہے۔ اُس کے بار کو اُٹھائے۔ اور والیان ممالک ولایات خاصہ کا انتظام کرتے ہیں امرار ولایت کو اُنکی ولایت میں کبھی اختیارات عام دیئے جاتے ہیں۔ اور کبھی اختیارات خاص۔ عام اختیارات عام کی صورت میں۔ اس کو امیر یا والی تفویض کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہی جس کا حاصل یہ ہوتا ہی کہ امام نے ایک ولایت میں اپنے کل اختیار اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ ہر ایک معاملہ کو اپنی رائے سے تجویز کر سکتا۔ اور نافذ کر سکتا ہی ایسے والیان ممالک کی مثال درکار ہی۔ تو سلاطین سلجوقیہ۔ دیلمیہ۔ صلاحیہ۔ سامانیہ وغیرہ کو جو نسبت خلافت عباسیہ کے ساتھ تھی اسکو پیش نظر کر لیجئے۔ اور خاص اختیارات کی حالت میں جبکہ اس کو تجویز حکم کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ صرف تنفیذ حکم کا اختیار دیا ہی وہ کسی امر کو اپنی رائے سے تجویز و فیصل نہیں کر سکتا۔ ہاں خلیفہ و امام کے احکام کو جاری و نافذ کر سکتا ہی تو ایسے امیر یا والیوں کو امیر یا والی تنفیذ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح وزرار کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وزیر تفویض دوسرا وزیر تنفیذ۔ وزیر تفویض کے اختیارات بالکل وہی ہوتے ہیں جو امام کے اُسکو کسی امر میں امام سے استفسار یا استمزاج کی حاجت نہیں ہوتی ہے۔ وہ بھی مثل امام کے دوسرا مستقل امام ہوتا ہے اور اسی لئے اُس کے اندر اکثر ایسے شرائط کا وجود ضروری ہے جو امام کیلئے لازمی ہیں۔ فرق ہوتا ہے تو اتنا کہ وزیر تفویض کا عزل و نصب امام کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ جب چاہے اُس کے اختیارات کو سلب کر سکتا ہے۔ گویا امام اصل ہے اور یہ اُس کا ظل۔ اور وزیر تنفیذ۔ خود کوئی حکم نہیں دے سکتا اور نہ تجویز کر سکتا ہی۔ وہ ہر ایک معاملہ میں امام کے حکم و رائے کا محتاج ہی۔ اُس کا منصب صرف اس قدر ہی کہ امام کے یہاں سے صادر شدہ احکام کو نافذ کر دے۔ ملوک بنی اسرائیل جو انبیار علیہم السلام کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے اُنکی شان یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرائع میں تابع احکام انبیار علیہم السلام ہوتے تھے اور کوئی معاملہ خلاف منشار شریعت طے نہ کر سکتے تھے شریعت کا منشار معلوم ہونے کا ذریعہ انبیار علیہم السلام ہوتے تھے۔ ہر موقع و مقام کے مناسب انبیار علیہم السلام احکام شریعت ظاہر فرماتے تھے اور ملوک اُنکا اتباع کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر اُن کو وزیر تنفیذ کہدیا جائے تو کچھ مستبعد نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ دو شعبوں ہدایت خلق و نظام عالم میں سے ایک شعبہ کے اختیارات مستقلاً اُن کی سپرد کر دیئے گئے ہیں تو اس اعتبار سے اُن کو وزیر یا والی تفویض کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہی۔ (امامت و سیاست کے بارے میں بذیل سلسلہ تعلیمات اسلام ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر توفیق الٰہی نے مدد فرمائی تو مستقل لکھیں گے اُس میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس بحث کو مفصل و مدلل درج کریں گے۔ یہاں بقدر ضرورت اسکی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے ۱۲ منہ

کیوں منتخب کیا گیا۔ یہ بات انکو انوکھی معلوم ہوئی کہ برخلاف معمول سابق خاندان یہود لاوے منتقل ہوکر ملک کسی اور خاندان میں چلا جائے۔ طالوت اپنی ذات سے مفلس و تنگدست تھے اپنے پیشہ کے اعتبار سے بھی ذی وجاہت ہونیکے بجائے کم رتبہ سمجھے جاتے تھے کیونکہ وہ دباغ (چمڑہ رنگنے والے) یا سقا (پانی بھرنے والے) تھے اور یہ دونوں پیشے مخلوق کی نگاہ میں حقیر و مبتذل سمجھے جاتے ہیں۔ اور خاندان سلطنت میں سے نہ تھے کیونکہ وہ بنیامین بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں تھے۔ اور بنی اسرائیل کی عادۃ مستمرہ یہ تھی کہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی بات بھی بلا کسی قسم کی نکتہ چینی کے نہ مانتے تھے۔ اسلئے منازعت کیلئے تیار ہوگئے اور کہنے لگے طالوت کو کیوں بادشاہ بنایا گیا۔ اسکو ہم پر کیوں فوقیت دی گئی۔ وہ کونسی بات اُس میں موجود ہے کہ ہم باوجود ہر قسم کی قابلیت۔ وجاہت ولیاقت کے نظر انداز کردیئے گئے اُن کے ان اعتراضات و خدشات کا جواب خداوند عالم نے آیات مذکورہ میں دیدیا جس کا حاصل یہ ہی کہ تمہاری نظر اس ظاہری شان و نمود مال و دولت پر ہی تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے جن کی وجہ سے حقیقتاً قابلیت سلطنت کی ہوتی ہی۔ طالوت میں وہ قابلیتیں موجود ہیں جو تم میں نہیں ہیں۔ علم اُن کا تم سے زیادہ ہے۔ قوت جسمانی و سلامتی حواس میں وہ تم سے زیادہ ہیں اور انہیں پر اداء فرائض سلطنت کا مدار ہے۔

پھر اسکے علاوہ یہ ہے کہ مملکت و سلطنت موہبت الٰہی ہے اُسکو اختیار ہے اپنا ملک جسکو چاہے عطا فرمائے۔ قابلیت پیدا کرنا بھی اُسی کے اختیار میں ہی اور عطاء ملک بھی وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَاءُ۔

ملک و سلطنت کے یہ دونوں سلسلے اسی طرح جُدا جُدا چلے آئے۔ لیکن حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی ذات میں ان دونوں کو جمع کردیا گیا۔ کلام اللہ میں ارشاد ہی۔

كُلًّا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (ہم نے ہر ایک کو علم و حکم عطا کیا)

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی زیادہ وسیع حکومت دیگئی اُنکی حکومت انسانوں سے متجاوز ہوکر جنات طیور و وحوش پر بھی تھی۔ ہوا کو اُنکے لئے مسخر کردیا گیا تھا

طیور و وحوش سے بیرہ چوکی کا کام لیا جاتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خود اسکی دعا فرمائی تھی۔ جو درجۂ اجابت کو پہنچی۔

وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب	(مجھ کو ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کیلئے نہ ہو تحقیق تو بڑی بخشش والا ہے)

فائدہ:۔ اس آیت میں دو امر قابل تنقیح و بحث ہیں۔

اول یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا مطلب کیا تھا۔

سو معلوم کر لینا چاہیئے کہ اس دعا کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں اول یہ جو ظاہر الفاظ آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ مجھکو ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کو ایسا ملک نہ ملے۔ کیونکہ مواقع تعریف و مدح یا طلب میں جب ایسے الفاظ کو جمع کیا جاتا ہے جو ظاہراً دوسروں سے نفی پر دلالت کرتے ہیں تو عرف و استعمال میں صرف اپنے لئے کسی بڑی چیز کی طلب یا کسی کے فضل و کمال کی عظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے دوسروں سے نفی مطلوب نہیں ہوتی مثلاً کسی کی مدح میں کہا جاتا ہے۔

لفلان ما لیس لاحد من الفضل والمال	(فلاں شخص کی فضیلت و دولت ایسی ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہے۔)

اس عبارت میں مدلول الفاظ صاف اور صریح طور پر ممدوح کیلئے اثبات اور غیر ممدوح سے نفی و سلب ہی لیکن عرف و استعمال شاہد ہے کہ نہ قائل کی یہ غرض ہی اور نہ سامع اس سے یہ مطلب سمجھتا ہے۔ اُس سے صرف ممدوح کے فضل و کمال کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ سوم یہ کہ اس عبارت میں ایک کلمہ کو مقدر مانا جائے اور تقدیر عبارت اس طرح کی جائے۔

لا ینبغی لاحد سلبہ	یعنی مجھکو ایسا ملک عطا فرما جو مجھ سے سلب کیا جائے اور مجھ سے نہ لیا جائے۔

اور اس وقت دعا کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ مجھکو نہایت عظیم الشان ملک عطا فرما۔ جو فی حد ذاتہ بے مثل ہو۔ اور نہ یہ ہوگا کہ اُس جیسا ملک کسی اور کو نہ ملے۔ بلکہ یہ ہوگا کہ جیسا ایک ابتلا کے بعد جس کا آیۂ سابقہ میں ذکر ہو چکا ہے۔ چند روز کیلئے میرا ملک مجھ سے سلب کر لیا گیا تھا۔ آیندہ مسلوب نہ ہو اور

کسی کو اُس کے سلب کرنیکی قدرت وطاقت نہو۔

یہ تین احتمال ہیں اس آیت کے مطلب میں جن میں سے احتمال اول باعتبار مدلول الفاظ اور مطابق دلالت کلام ہونے کے قوی ہے اور اُس سے عدل وتجاوز کرکے دوسرے معنی کی طرف جو باعتبار دلالت خفی ہوں اور اُن کی مراد لینے میں عرف واستعمال کا سہارا حاصل کرنیکی ضرورت پڑی یا جو مدلول سے بعید ہوں۔ کوئی وجہ نہیں ہے۔

مگر مفسرین کو ایسے ظاہر الدلالت معنی مراد لینے میں دو تامل ہیں۔ اول یہ کہ کسی اور کو ایسا ملک نہ دیئے جانیکی دعا کرنا منافسہ میں داخل ہے جو ایسے جلیل القدر نبی کی شان سے مستبعد ہے اپنے لئے طلب کرنا اگرچہ منشا اُس کا صحیح ہو معیوب و مذموم نہیں لیکن دوسرے کو فضیلت و نعمت سے محروم کرنیکی خواہش کرنا اچھا نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا مقبول ہوچکی اور اب کسی کو ایسا ملک ملنا نہ چاہیئے۔ لیکن ایک حدیث سے جو بخاری وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسی عام حکومت واختیارات جن وانس پر حاصل تھے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان عفریتا جعل تیفلت علی البارحۃ لیقطع علی صلوتی وان اللہ تعالی امکننی منہ فلقد ھممت ان اربطہ الی ساریۃ من سواری المسجد حتی تصبحوا فتنظروا الیہ کلکم فذکرت قول اخی سلیمان رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی فردہ اللہ خاسئا۔

ایک بھوتنا کل رات میری طرف اس غرض سے آیا کہ میری نماز کو منقطع کردے۔ اللہ تعالی نے مجھ کو قابو دیدیا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس کو مسجد کے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ صبح کو تم سب بھی اُس کو دیکھو لیکن مجھکو میرے بھائی سلیمان کی دعا رب ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی یاد آگئی۔ خدا تعالی نے ذلت کے ساتھ اس کو لوٹا دیا۔

اور اسی لیئے دوسرے معنوں میں سے معنی ثانی کو مرجح سمجھتے ہیں کہ اُن میں کوئی خلجان نہیں ہی لیکن میرے خیال میں یہ دونوں باتیں ایسی نہیں ہیں جنکی وجہ سے ان ظاہر الدلالت معنی کو ترک کیا جائے۔

گر ان ایا جائے کہ اس دعا سے منافسۃ معلوم ہوتی ہی تب بھی ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ منشا اسکا کیا ہے۔ آیا ذاتی عز وجاہ ہے یا اظہار شوکت دین الٰہی وجلالت قدر انبیار علیہم السلام۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملک وسیع واختیار وتسلط عام جن وانس طیور ووحوش پر تو پہلے سے دیا ہی گیا تھا۔ اسلیئے اسکی خواہش تو در اصل اُنکو نہ تھی اور نہ ایسی دعا کرنے کا خیال تھا مگر چونکہ اُسی ابتلا وامتحان کی وجہ سے جو اُن کو پیش آیا جس کی وجہ سے چند روز ان کا ملک مسلوب اور اختیارات ساقط ہو گئے تھے ان کو یہ ضرورت پیش آئی کہ انبیار علیہم السلام کی جلالت شان۔ اپنی قرب ومنزلت عند اللہ اور قدرت باری کی وسعت کا اظہار کریں اور دکھلادیں کہ گو اس ابتلا کی وجہ سے چند روز یہ ملک مسلوب ہو گیا ہو۔ مگر اب مجھ کو وہی ملک پہلے سے زیادہ استحکام کیساتھ مل گیا کہ نہ اب اُسپر کسی کا خواہ جن ہو یا انس تسلط ہو سکتا ہی اور نہ میرے بعد کسی کو ایسا ملک مل سکتا ہی اور جبکہ منشار اس دعا کا یہ ہی تو اس میں کچھ ہرج نہیں ہی اور نہ خلاف شان انبیا علیہم السلام ہے۔

رہا خلجان ثانی وہ بھی کچھ نہیں ہی کیونکہ اس دعا میں اگرچہ لفظ غیری عام ہی مگر ہر عام میں بعض چیزیں مستثنیٰ بھی ہوتی ہیں اور یہ استثنار اُنکی عموم کو باطل نہیں کرتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا اسی عام مفہوم کیموافق مقبول بھی ہو چکی ہو اور فرض کر لو کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی عظمت وشان کا وسیع ملک اور کامل وتام اختیارات بھی عطا کئے گئے ہوں اور آپ سلطنت ومملکت کے اعتبار سے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے مساوی نہیں بلکہ بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔ تب بھی اس دعا کی عموم اور اجابت دعار میں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپکی دعا کے مفہوم میں داخل ہی نہیں ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام آپکے منزلت عند اللہ۔ نبوت حقیقی وذاتی۔ انبیار علیہم السلام کی آپ سے مستفیض اور تابع ہونے کو بخوبی جانتے تھے پھر اپنی دعار کے عموم میں آپ کو کیسے داخل کر سکتے تھے۔

دوسرے یہ کہ اس حدیث سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہی کہ آپ کو ایک عفریت پر تسلط دیا گیا

وہ بھی ایک وقت خاص ہیں جیسا کہ لفظ امکننی اللہ منہ سے معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی مطلب لے سکتا ہے تو یہ کہ جنات پر آپ کا تسلط تھا اور اس خاص شعبہ میں آپکی حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کے مساوی تھی۔ لیکن انکی حکومت تو علاوہ جنات کے اور چیزوں پر بھی تھی اور اس حدیث سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت و مملکت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح عام تھی پھر اسمیں خلجان کیا رہا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا علی السبیل العموم مقبول ہونا کیونکر باطل ہو گیا۔

ان سب کے علاوہ یہ بات ہے کہ بیشک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہوں کے بادشاہ اور نبیوں کے نبی تھے جس کو جو کمال ملا آپکی وساطت سے ملا۔ تمام کون آپ کے زیر نگین تھا۔ اور اس اعتبار سے آپکی روحانی وجسمانی برتری۔ حکومت وسطوت کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے بھی عظیم الشان کہا جائے تو بجا و درست ہے۔ مگر آپ کی شان ملوک وسلاطین کی شان نہ تھی۔ باوجود اس عظمت واقتدار کے آپنے اپنے لئے شان عبدیت کو ہی پسند فرمایا۔ (آکل کما یاکل العبد (اس طرح کھاتا ہوں جس طرح ایک بندہ کھاتا ہے) کبھی تخت رواں پر بیٹھ کر ہوا میں چلنے کو پسند نہیں فرمایا۔ نہ جنات سے آپنے معماروں مزدوروں کا کام لیا۔ نہ وحوش وطیور کی افواج صف بستہ آپ کے سامنے کھڑی ہوتی تھی۔ نہ تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ پھر جب آپنے ، باوجود اس عموم حکومت واقتدار واختیارات اپنے لئے اس طرز وشان کو پسند نہیں فرمایا اور نہ آپ کا طرز ملوک وسلاطین کا طرز تھا۔ تو اس حالت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی عموم حکومت وسلطنت سے اسکو کیا منافات ہے۔

جبکہ دونوں خلجان مرتفع ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کے ظاہری مطلب کو چھوڑ کر دوسرے معنی کی طرف توجہ کریں۔ بیشک جہانتک ہمارا خیال ہے اس آیت کا یہی مطلب سمجھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے مفہوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی اس دعا کا یہی مطلب سمجھا ورنہ آپ کو اس ارشاد کی کیا ضرورت تھی فذکرت قول اخی سلیمان رب اغفر لی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی

اور تواریخ عالم بھی شاہد ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی بادشاہ کو نہ اتنا وسیع ملک ملا

نہ ایسے عام اختیارات عطا ہوئے۔

رہی یہ بات کہ ایک عفریت کو پکڑ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ستون مسجد سے باندھ بھی دیتے تو اس سے مساوات حکومت سلیمان علیہ السلام کیونکر ہو جاتی پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے اس دعا کے خیال سے اُسکو چھوڑ دیا۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کمال رعایت و پاس درجۂ دعا و اجابت دعا کا تھا کہ ایک جزو میں بھی تھوڑے سے اشتراک کو پسند نفرمایا

اور اسی سے ہماری اس غرض کی مزید تائید ہوتی ہے کہ آپ کو بیشک ہر قسم کے اقتدار و اختیارات تمام موجودات پر حاصل تھے آپ اولین و آخرین کے سردار۔ مبدء فیوض و برکات تھے خلق عالم کی منشاء تھے۔ مگر آپ نے شان ملکیت اختیار کرنے اور ملوک و سلاطین کے ساتھ اشتراک کو خواہ نبی ہوں یا غیر نبی اور وہ اشتراک خواہ اسم میں ہو یا رسم میں کسی حد تک بھی پسند نہیں فرمایا۔

معنی اوّل مراد لینے کی صورت میں ایک یہ بھی فائدہ ہو کہ دونوں آخری معنی خود بخود اس کے ساتھ آجاتے ہیں کیونکہ ایسا ملک جو کسی کو نہ ملے خود عظیم الشان بھی ہو گا اور کسی کو اُس کے سلب کی قدرت نہ ہو گی۔ اور وہ کبھی مسلوب نہو گا۔

امر ثانی یہ کہ ایسی دعا کرنیکا منشا کیا تھا۔ اس میں اقوال مختلف ہیں اگر سب کو مفصلاً بیان کیا جاوے تو نہایت طول ہو جائیگا اور یہ موقع اس کا نہیں ہو لہذا باختصار بیان کیا جاتا ہی۔

بعض کا قول تو یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب اس ابتلاء میں مبتلا ہوئے جس کا ذکر آیۂ سابقہ میں ہوا ہی تو اُس کے بعد آپ نے قبولیت دعا کی علامت کے طور پر اور اس اثر کے دفعیہ کے لئے جو ابتلاء سے پیدا ہوا تھا۔ یہ دعا مانگی تاکہ عوام و خواص کو معلوم ہو جاتے کہ اس ابتلاء سے آپ کی عظمت شان۔ قرب و منزلت عند اللہ میں کچھ فرق نہیں آیا بلکہ اور زیادہ بڑھ گئی اور یہ کہ ابتلاء ایسا ہی تھا جیسا کہ خواص و مقربین کو پیش آجاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ دعا اسلئے تھی کہ اسقدر عظیم الشان ملک و دولت طاعات و عبادات خداوندی کی کثرت کا ذریعہ بن جائے۔ کیونکہ اگر مال و دولت دنیا کو امور خیر اور ابتغاء مرضات اللہ میں صرف کیا

کیا جاتے اور یہ دنیا حصول دین کا وسیلہ ہو جائے تو ایسی دنیا نہایت محمود ہے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

نعم المال الصالح للرجل الصالح | (مال صالح مرد صالح کیلئے بہت اچھی چیز ہے۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام ایسے ملک عظیم کے مالک متصرف ہوں جو شاہان دنیا میں کسی کو نصیب نہیں ہوا اور نہ آپکے بعد کسی کو نصیب ہوا اور اس حالمیں ایک ساعت کیلئے بھی اسکی طرف ملتفت نہوں۔ اُس سے کام لیا جائے تو صرف اصلاح دین۔ تکثیر خیرات و مبرات کا تو اُسکے ذریعے تقرب آلہی ہونے میں کیا تردد ہے پس ان کا اس ملکِ عظیم کا طلب کرنا درحقیقت سراسر خیر تھا بلاد وعباد سب کی بہتری اُس میں ملحوظ تھی۔

زمخشری کہتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام خاندان ملک و نبوت میں تھے یعنی آپکے خاندان میں ملک و نبوت کو جمع کر دیا گیا تھا آپ کو نبوت و سلطنت اپنے والد داوٗد علیہ السلام سے ملی تھی۔ آپ کو مملکت و سلطنت سے اُنس حاصل تھا۔ آپنے اپنی نبوت کی دلیل کیلئے معجزہ بھی اُسی نوعیت کا طلب کیا یعنی مجھکو ایسا ملک عطا فرما جو کسی کو نہیں ملا اور یہ امر معجزہ کی حد میں جبھی داخل ہوتا ہی جب بطور خرق عادت کے ہو

زمخشری کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہ زمانہ قوم جبارین کے تسلط و مملکت کا زمانہ تھا ان کو اپنی وسعت ملک اور تسلط و قوت پر فخر تھا۔ اور یہ ایک امر مسلم ہے کہ ہر نبی کو مناسب وقت معجزہ عطا ہوتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر کا کمال درجۂ غایت کو پہنچا ہوا تھا تو آپ کو معجزہ بھی اُسی قسم کا دیا گیا جس کے مقابلہ سے فن سحر کے صاحب کمال باوجود اشتراک ظاہری عاجز آگئے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا چرچا تھا بڑے بڑے صاحب کمال طبیب موجود تھے سخت سے سخت امراض کے معالجہ میں اُن کو کامل دستگاہ حاصل تھی ایسے زمانہ میں آپ کو معجزہ احیاء موتے اور ابراء اکمہ و ابرص عطا ہوا جس کے مقابلہ سے بڑے بڑے طبیب عاجز و درماندہ ہوگئے

علیٰ ہذا حضرت خاتم النبیین کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر تھا اپنے مقابلہ میں وہ ساری دنیا کو عجم کا خطاب دیتے تھے۔ گویا سوا انکے دنیا میں کوئی قوم اپنی مافی الضمیر کو کما حقہٗ ادا کرنے پر قادر ہی نہیں ہے۔ ایسے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ کلام اللہ عطا فرمایا گیا۔ اور وہ بڑے بڑے مدعیان فصاحت و بلاغت اسکی ایک چھوٹی سی سورۃ کے مقابلہ سے عاجز رہ گئے۔

بعینہٖ اسی قاعدہ کیموافق اس زمانہ میں جبکہ ممالک وسیعہ سطوت و شوکت کے حصول پر جابرین کو فخر تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا ہوا۔

لیکن اس دعا کو بطور طلب معجزہ تسلیم کرنے میں ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ معجزہ ابتدا نبوت کیوقت عطا ہوتا ہے اور یہ واقعہ جیسا کہ سیاق آیات سے معلوم ہوتا ہے درمیان کا ہے۔ یعنی آپ کو ملک و نبوت عطا ہونے اور ایک زمانے تک ایسے عظیم الشان ملک پر حکمرانی کرنے اور فتنہ میں مبتلا ہو کر اُس سے نجات حاصل ہونے کے بعد کا ہے۔

جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ معجزہ کیلئے شرط ہے کہ ابتدا نبوت کے وقت طلب کیا جائے۔ اور تسلیم بھی کرلیں تو آیۃ اس امر کیلئے نص صریح نہیں ہے کہ یہ دعا درمیان میں ہوئی۔ ممکن ہے کہ ابتدا نبوت ہی کا واقعہ ہو۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ زمخشری کا قول اگرچہ صحیح ہو سکتا ہے اور جواب اشکال کو بھی اگرچہ اُس میں بہت سے خلجان ہیں تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن سیاق آیۃ بالکل اسکی تائید نہیں کرتا۔

اس بحث میں بہت سے اُمور قابل تحقیق تھے۔ مگر چونکہ یہ موقعہ اس کا نہیں اس لئے ہم اتنے ہی پر قناعت کر کے اور اس ضمنی فائدہ کو ختم کر کے اصل مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(بنی اسرائیل میں) نبوت سلطنت مجتمع و متفرق ہونیکی وہ صورت تھی جو اوپر عرض کی گئی۔ ختم الانبیاء کا زمانہ آیا۔ اور امت محمدیہ کو تمام عالم پر حق ریاست و حکومت عطا ہوا تو مملکت کو نبوت سے جدا نہیں رکھا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان وہی تھی جو سابق میں عرض کر چکے کہ باوجود کونین کے زیر نگین ہونے کے آپ نے اپنے لیئے شان عبدیت ہی کو پسند فرمایا۔ آپ نے سلطنت و مملکت کے کسی ایک طرز و انداز کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔ مگر جو اختیارات ایک شہنشاہ اعظم کے ہونے چاہئیں وہ سب آپ ہی کے قبضہ میں تھے، اور آپ انکا استعمال فرماتے تھے صوبوں کے والیوں کا تقرر آپکے حکم سے ہوتا تھا، قاضی آپ مقرر فرماتے تھے تحصیل محاصل آپ کے حکم سے ہوتا تھا۔ اموال خراج و زکواۃ آپکی خدمت میں لائے جاتے تھے مہمات غزوات سرایا بہ نفس نفیس انجام دیتے تھے، یا کسی کو اپنا قائم مقام مقرر فرماتے تھے، الغرض سوا مظاہری شان سلطنت جملہ امور جو سلطان وقت کے متعلق ہوتے ہیں آپ کے دست مبارک میں تھے اور نظام سلطنت کیلئے کوئی جداگانہ سلطان نہ تھا۔

آپ خاتم الانبیاء تھے۔ نبوت کا سلسلہ آپکی ذات مبارک پر ختم ہوچکا۔ یہ صورت تو باقی نہ رہی کہ نبوت و سلطنت یکجا جمع ہوجائیں اور اقتضاء صلی حالت امت مرحومہ یہ تھا کہ یہ سلسلہ اسی شان و انداز سے بحیثیت اجتماعی قائم رہے۔ اور اس میں نبوت کے آثار اور حکومت و سلطنت کے لوازم مجتمع رہیں یہ درجہ خلافت راشدہ کا تھا۔ خلفائے راشدین نبی نہ تھے۔ مگر منہاج نبوت کو عیاناً و کشفاً سمجھے ہوئے اُس پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کی قابلیت تام رکھتے تھے۔ علوم نبوت کا انعکاس تام اُن میں موجود تھا۔ اور اس بناء پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے طریقے و سنت کو اپنی سنت کیساتھ ملحق فرمایا۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

علیکم بسنتی وسنت الخلفاء الراشدین المهدیین	میری سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو۔

خلفاء راشدین میں بھی شیخین درجہ بدرجہ فائق تھے۔ اس لیئے اُن کی اتباع و اقتداء کا خاص حکم دیا گیا۔

اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر	اقتداء کرو اُن دو کا جو میرے بعد ہونگے۔ یعنی ابی بکرؓ و عمرؓ کا

خلیفہ راشد کا کام یہ ہی کہ وہ نظام ظاہری کو قائم رکھنے کیساتھ امت کو منہاج نبوت پر چلائے اور یہ ایسا سخت و صعب کام ہی جس کا نبھانا نہایت دشوار ہی۔ سلاطین عادل کا وجود دنیا میں بہت

ملیگا۔ مگر سلطنت علیٰ منہاج النبوت کا وجود عنقا کے حکم میں ہے۔ آپکے مبارک و مسعود زمانے کے بعد صرف تیس سال تک خلافت علیٰ منہاج النبوت کا سلسلہ رہا اور اُس کے بعد باوجودیکہ خلفاء مروانیہ و عباسیہ میں ایسے خلفاء ہوئے جو عدل و انصاف اور تنظیم امور سلطنت میں ضرب المثل ہیں۔ مگر اُنکی خلافت کو خلافت علیٰ منہاج النبوت نہیں کہتے۔ صرف عمر ابن عبد العزیز ایسے گذرے ہیں جن کی شان خلفاء راشدین کی سی تھی اور اسی وجہ سے اُن کے زمانہ کو مثل زمانہ خلفاء راشدین کہا جاتا ہے۔ با آخر زمانہ میں امام مھدی ایسے ہونگے جنکے اندر دونوں وصف یعنی آثار نبوت و حکومت پوری طرح مجتمع ہونگے اور وہی خیرات و برکات عود کر آئیں گے جو زمانہ نبوت یا خلافت میں تھے۔ انکے علاوہ بہت سے سلاطین رحمدل۔ انصاف پسند متشرع و متدین گذرے ہیں جنہوں نے توسیع ممالک و حفظ حدود سلطنت اجرار احکام شریعت میں سر توڑ کوشش کی ہے مگر امت نے انکو خلیفۂ راشد تسلیم نہیں کیا۔

اسکی وجہ بجز اسکے کچھ نہیں ہے کہ دونوں کو جمع کر کے ہر ایک آثار و لوازم کو اسکی حد پر رکھنا نہایت سخت مرحلہ ہے اور سلطنت کو منہاج نبوت پر چلانا کٹھن کام ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرض وفات میں ایک روز بہت بےچین تھے اور فرماتے تھے میری سمجھ میں نہیں آتا خلافت کے معاملہ میں کیا کروں۔ اسی تردد میں رہتا ہوں کہ اپنے بعد کس کو جانشین کروں حضرت عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ علیؓ کیسے ہیں آپ انکو ولی عہد کیوں نہیں بناتے۔ فرمایا وہ ہر طرح اہل و لائق ہیں۔ سوا اسکے کہ اُنکے اندر مزاح و خوش طبعی ہے کوئی اور بات نہیں ہے۔ مجھے نظر آتا ہے کہ وہ متولی خلافت ہو جائیں تو تم کو حق کے اس راستہ پر لیکر چلیں جس کو تم پہچانتے ہو۔

یہ طریقہ جس کو صحابہ رضوان اللہ علیہم پہچانتے اور جانتے تھے وہی منہاج النبوت تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اُس طریقہ پر قائم رہنے دوسروں کو اس راہ پر چلانیکے پورے اہل تھے۔

اس ہمارے بیان سے نبوت سلطنت خلافت راشدہ کا فرق معلوم ہو گیا اور یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ نبوت و سلطنت کے مجتمع و متفرق ہونے میں کل چار احتمال ہیں۔ نبوت۱ محض سلطنت۲ محض۔ نبوت۳ سلطنت ایک جا جمع ہوں یعنی سلطنت۴ علی المنہاج النبوت۔ سو محض نبوت تو ایسی ہی جیسے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں۔

ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہم مفصلاً بیان کر چکے ہیں۔ کہ باوجود انبیاء کے موجود ہونیکے سلطانِ وقت علیحدہ ہوتا تھا۔ نبوت و سلطنت دونوں کے اجتماع کی وہ صورت ہی جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو بنی اسرائیل پر حاصل تھی۔ یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جمع کر دیئے گئے تھے اور سلطنت محضہ کی مثالیں ہزاروں موجود ہیں۔ بنی اسرائیل و امت محمدیہ کی ہر قرن میں سلاطین کا سلسلہ موجود رہا۔ سلطنت علی منہاج النبوت جس کو ہمنے خلافت راشدہ کے نام سے تعبیر کیا ہی۔ اسکے اندر ایک جانب تو اختیارات سلطنت کامل و تام موجود ہوتے ہیں۔ دوسری جانب نبوۃ کے آثار بھی پورے نمودار ہوتے ہیں اسی وجہ سے اُن کے احکام نبوت کے احکام کے ساتھ ملحق سمجھے جاتے ہیں۔ ان چاروں کے فرائض بھی متفاوت ہیں۔ نبی وحی الٰہی کے تابع ہوتے ہیں اور اُس کے اشارہ پر معاش و معاد کے احکام کی تلقین کرتے ہیں اُن کے حکم کی اطاعت فرض و لازمی ہوتی ہے۔ اُس سے روگردانی کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر مردود ابدی ہو جاتا ہے۔

سلطان احکام شرعیہ میں بالکل نبی کے تابع ہوتا ہے۔ البتہ نظام عالم کو قواعد شرعیہ کے مطابق قائم کرنا۔ عدل و انصاف کے قوانین جاری کرتا ہے۔ تمام معاملات کا خواہ زرعی ہوں یا تجارتی۔ تمدنی ہوں یا سیاسی۔ صلح کے ہوں یا جنگ کے اُسی سے تعلق ہوتا ہے اور اسی احاطہ میں خود مختار بنکر اپنے احکام نافذ کرتا ہے۔

خلیفہ راشد میں سلطنت و حکومت کی جہت غالب ہوتی ہے۔ مگر چونکہ وہ مشکوٰۃ نبوت سے بھی مقتبس و مستنیر ہوتا ہی۔ اس لئے احکام و اختیارات ایک حیثیت سے اگر بالکل سلاطین کے سے احکام و اختیارات ہوتے ہیں تو دوسری حیثیت سے وہ اپنے اندر احکام نبوت کی جھلک بھی لئے ہوتا ہی اور اسی وجہ سے خلفاء راشدین کا اتباع گو اس درجہ کا فرض و لازمی نہیں ہے جیسا کہ احکام انبیاء کا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُنکی سنت و طریقہ سنت انبیاء کی مماثل و مشابہ بنا دیا گیا ہی اور اُنکے اتباع کو ایک درجہ میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔

خلیفہ راشد اور سلطان عادل کے طریقے اُن کے احکام کا فرق اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو

تاریخ وسیر میں خلفاء راشدین کے حالات ملاحظہ فرمایئے آپ کو صدہا مثالیں ایسی ملیں گی کہ خلیفہ کا حکم یا طرز عمل سیاسی پہلو سے علیحدہ ہو کر اصلاح معاد و تہذیب اخلاق و ملکات تصفیہ باطن و تزکیہ خواطر پر مبنی ہوتا ہے۔

مثال کی ضرورت ہے تو دیکھ لیجئے

حضرت معاذ ابن جبل انصاری رضی اللہ عنہ۔ نوجوان خوش رو۔ خوش خو۔ کشادہ دل سخی تھے اپنی قوم کے بہترین نوجوانوں میں سے سخاوت و کشادہ دستی کا یہ حال تھا کہ کسی چیز کا رکھنا اور جمع کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایسے سخی کریم النفس کی آمدنی اگرچہ وہ فی حد ذاتہ زیادہ بھی ہو۔ کہاں تک خرچ کا ساتھ نباہ سکتی تھی۔ آخر قرض لیکر خرچ کرنا شروع کیا اور اسقدر قرضدار ہو گئے کہ تمام اموال منقولہ وغیر منقولہ قرض کے احاطہ میں آگئی۔

جب آمدنی کی کوئی صورت نہ رہی قرضخواہوں نے مطالبہ شروع کیا تو حضرت معاذؓ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بدیں غرض حاضر ہوئے کہ آپکے ایما پر قرضخواہ کچھ نہ کچھ مسامحہ کرینگے اور کسی حصہ دین سے گذر کر کے تھوڑی سی پر قناعت کرلیں گے۔ قرضخواہوں نے باوجود آپکے ایما کے کچھ بھی چھوڑنا گوارا نہ کیا تو آخر خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا تمام مال فروخت کر کے قرض ادا فرمادیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بالکل خالی ہاتھ رہ گئے کوئی چیز اُن کے پاس باقی نہ رہی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُنکی اس حالت کا فکر تھا فتح مکہ کے ساتھ آپنے ملک یمن کے کسی حصہ پر اُن کو والی مقرر فرما کر بھیجا تاکہ اُنکی حالت کسی قدر درست ہو جائے اور جو نقصان مالی اُنکو پہنچا ہے اُس کا جبر اُس آمدنی سے ہو جائے جو بیت المال سے معاوضہ خدمت عطا ہو گی۔

حضرت معاذؓ اُدھر تو امیر یمن تھے اُدھر وہاں کچھ تجارت کی سلسلہ جنبانی کر دی۔ اور اس طرح اچھی مقدار مال کی اُنکے پاس جمع ہو گئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ مدینے منورہ حاضر ہوئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے عرض کیا کہ آپ معاذ کے پاس اتنا چھوڑ کر جس سے وہ زندگی بسر کر سکیں باقی سب روپیہ و سامان لیکر

بیت المال میں داخل فرمالیں۔ صدیق اکبر نے اسکے جواب میں فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے بھیجا تھا کہ اُن کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔ ایسی حالت میں میں اُن سے خود نہ لوں گا۔ ہاں وہ خود داخل کریں تو مضائقہ نہیں۔

حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ ابو بکر صدیقؓ نے اس بات کو قبول نہیں کیا تو خود حضرت معاذ کے پاس پہنچے اور یہ درخواست کی کہ تم اُس مال کو داخل بیت المال کردو حضرت معاذ نے وہی جواب دیا کہ میں یمن بھیجا ہی اسلئے گیا تھا کہ وہاں جاکر تلافی نقصان کروں اب میں ہرگز کچھ بھی نہ دونگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سُن کر خاموش ہو گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد حضرت معاذ آپ سے ملے اور فرمایا کہ بھائی میں آپکے ارشاد کی تعمیل کروں گا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں پانی کے گرداب میں غوطے کھا رہا ہوں۔ ڈوبنے کے قریب ہوں تم نے مجھکو نجات دلائی ہے اسکے بعد حضرت معاذ نے صدیق اکبر کی خدمت میں سارا ماجرا عرض کیا اور جو کچھ کما کر لائے تھے سامنے رکھ کر بحلف عرض کیا کہ میں نے کسی چیز کو مخفی نہیں رکھا۔ صدیق اکبر نے حلف کیساتھ فرمایا کہ میں اسمیں سے کچھ نہ لونگا۔ میں اپنی طرف سے تمکو ہبہ کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ موجود تھے۔ فرمایا کہ اب اس کے رکھنے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نہایت جلیل القدر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں اُنکی فضیلت و منقبت کا اندازہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد امام العلماء برتوۃ۔

(معاذ ابن جبل قیامت کے روز علماء کے آگے آگے رہیں گے اور اونچے مقام پر ہونگے)

ایسے جلیل القدر صحابی سے یہ تو ناممکن تھا کہ وہ بیت المال میں کسی قسم کی خیانت و بے احتیاطی کرتے یا رعایا کو ستا کر اپنا خزانہ پر کرتے۔ بطور روزینہ کے کچھ لیا تو وہ جائز تھا بیت المال کے مال میں تجارت کر کے نفع حاصل کیا تو باذن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا آپنے اُنکو یمن بھیجا ہی اسلئے تھا کہ وہاں اس نقصان کا جبر ہو جائے جو تمام جائداد و اموال کی فروخت سے پہنچ چکا تھا۔ ایسی حالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اول صدیق اکبر سے اور پھر خود حضرت معاذ سے اموال مکسوبہ یمن کو واپس کر دینے کیلئے اصرار کرنا اس بناء پر تو ہو نہیں سکتا کہ اُنکی طرف کسی قسم کی سوء ظنی تھی یا اس طریقہ کسب کو ناجائز

اور مال مکسوب کو حرام و مشتبہ سمجھتے تھے۔ بلکہ بات تو یہی تھی کہ حضرت معاذ جیسے پاک بے لوث منقطع عن الدنیا کیلئے آپ اُس کو پسند نفرماتے تھے کہ دنیا یا متاع دنیا کی طرف کچھ بھی توجہ کریں۔ اُن کے دلمیں ثروت و دولت کی کچھ بھی قدر و منزلت ہو۔ ولایت و قضائے کے معاوضہ میں جو ایک ضروری اسلامی و دینی خدمت تھی سوا کفاف ما یقدر گذران اوقات کچھ بھی لیں۔ غرض اُنکے دل کو حب دنیا سے پاک رکھنا اور اُس تلوث سے دور رکھنا تھا جو ممکن ہی کہ ولایت صوبہ کی جلیل القدر منصب یا تحصیل مال میں ہو گیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جبتک حضرت معاذؓ کی طبیعت میں کچھ بھی تعلق یا میلان اُس مال کیطرف رہا۔ آپکی طرف سے اُسکی واپسی پر اصرار رہا اور جس وقت وہ تعلق منقطع ہو کر خود واپس کرنے پر آمادہ ہو گئے دل سے اُس خیال کو دور کر کے حضرت صدیق اکبر کی خدمت میں سب کچھ حاضر کر دیا اور آپ نے اُسکے قبول سے انکار فرمایا۔ تب حضرت عمرؓ نے بھی یہی فرمایا کہ اب اُسکے رکھنے میں کچھ ہرج نہیں۔ کیوں اس لئے کہ جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ پہلے انکو رکھنا حرام و ناجائز تھا اب حلال ہو گیا۔

خیال فرمائیے کہ حضرت عمرؓ کے اس اصرار کا کیا منشاء تھا۔ بجز تزکیہ باطن و تطہیر قلب کچھ نہ تھا۔ اُنکی ہمدردی و نصح دینی کا اقتضاء یہ تھا کہ جو حضرات شرف رویت و مجالست سرور انبیا علیہ و علیہم الصلوٰۃ والسلام مشرف ہو چکے۔ آپکی برکات ظاہری و باطنی کی انعکاس نے اُنکی اخلاق و ملکات کو منور کر دیا اور وہ انوار ایمانی سے مالامال ہو چکے اُن کو متاع دنیا سے کسی قسم کا رابطہ و تعلق نہ ہو۔ دنیا کو محض بلاغ یعنی ایام حیوٰۃ پورا کر کے دار آخرۃ تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھیں۔

دوسری مثال درکار ہو تو دیکھئے کہ حضرت عمرؓ بجز اُن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو بضرورۃ سرانجامی معرکہ ہای رزم و بغرض اشاعت اسلام و توسیع ممالک اسلامیہ شام و عراق وغیرہ کے بھیجے گئے تھے۔ باقی جلیل القدر صحابہ کو بلا کسی خاص ضرورت کے حدود مدینہ منورہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ دنیا کے سرسبز و شاداب ممالک وہاں کے سامان عیش و طرب آسایش و راحت تلذذ و تنعم کو دیکھنے اُن سے حد جواز میں استمتاع و انتفاع کو پسند نہ فرماتے تھے اور فرماتے تھے میں چاہتا ہوں

لا یرون الدنیا و لا تراھم
(نہ یہ دنیا کو دیکھیں اور نہ دنیا ان کو)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ تشدد جس کو غالبًا ایک سطحی نظر والا جابرانہ حکم سے تعبیر کر سکتا ہی۔ بظاہر قواعد شرعیہ اور اُصول مہذّہ اسلامیہ میں داخل نہ تھا۔

نہ سیاحت کیلئے سفر کی ممانعت ہی نہ تجارت اور طلب رزق کیلئے۔ مگر اس کا مبنیٰ بھی وہی تزکیہ و تطہیر و قطع تعلقات دنیا و متاع دنیا تھا۔ آپ کو اسکی فکر لگی ہوئی تھی کہ جن کامل و مکمل افراد کا برکت صحبت حضرت سرور انبیاء علیہ و علیہم الصلوٰۃ والسلام تزکیہ تام ہو چکا دنیا کی اُنکے قلب میں پشہ کی برابر قدر و قیمت نہیں رہی۔ وہ اسی طرح اُس عالم کو تشریف لیجائیں اور کسی نہج و کسی عنوان سے ظاہری طور پر اُنکو دنیا کی سرسبزی و شادابی اپنی طرف مائل نہ کر سکے۔

یہ اور اس قسم کے احکام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصود ہے اور یہ اُنکے خاص فرائض منصبی میں داخل ہی۔ انبیاء علیہم السلام جہاں ایک طرف اوامر و نواہی شرع کی تعلیم فرماتے تھے دوسری جانب دنیا و مافیہا کی نفرت ذہن نشین کر کے قلوب کا تزکیہ و تصفیہ فرماتے تھے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتٰب والحکمة۔

(وہ ہے جس نے اُٹھایا بیچ اَن پڑھوں کے پیغمبر انہیں میں سے پڑھتا ہی اوپر اُن کے نشانیاں اُس کی اور پاک کرتا ہے اُن کو اور سکھاتا ہی اُن کو کتاب و حکمت)

خلفاء راشدین کو بھی انبیاء علیہم السلام کے دونوں قسم کے احکام و اختیارات سے حصّہ ملا ہے اور اسی لئے ہمنے کہا ہی کہ وہ اختیارات سلطنت کیساتھ آثار نبوت بھی اپنے اندر لئے ہوتے ہیں۔

جب خلافت راشدہ کی حقیقت اور اُسکے اختیارات و آثار کا حال ہمارے بیان مذکورہ بالا سے بخوبی منکشف ہو گیا۔ تو اب سُنئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

(جو خلفاء میں بھی ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ بلکہ یوں کہدیا جائے کہ خلافت راشدہ اپنی دونوں جانبوں اختیارات و لوازم سلطنت اور آثار و برکات نبوت سے پوری قوۃ کے ساتھ آپ ہی کے عہد میں ظاہر ہوئی۔ اگرچہ درجہ و مرتبہ صدیق اکبر کا ہر معاملہ میں آپ سے بڑھا ہوا ہے۔ اور

خلافت کے اصول فتوح امصار و بلاد کی قواعد ترتیب جیوش تنظیم عساکر تولیۂ امراء و قواد
سب کی بنا آپ ہی کے ہاتھوں سے پڑی۔ ملک عرب کا فتنہ و فساد کے عام زلزلہ سے پاک
و صاف کرنا صرف آپ ہی کی ذات سے ہوا ہے۔ اُسوقت آپنے انبیاء اُولوالعزم کی سی استقامت و
صبر سلاطین قاہرین کی سی قوۃ و شوکت کا ثبوت دیا اور سب کچھ وہ کیا جس کے کرنے
بلکہ سمجھنے سے بھی جلیل القدر صحابہ قاصر ہو رہے تھے۔ مگر باین ہمہ آپ کی خلافت کو شاہراہ نبوت
کا تتمہ سمجھنا چاہیئے آپ میں آثار نبوت کا غلبہ تھا تنظیم بلاد وغیرہ امور سے آپ کو فطرتاً مناسبت
زیادہ نہ تھی۔ آپنے جو کچھ کیا وہ اُس داعیہ خیر کی وجہ سے کیا جو بعد وفات جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم منجانب اللہ آپ کے روشن اور پاک دل میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے تمام مہم
اور عظیم الشان امور آپنے سرانجام دیے۔ اور اسی زہد اور عدم رغبت فی الدنیا کی بنا پر جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی خلافت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا وفی نزعه ضعف[1]
اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں ایک جانب تو شان محدثیت کا امتیازی درجہ موجود جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس انوار کامل و مکمل حاصل تھا ادھر شان انتظامی ایسی اعلیٰ پیمانہ پر کہ
اشدهم في امر الله کا گراں بہا خطاب آپکو ملا۔ ادھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
واقعہ میں جس کے اندر خلافت خلفائے راشدین کی طرف اشارہ ہے فلم ار عبقريا يفري فريه[2]
کے حالات و معاملات۔ احکام و قضایا سے جو درباره حضرت خالد اُن سے آخر تک ظاہر ہوئی۔ دونوں
قسم کے امور ظاہر ہوئے بعض معاملات تو بربنا ر قواعد و اصول سلطنت تھے اور منشاء مواخذہ
یا اجراء احکام یہ اُصول تھے۔ اور بعض معاملات کا مقتضاء وہی امور تھے جو منصب نبوۃ سے
تعلق رکھتے ہیں۔ اُن میں عام اعتقاد کا تحفظ۔ حضرت خالد کو دنیا اور اُسکے لذائذ و حظوظ سے بے لوث

---

[1] یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ابوبکر نے دو ایک ڈول پانی کے کھینچے اور اُنکے کھینچنے میں ضعف ہے۔
[2] نہیں دیکھا میں نے کسی جوان کو کہ عمر کا سا کام قوت سے کرتا ہو یہ بھی جملہ خواب کا ہے۔ آپنے خواب میں دیکھا کہ آپ ڈول کھینچ رہے ہیں آپسے ڈول حضرت ابوبکرؓ نے لیا دو ایک ڈول کھینچے آپکے کھینچنے میں ضعف تھا پھر اُن سے ڈول حضرت عمر نے لیا تو خوب قوۃ سے بہت ڈول کھینچے اس قوت کو آپنے باین الفاظ بیان فرمایا کہ میں نے کسی جوان قوی کو عمر کی طرح اپنا کام قوت سے کرتے نہ دیکھا۔ ۱۲

دیکھکر تزکیہ خاطر کرنا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ ان تمام حالات کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے اور ہم ہر موقعہ پر اشارہ بھی کرتے آئے ہیں۔ اسلئے یہاں اُنکے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ہر صاحب فہم سلیم منطبق کرسکتا ہی۔ ہمنے اصل اور الم بیان کر دی سلطنت وخلافت کے فرق کو بتلا دیا ہے۔ اسکو سمجھ لینا چاہیے اور پھر اسکو دیکھ کر کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دونوں قسم کے معاملات کس قوۃ وصلابت کیساتھ صادر ہوئے ہیں۔ ہر ایک بات کی تہ کو پہنچ جانا چاہیے۔ واللہ الهادی الی صراط المستقیم۔

فائدہ ثالثہ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں انما بعثت معلما۔ (میں معلم بناکر بھیجا گیا ہوں) یعنی میرا اصلی اور حقیقی کام یہ ہے کہ جہل کی عام تاریکی کا پردہ عقول و بصائر سے اُٹھاکر علم کے انوار و برکات سے عالم کو منور کردوں۔ ادھر دوسرا ارشاد ہی۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق	میں مکارم اخلاق ملکات فاضلہ واوصاف حسنہ کی تکمیل وتتمیم کیلئے بھیجا گیا ہوں۔

یعنی مکارم اخلاق وملکات فاضلہ کی تعلیم وتلقین کا سلسلہ گو ابتداء آفرینش سے جاری ہی۔ ہر نبی نے اپنی شریعت میں اسکی تعلیم دی ہی۔ ہر ایک امتہ کے افراد صالحہ نے اخلاق وملکات فاضلہ کے ذریعہ سے مدارج روحانی وجسمانی میں ترقی حاصل کی۔ انبیاء علیہم السلام کے بیان فرمودہ اصول وقواعد کو دیکھ کر اور سمجھ کر عقلاء ہر زمانہ خواہ کسی دین ونبی کے پیرو ہوں یا نہوں۔ اخلاق حسنہ وملکات فاضلہ کی تعلیم کو انسانی تمدن وتہذیب کا جزو لاینفک سمجھتے چلے آئے ہیں۔ مگر شریعت محمدیہ چونکہ تمام شرائع سابقہ کی مکمل شرع ہے اُنکے اندر جو افراط وتفریط تھی اسکو زائل کرکے جادۂ اعتدال قائم کرنیوالی ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہی آیہ شریفہ۔

یضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم۔	دفع کرتے ہیں اُن سے اُن کا بوجھ اور شدائد جو ان پر پہلے سے تھے۔

اس لئے جس طرح احکام شریعت کے اندر امم سابقہ میں افراط وتفریط کو دخل تھا اسی طرح مکارم اخلاق کے اندر بھی ایک گونہ افراط وتفریط موجود تھی۔ وجہ اسکی ظاہر ہی۔ ہر حکم شریعت کا منشار کوئی خلق طبعی

اور ملکہ اصلی ہوتا ہے اور اس حکم و رکن شریعت سے ان اخلاق و ملکات کے آثار و ثمرات ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی حکم میں اگر کسی ملکہ فاضلہ کی تقویت و اصلاح مد نظر ہوتی ہے تو دوسری میں کسی ملکہ رذیلہ اور خلق ردی کا ازالہ و محو مقصود ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تمام شرائع سابقہ کی ناسخ یا بالفاظ دیگر مکمل ہے تو آپکی اخلاقی تعلیم بھی مکارم اخلاق کی مکمل و متمم ہوگی۔

اکمال و تتمیم کے یہی معنی ہیں کہ اگر کسی ملت یا طبقہ میں کسی خلق حسن پر عملدرآمد نہیں ہوا اُسکو زیادہ مستحسن یا قابل عمل و التفات نہیں سمجھا تو اسکی ترویج دی جائے۔ اُنکو اسکے آثار و ثمرات سے مطلع کیا جائے۔ یا اگر کہیں خلق حسن گو بجائے خود مستحسن و واجب العمل سمجھا جاتا ہے مگر افراد قوم نے اپنے خود تراشیدہ خیالات سے اسکی صورت نوعیہ کو بدل ڈالا ہے اسکے طرق استعمال میں تغیر کر دیا ہے اُسکے اندر افراط و تفریط پیدا کر دی ہے۔ تو اُن امور زوائد کو حذف کر کے اصلی محاسن کی تعلیم دیکر جبر نقصان کر دیا جائے اور اس طرح اسکی تتمیم کر دی جائے۔

ہر ملک۔ ہر ملت۔ ہر طبقہ۔ ہر قرن۔ بلکہ ہر قوم اور اُسکی کل افراد میں اخلاق کی تقسیم حسنہ و قبیحہ کے اندر موجود ہے کسی جاہل سے جاہل قوم کے حالات و معاملات کا بھی اگر تجسس و تفقد کرینگے تو آپکو اُن کی روزانہ زندگی کے دیکھنے سے صاف صاف معلوم ہو جائیگا کہ انکی رسوم و عادات میں بعض اخلاق کا استحسان بعض کا استکراہ و قبح داخل ہے اور اُسی پر اُنکی باہم معاشرت کے حسن و قبح کا مدار ہے۔ یہ تو طبقہ جہال غیر متمدن وحشی منش لوگوں کا حال ہے لیکن جو اہل عقل کہلاتے ہیں متمدن ہیں۔ تہذیب و ترقی نے اُنکی عقول کو مصفی و مجلی کر دیا ہے۔ وہ انسانی معاشرت کے آداب و اُصول سے کماحقہ واقف ہیں۔ اُنکی اندر تو اخلاق حسنہ و سیئہ کی توزیع و تقسیم کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ جو اخلاق اُن کے نزدیک حسن و جمیل قرار دیدئے گئے ہیں خواہ فطرۃ سلیمہ کے نزدیک وہ جمیل نہوں کسی شریعت نے اُن کو تعلیم نہ دی ہو۔ مگر وہ اپنی زندگی کا لب لباب۔ اپنی برتری و بہتری قوم میں اپنی عزت و رفعت انہیں اخلاق کیساتھ متصف ہونے میں سمجھتے ہیں۔ لہذا اوقات ایسے اخلاق کسی قوم میں رائج ہو جاتے ہیں جو جیسا کہ نفس الامر میں قبیح اور قابل نفرت ہیں، اس قوم کے بعض افراد کو بھی اسی طرح کھٹکتے ہیں مگر یہ شخص باوجود ایسے افعال اور انکی منشار یعنی اس خلق و ملکہ کو سخت نفرت و حقارت سے دیکھنے کے اپنی قوم کے خود تراشیدہ تہذیب و تمدن کو سنبھالنے کیلئے ان اخلاق کیساتھ مجبوراً متصف ہوتا اور وہ

افعال اس سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ملک عرب میں بہت سے ایسے اخلاق ذمیمہ رواج پکڑ گئے تھے جن کو برا سمجھنے والے ان میں موجود تھے۔ مگر جمہور اور قوم کی قوم انہیں اخلاق و ملکات کی تابع تھی۔ علیٰ ہٰذا دوسری متمدن اقوام کا حال دیکھ لیجیے۔ ہماری اس عرض کا حاصل یہ ہوا کہ تعلیم اخلاق عالم کیلئے ایک لازمی امر ہے جو قومیں شرع الٰہی کی متبع ہیں اُنکے اندر وہی اخلاقی تعلیم ہے جو بواسطہ نبی ان تک پہنچی ہے۔ اور جو قومیں کسی مذہب و ملت حقہ کے تابع و منقاد نہیں رہی اُن کے اندر بھی اخلاق کی اُصولی تعلیم تو بواسطہ شرائع انبیاء علیہم السلام پہنچی ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو باعتبار اپنی روایات قدیمہ کے کسی نبی یا کسی شریعت کی متبع نہوئی ہو۔ جہل و تمرد۔ سرکشی و نافرمانی نے رفتہ رفتہ اپنا اثر جما کر ان کو دائرہ اتباع انبیاء و شرائع سے نکال کر مستقل بنا دیا۔ اور ان اقوام نے انہی اُصول تعلیم اخلاق کو ترمیم کرتے کرتے اس حد تک پہنچا دیا کہ بظاہر سوا رچند امور کے تعلیم انبیاء اور اخلاق و رسوم مروجہ اقوام میں کچھ مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔

دیکھیے تو سہی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپکے جانشین حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہ السلام نے حرم محترم میں بیٹھکر مکارم کی تعلیم دی۔ وہ کونسا خلق حسن تھا جسکی آپنے تعلیم نہ دی تھی اور پھر زمانہ دراز تک انہی اخلاق انہی اقوال و افعال انہیں اعمال و معاملات پر عملدرآمد بھی ہوتا رہا۔ مگر آخر میں جو عرب کی حالت تھی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ تعلیم خلیل الٰہی کا کچھ بھی اثر باقی تھا۔ جب اخلاق تمدن عالم کیلئے ایسا جزو لاینفک ہیں اور کسی قوم میں خواہ کسی شریعت کے پابند ہوں یا اپنی عقل و رسوم مقررہ کے۔

اخلاق و ملکات فاضلہ علی وجہ الکمال موجود نہ تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ کسی ملت میں تعلیم اخلاق مکمل طور پر نہیں ہوئی اور جسقدر تھی اس ملت کے افراد نے خود اُنکو بگاڑ ڈالا تھا اور رد و بدل کرکے اصلی تعلیم کا الیا ملیامیٹ کر دیا تھا کہ حقیقت و غیر حقیقت کا پتہ لگنا دشوار تھا۔ اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ عالم کے اکثر افراد نے جہاں احکام الٰہی کا اتباع ترک کیا۔ وہیں اپنی اخلاقی حالت کو اپنی عقول و اوہام۔ رسوم و عادات کے تابع کر لیا اور یہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ منشاء جملہ افعال و اقوال کا اخلاق و ملکات ہیں۔ جیسا خلق اور جیسا ملکہ ہوتا ہے ویسے ہی اقوال و افعال صادر ہوتے ہیں۔ پس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

گرامی جب رحمۃ اللعالمین ٹھیری اور آپکی ذات پر تمام عالم کی نجات کا مدار ٹھیرا تو لازمی امر تھا کہ تکمیل شریعت کے ساتھ تکمیل و تتمیم مکارم اخلاق بھی آپ کے ذریعہ سے ہوتی جو اخلاق و ملکات حسنہ عالم سے مٹ چکے تھے ان کو از سر نو زندہ فرماتے جن میں جو نقصان آکر انکی حالت و صورت بدل چکی تھی یا انکے مواقع استعمال میں تغیر آچکا تھا۔ اُن کو اصلی حالت پر نمایاں فرماتے۔ اور یہی مطلب آپکے ارشاد فیض بنیاد کا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض تعلیمی کو آیۂ شریفہ کے اندران جامع الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة

وہ وہ ذات پاک ہے کہ جس نے امی لوگوں میں ایک رسول بھیجا اُن کی قوم میں سے جو اُن پر اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور اُن کے نفسوں کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب کی تعلیم کرتا ہے اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

مفہوم آیہ سے ظاہر ہے کہ آپکی تعلیم میں تلاوت آیات و بیان احکام شرعیہ تزکیہ باطن و تطہیر اخلاق تعلیم دقائق کتاب اللہ۔ واصول و لمیات شرع تعلیم اسرار معرفت و توحید سب ہی کچھ داخل تھے۔ آپ کی تعلیم نے شریعت حقہ کو من کل الجوانب ایسا محفوظ و مستحکم کردیا کہ کسی جانب سے اسمیں رخنہ پڑنے اور گزند پہنچنے کا اندیشہ و احتمال باقی نہ رہا۔ آپ نے شریعت کے حدود اخلاق کے حسن و قبح اُن کے استعمال کے طریقے اس طرح بیان فرمادئے کہ جو شخص انپر تنقیحا و فہم کے ساتھ قائم رہے کسی ورطۂ ہلاکت و رسوائی میں نہیں گر سکتا۔ آپنے ظاہری احکام کی تعلیم کے ساتھ اسرار شرائع اور لمیات احکام کی تلقین بھی اس طرح فرمادی کہ کسی کو شک و شبہ کی اس میں گنجائش نہ چھوڑی تزکیہ باطن و تطہیر اخلاق کے ذریعہ سے علم الیقین کو حق الیقین کے درجے تک پہنچادیا۔ اس طرح شریعت کے حصار کو اتنا محکم و استوار فرمادیا کہ خداوند عالم جل جلالہ نے شریعت محمدیہ کو تمغہ کمال و تکمیل سے سرفراز فرمایا

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

آج کے دن تمہارے دین کو کامل کردیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر پورا کردیا۔ دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کرلیا

یہ تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل تعلیم اور اس تعلیم گاہ کے سند یافتہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے استاد کامل و بےنظیر تھے ہی۔ مگر شاگرد بھی بےمثل تھے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے شریعت اسلامیہ کی حدود و فرائض اخلاق حسنہ کے استعمال خصائل ذمیمہ سے اجتناب۔ علوم اذواق و مواجید اسرار معرفت ذات و صفات توحید و تنزیہ اس درجہ پائی تھی کہ اولین و آخرین میں ان کا کوئی مثل نہیں ہوا صحابہ مکمل دین تھے باطن ان کا نور معرفت و توحید سے لبریز تھا۔ اُنکے تمام اخلاق و ملکات مرضیات الٰہی کے تابع تھے۔ اُنکے تمام قویٰ و حرکات شریعت کے پابند حدود شریعت کو اس طرح سمجھے ہوئے تھے۔ ایک اینچ اُن سے ادھر اُدھر ہٹنا ناممکن تھا۔

واقعہ امارت و عزل خالد رضی اللہ عنہ سے صحابہ کے حالات پر ایک بسیط روشنی پڑتی ہے ہر مسلمان کا فرض ہی کہ اس واقعہ کے جزئیات پر غور کر کے صحابہ کے کمال کا اذعان کرے اس واقعہ کے اندر اسقدر امور قابل بیان ہیں جن کے احاطہ سے میں قاصر ہوں۔ مگر تتمیم فائدہ کی غرض سے چند باتیں عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔

(۱) تمام دنیا میں جس طرح لائق و باتدبیر افسران افواج کی ضرورت ہوتی ہے مسلمانوں کو بھی خصوصاً اس حالت میں جبکہ جزیرہ نما عرب کی تنگنا سے نکلکر ساری دنیا کا مقابلہ کرنا تھا کوئی بڑی ترتیب یافتہ فوج اُن کے ساتھ نہ تھی صحابہ میں مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ بدیں معنی آزمودہ و پختہ کار تھے کہ صحبت کیمیا اثر نے ادھر شب و روز کی حاضری و خدمتگذاری۔ معرکہائے رزم کے نشیب و فراز نے اُنکے تمام ملکات و قویٰ کو روشن و منور بنا دیا تھا۔ ان میں کا ہر ایک فرد اُمت واحدہ کا حکم رکھتا تھا مگر ایسے قدیم الایام مہاجرین و انصار کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ صحابہ میں بھی زیادہ تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کو سوا شرف زیارۃ جمال مبارک یا چند ایام یا چند ساعت یا ایک ہی بار حاضری دربار کی زیادہ نوبت خدمتگذاری نہ آئی تھی۔ کیونکہ قبائل کے قبائل فتح مکہ کے بعد اور حجۃ الوداع کے درمیان مسلمان ہوئے تھے۔ اگرچہ اکثر قبائل کے وفد حاضر دربار نبوی ہوئے۔ مگر وفود میں چند افراد حاضر ہوتے تھے نہ کہ سارا قبیلہ۔ اور حجۃ الوداع میں گو بکثرت قبائل عرب شریک حج ہوئے اور یہی موقع عام طور پر قبائل عرب کو

اقتباس انوار و دیدار جمال مبارک کا نصیب ہوا۔ مگر اوّل تو اس میں بھی سارا عرب شریک نہ تھا۔ حجۃ الوداع میں کل تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بیان کی جاتی ہے۔ حالانکہ مسلمان قبائل عرب کی تعداد اسوقت بہت زیادہ تھی مسلمانوں میں ایک بڑی جماعت اُن طلقاء کی تھی جو فتح میں اسیر ہوئی اور ان کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ لوگ مسلمان بھی ہو گئے تھے اور صحابہ کے عدد میں بھی داخل سمجھے جاتے تھے۔ مگر درحقیقت ابھی پختہ مسلمان ہی نہ ہوئے تھے۔ ہاں اُسوقت کا اسلام اُنکے حقیقی اسلام کی مضبوط بنا کا حکم رکھتا تھا بعض تو اُسی وقت پختہ مسلمان ہو گئے اور اکثر کچھ زمانہ بعد۔ طائف میں مسلمانوں کی ہزیمت انہیں طلقاء مکہ کی طفیل تھی جو کہ عدد میں ہزاروں تھے۔ مگر جہاد کے فضائل اسکے متاعب و مصائب سے واقف نہ تھے پھر دلمیں اسلام کی محبت نہ تھی مسلمانوں کا درد نہ تھا۔ کوئی مضمون تھا جو بوجہ عدم الفت اسلام و الفت دین آبائی و محبت قومی یہی تھا کہ مسلمانوں کی مغلوبی سے دلمیں مسرت پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ ابوسفیان باوجود مسلمان ہو جانیکے بول ہی اُٹھے تھے۔

لن تنتھی الھزیمۃ الا الی البحر (یہ ہزیمت سمندر سے ورے نہ رُکے گی)

پھر منافقین کی ایک جماعت بھی اس وقت تک دخیل و شریک تھی۔ ادھر وہ قبائل عرب جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے بلکہ برسر مقابلہ تھے۔ ان کا شمار بھی مسلمانوں کے شمار سے زیادہ تھا چنانچہ صدیق اکبر کو جو کام سب سے پہلے کرنا پڑا وہ یہی تھا کہ مسیلمہ کذاب۔ اسود عنسی وغیرہ مرتدین۔ اور کفار عرب و منافقین کے فتنہ سے عرب کو صاف کیا اور یہ ظاہر ہے کہ گو حضرت صدیق اکبر کی بے مثل استقامت بروقت تدبیر و تدارک نے اسلام کی جڑ کو مضبوط کر دیا۔ کفر و شرک کی بیخ و بنیاد نکالکر پھینکدی مگر یہی تو وہ مسلمان تھے جو ابھی برسر جنگ تھے اور اب ان کو عساکر اسلامیہ میں بھرتی کر کے روم و شام عراق و فارس جیسی قدیم الایام سلطنتوں کے بیشمار عساکر قاہرہ کے مقابلہ پر بھیج رہے تھے جو تہذیب و تمدن کے علاوہ کامل و مکمل سامان حرب و ضرب سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ غرض عساکر اسلام کا اکثر عنصر ایسے ہی افراد سے مرکب تھا۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیسے لائق۔ کیسے [illegible] [illegible] سرد و گرم چشیدہ صعر کہائے رزم

اور کیسے کوہ وقار با تمکین مدبّر و فرزانہ امراء عساکر و قواد کی ضرورت تھی۔

پھر یہ بھی دیکھ لینے کی بات ہو کہ مہاجرین و انصار میں کی ایک بڑی جماعت جو علماً و عملاً ہر طرح سے ممتاز و فائق سمجھے جاتے تھے۔ ان کی ضرورت خاص دارالخلافت میں کس قدر تھی چنانچہ ایسے افراد میں سے سوا بعض چیدہ بزرگوں کے جیسے امین الامۃ ابو عبیدہ ابن الجراح۔ یا سعد بن ابی وقاص وغیرہ رضی اللہ عنہم کے باقی کل وہ حضرات جنکو صحابہ کے اندر علم و زہد تقویٰ وغیرہ میں امتیاز تھا تعلیم امت اور ضروریات خلافت کیلئے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہوئے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ میں تمام وہ اوصاف موجود تھے جو ایک اول درجہ کے جرنیل میں ہونے چاہئیں مسلمانوں بالخصوص طبقہ اوّل صحابہ میں ایک سے ایک جری ایک سے ایک بڑھ کر مدبر و ذی رائے موجود تھے مگر کوئی تو خصوصیت تھی کہ سیف من سیوف اللہ کا خطاب حضرت خالد کو عطا ہوا۔

حضرت خالد کے اندر جس وصف کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہی کہ ایک قائد جیش میں اس سے بڑھکر اوصاف نہیں ہو سکتے۔ انکی شجاعت و بسالت۔ دانائی و فرزانگی۔ جرأۃ و چستی۔ حزم و تیقظ۔ غرض جس وصف کو دیکھیئے یوں کہنے کو دل چاہتا ہی کہ اُس سے بڑھکر ہونا مشکل ہے۔ پھر ان اوصاف کیساتھ اعداء پر اُن کا یہ رعب کہ نام سُننے ہی ہوش و حواس خطا ہو جائیں۔ تدبیر بھول جائیں۔ دوستوں کو یہ اعتماد کہ جدھر لیجائیں بلا پوچھے ساتھ ہو لیں۔ یہ وہ باتیں تھیں کہ کسی اقبالمند قوم کو بھی آجتک نصیب ہوتی تھیں اور یہی وہ اوصاف تھے کہ آج تیرہ سو سال گذرنے پر حضرت خالد کا سکہ مخالف و موافق کے قلوب میں اُسی طرح بیٹھا ہوا ہی جیسا جب تھا۔

ادھر تو یہ حالات تھے جن کا اقتضاء یہ تھا کہ ایسے بے مثل جرنیل کی خدمات سی عساکر اسلامیہ کو محروم کر دینا مہلک غلطی اور خودکشی سے کم نہ تھا لیکن اُدھر شان فاروقی دیکھئے کہ بوجہ بعض ان لغزشوں یا بے احتیاطیوں کے جو حضرت سے مقابلہ مرتدین عرب صادر ہو چکی تھیں عظیم الشان معرکہ یرموک میں جہاں کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر فوج کو ایشیا کی ترتیب یافتہ افواج سے مقابلہ تھا۔

صف کارزار مرتب تھیں۔ حضرت خالد کے سر پر قیادۃ عامہ کا پھریرا الہما رہا تھا۔ ایکدم معزولی کا

حکم بھیجدیا۔ اس اوّل معزولی میں ان معمولی گرفتوں کیساتھ وہ خیالات حفظ و اعتقاد امتہ بھی تھے جو دوبارہ کلی عزل اور واپس طلب کر لینے کے سبب آبنے۔ مگر جیساکہ تواریخ کے مطالعہ سے مفہوم ہوتا ہے عزل کو ظاہراً اُنہیں گرفتوں پر مرتب رکھا گیا۔

اگر ذرا خیال و غور سے دیکھیئے تو اس وقت فاروق عظم کو سخت اشکال تھا۔ حدود شریعت کی محافظت تو اس طرف داعی تھی کہ ایک ایسے ذمہ دار افسر کی ادنیٰ فروگذاشت پر چشم پوشی نکی جائے۔ اور پھر افسر بھی محض افسر ہی نہیں بلکہ اوّل درجہ کا مقبول و خاص صحابی جسکا فعل و قول خود قابل اقتدار۔ کیونکہ تھوڑی سی چشم پوشی کر نیسے انتر میں مفسدہ عظیم کی بنیاد پڑتی تھی۔ افسران افواج کو ایسے مواقع میں اپنے خیالات اور جرأتوں کے پورا کرنے کیلئے حجۃ تامہ ہاتھ آئی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ وہ ایک صحابی کا فعل تھا۔ ادھر خلفاء سلاطین مابعد کو یا تحت افسرونکی ناجائز و مہلک غلطیوں سے چشم پوشی کرنے کیلئے حضرت عمر کا طرز عمل ایک نہایت قوی حجۃ ہوجاتی۔ اور حضرت خالد کی فتوحات عظیمہ کفار پر اُن کا رعب و داب مسلمانوں کو ایسے سخت وقت میں ایسے لائق و قائد و سپہ سالار کی ضرورت یہ امور اس طرف بلاتے تھے کہ اُنکو اس عہدہ سے جنبش نہ دی جائے۔ مگر بالآخر آپ کا فیصلہ یہ ہوا کہ شریعت کی حد میں رخنہ پڑنا ایسا مفسدہ عظیم ہے جس کی اصلاح خارج از امکان ہے۔ ادھر صحابہ میں اُن سے بڑے درجے کے موجود ہیں جنکی برکت سے وہ کام ہوجائیں گے۔ جو حضرت خالد کی آزمودہ کاری تیقظ و حزم سے ہوتے تھے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی یقین تھا کہ حضرت خالد کی خدمات محض ایک سبب سے زیادہ نہیں ہیں۔ اُن کا کوئی فعل موثر نہیں ہے۔ جو کچھ ہوتا ہی خداوند عالم کے حکم و اذن سے ہوتا ہی۔ ایک مسبب کیلئے بہت سے سبب ہوتے ہیں دوسرے اسباب پیدا ہوجائیں گے۔ ادھر آپ کو حضرت خالد کی دینداری، اسلام اور مسلمانوں پر جان نثاری سے کامل توقع تھی کہ اس عزل کا اُن کے کسی حال پر اثر نہ پڑیگا۔ بلکہ وہ بمقابلہ کفار اداء خدمات جہاد کیلئے پہلے سے زیادہ چست و چالاک ہوجائیں گے اور اُس سے زیادہ کر دکھائیں گے جو حالت قیادۃ عامہ میں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کا یہ حسن ظن پورا ہو کر رہا۔

حضرت خالد نے وہ خدمات کیں جنکی وجہ سے حضرت عمر کو بھی مان لینا پڑا کہ اُن کی خدمات سلے

خود ان کو امیر بنادیا۔ یہ تھا حضرت عمرؓ کا تصلب دین۔ محافظت حدود شریعت۔ انسداد فتنہ متعدیہ اور یہ تھا ان کا توکل و ایمان۔ کہ ایک ذراسی فروگذاشت کو جن کی تاویل حضرت خالد کے پاس موجود تھی بوجہ انسداد مفسدہ عظیمہ گوارا نہ کیا۔

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ زمانہ قرن اوّل تھا۔ بکثرت صحابہ عساکر اسلامیہ میں موجود تھے مسلمانوں پر اُنکی صحبت کا گہرا اثر تھا۔ شرک وجہل کی بنیادیں اوکھڑ چکی تھیں۔ اسلئے کسی ایسے اعتقاد باطل کے راسخ ہوجانیکا تو اندیشہ بالکل نہ تھا کہ مسلمانوں کا کوئی ایک فرد بھی حضرت خالد کی کسی تدبیر یا فراست کو نتیجہ حرب میں مؤثر سمجھنے لگے اور خدائے بے نیاز کی طرف سے توجہ اور انابت سے ذہول ہوجائے مگر اسمیں شک نہیں کہ جو اعتماد حضرت خالد کے تدابیر جنگ جرأت و بسالت کے اوپر تھا اس کا فوری نقصان ایک تو یہ تھا کہ بہت سے افراد ان پر اور ان کی تدابیر پر ایسے مطمئن ہو چلے تھے کہ خود اپنی طرف سے اقدام کرنیکی گویا ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اور یہ امر جیسا کچھ مضر ہے ظاہر ہے خصوصًا ایسی قوم کے لیے جو دنیا کو ہدایت کرنے نکلے ہوں اور اسکو حضرت خالد جیسے ہزارہا افراد کی ضرورت ہو۔

پھر صحابہ جیسے جلیل القدر افراد اور قرن اوّل کے مسلمانوں میں غیر اللہ پر اعتماد و بھروسہ گو وہ کسی درجہ کا ہو یا سوا خدا وند عالم اور کسی کے فعل کو دخیل و مؤثر سمجھنے کا شائبہ گو ظاہری صورت کے اعتبار سے ہی ہو اُنکے رسوخ علم۔ ذوق معرفت۔ فنا فی الذات۔ توکل و تقدیر ایمانی ذوق و وجدانی کے سراسر خلاف تھا۔ سب سے بڑھکر یہ کہ مفاسد اعتقاد۔ اعمال و افعال کی بنیاد ہمیشہ ابتدًا یونہی پڑی ہے وا فکار اور راسخین فی العلم میں تو کبھی اعتقاد فاسد کی بنیاد جم ہی نہیں سکتی ہاں اسوقت اگر کسی ادنیٰ درجہ کے جائز یا مباح پر مسامحہ کیا گیا تو قرن مابعد میں اُنہیں مباحات سے شرک و بدعات کی صورت اختیار کرلی ہے بت پرستی کی بنیاد یہیں سے چلی ہے کہ انبیاء وصالحین کی تصاویر کو ان کی یاد تازہ کرنے انکی صورت سے ان کی طاعات و عبادات کی طرف راغب و متحرک ہوجانے لیئے اپنے مکانوں میں انکو اُنکی پاک صورت نورانی دل لبھانیوالی وضع قطع سے برکات و فیوض حاصل کرنیکے لیئے رکھاجانا شروع ہوا اس طبقہ میں ان بزرگوں کی عظمت تھی تو اُنکے بندہ کامل و عابد و ذلیل بدرگاہ رب العلمین ہونے کی حیثیت سے لیکن دو چار طبقہ گذر جانے پر وہ اصلی

وجہ توگم ہوگئی۔ وہی عباد صالحین اب بصورت رب و معبود پرستش کئے جانے لگے۔

بعینہ اسی طرح حضرت خالد پر اعتماد و بھروسہ جو عساکر اسلامیہ میں پھیل گیا تھا اسوقت تو گو اُسی درجہ کا تھا جیسے کہ تدابیر پر اعتماد کی شرع نے اجازت دی ہی۔ مگر تدابیر پر افراط کی حد تک احتمال اول تو اعمال و افعال میں ترک توکل کی طرف داعی ہوتا ہے بڑے بڑے صلحا رصبح سے شام تک تدابیر میں منہمک رہتے ہیں۔ ترک تدبیر کیوقت پریشان خاطر ہو جاتے ہیں۔ ان کو بہت کم خیال ہوتا ہی کہ تدبیر و عدم تدبیر دونوں حالتوں میں فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہی۔ اور پھر شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہی کہ توکل کو محض ڈھکوسلہ سمجھنے لگتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ جہالت کسل و کاہلی حیب غالب ہوتی ہی تو توکل کو آڑ بنالیا جاتا ہی اسمیں شک نہیں کہ خامکاروں کا توکل اسی درجہ کا ہوتا ہے۔ مگر حقیقی توکل ایسا نہیں ہی اور حقیقی توکل سے بیخبر ہو کر رسمی توکل کو سنبھالنا جس کے معنی عجز عن التدبیر کے ہیں یہ بھی اُسی کا تتمہ ہی کہ اول تدابیر ہی کو معتمد علیہ اور معول بنایا گیا۔ اور جب تدابیر کی تاثیرات قلوب میں راسخ ہو چکیں تو اب صرف توکل پر ایمان ہی ایمان رہگیا۔ اور پھر اس سے بڑھ کر جب عقل اور فلسفہ کی اُلجھنوں میں پڑے۔ عالم کو تدابیر ہی کا مظہر دیکھا حقیقی اسباب و موثرات۔ خالق الاسباب و التاثیرات تک رسائی نہ ہوئی نہ عقول سلیمہ کی ہدایت باقی رہی نہ قوانین فطرۃ پر عملدرآمد رہا علم ذوقی رہا نہ وجدانی۔ نہ کشف حقائق سے تعلق رہا اور نہ اسرار معرفت سے نہ اہل اللہ کے علوم و معارف پر ایمان واذعان میسر آیا۔ نہ اُنکے آگے سر تسلیم خم کیا اب توکل کے اعتقاد سے بھی خلاصی ہوگئی۔ یہ وہ مراحل ہیں جو عالم میں پیش آچکے اور آرہے ہیں۔

انہیں وجوہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے فاتح سپہ سالار کو ظاہراً ایک قسم کی بے عنوانی کے ساتھ معزول اور میدان کارزار سے واپس بُلا کر بروقت امت کو سنبھالا اور اس مفسدۂ عظیم سی نجات دی جس کا اثر گو ابھی سوا ر ایسی قدسی نفوس کے دوسرے حضرات کو محسوس نہوا ہو۔ مگر آپ کو اور آپ جیسوں کو عیاناً مشہود تھا۔

آج صدہا اولیاء امت کی قبروں کی پرستش ہو رہی ہی۔ انکی ذوات کی تعظیم مفرط میں گروہ کے گروہ مبتلا ہیں۔ مگر حضرت خالد جن کی عظمت خود انکی حیات میں انکے اقران و امثال میں اس قدر تھی

آج اُنکی تعظیم مفرط کا وجود نہیں ہے۔ نہ اُنکی قبر کا عرس ہوتا ہے۔ نہ آداب و سجدات تعظیمی بجالائے جاتے ہیں۔ یہ اُس برگزیدہ تعلیم کا اثر ہیں تھا اور یہ حضرت عمرؓ کا اس قرن پر اور تمام اُمت پر احسان عظیم تھا۔ جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیرا۔

اصل وجہ تو اس عزل کی یہی تھی جو عرض کیگئی۔ چنانچہ حضرت عمر کا ارشاد کہ میں نے خالد کو کسی ناراضی ریبہ اور تہمت کی وجہ سے معزول نہیں کیا اسکی واضح اور بین دلیل ہے۔

لیکن بعض اُن جزوی امور کو بھی اس میں دخیل مان لیا جائے۔ مثلاً کسی شاعر کو کچھ زیادہ رقم انعام میں عطا فرما دینا۔ یا حمام میں جا کر اُبٹنے کا استعمال جس میں شراب کا کوئی جزو مخلوط تھا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اس قسم کی بات ہے جو وجوہات عزل میں بیان ہوچکیں حضرت خالد نے اپنے خیال و رائے کے موافق کوئی ناجائز امر نہیں کیا شعراء کو انعام دینے کا منشاء موجود ہے مع ہذا حفظ ناموس کے لئے بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر حضرت عمر جانتے تھے کہ خالد کوئی معمولی شخص نہیں ہے اُن کا فعل قابل اقتدار و تقلید ہے۔ اُنھوں نے آج ایک شاعر کو اپنی ملک سے ہزار روپیہ دیئے تو دوسرے اُمراء و سلاطین بیت المال سے لاکھوں کروڑوں دینگے اور اس فعل کو حجت گردانیں گے۔

علے ہذا اُبٹنے کا قصہ گو حضرت خالد کے نزدیک اس وجہ سے کہ شراب باقی نہ رہی تھی اُسکا استعمال جائز تھا مگر اس سے عوام کے خیالات کی تصحیح نہیں ہوسکتی شہرت یہی ہوتی کہ ایسا اُبٹنا استعمال کیا جس میں شراب تھی اور ظاہر ہے کہ آپکا یہ فعل دوسروں کیلئے حجت ہوتا اور آگے چلکر بلا تورّیہ و بلا تاویل ایسے ابٹنے استعمال ہونے لگتے جن میں ظاہرا شراب اپنی اصلی حالت میں مخلوط ہوتی۔ یہ تھی حضرت عمر کی شان کہ مسئلہ توکل و تقدیر کو جو ایک اعتقادی مسئلہ اور دین کا اصل اصول ہونیکے ساتھ کشفی و ذاتی تھا سنبھالنے اور امت کو فساد عظیم سے بچانے کیلئے حضرت خالد کے عزل میں پس و پیش نہ کیا اور کچھ پرواہ نہ کی کہ عساکر اسلامیہ کو ان کی علیحدگی سے کس قسم کا نقصان یا گزند پہنچے بیشک پہنچتا اگر منشاء اس انتظام کا شائبہ نفسانی ہوتا۔ ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا اور یہ تھا صحابہ کا توکل تام۔ یہ تھی حضرت عمر کی صلابت دینی کہ ایک امر قابل تاویل میں بھی اس مسالمت و رواداری کو جائز نہ رکھا جس کی وجہ سے خیالات میں تغیر اعمال و افعال میں نقصان پہنچے۔ امت کسی گمراہی میں مبتلا ہو

(۲) حضرت خالد کی اوّل معزولی میدان یرموک کے صف کارزار میں ہوئی جبکہ وقت انکی زیر کمان ۴۵ ہزار جرار لشکر کی کمان تھی اور جلیل القدر صحابہ بطور امراء ڈویزن اُنکے حکم و ارشاد کے تابع تھے۔ اس لشکر جرار میں کس درجہ کے لوگ تھے اُسکے اندازہ کیلئے یہی کافی ہے کہ بکثرت صحابہ ان میں موجود تھے یا وہ لوگ جو ذوات صحابہ کے فیوض و برکات سے مستفیض رہتے تھے اُنکے قلوب صاف۔ ذہن سلیم اور علم راسخ تھے۔ ہر حکم کے منشاء و بینی کو سمجھتے تھے وہ اسکو بھی جانتے تھے کہ اسلام نے اُنکے حقوق کو کس قدر قوی کر دیا ہے اُن میں کا ادنیٰ سے ادنیٰ عہد کر سکتا تھا جس کی ذمہ داری سب پر عائد ہوتی تھی۔ باایں ہمہ علو شان شریعت میں بال بال جکڑا ہوا تھا اُنکو خوب معلوم تھا کہ اللہ اور اُسکے رسول کے بعد اطاعت اولی الامر خلفاء بھی فرض ہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فتنہ و اختلاف قومی شیرازہ کو پراگندہ کر دیتے اور دین کی جڑوں کو کھوکھلا بنا دیتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ باوجود حضرت خالد کی عظمت و اقتدار کا قلوب میں سکہ بیٹھ جانے کے اور باوجودیکہ ان میں کا ہر شخص فدا ہونے جان دینے کو تیار تھا۔ مگر جب خلیفہ وقت کا ایک سفیر۔ نامہ بر یا چپراسی حکم نامہ عزل سپہ سالار اعظم لیکر پہنچا تو تواریخ ہمیشہ پتہ نہیں دیتی کہ اس عظیم الشان لشکر میں سے ایک نے بھی خلیفہ کے حکم سے سرتابی تو درکنار اس میں کسی حد تک نکتہ چینی بھی کی ہو۔

اس عظیم اجتماع میں حضرت خالد کے قریبی رشتہ دار، خاص احباب۔ ہم عصر و ہم قرن۔ خواص و مصاحب۔ اڈیکانگ اور باڈیگارڈ سب ہی موجود تھے حضرت خالد کے جن امور کو سبب عزل بنایا گیا تھا۔ وہ ایسے نہ تھے کہ تاویل نہ ہو سکتی ہو ایسے وقت بالکل ممکن تھا کہ اقرباء و احباب خواص و مصاحبوں کی طرف سے کسی جانبداری و حمایت کا اظہار ہوتا۔ حضرت عمر کے حکم پر نکتہ چینی ہوتی۔ یا کم از کم اس کو بے محل اور بے موقع بتلایا جاتا۔ اس عجلت کو اُنکی سوء تدبیری پر محمول کیا جاتا اس سے کم درجہ یہ بات تھی کہ ایسے سخت مقابلے کیوقت یک لخت اتنے بڑے سپہ سالار اور قائد فرزانہ کی معزولی اُنکے عزم و ہمت میں فتور ڈالتی اُن کو دشمنوں کے غلبہ اور اپنی مغلوبیت کے خطرات ستاتے اور اس بناء پر خلیفہ کی خدمت میں نظر ثانی کی درخواست بھیجتے۔

ہمعصر وہم قرن وہمرتبہ حضرات کی جانب سے حضرت عمرؓ کے حکم میں عین مصلحت وصواب ظاہر کرنے کی کوشش کیجاتی۔ حضرت خالد کو اس سزا کا مستحق ظاہر کیا جاتا۔ مگر اللہ اکبر یہ حکم عزل کس سکون و اطمینان سے سنا گیا نہ موافق کی جانب سے صدائے حمایت بلند ہوئی۔ نہ اقران و امثال کی طرف سے حکم کی تائید اور تقویت۔ ہمکو تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ اس حکم کے بارہ میں باہم بھی سرگوشیاں ہوئی ہوں۔

حکم آیا سپہ سالار معزول ہوا۔ دوسرا ان کی جگہ قائم ہوا۔ اور کسی نظم وترتیب میں فرق نہ ہوا۔ نہ خیال میں ہیجان وتلاطم پیدا ہوا جس کی روک تھام کی جاتی۔

یہ کیوں ہوا اس لیے کہ تعلیم اسلام نے سب کے قلوب میں ایک ہی رنگ جما دیا تھا جن محض حکمتوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عزل میں پیش نظر رکھا تھا گو اول اول عام قلوب میں اس کا احساس نہوا ہو۔ اور جنکے قلوب میں یہ خلش وخلجان ہو بھی تو اول ان کو اس قسم کے اختیارات نہ تھے کہ خود معزول کر دیتے اور ایسی ذوجہتیں معاملہ میں انقلاب کی تحریک کو بھی پسند نہ کرتے تھے مگر جب حکم نامہ پہنچگیا تو سب نے برضا و رغبت اسکو منظور کر لیا۔ اور اس بات کی تہ کو پہنچگئے جس کی خلیفۂ وقت کی فراست ایمانی نے ہدایت فرمائی تھی۔ کیا کوئی قوم ایسی پاک تعلیم اور ایسے پاک نفوس کی مثال پیش کرسکتی ہے۔

(۳) امین الامۃ ابو عبیدہؓ ابن الجراح کے نام حکم پہنچا کہ خالد سے اپنے ہاتھ میں کمان لے لیں حضرت امین الامۃ نے اس حکم کی تعمیل تو اتنی ترمیم کیساتھ کی کہ عین معرکہ کے وقت اس کا اظہار نہ کیا اور اتنا اختیار بوجہ رعایت مصلحت مسلمین ان کو تھا۔ مگر آخر اعلان عام اس طرح کر دیا کہ حضرت خالدؓ کی عظمت و وقار میں سر مو فرق نہ آنے دیا۔ وہ پہلے اگر قائد عام تھے تو اب قائد عام کے مشیر بلکہ مدار کل ہو کر رہنے لگے۔ حضرت امین الامۃ بغیر انکی صلاح ومشورہ کے کچھ نہ کرتے تھے۔ اکثر موقعوں پر کسی بڑے حصۂ عسکر کی کمان اُنکے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اکثر مواقع میں مستقلاً اپنی رائے سے حملہ کرتے یا کسی شہر و قلعہ کو فتح کر لیتے تھے اپنے لئے ماتحتوں کا خود انتخاب کر لیتے تھے۔ غرض جو امور ایک قائد عام کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں وہ سب کچھ اُن کے ہاتھ میں تھے۔ اور یہی اُن کی مستعدی وچستی۔ جانبازی وجان نثاری تدبیر و فراست تھی کہ ظاہر میں قائد عام ثانی فرمان اور کام کرنے میں بااختیار رہے۔ اور اسی حالت

کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرما دیا۔

اَمَّرَ خَالِد نفسہ | (خالد نے خود اپنے آپ کو امیر بنا لیا)

امین الامۃ وہ شخص تھے کہ اس امت مرحومہ کے اندر فرد اکمل شمار ہوتے تھے۔ انکے بارہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق امین فرمایا ہے۔ ایسے شخص سے یہ تو ممکن نہ تھا کہ اپنے اندر قابلیت سرانجامی فرائض عامہ قیادہ جیوش مسلمین نہ پاتے۔ اور پھر اسکو قبول کر لیتے ایسا کرتے تو بجائے امین ہونے کے سخت خائنوں اور مجرموں میں شمار ہونیکے قابل ہوتے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ پاسداری قرابت یا رشتہ مودۃ و مصاحبت حضرت خالد کی اتنی مراعاتداری کرا دیتی کہ خلیفہ وقت کے حکم میں فرق پڑ جاتا نہیں نہیں۔ آپ میں لیاقت خداداد تجربہ حرب و ضرب و فتح بلاد و امصار ہر قسم کے امور موجود تھے اور اس کے ساتھ فراست ایمانی و رسوخ علم بھی کامل موجود تھے۔ آپنے خلیفہ کے حکم کے منشاء کو خوب سمجھا کہ امت کو ایک عام ورطہ ضلالت سے بچانا اور شریعت کی حدود کو رخنہ اندازی سے محفوظ رکھنا۔ ادھر آپ حضرت خالد کے ذاتی جوہران کے کمال خداداد کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ اسلئے آپنے بکمال حزم دونوں پہلوؤں کو سنبھالا۔ انکی معزولی کا اعلان فرما دیا اور حضرت خالد کے ذاتی کمالات اور انکی فراست و تدابیر انکی جراۃ و بسالت۔ آراء صحیحہ و مشاورۃ مفیدہ سے ویسے ہی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ مستفع ہوتے رہے۔

امین الامۃ کیلئے اسوقت دو حالتوں میں سے ایک حالت سامنے تھی۔ یا تو یہ کہ ایسے مشہور نبرد آزما مقبول خلائق قائد عام کی جگہ قائم ہو نیمیں اپنی عدم قابلیت و مسلمانوں میں عدم مقبولیت کے احتمال پر حضرت خالد پر اعتماد کرتے۔ یا یہ کہ اس جلیل الشان منصب قیادۃ عامہ کو لینے سے عزت و وجاہت کا ذریعہ بنا کر حضرت خالد کو بالکل نظر انداز کر دیتے اور انکو ایک عام سپاہی کے درجہ میں پہنچا دیتے یا اس سے بھی بڑھکر یہ خطرہ ہوتا کہ ایسا شخص جو اتنے بڑے درجے سے گرایا گیا ہے ممکن ہے بوجہ اپنے رسوخ و مقبولیت عام کوئی ایسی ریشہ دوانی کر بیٹھیں جس سے انکے کارناموں میں فرق پڑ جائے۔ فتوحات رک جائیں اور بالآخر قومی صدائے احتجاج حضرت خالد کو دوبارہ قائد عام بنائے جانے کیلئے بلند ہو۔

مگر سبحان اللہ کوئی ایک امر بھی اُن کیلئے کوئی ایسی بات کا محرک نہوا جس سے کچھ بھی شائبہ نفسانیت کا پتہ چلتا۔ بشاشت ایمانی رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی تعلیم اسلام نے اُنکے تمام قوی و اخلاق کو جکڑ رکھا تھا تہذیب نفس نے کسی ناملائم خلق کا اثر باقی نہ چھوڑا تھا۔ توکل و ایمان بالتقدیر نے کسی شخص کے قول و فعل کو مؤثر حقیقی باقی نہ رکھا تھا۔ اُن کو علم راسخ تھا کہ جو اللہ چاہیگا ہو کر رہیگا۔ عمر و خالد ابو عبیدہ سب ملکر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ اسلئے اسوقت اُنہوں نے وہی کیا جو ایک کامل الایمان۔ صاحب فراست و تدبیر کو کرنا چاہئے تھا۔

(۴) یہ وقت سب سے زیادہ حضرت خالد کیلئے پرخطر تھا۔ کیسا ہی کوئی مخلص ہمدرد کتنا ہی دانشمند وہوشمند ہو اسکو بھی ایسے وقت اپنے ننگ و ناموس کی پامالی رفعت کے بعد ہبوط۔ عروج کے بعد نزول۔ عزت کے بعد ذلت کے خیالات ستاتے ہیں خصوصاً جبکہ ایک شخص اپنے آپکو بالکل بے لوث سمجھتا ہو۔ اور وہ اور تمام دنیا جانتی ہو کہ اُس نے تائید اسلام و نصرۃ المسلمین میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اور پھر اس کو مسلمانوں کے خلوص و اعتماد سے بھی احتمال ہو کہ میں کچھ بھی زبان سے نکالوں گا۔ یا کوئی حرکت کرونگا۔ ہزاروں دل میرے ساتھ ہونگے سینکڑوں ہاتھ تائید میں جنبش کرنے لگیں گی۔ مگر وہی ایک پاک اسلامی تعلیم تھی جس کی بدولت حضرت خالد بھی حظوظ نفسانیت سے اتنی دور نکل چکے تھے جتنے حضرت ابو عبیدہ و حضرت عمر۔ آپکو بمقتضاء بشریت اپنی براۃ کی بنا پر یہ خیال گذرا ہو کہ میرے ساتھ یہ معاملہ درست نہیں ہوا۔ تو ممکن ہی مگر قابل گرفت نہیں لیکن آپنے بھی خلیفہ کے حکم کو اُسی طوع و رغبت سے سُنا جیسے عام افراد نے۔

نہ چیں بہ جبیں ہوئے۔ نہ کسی کے پاس شکوہ شکایت لیکر گئے۔ نہ اس منصب جلیل سے معزولی نے اُنکے اندر کچھ تحریک کی۔ نہ چہرہ پر حزن و ملال کے آثار ظاہر ہوئے۔ نہ بشاشت میں فرق پڑا۔ نہ کسی امر میں تقاعد ہوا۔ بلکہ ادائے فرائض میں پہلے سے زیادہ چست و چالاک ہو گئے۔ قیادہ عامہ کی صورت میں اگر ان مساعی جمیلہ میں تحصیل رفعت و نیکنامی کا بھی احتمال لگا رہتا تھا تو اب اس کا لوث بھی نہ رہا اور انکا پاک نفس ان توہمات سے بھی بری ہو گیا اور آپنے وہ کچھ کیا کہ دنیا نے دیکھ لیا۔

ذرا انصاف سے دیکھو کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مہاجرین اولین میں سے نہیں ہیں۔ عشرہ مبشرہ

اور دوسرے جلیل القدر صحابہ سے قبول اسلام میں۔ خدمت و جان نثاری میں تحمل مصائب و شدائد میں بہت ہی موخر ہیں۔ غزوۂ خندق تک تو مسلمانوں سے برسر پیکار رہے۔ مگر جب اسلامی تعلیم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر نے اپنا اثر دکھلایا۔ تو اُن کو بھی ایک دم میں وہی حالات و مقامات طے کرا دیئے گئے جو علی فرق المراتب قدیم الایام صحابہ کو طے ہو چکے تھے۔ اُن کے اخلاق و ملکات میں نہ شائبہ جاہلیت باقی نہ رہا۔ نہ واہمہ نفسانیت۔ ان کا بال بال شریعت کے محکم و استوار اصول سے بندھ گیا۔

(۵) عزل ثانی میں امین الامۃ کیلئے ایک قسم کی زیادہ آزمائش و امتحان کا وقت تھا۔ ادھر تو حضرت خالدؓ کی عظمت عام قلوب میں سابق سے زیادہ راسخ و مستحکم ہو چکی تھی۔ انکی تدابیر جنگ۔ فراست و دانائی بسالت و شجاعت کے ساتھ ساتھ اُنکی پاک نفسی یمن و برکات کا اعتقاد اور بھی بڑھ چکا تھا اور اب ہر ایک فتح و نصرۃ کو انکی تدبیر یا جرأۃ یا اُنکے وجود کی یمن و برکت کی طرف منسوب سمجھنا ایک کھلی ہوئی بات تھی مسلمان اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ قائد عام امین الامۃ باوجود اس رفعت وشان و علو مرتبت ہر قسم کے تجربہ و تدبیر کی ہر بات میں حضرت خالد پر اعتماد کرتے ہیں۔ گویا حقیقت میں قیادۃ عامہ کی تمام ذمہ داری انہیں کے سپرد ہے ادھر اُنکے دل میں یہ اعتقاد اور ادھر امین الامۃ کا یہ معاملہ پھر کیسے ممکن تھا کہ اُن کا بلکلحت معزول کر دینا تمام خدمات سے سبکدوش کر کے میدان کارزار سے واپس بلا لینا۔ انکو نہ کھٹکتا۔ اس وقت امین الامت کو یہ خطرہ ہو جاتا کہ اُنکی معزولی مسلمانوں میں کسی ہیجان کا سبب نہ بنجائے۔ خلیفہ ارشد کی طرف کسی قسم کی سوء ظنی نہ پیدا ہو جائے کچھ مستبعد امر نہ تھا۔

دوسری جانب اُن کو یہ اشکال کہ خلیفۂ وقت کی اطاعت تو اسکی مقتضی ہے کہ حرف بحرف تعمیل ارشاد کریں۔ ادھر حضرت خالد کی جلالت شان علو مرتبت اور پھر خود امین الامۃ سے قرابت اور اہل قرابت کیساتھ مراعات اور رعایت حقوق کا حکم اس سے مانع۔ ادھر حکم عزل ایسا سخت کہ حقیقی مجرموں کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ بالخصوص جبکہ باوجود جرم کے ناقابل معافی و درگذر ہونیکے وہ شخص کسی اعلے رتبہ پر ممتاز ہو ایسے وقت تو ایسے احکام میں نہایت احتیاط برتی جاتی ہے اخفا کے

ساتھ کسی اور بہانہ سے طلب کر کے نظر بند کر دیتے۔ یا حکم سُنا دیتے ہیں۔

مگر آپنے باوجود ان اشکالات اور پرخطر آزمایش کے وہی کیا جو ایک پاک دل۔ راسخ فی العلم کو کرنا چاہیے جو اسباب و تاثیرات اسباب ظاہری سے گذر کر مؤثر حقیقی کی بارگاہ تک رسوخ یافتہ ہو جو حدود شریعت کو کماحقہ سمجھے ہوئے اور حفاظت حدود کو اولین فرض سمجھے ہوئے ہو۔

آپ بہ تعمیل حکم خلیفہ ارشد امرا و اجناد کو جمع کر کے حکمنامہ خلافت ہاتھ میں لیکر ممبر پر بیٹھے اور بموجب مضمون حکمنامہ حضرت خالد سے سوالات شروع کیے۔ مگر مشکیں باندھنے میں ابھی کچھ تامل تھا جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ایسا کرنے میں مسلمانوں کی طرف سے کچھ خطرہ یا پاسداری حضرت خالد و جنبہ داری قرابت مانع تھی۔ نہیں بلکہ رفعت شان وجلالت قدر حضرت خالد کی وجہ سے ایک قسم کی حیا تھی۔ جو اقدام سے اول وہلہ میں مانع آتی تھی حضرت امین الامۃ فطری طور سے نہایت حلیم بردبار واقع ہوئے تھے اُنکی طبیعت بھی نرم تھی۔ لیکن یہ تامل بھی چند لمحوں کی بات تھی۔ ادھر آپ اس سے قبل مسلمانوں کو منشائے حکم کی اطلاع دیچکے تھے اور یہ بھی ممکن ہی کہ آپنے خود پہلے ہی سے تعمیل حکمنامہ خلافت کیلئے کسی کو مامور فرما دیا ہو۔ حضرت بلال کا خود کھڑے ہو کر سر سے عمامہ اُتارنا اور اسی سے مشکیں باندھنا جبکہ قائد عام امین الامۃ ساکت بیٹھے ہوں اس کا زبردست قرینہ ہی۔

حضرت خالد نے امین الامۃ سے سوالات سُن کر کچھ جواب نہ دیا۔ اس بھاری اور عظیم الشان اسلامی جماعت میں ایک قسم کا سناٹا اور سکوت تھا۔ لوگ ادھر حضرت خالد کی عظمت و شان کو دیکھتے تھے ادھر خلیفہ کے سخت حکم کو خیال کر کے امین الامۃ کو دیکھ رہے تھے۔ کہ کیا کرینگے اس سکوت کو حضرت بلال حبشی مؤذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکت قدم اور جنبش دست نے توڑا۔ آپ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر سر سے عمامہ اُتارا اور اُسی سے اُن کے ہاتھ کس کر باندھ دیئے اب پھر اُنہیں سوالات کا اعادہ ہوا۔ اور اب حضرت خالد نے بھی صفائی سے جو جواب صحیح تھے دیئے۔ جواب سُننے کے بعد حضرت امین الامۃ نے خود کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ سے سر پر عمامہ باندھتے ہوئے فرمایا

هم اپنے ولاۃ و حکام کا حکم سُنتے اور اس کی اطاعت کرتے	نطیع ونسمع لولاتنا ونکرم ونخدام

اور قرابت داروں بنی اعمام کا اکرام و احترام کرتے ہیں۔

ایسے اشکال و خطرہ کے وقت امین الامت نے تمام جوانب کو کس طرح سنبھالا۔ ہر معاملہ میں حدود شریعت کی کتنی محافظت کی۔ ظاہر ہے اور یہ اسلام کی اُسی پاک تعلیم کا اثر تھا جس نے سوا ایک سودائے عشق الٰہی کے سب خیالات کو مٹا دیا تھا۔

خلیفہ راشد کے حکم کی بھی پوری اطاعت کی حضرت خالد کی قرابت کا حق بھی پورا ادا کیا انکی جلالت شان کو بھی اُسکے درجہ پر قائم رکھا۔

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اپنے ہاتھ سے عمامہ سر پر باندھنے اور ان الفاظ کے ادا کرنے میں جن سے حضرت خالد کی تعظیم ثابت ہوتی ہے۔ منشاء حکمنامہ خلافت کی خلاف ورزی تھی کیونکہ منشاء حکمنامہ تو برسر مجمع توہین تھا۔ اور اس کا منشا تعظیم و تکریم جس سے خیال ہو سکتا ہے کہ تعمیل حکمنامہ بہ جبر و اکراہ تھی۔

ایسا ہرگز نہ تھا حضرت امین الامۃ کو منشاء حکمنامہ معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر کے قلب میں اس بےمثل وجانباز سپہ سالار کی عظمت مرکوز ہے۔ اُنکی جلالت شان کو جانتے ہیں۔ جو خطاب سیف من سیوف اللہ کا ان کو بارگاہ رسالت سے مل چکا ہے وہ بھی انہیں معلوم ہے یہ جو کچھ کیا گیا انتظاماً و سداً لباب الفتنہ بضمائنفس خالد کیا گیا ہے اور یہی امین الامۃ کی غایت فراست ایمانی تھی کہ ہر بات کو اسکی حد پر رکھا۔ افراط و تفریط کی جانب ایک انچ بھی قدم نہیں بڑھایا۔

ایک لطیف اور باریک نکتہ اس کی بظاہر کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ امین الامۃ نے قبل تعمیل حکمنامہ خلافت ممبر پر بیٹھ کر حضرت خالد سے سوال کیا۔ تو آپنے محض سکوت کیا۔ کچھ جواب دیا اور جب حضرت بلال عمامہ اتار کر اور مشکیں باندھ کر تعمیل تمام کر چکے اور اسوقت اُن سے اُن سوالات کا اعادہ کیا گیا۔ تو آپنے جو اصلی اور حقیقی جوابات تھے عنایت فرما دئے۔ یہ وجہ تو ہو نہیں سکتی کہ اول مرتبہ سوالات کو محض معمولی بات سمجھا تھا۔ یہ خیال تھا کہ بات یوں ہی ٹل جائیگی اور جب تعمیل حکمنامہ ہو چکی تب آپ سمجھے کہ بلا جواب دئے چارہ نہیں کیونکہ حضرت خالد بھی اسی مقدس جماعت کے ایک برگزیدہ فرد

تھے۔ شان صلابت عمری اور شدۃ فی امر اللہ کو بخوبی جانتے تھے۔ احکام خلافت کی اطاعت مسلمانوں کے دلوں میں جسقدر مرکوز تھی وہ بھی معلوم تھی۔ حضرت ابو عبیدہ کی امانت و دیانت۔ راستبازی و صداقت سے بخوبی واقف تھے اسلئے یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ بات یونہی سکوت سے ٹل جائیگی بلکہ درحقیقت اس میں ایک نہایت باریک پہلو اور غامض نکتہ تھا جس کے سمجھنے کے بعد حضرت خالد کی عظمتِ شان و رفعتِ قدر قلوب میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

بات یہ تھی کہ حضرت خالد کو خواہ بوجہ اپنی فراست باطنی و نور ایمانی اور خواہ بربنا تذکرہ باہمی معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت عمر نے میرے ساتھ کیا معاملہ فرمانا چاہا ہے اور وہ سوالات کے جوابات مجھ سے کس حالت اور کس انداز میں لینا چاہتے ہیں اور اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس معاملہ سے مقصود حقیقتاً میری توہین نہیں ہے۔ گو صورتاً توہین ہے۔ بلکہ اصلاح خیالات و سد باب فتنہ اور خود میرے امراض نفسانی کا علاج کرنا مقصود ہے۔ ادھر یہ بھی جانتے تھے کہ اطاعت اولی الامر واجب ہے کسی ایک فرد کو بھی گنجایش پس و پیش نہیں ہے۔ ادھر امین الامۃ کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ حیا ؔ اس سے رُکیں گے اسلئے آپنے تمام جوانب کو ملحوظ رکھکر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جبتک ہو بہو تعمیل حکمنامہ ہو کر مجھ سے جواب لیا جائیگا کچھ نہ کہوں گا۔ یہ وجہ تھی سکوت خالد کی اور یہ وہ بات تھی کہ جس کو ہر شخص نہیں پہنچ سکتا۔ پہنچے گا تو وہ شخص جس کے دل میں نور ایمان کی وہی جھلک ہو جس سے اُس قرن کے قلوب معمور و مستنیر تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ صحابہ کے ہر ایک قول و فعل میں جسقدر بھی زیادہ خیال کیا جاتا ہے اُسکے اندر سے نہایت لطیف و دقیق پہلو نکلتے آتے ہیں۔ الحمد للہ علی ذالک۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت صفائی اور نہایت آزادی سے حضرت خالد جیسے بے مثل قائد عام کو ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ معمولی طور پر نہیں بلکہ نہایت عنف اور ایک قسم کی بے عنوانی سے معزول فرمایا۔ اور وجوہات عزل میں ہم اُنکے حکم کی اصل منشا اور صحیح غرض کو بالتفصیل بیان کر چکے ہیں اسکے اعادہ کی تو ضرورت نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان کو ایسا کرنے میں اشکالات کیا تھے۔ اور ایک عقل کے پابند شریعت کے تابع و منقاد کو کس قسم کے خلجان ہو سکتے تھے۔ حضرت خالد کے فضائل

وکمالات سے واقف اُنکی نمایاں خدمتگذاری اسلام وفتوحات ممالک ہویدا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُنکے اس قسم کے افعال سے باوجود اظہار ناراضی درگذر فرمانا اور اسی طرح خدمات اسلام پر مامور و برقرار رکھنا۔

صدیق اکبر کا باوجود اصرار معزول نکرنا۔ اُن کے افعال کو قابل تاویل سمجھنا یہ سب کچھ معلوم تھا مسلمانوں میں اُنکے اقتدار وعظمت کا پہلو بھی پیش نظر تھا سب سے بڑھکر اسلامی عساکر کو ایسے سپہ سالار کی سخت ضرورت وحاجت ایسے وقت محض انکو اپنی رائے واجتہاد پر عمل کرنے میں کس قدر پس و پیش ہو سکتا تھا۔ دوسری جانب جن فتنوں کا استیصال اور جن بدعتوں کا سدباب کرنا چاہتے تھے وہ ایسے نہ تھے کہ آپ اُن سے اغماض کرتے اور اُمت کو گمراہی وضلالت سے نہ بچاتے مگر سبحان اللہ حضرت عمرؓ نے وہی کیا جو ایک پاک تعلیم گاہ کے رشید ارشد شاگرد کو کرنا چاہیے تھا آپنے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر کے منشار حکم کو صحیح ومناسب وقت سمجھا۔ آپنے یہ بھی سمجھا کہ وقت واسباب کے تغیر سے احکام بدل جاتے ہیں۔ آپنے یہ بھی سمجھا کہ احکام اجتہادیہ میں مجتہد وقت کو اپنی رائے پر عمل کرنا جائز ہے آپکو حضرت خالد وجملہ عساکر اسلامیہ وافراد مسلمین پر یہ بھی اطمینان تھا کہ اسلامی تعلیم نے اُنکے اندر خودغرضی احکام اسلام سے انحراف خلیفہ وقت سے تعنت وسرکشی کا مادہ ہی نہیں چھوڑا۔ باوجود حریت جراۃ اخلاق جو اسلامی تعلیم کا جزو اہم تھا شریعت کے احکام میں سب جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے آپنے بیدھڑک اصلاح امت کے پہلو کو مرجح سمجھکر احکام جاری کر دیئے جس کی موبمو تعمیل ہوئی۔

لیکن اس کے ساتھ جو بات سب سے زیادہ ہمارے دعوے پر روشنی ڈالتی ہے یہ ہے کہ خلیفہ وقت نے اپنے حکم کی تائید اور ترجیح میں کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جس سے حضرت خالد کی تنقیص شان یا توہین وعدم کمال کی طرف ادنی اشارہ بھی ہوتا۔ بلکہ اس عزل کیوجہ سے مسلمانوں میں جو ایک نقص و توہین پیدا ہوجانیکا خیال تھا۔ اور ایسے مواقع میں اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ اسکو آپنے نہایت کشادہ دلی فراخ حوصلگی سے بکرات ومرات ظاہر فرما کر بذریعہ گشتی عام امرا اجناد وولاۃ امصار کو مطلع فرما دیا کہ خالد کی معزولی کسی سوء ظنی یا تہمت کی وجہ سے نہیں ہوئی۔

حضرت خالد کو خود خطاب کر کے فرمایا

واللہ انك الی لحبیب واللہ انك علی کریم	(خدا کی قسم تم مجھ کو محبوب و پیارے ہو۔ تمہاری عظمت واکرام میرے دل میں ہے)

آپ کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہی کہ آپ نے جملہ جوانب کی پوری عایت کی۔ حد ذمہ داری کو سنبھالا حضرت خالد کے درجہ کو قائم رکھا مسلمانوں کے عقائد و خیالات کی اصلاح کی امۃ کو فتنہ و فساد سے بچایا۔ اور اس جملہ کارروائی میں از ابتداء تا انتہا کہیں لوث نفسانیت یا شائبہ غرض کا وہم بھی ظاہر نہوا۔

یہ بھی اسلام کی اصلی تعلیم جس نے مسلمانوں کو اوج رفعت پر پہنچایا اور جب مسلمانوں نے جسقدر اس اصل تعلیم سے بے توجہی کی اتنا ہی اُن پر ادبار آیا۔ ترقی سے تنزل کی طرف جھکے۔ واللہ الهادی واللہ المرجع والمآب

فائدہ رابعہ۔ عزل ثانی کیوقت خلیفہ کا یہ حکم پہنچا کہ حضرت خالد کے سر سے عمامہ اُتار کر اُسی سے اُنکی مشکیں باندھی جائیں اور جواب طلب کئے جائیں جو نہایت سخت اور ہتک آمیز تھا۔ مگر تاہم اگر حضرت خالد کے اقران و امثال عرب کے رؤسا و سادات عساکر کے امراء و قوادیں سے کوئی اسکی تعمیل کرتا تب بھی ایک بات تھی۔ اپنی اقران و امثال سے کوئی بات ہتک آمیز یا خلاف شان بھی پہنچ جاتی ہی تو اس کو گوارا کر لیا جاتا ہی لیکن یہاں معاملہ برعکس ہوا۔ اس حکم کی تعمیل کے لئے عظیم الشان عساکر اسلامیہ میں سے جہاں ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے۔ کھڑے ہوئے تو حضرت بلال حبشی۔ مؤذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

بلال اپنے فضائل و مناقب کیوجہ سے کیسے ہی اعلیٰ درجہ کے مقرب و برگزیدہ ہوں۔ مگر تھے ایک حبشی غلام۔ اُن کا ایک ایسے عظیم الشان پر خطر کام کیلئے خواہ تو اس وجہ سے کہ امین الامۃ نے خود اشارہ کیا ہو۔ اور خواہ اس وجہ سے کہ تعمیل حکمنامہ خلافت نے انکو آمادہ کیا ہو۔ کھڑا ہونا حیرت انگیز ضرور تھا۔ مگر سبحان اللہ کیا صفائی اور پاکبازی تھی۔ قلوب کیسے منور و مجلی ہو چکے تھے۔ رذائل نفسانی کس

حدتک ناپدید ہو چکی تھیں۔ کہ کسی شخص نے اس حرکت کو ناگواری سے نہیں دیکھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ اسلام نے حریت و مساوات کی تعلیم کس حدتک دی ہے۔ اُس نے توازن و تماثل کی میزان کو کیسا صحیح قائم کیا۔ جو قومیں آج حریت و مساوات کی مدعی ہیں اور فخر کرتی ہیں کہ اسلام نے غلامی کو قایم کیا۔ اور ہم نے اس کو مٹا کر حریت و مساوات کو جاری کیا اپنے دل میں ذرا انصاف کریں کہ ان کا فخر کہاں تک بجا ہے۔ اور وہ کیونکر اسلام کی حریت و مساوات کا مقابلہ کر سکتی ہیں ہرگز نہیں اس حریت و مساوات کو اسلام کی حریت و مساوات توازن مراتب سے کیا نسبت چہ نسبت خاک را با عالم پاک

جو لوگ اس غلطی میں مبتلا ہو کر اسلام پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ اُنھوں نے درحقیقت حریت و مساوات کی حدود اور ان کے احکام کو سمجھا ہی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ حریت و مساوات اسکی حدود احکام۔ طرق استعمال کے متعلق بھی کچھ وضاحت کر دوں۔

تفصیل و تحقیق مسئلہ حریت و مساوات

مساوات۔ عالم کے تمام اجزا پر نظر ڈالنے سے خواہ وہ افراد ہوں۔ یا اصناف۔ انواع ہوں یا اجناس صاف واضح ہے کہ انکے نظام کا محور اشتراک و انفراد۔ اجتماع و افتراق۔ تماثل و تمائیز ہے عالم بجمیع اجزائہ وجود میں مشترک ہے۔ موجودات میں وصف حیوۃ سے تفریق شروع ہوتی ہے۔ اور یہیں سے احکام و معاملات میں بھی تفریق کی بنیاد پڑتی ہے۔

موجودات غیر ذی حیات میں جمادات۔ نباتات۔ اشجار و احجار۔ در و دیوار کوہ و کوہسار سب شامل ہیں۔ موجودات ذی حیات میں پھر ایک کلی تقسیم ہو گئی۔ ایک جزو وہ ہے جو احکام خداوندی کا مکلف بنایا گیا۔ جن سے احکام شرع کا تعلق ہے۔ جن کے اقوال و افعال حالات و معاملات قانون مذہب و شرع میں حکم دیئے گئے ہیں اور یہ حصہ ذوی العقول کا ہے۔ دوسرا جزو وہ ہے جو غیر ذی العقول کہلاتے ہیں اور مکلف و مخاطب احکام الٰہی نہیں ہیں۔ اس جزو کے اندر گو ہزارہا انواع و اقسام داخل ہیں۔ جن کا احاطہ دشوار ہے۔ بری۔ بحری۔ طیور۔ سباع و بہایم۔ حشرات الارض وغیرہ۔ مگر کلی طور پر ہم اسکو بھی

دو حصوں پر منقسم کرتے ہیں ایک موذی مثل سباع طیور و بہائم - اس میں شیر چیتا - سانپ بچھو وغیرہ داخل ہو گئے - دوسرا غیر موذی -

غیر موذی کی بھی ہم کلی تقسیم کر کے اس کو دو حصوں میں منقسم کرتے ہیں - ایک وہ جس کا کام میں لانا انسان کیلئے جائز حلال مفید قرار دیا گیا - دوسرے وہ جن کا کسی طرح سے بھی استعمال ناجائز و حرام ہے جزو مکلف بالاحکام بھی دو حصوں میں منقسم ہے ایک انسان جو جسم کثیف ارضی ہے - دوسرا جن جو جسم لطیف - ناری - قادر علی التشکل بالاشکال المختلفہ ہے -

وصف وجود میں سارا عالم شریک تھا اور یہانتک حقوق اور استحقاق کا تعلق نہ تھا - وصف حیوۃ نے اُن میں تفریق پیدا کر دی - مساوات وجودی کے احکام بدلدئے حقوق کے تعلق قائم کر دیے - تمام موجودات پر جزو مکلف کا حق تفوق قائم کر دیا - عالم کو بجمیع اجزائہٖ اس جزو کیلئے کار آمد بنایا گیا - خداوند عالم نے ایک عام فرمان کے ذریعہ سے ہم کو اس عظیم الشان احسان سے ان الفاظ میں مطلع فرمایا -

خلق لکم ما فی الارض جمیعا (زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے نفع کیلئے پیدا کیا -)

اشتراک وجودی کا نفع تو صرف اتنا ہی کہ موجودات میں سے ایک موجود دوسری موجود کے کار آمد ہو لیکن چونکہ احکام کا تعلق حیوۃ سے ہی - اس لئے کسی کا دوسرے پر حق نہیں ہی -

حیوۃ کی تفریق نے اوّل تو یہ امتیاز قائم کیا کہ غیر ذی حیات اس جزو کا خادم و تابع ہوا جو ذی حیات ہے چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ غیر ذی حیات تمام افراد ذی حیات کیلئے کار آمد ہے حیوانات - طیور - دواب سب انہیں اجزا سے فائدہ اُٹھاتے ہیں - پانی پیتے ہیں - گھاس درختوں کے پتے میوے پھل غلہ کھاتے ہیں - درختوں کے سایہ میں - پہاڑوں کے غاروں میں - زمین کی کھووں میں آرام کرتے اور پناہ لیتے سردی گرمی سے محفوظ رہتے ہیں -

لیکن وصف حیوۃ کے اشتراک نے افراد ذی حیات میں ایک اور علاقہ بھی قائم کر دیا باوجود اسکے کہ حصہ مکلف کو اس حصہ پر فوقیت دی گئی جس میں فقط حیات ہی مکلف نہیں ہی کہ ایں کا خادم و تابع بنایا گیا - اور اُسی کے منافع کیلئے پیدا کیا گیا - مگر تاہم وصف حیات کی رعایت اس جزو کے

فے بھی دیگئی۔ ذی حیات میں جو حصہ غیر موذی ہے اور انسان کو اسکی پرورش استعمال کی اجازت دیگئی ہے۔ جیسے اونٹ بیل۔ بکری۔ مرغی وغیرہ۔ اسکی رعایت تواس درجہ تک ہے کہ اُسکے چارہ دانہ میں کمی کر دینے یا برداشت سے زیادہ خدمت لینی۔ بوجھ لادنے۔ سوار ہونے میں قابل مواخذہ ہوجاتا ہے۔ رہا وہ حصہ جو خود انسان کا دشمن اور اسکی بنیاد کو گرانے والا ہے۔ باوجود اسکو قتل کرڈالنے کی اجازت کے اسکی ممانعت ہے کہ ترسا کر یا تکلیف پہنچا کر مارڈالا جائے۔ یہ کیوں صرف اس لئے کہ اشتراک حیاتی کا اقتضا یہ ہے اور تفریق دیگر اوصاف کا اقتضا دوسرا۔

یہ اشتراک و انفراد اسی طرح ترقی کرتا ہوا انس و جن پر منتہی ہوا جن و انس موجود بھی ہیں ذی حیات بھی ہیں ذوی العقول بھی ہیں۔ مکلف بتکالیف شرعیہ و مخاطب بالخطابات الالہیہ بھی ہیں۔ اور باوجود ان اشتراک کے ان میں انفراد و امتیاز بھی ہے۔ جن مرکب ہے۔ اجزار ناری سے اور اس وجہ سے وہ لطیف ہے۔ اس کو قدرۃ دیگئی ہے کہ اشکال مختلفہ میں متشکل ہوسکے۔ انسان کثیف ہے اجزار ارضیہ سے اسکی ترکیب ہے لیکن انسان کو اس وجہ سے کہ وہ اجزار ارضی سے بنایا گیا۔ تواضع فروتنی تذلل و انقیاد اس کے خمیر میں داخل اور عبدیت و افتقار اسکی اصل فطرۃ میں مستقر ہے جن پر جس کے اندر بوجہ اجزار ناری علو و استکبار خلقی ہے تفوق امتیاز دیا گیا۔

بوجہ ان اشتراکات کثیرہ متنوعہ کے جن و انس میں حقوق کا موثق و محکم تعلق قائم کردیا گیا جن کے حقوق انس پر ہیں اور انسان کے جنات پر اور بوجہ ان اوصاف مخصوصہ کے جو انسان میں ہیں۔ اُس کو جنات پر صورتاً۔ سیرتاً۔ حکماً تفوق و امتیاز دیا گیا۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (ہم نے انسان کو اچھے سے اچھے صورت پر پیدا کیا)

اس سے تو جسم انسانی کا تمام اجسام سے خواہ لطیفہ ہوں یا کثیفہ احسن ہونیکا ثبوت ملتا ہے اور اسی سے اُس کے اخلاق باطنی کی فوقیت و امتیاز کا نشان بھی ملتا ہے۔ ارشاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلق اللہ آدم علی صورتہ (اللہ تعالی نے آدم کو اپنی صورت مثال پر یا اُنکی صورت پر جو نوع انسان کیلئے مناسب تھی پیدا کیا)

سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مظہر تمام صفات کمالیہ خداوند عالم کا ہے۔ مخلوقات کا کوئی دوسرا فرد خواہ لطیف ہو

یا کثیف۔ نوری ہو یا ناری۔ اس درجہ کا مظہر تام نہیں ہے۔ اور اسی حدیث سے نیئہ انسان کی باعتبار تقویم و اعتدال اجزاء صوری احسن و اجمل اعلیٰ و برتر ہونیکی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

آدم علیہ السلام کو خلعت خلافت خداوندی عطا ہونے اور ارشاد خداوندی

انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ (میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانیوالا ہوں)

کے فرمان واجب الاذعان نے اسکی تفوق و برتری پر مہر لگادی اور اب کسی کو دعوئے ہمسری استحقاق تقدم و تفوق اس پر نہ رہا۔ اور اس طرح اشتراک و انفراد مساوات و امتیاز کا سلسلہ موجودات سے چل کر ایک صنف کو دوسری پر فوقیت دیتا ہوا انسان پر منتہی ہوا اور انسان کے افراد میں پھر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ ہماری اصلی غرض مساوات و حریت کے مسئلہ کا تعلق چونکہ افراد انسانی سے ہی ہے اس لئے ہم اسکی تفصیل شروع کرتے ہیں۔

تمام افراد انسانی خواہ کسی ملک اور کسی رنگت کے ہوں۔ رومی۔ حبشی۔ ترکی۔ تاتاری۔ یورپی ایشیائی۔ افریقی۔ امریکی سب ایک نسل سے ہیں۔ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس انشعاب و تفریق پر اس مباہنت رسوم و عادات پر سب کے سب ایک میدان پر جاکر مل جاتے ہیں لیکن اس اشتراک پر جس سے بڑھکر اور کیا اشتراک ہوسکتا ہے اُن میں افتراق و تقسیم کا سلسلہ جاری ہے اور اسی سے احکام میں بھی تفریق ہو جاتی ہے تفصیل اسکی یہ ہے۔

کہ خداوند عالم نے آدم کے اشتراک و افتراق تجانس و تمائز کو آیتہ ذیل میں ارشاد فرمادیا ہے۔

یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وانثیٰ وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم	(اے لوگو ہم نے تمکو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور پھر تم کو قبیلوں اور کنبوں میں تقسیم کردیا۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو امتیاز قائم رکھ سکو خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک تم میں کا وہی شخص اکرم ہے جو زیادہ متقی ہے)

جملہ اولیٰ میں بنی آدم کا اشتراک بیان فرمایا گیا ہے اور جملہ جعلناکم سے آخر آیتہ تک اُن کا افتراق و تمائیز ظاہر ہے کہ نظام تمدن اس کا مقتضی تھا کہ بنی آدم باوجود ایک نسل اور ایک جنس ہونیکے

باہم متمایز اور متباین بھی ہوں۔ اُنکے انساب محفوظ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان میں اور بہائم میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

امتیاز دو قسم کے ہیں ایک تمدنی و معاشرتی جس کے منافع حیات دنیا تک محدود ہیں دوسرا مذہبی و دیانتی جن کا احاطہ فوائد دار دنیا سے آخر تک وسیع ہے۔ آیۃ مذکور میں اول امتیاز و فراق کو جعلنٰکم شعوبًا و قبآئل لتعارفوا میں بیان فرمایا ہے اور مذہبی و دیانتی کو ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم میں۔

ہر ایک امتیاز کا مبنیٰ جُداگانہ امور ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

امتیاز تمدن و معاشرت میں بہت سے شعبے امتیاز و افتراق کے ہیں۔ پہلا شعبہ نسب کا ہے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے چند بیٹے ہوئے اور ہر بیٹے کی اولاد جداگانہ ہوئی اور اسی طرح سلسلہ بسلسلہ شاخ در شاخ ہوتا چلا گیا۔ اگر بنی آدم کا توالد و تناسل مثل حیوانات و بہائم ہوتا تو اس قسم کا امتیاز قائم نہ ہوتا اور نہ اس کی ضرورت پڑتی۔ اس امتیاز نسبی سے کنبے۔ خاندان۔ کنبوں سے چھوٹے بڑے قبیلے اور پھر قومیں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ یہ امتیاز و افتراق شروع میں تو بہت کم محسوس ہوتا ہے کیونکہ مثلاً اپنی اولاد اور اپنے بھائی کی اولاد میں بہت کم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں بعد بڑھتا جاتا ہے مباینت بڑھتی جاتی ہے یہانتک کہ قبائل کا امتیاز بہ نسبت کنبہ اور خاندان کے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اقوام کا افتراق و امتیاز تو اس درجہ ہوتا ہے کہ گویا ان میں کہیں جاکر بھی مشارکت نسبی نہیں ہے۔

دوسرا امتیاز ملک اور وطن کیوجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک ملک کی آب و ہوا جداگانہ ہے۔ رنگ و روپ رسم و رواج قومی جسمانی کے ارتقاء کا انحطاط میں اس کو بڑا دخل ہے اور جس طرح حفاظت انساب نسل انسانی کیلئے ضروری تھی۔ اُسی طرح امتیاز ملک و وطن بھی تمدن کا لازمی جزو ہے۔ بغیر اسکے نظام تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔

تیسرا امتیاز حرفت و صنعت اور پیشہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دنیا میں بعض پیشے اعلیٰ و ارفع موجب عزت سمجھے جاتے ہیں اور بعض ادنیٰ موجب حقارت و توہین ہوتے ہیں۔ مثلاً تجارت کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ گداگری و سوال کو نہایت حقارت سے۔ اسی طرح صناع میں زیور بنانیوالا معزز سمجھا

جاتا ہے بہ نسبت جوتے سینے والے کے۔ علی ہذا درزی کا درجہ خاکروب سے بلند ہوتا ہے۔

ہر سہ امتیازات مذکورہ بالا تمدن عالم کیلئے ضروری ہیں۔ اگر یہ تینوں نہوں تو نظام عالم استوار نہیں رہ سکتا۔ امتیاز مدارج و مراتب۔ انصرام حوائج و ضروریات زندگی۔ جلب منافع و دفع مضار کا مدار انہیں پر ہے۔ اور اس قسم کے امتیاز اور بھی ہیں جنکے بیان کرنے میں طول ہے۔

یہ وہ امتیاز ہیں جن سے قومیں نکلتی ہیں۔ قبیلے بنتے ہیں۔ خاندان پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی امتیاز حدود بنتے ہیں۔ جن کیوجہ سے ایک قوم دوسری قوم سے ایک ملک دوسرے ملک سے ایک خاندان دوسرے خاندان سے ہر ایک صناع و پیشہ ور دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔

ان امتیازات سے تو بنی آدم کے اصناف و انواع اجناس پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسری قسم کا امتیاز اور ہے جس کا اثر افراد تک تو بیشتر اور بسا اوقات اقوام و قبائل تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

مثلاً امتیاز علم و جہل۔ علم جوہر نفیس ہے جس کے اندر یہ جوہر ہو اسکے محترم واجب التعظیم قابل اطاعت ہونے میں کس کو شک و شبہ ہو سکتا ہے۔ علم کسی فن کا ہو انسان کے مرتبہ کو بالا و بلند کر دیتا ہے۔ اُسکے مقابلہ میں جہل عزت سے ذلت۔ اوج سے حضیض۔ اہتمام و اکرام سے اہانت و تذلیل کی طرف دھکیلتا ہے۔ علم و جہل سے حقیقی بھائیوں کے مدارج و مراتب میں امتیاز و افتراق پیدا ہو جاتا ہے ایک بھائی دولتِ علم سے مالا مال ہو کر دنیا کا سرتاج۔ شاہانِ دنیا کا مقرب۔ مخلوق کا اُستاد و مؤدب بنا ہوا ہے۔ دوسرا جاہل کندہ ناتراشیدہ اس قابل بھی نہیں کہ کوئی اس سے تخاطب کرے۔ پاس بٹھلانے کا بھی روادار ہو۔ اور یہ امتیاز علم بسا اوقات افراد سے متجاوز ہو کر اقوام تک پہنچ جاتا ہے کسی خاندان سے دولت علم زائل ہوئی۔ جہل کا غلبہ ہوا تو چند پشتوں کے بعد وہ وحشی بنجاتے ہیں بجائے اخلاق انسانی وحشت حیوانی ان پر غالب آجاتی ہے۔ اسی طرح بعض ملک کے ملک جہل کیوجہ سے انسانیت سے خارج ہو جاتے اور وحشی کہلانے لگتے ہیں۔

ایسی اقوام یا ممالک یا اقالیم کی مثالیں بھی بہت کم ہیں۔ جو کسی وقت جہل کی وجہ سے وحشی کہلاتے تھے۔ علم نے ان کو مہذب بنا کر متمدن اقوام میں داخل کر دیا۔ پہلے تو عرب ہی کی حالت دیکھ

لیجیے۔ اکثر حصہ ملک بیشتر اقوام و قبائل جہل کے تیرہ و تار میدانوں میں بھٹکتے پھرتے تھے ان میں اور وحشیوں میں تھوڑا سا ہی فرق تھا۔ اور جب علم آیا اُس نے فطری اخلاق و ملکات کو جلا دی تو کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے دنیا پر اپنے علم و ہنر کا سکہ جما دیا۔ اصلی و حقیقی تہذیب کا سبق سارے عالم کو دیدیا پھر امریکہ پر نظر ڈال لیجیے۔ کہاں وہ وحشت۔ اور کہاں یہ ترقی ایجادات و صنائع۔ وعلی ہذا جاپان وغیرہ ممالک کا حال ہی۔

یا مثالاً۔ امتیاز اخلاق و اعمال۔ ایک درجے کے افراد میں۔ محاسن اخلاق و مکارم اطوار سے امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ مہذب و متمدن۔ علم کی دولت سے مالامال نسب و حسب و قومیت میں مساوی باینہمہ اشتراک اخلاق شریفہ و ضیعہ۔ سے امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ حسن خلق عالم کے علم کو مہذب کی تہذیب شریف النسب کے نسب کو ممتاز بنا دیتا ہی۔ جہل کے نقصانات آنکھوں سے اوجھل کر کے جاہل کی عزت بڑھا دیتا ہے۔

علی ہذا اس قسم کے امتیازات اور بھی ہیں ان امتیازات سے قبائل و اقوام تو نہیں بنتے مگر افراد یا اقوام میں فضائل و کمالات شرافت و دنارت کے درجات قائم ہو جاتے ہیں۔

ان امتیازات کے بعد ایک اور بھی امتیاز ہی جو ساری دنیا یا کسی اقلیم یا کسی حصۂ ملک کو دو حصوں پر منقسم کر دیتا ہے۔ ایک سلطان یا حاکم ہوتا ہے۔ باقی کل افراد اسکی محکوم و رعیت۔ یہ امتیاز قومیت و وطنیت بلنسب خاندان سے بالکل علیحدہ ہے۔ یہ تمام امتیازوں سے اوپر کا امتیاز ہے۔ اور عالم کے تمدن۔ بقائے نسل تحفظ حقوق کیلئے اس کا وجود نہایت ضروری و لازم۔

امتیاز و دیانت و مذہب جو جناب باری کے ارشاد ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم سے معلوم ہوتا ہے اسکے شعبے و درجات اگرچہ بہت سے ہیں۔ مگر ان سب کا منشاء اور اصل ایک ہی۔ انسان کو خدا نے اسلیئے پیدا کیا ہی کہ عالم کے ہر جزو سے فائدہ اٹھائے تمام لذائذ و نعم سے متمتع ہو۔ سب پر حکومت کرے اور ہماری بندگی کرے۔ ہمارے سامنے گردن جھکائے۔ ہم کو خالق مالک سمجھے۔ اپنے آپ کو مخلوق و مملوک سارے عالم کو اس کا ملک بنا کر اس کو ہر قسم کے تصرفات مالکانہ کی اجازت دی گئی۔ اور اس سے

صرف اتنا طلب کیا گیا کہ ہم کو اپنا مالک و رب رزاق و معطی معبود جانیے۔ تمام اجزائے عالم کا انسان کیلئے مسخر و خادم ہونا تو ظاہر ہے کہ کوئی ذی عقل انکار ہی نہیں کر سکتا۔ رہا یہ امر کہ وہ عبادت و اطاعت کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس کا انکار بھی کسی عاقل فہیم سے ممکن نہیں ہے خداوند عالم نے امر اول کو تو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموٰت و ما فی الارض و اسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ و باطنۃ

کیا نہیں دیکھا تمنے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں و زمینوں میں ہے مسخر کردیا اور اپنی ظاہری و باطنی نعمتوں کو تم پر پورا کیا

اور دوسری جگہ یوں ارشاد ہے۔

اللہ الذی خلق السموٰت والارض و انزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم و سخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ و سخر لکم الانہار و سخر لکم الشمس و القمر دائبین و سخر لکم اللیل و النہار و اتاکم من کل شیٔ ما سألتموہ و ان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوہا ان الانسان لظلوم کفارٌ

اللہ وہ ذات پاک ہی جس نے آسمانوں کو اور زمینوں کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی اُتارا اور اس سے تمہارے لئے میوؤں سے رزق پیدا کیا اور مسخر کیا تمہارے لئے کشتیوں کو کہ اُسکے حکم سے دریا میں چلیں اور مسخر کیا تمہارے لئے نہروں کو اور مسخر کیا تمہارے لئے سورج اور چاند کو ہمیشہ اور مسخر کیا تمہارے لئے دن اور رات کو اور دیا تم کو کچھ ہر چیز سے جو تمنے سوال کیا اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہ کرسکو گے بیشک انسان بڑا ظلم کرنیوالا اور ناشکر گذار ہے۔

اور امر ثانی کو آیۃ ذیل میں،

وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون ما ارید منہم من رزق و ما ارید ان یطعمون

نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انس کو مگر اسی لئے کہ وہ میری عبادت کریں میں اُن سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ کہ وہ مجھکو کھلائیں۔

انسان کی خلقت اس غرض کیلئے ہے تو اس کی افراد میں ایک عام تقسیم ہو کر کل اقوام عالم کے دو حصے ہوگئے خواہ وہ ایک نسب ایک خاندان ایک قبیلہ کے ہوں یا جُداگانہ۔ ایک ملک ایک اقلیم ایک شہر ایک قبیلہ ایک گاؤں ایک محلہ کے ہوں یا علیحدہ علیحدہ۔ کسی پیشہ و حرفت کے ہوں۔ عالم کریم النفس ہوں یا جاہل وحشی اخلاق و عادات کے۔

ایک حصہ مومن ایک کافر جس نے خداوند عالم کی اصلی غرض خلق عالم اور خلق انسان کو ملحوظ رکھا عالم کے اجزاء سے متمتع ہوا اور خود کو خدا کا بندہ مانا۔ ساری دنیا کو اپنی ملک سمجھا۔ اپنے آپ کو اپنے خالق کا مخلوق مملوک خداوند عالم کے بھیجے ہوئے انبیاء اور اس کے نازل کئے ہوئے احکام کا اتباع کیا مومن کہلایا اور جس نے سرتابی کی مخلوقات دنیا پر تو ایسے تصرفات کئے گویا اسکی پیدا کی ہوئی اسکے مملوک وغلام ہیں اور خود اپنے مالک وخالق سے روگردانی کی اُس کے وجود کا قائل نہ ہوا یا ہوا تو اپنی عقل نارسا کا تابع ہوا انبیاء کو نہ مانا۔ احکام منزلہ کا اتباع نہ کیا۔ شریعت کو نہ مانا۔ وہ کافر ناشکر گذار۔ جاحد نعمت ٹھیرا۔

اس امتیاز کے درجات بیشمار ہیں۔ مومن کی تقسیم بوجوہ متعددہ ہوتی ہے جس سے اسکے افراد و انواع بنتے جاتے ہیں۔ ایمان درجۂ اعتقاد واعمال دونوں میں ہے۔ تو مومن صالح ہے۔ فقط درجۂ اعتقاد میں ہے۔ اعمال میں تقصیر ہے مومن فاسق ہے۔ خداوند عالم کے وجود اسکی توحید وصفات کا علم یقینی اسکو حاصل ہے تو کامل ہے محض تقلیدی ہے تو ناقص۔ علی ہذا اسرار معرفت وتوحید۔ علوم اذواق و مواجید سے بہرہ ور ہو تو مومن عارف ہے۔ ورنہ غیر عارف۔ وحی وتنزیل سے اسکو سرفراز فرمایا گیا ہے تو نبی ورسول ہیں۔ ورنہ صدیق وشہید وصالح۔

اس امتیاز کے اصلی آثار تو آخرت میں ظاہر ہوں گے۔ مگر اس کے احکام کا تعلق حیوۃ دنیا سے ہے اس لئے ان احکام کے آثار دنیا میں بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

اشتراک وامتیاز کی اس بحث کا جس کو یہاں بیان کیا حاصل یہ ہے کہ اشتراک کے درجہ میں مساوات ہوتی ہے اور امتیاز کے مرتبہ میں تفریق احکام ومعاملات ہو جاتی ہے۔ جبتک اشتراک وجودی تھا حقوق اور معاملات کا تعلق نہ تھا۔ موجودات عالم میں ایک کو دوسرے پر حق تقدم وتفوق باعتبار تقدم خلقت۔ یا محتاج الیہ ہو نے یا صغر وکبر اجسام یا قلت وکثرت نفع کے ہو مثلاً اربع عناصر کو موجودات عالم کی خلقت میں ایسا دخل ہے جس کی وجہ سے ان کو اصل موجودات کہا جاتا ہے۔ پہاڑ پیدا ہوتے ہیں تو انہیں عناصر کی ترکیب وامداد سے۔ اشجار واثمار بھی انہیں سے۔ حیوانات وبہائم بھی انہیں سے یا مثلاً شمس وقمر۔ کواکب سیارہ وثوابت۔ علی ہذا افلاک وسموات بھی موجودات میں ہیں۔ مگر ان کا نفع موجودات

عالم کو زیادہ پہنچتا ہے۔ موسموں کا تغیر و تبدل جن کو اعتدال مزاج عالم میں بڑا دخل ہے۔ انہیں کے متعلق ہے شمس و قمر کی نورانیت اور تنویر نے اُن کے درجہ کو بڑھا دیا ہے۔ مگر جبتک فقط وجود کا اشتراک ہے حقوق و معاملات کا تعلق نہیں ہی اور جب وصف حیوۃ نے امتیاز کر دیا موجودات میں حد فاصل لگا دی حقوق و استحقاقات و معاملات کا علاقہ قائم ہو گیا۔ اور پھر درجہ بدرجہ جو امتیاز و تفریق ہوتی گئی حقوق کا تعلق بڑھتا گیا، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، جب یہ معلوم ہو گیا تو اب سُنیئے کہ اشتراک و امتیاز کے احکام جداگانہ ہیں جس حد تک اشتراک ہے اس میں حکم مساوات ہی، اور جس وصف سے امتیاز شروع ہوتا ہی مساوات بدلجاتا ہی احکام میں تفریق ہو جاتی ہے، ہر ایک وصف کے امتیاز نے اسکے لئے جداگانہ حکم ثابت کیا ہے۔

مساوات کے تین درجے ہیں۔ ایک مساوات ذات میں۔ ایک مساوات صفات و حالات میں ایک مساوات حقوق و معاملات میں۔ ہماری غرض اسوقت مساوات حقوق و معاملات کو بیان کرنے سے ہے۔ مساوات ذات و صفات سے نہیں ہے۔ ذات و صفات میں مساوات کا ہونا مشکل ہی۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ ہر موجود کی صورت شکل۔ قد و قامت۔ حیز و مکان وغیرہ اوصاف مختلف نے ناممکن کر دیا ہے تو بیجا نہیں اور ہو بھی تو ہم کو اس سے بحث نہیں ہے۔

اس سب تمہید کے بعد عرض ہے کہ انسان مخلوقات میں کامل و اکمل ہے۔ حقوق و معاملات کا علاقہ جس قدر اسکی ذات سے ہی۔ عالم کے تمام انواع و اقسام میں کسی سے نہیں ہی۔ اسکے افراد میں خود باہمی حقوق و استحقاقات کا سلسلہ اس طرح قائم ہے کہ یہ نہو تو نظام تمدن باطل ہو جائے۔ بلکہ نسل انسانی منقطع ہو جائے اور باوجود ان تمام اشتراکات کے جو افراد انسان میں پائے جاتے ہیں اُن کے اندر امتیاز و افتراق بھی ہے۔ اشتراکات اگر مساوات کو تقاضا کرتے ہیں۔ تو امتیازات تفریق و تفاضل کو ہم کو دیکھنا یہ ہی کہ افراد انسانی کے اندر مساوات کتنے امور میں ہونی چاہیئے اور تفریق و مفاضلۃ کتنے معاملات میں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اوّل عقل و عرف عقلاء زمانہ کے طرز عمل اُن کے قوانین کے اعتبار سے بحث کریں اور اسکے بعد دکھلائیں کہ شریعت نے اس مسئلہ میں کیا تعلیم دی ہی۔

بادی النظر میں لفظ مساوات بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ سُنا جاتا ہی کہ فلاں شخص کی

نظروں میں یا فلاں ملک میں امیر و غریب۔ شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت و امتیاز نہیں ہے
یا کہتے ہیں کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں تو سننے والے کے قلب میں مسرت و اطمینان۔ پسندیدگی
و طمانیت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مسرت و ابتہاج سے دل لبریز ہو جاتا ہے اور وہ اس سے بڑھکر دنیا کے امن و امان
کا ضامن کسی بات کو نہیں سمجھتا۔ لیکن تحقیق طلب امر ہے کہ آیا ہر امر میں ہر معاملہ میں مساوات محمود ہے۔ یا ایسے
مواقع بھی ہیں۔ جہاں مساوات مذموم سمجھی جاتی ہے اور اسکی مضرتیں و نقصانات اس امتیاز و مفاضلت سے
بدرجہا زائد ہوتی ہے جس کو بظاہر غیر محمود سمجھا جاتا ہے۔

ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ انسان کے اندر باوجود اشتراک صفت انسانیت مختلف وجوہ و طرق سے امتیازات
پیدا ہوتے ہیں اور ہر امتیاز اپنا جدا حکم رکھتا ہے۔ پس یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ تمام افراد انسانی ہر امر میں مساوی قرار
دیدیے جائیں۔ لازم اور واجب ہے کہ کسی حد تک ان میں مساوات ہو اور کسی جگہ جا کر بوجہ تفاضل و تفاوت
درجات و مراتب اُن کے معاملات میں تفاضل ملحوظ رکھا جائے۔

اسی لئے تمام عقلاء دنیا کا اجماع ہے۔ اور دنیا بھر کے قوانین باعتبار اُصول اس پر متفق ہیں کہ انسانی
افراد کے حقوق باعتبار انسانیت مساوی ہیں۔ ایک نہایت غریب ضعیف بے یار و مددگار۔ جاہل وحشی۔
کندہ ناتراشیدہ غیر مہذب غیر متمدن۔ کج خلق۔ کمینہ۔ رذیل اخلاق۔ بد افعال۔ قبیح منظر سیاہ فام کے
حقوق انسانیت کا محفوظ رکھنا ایسا ہی ضروری ہے۔ جتنا سلطان وقت یا ایک رئیس و زمیندار تاجر و
صناع کا یا ایک مہذب و متمدن کریم النفس جامع اوصاف حمیدہ و ملکات پسندیدہ کا کسی منصفانہ قانون میں
ضعیف و کم رتبہ شخص کی جان کو بڑے پایہ والے سے کمتر نہیں سمجھا جاتا۔ اور اسی وجہ سے افراد انسانی کے
حقوق و معاملات کی پامالی دنیا کے کسی قانون میں پسند نہیں کی گئی۔ اس کو جور و تعدی ظلم و ستم کہا جاتا ہے
انسانیت کے خلاف وحشت و بہیمیت کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن باوجود اس مساوات حقوق انسانی کے باجماع عقلاء دنیا دوسرے مدارج میں ایک کو دوسرے
پر فوقیت دیجاتی ہے اور اس فوقیت میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کسی کے انسانی حقوق پامال نہ ہو جائیں
اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس درجہ کے مساوات کہ عالم کے تمام افراد خواہ کسی طبقہ کے ہوں ایک ہی

درجہ پر رکھدی جائیں کبھی محمود پسندیدہ نہیں ہوسکتی۔ کیا یہ امر پسندیدہ ہو سکتا ہے کہ سلطان وقت اور ایک ادنیٰ عنا کروب معاملات نشست و برخاست۔ کھانے پہننے احترام و اکرام میں برابر کر دیے جائیں اور ایسا ہو تو کیا کوئی عاقل اس کو پسند کریگا۔ اور کیا ایسا ہونیکے بعد عالم کا نظام باقی رہ سکتا ہے۔ آپس میں سکون و امن قائم اور اسکے افراد میں تعاون و تناصر کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔

اور کیا دنیا کا کوئی عقلمند شخص اسکو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے کہ کسی فن کے عالم اُستاد کا رتبہ باعتبار حرمت و عظمت ایک کندۂ دین جاہل کی برابر کردیا جائے۔ شاگرد و اُستاد میں فرق مراتب اُٹھادیا جائے۔

اسی طرح ہر درجہ و مرتبہ کے امتیاز کا حکم جداگانہ ہے جس کا لحاظ عقل و عرف و قوانین فطرۃ و قوانین عقلا کے اعتبار سے ضروری ہے۔ ہاں مگر اسی طرح پر کہ حقوق انسانیت کی مساوات میں اس سے فرق نہ آوے۔

اگر کسی زمانہ میں یا کسی ملک و قوم میں حقوق انسانیت کے اندر ایک نوع کو دوسرے نوع پر یا ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر فوقیت دی گئی۔ تو اس کو ہمیشہ ظلم سمجھا گیا ہے اور وہ قومیں آجتک وحشی جاہل غیر مہذب کہلاتی ہیں۔

اسی طرح اگر کسی ملک یا قوم میں مساوات کو اس درجہ بڑھادیا جائے کہ حقوق انسانی کے علاوہ باقی معاملات و مدارج میں بھی سب کو مساوی قرار دیدیا جائے۔ اچھے بُرے۔ عالم۔ جاہل۔ شریف و وضیع ایک ہی ترازو میں وزن کر دیے جائیں تو اس مساوات کی مضرت اس امتیاز و تفوق ناجائز سے بدرجہا زیادہ ہے امتیاز و تفوق کی صورت میں ایک طبقہ کی قوت اس کا اقتدار اس درجہ کا ضرور رہیگا کہ وہ امن و سکون قائم رکھ سکے۔ لیکن اس درجہ کے مساوات میں جبکہ تمام افراد یکساں سمجھے جاتے ہیں۔ بالکل امن و امان اُٹھ جائیگا۔ ہر ایک متنفس کو زندگی دوبھر ہو جائیگی۔ ایسی مساوات نہایت حماقت آمیز اور مضحکہ خیز ہے۔

ہم کو اس مساوات پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک گرو اور اُس کا چیلہ ملک در ملک شہر بشہر سیاحت کرتے پھرتے تھے۔ کسی ایک جگہ ٹھیرنے یا اقامت گزین ہونے کو پسند نہیں کرتے تھے جو حال ایسے آزاد اور مجرد لوگوں کی معیشت و طرز زندگی کا ہوتا ہے وہی اُن کا بھی تھا۔ جہاں پہنچے وہاں جو کچھ ملا کھالیا۔ سیر و سیاحت کرتے کرتے اتفاق سے ایک

بستی میں پہنچے۔ تو دیکھا کہ وہاں ہر چیز ایک نرخ پر فروخت ہوتی ہے۔ گھی مٹھائی۔ غلہ میوہ جات۔ دودھ۔
دہی ترکاری سبزی۔ کپڑا۔ لوہا۔ تانبا۔ سونا۔ چاندی وغیرہ۔ ان تمام اشیاء کا یہی حال ہے۔ چیلہ جو سفر کی
صعوبت اور کھانے پینے کی تکالیف برداشت کرتے کرتے تنگ آگیا تھا۔ اُس نے یہ حال دیکھ کر گرو
سے عرض کیا کہ حضور کچھ دنوں یہاں قیام فرمائیں۔ تو سفر کی ماندگی دور ہو جائے ہر قسم کی اچھی خوش
ذائقہ موافق طبع اشیاء کے کھانے سے ناتوانی بھی زائل ہو جائے۔ اور کچھ دن راحت و آرام سے گذر جائیں
گرو نے فرمایا جس جگہ اچھی بُری چیز کی تمیز اُٹھ گئی ہو سب کا ایک ہی حال ہو۔ وہاں ٹھیرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے
مگر چیلہ کے بیجا اصرار پر گرو نے بھی منظور کر لیا۔ پھر کیا تھا۔ دونوں نے خوب کھانا پینا شروع کر دیا۔ تھوڑی
ہی مدت میں لاغری کافور ہو کر فربہی اور توانائی آگئی۔ خوب موٹے تازے ہو گئے۔ انہیں ایام میں وہاں ایک قتل
کا واقعہ پیش آگیا۔ مجرم پکڑا ہوا آیا۔ راجہ صاحب نے اس کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ پھانسی پر لٹکانے
لگے تو دیکھا کہ اس کا حلقہ بڑا ہے۔ مجرم کی گردن پتلی ہے۔ حلقہ میں نہیں پھنس سکتی۔ راجہ صاحب سے عرض کیا گیا۔
ارشاد ہوا کہ جس شخص کی گردن اس حلقہ میں پھنس سکے اس کو بجائے اسکے لٹکا دو۔ مجرم تو دعائیں دیتا ہوا چلدیا
اور ایسے موٹے تازے شخص کی تلاش شروع ہوئی۔

یہ دونوں گرو چیلے ابھی تازہ دم کھا پی کر موٹے ہوئے تھے۔ انکو پکڑ لائے۔ گرو صاحب نے چیلہ سے فرمایا
میں کہتا نہ تھا کہ ایسی جگہ جہاں اچھے بُرے کی تمیز نہ ہو ٹھیرنا مناسب نہیں ہے۔ اب دیکھ لیا کہ کیا نتیجہ ہوا چیلہ نے
عرض کیا کہ غلطی تو ہو گئی لیکن کچھ تدبیر تبلائے۔ فرمایا کہ تدبیر یہ ہے کہ جب پھانسی پر لٹکانیکے لئے لیجائیں
تو میں کہونگا کہ مجھکو پھانسی پر لٹکایا جائے۔ اور تم اصرار کرنا کہ مجھکو۔ راجہ صاحب نے حکم دیا کہ ان دونوں میں
سے ایک کو پھانسی دیدو۔ گرو چیلہ میں جھگڑا شروع ہوا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ میں پھانسی دیا جاؤں۔ یہ عجیب
قسم کی تکرار تھی۔ موت کیلئے جھگڑا نئی بات تھی۔ بالآخر راجہ صاحب کی خدمت میں یہ معاملہ پیش ہوا تو آپنے
دونوں کو بلا کر اس کا سبب دریافت کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمکو معلوم ہے کہ یہ وقت نہایت مبارک ہے۔ مکتی کی
گھڑی ہے۔ جو بھی اس وقت مریگا سیدھا سُرگ میں جائیگا۔ راجہ صاحب نے یہ سُنا تو دل میں سوچا کہ مرنا تو سب
ہی کو ہے۔ راجا یا پرجا کسی کو معلوم نہیں کہ کب مریگا۔ ممکن ہے کہ میرے مرنیکا زمانہ قریب آگیا ہو۔ اور قریب

نہ سہی تب بھی آخر مرنا ہے۔ اگر مرنے کے بعد نجات ہو جائے آرام ملجائے۔ اُس سے بڑھکر اور کیا دولت و نعمت ہے اس مبارک وقت کو کیوں ہاتھ سے دیں۔ دنیا میں تو بہت کچھ عیش و آرام۔ اختیارات و حکومت کا مزہ دیکھ لیا اب آخرت کی فکر چاہیئے۔ یہ سوچ بچار کر کہا کہ ان کو چھوڑ دو اور مجھے اس پھانسی پر لٹکا دو۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور راجہ صاحب نرک یا سرگ میں جہاں جانا مقدر تھا تشریف لیگئے۔

ظاہر بین نظروں میں تو یہ مساوات بھی خوش کن تھی۔ اور بالکل ممکن ہے کہ اُس بستی کے سادہ لوح اس پر فخر بھی کرتے ہوں۔ مگر حقیقت میں حماقت تھی۔ اچھے بُرے کا امتیاز نہ ہونا۔ اعلیٰ وادنیٰ کا ایک درجہ میں رکھدینا بالکل تباہی و بربادی کا سامان ہے۔ اس احمقانہ مساوات کے خیال نے جو استعمالی اشیاء میں جاری تھی زیادہ وسعت پکڑلی تو مجرم و غیر مجرم کی تمیز بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا پھانسی کا حلقہ تنگ نہ کیا جاسکتا تھا۔ یا پاداش جرم کی سزا بجز پھانسی کے اور کسی صورت سے نہ ہو سکتی تھی۔

دولت و نعمت کے نشہ نے اس زمانہ کی متمدن اقوام میں بھی اس قسم کا سودا مساوات پیدا کر دیا ہے۔ بعض بستیاں بنائی گئی ہیں جن میں مساوات کو قائم کیا گیا ہے ہر بات میں تساوی درجہ تجویز کیا گیا ہے جس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکایت مذکورہ بالا بھی بے اصل نہ ہوگی ہاں یہ فرق ضرور ہوگا کہ وہ جہالت و وحشی پن کا کرشمہ تھا اور یہ دولت و ثروت۔ سائنس و حکومت کا چوچلا۔ اگر یہ آخر الذکر صورت بڑے جدوجہد سے کسی چھوٹے پیمانہ میں کامیاب بھی ہو جائے تب بھی اس کا نفاذ عام نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے اس بارہ میں کچھ زیادہ کہنے کی حاجت نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلی و عرفی طور پر ایسی مساوات جن میں تمام طبقات کے کل معاملات یکساں ہو جائیں ہرگز محمود و پسندیدہ نہیں۔

ہاں مساوات حقوق لازمی امر ہے۔ ہر ایک حکمران قوم اسکی مدعی ہے۔ اسکے قوانین مرتب ہیں۔ گو وہ اسکی صحیح میزان قائم نہ کر سکیں۔

عقلی و عرفی طور پر مسئلہ مساوات و تفاضل کی حقیقت اور اسکے احکام معلوم کرنے کے بعد اب دیکھئے کہ شریعت اسلام نے اس بارہ میں کیا تعلیم دی ہے اور پھر اس فرق کو محسوس کیجئے جو قوانین دنیا اور قانون

شریعت میں ہے۔

ہمارے سابق بیان سے معلوم ہوگیا ہی کہ بنی نوع انسان کا اشتراک مساوات کو مقتضی ہے اور اس کا امتیاز خواہ معاشرت و تمدن کے لحاظ سے ہو اور خواہ دیانت و مذہب کے اعتبار سے تفاضل و تمایز کو۔ اہل عقل کے قوانین صرف معاشرت و تمدن کے تفاضل و تمایز کو محیط ہوتے ہیں۔ لیکن شریعت دونوں کو جامع ہے۔

انسانیت کے اشتراک سے جن امور میں مساوات ضروری ہی وہ حفظ جان و مال۔ حفظ ننگ و ناموس۔ حفظ حقوق و معاملات وغیرہ ہیں۔

شریعت اسلام نے گو ہر ایک ذی روح کی جان کا حق انسان پر کسی نہ کسی حد تک قائم کیا ہی مگر انسان کی جان و مال کی حفاظت اس درجہ کی کہ اس سے بڑھکر کیا ہو سکتی ہے۔ تمام افراد انسانی کو بلا امتیاز ملک و ملت رنگ و روپ شریعت اسلام نے اپنے حفظ میں لیا ہی اور ہر ایک موقع و وقت کے مناسب احکام اس بارہ میں نافذ فرما کر متبعین شریعت کو ان کا پابند بنا دیا۔

انسان کی دو ہی حالتیں ہیں مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ مسلم کی دو حالتیں ہیں۔ اسلامی ممالک میں رہتے ہوں اُنکے عہد و امن میں داخل ہوں۔ یا ممالک غیر اسلام میں غیر اسلامی ملک میں رہنے والے دو حال سے خالی نہیں یا مسلمانوں سے برسر مقابلہ ہیں۔ اُن سے کسی قسم کا عہد و پیمان نہیں ہی۔ یا اُن سے عہد و پیمان کئے ہوئے ہیں۔

مسلمان بھائی کے جان و مال کی حفاظت تو اس درجہ فرض ہے کہ قتل مسلم سے بڑھکر کوئی کبیرہ گناہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاءہ جھنم خالدًا فیھا	جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کریگا اسکی جزا جہنم ہی جہاں وہ ہمیشہ رہیگا۔

اسی طرح ان غیر مسلموں کا حال بھی ہی جو مسلمانوں کے ملک میں انکی ذمہ داری و عہد و پیمان کے ساتھ بستے ہیں۔ ان کا قتل بھی گناہ کبیرہ ہے قتل تو قتل ان کی غیبت بھی حرام ہی اور کسی قسم کا ظلم کرنا

جائز نہیں بلکہ کتب فقہ میں ذمی پر ظلم کرنا اشد ہی۔ ردمختار۔ اسلام وکفر کے فرق سے معصیت میں شدت وضعف ہو تو ہو۔ مگر کبیرہ ہونے میں تردد نہیں ہی۔ بلکہ حدیث شریف میں ہی۔

من اخفر مسلما فی ذمتہ فعلیہ لعنۃ اللّٰہ والملٰئکۃ والناس اجمعین لا یقبل اللّٰہ منہ صرفا ولا عدلا	جس نے کسی مسلم کے ذمہ کو جو اُس نے کسی ذمی سے کیا تھا توڑ دیا اور برقرار نہ رکھا اس پر اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کی لوگوں کی لعنت ہی اللہ تعالیٰ اس کا نفل و فرض کچھ قبول نہیں کرتا۔

معاہد کو تکلیف پہنچانے میں۔ خلاف عہد کرنے والا خواہ کوئی ہو۔ یہ وعید شدید اور یہ عتاب ہے جس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہی۔ ایسے شخص پر خدا کی فرشتوں کی لوگوں کی لعنت ہی۔ اسکی کوئی عبادت فرض و نفل قبول نہیں ہوتی۔

رہے ممالک غیر اسلامی کے رہنے والے جن سے معاہدہ ہو چکا ہے انکو خلاف عہد تکلیف پہنچانا قتل و غارت کرنا بھی حرام و معصیت اور گناہ کبیرہ میں داخل ہی۔

اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا	عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے بارہ میں سوال کیا جائیگا۔

کا عام فرمان اس صورت کو بھی شامل ہی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں کفار کے ساتھ ایسے سخت شرائط پر معاہدہ کر لیا کہ جو مسلمان دین اسلام سے پھر کر تمہارے پاس آجائے ہم اُسکو واپس کرنے کا مطالبہ تم سے نہیں کرینگے۔ اور تم میں کا کوئی مسلمان ہو کر ہمارے پاس آئیگا تو ہم اسکو واپس کر دیں گے اور اسی بنا پر جب کفار مکہ نے ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ نے ایک ایسے شخص کو جو کفر سے بھاگ کر اسلام میں داخل ہوا تھا جس کے بگڑ جانے یا مارے جانیکا اندیشہ تھا اس کی ہزار منت و سماجت۔ دل شکنی اور حسرت و یاس پر خیال نہ فرما کر بے تامل کفار کے حوالہ کر دیا۔

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اس حکم کی پابندی اس حد تک کی کہ اس سے بڑھکر نا ممکن ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جبکہ ملک شام میں برسر کار تھے ایک مرتبہ دشمن کے ساتھ چند مدت تک التواء جنگ کا معاہدہ کر لیا تھا۔ مگر بقاعدہ الحرب خدعۃ (لڑائی حیلہ و تدبیر ہے) اس زمانہ میں چپکے چپکے۔ سرحد پر تیاریاں مکمل کرتے رہے کہ مدت التوا ختم ہوتے ہی اچانک حملہ کر دیں۔ اُنکی رائے میں

یہ امر ناجائز یا خلاف عہد نہ تھا تدابیر جنگ اور احتیاط کا اقتضا بھی یہی تھا۔ ان کو کیا اطمینان تھا کہ دشمن بھی اسی فکر میں ہو اور وہ بھی مدۃ ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر بیٹھے ادھر مدت التوا ختم ہوئی اور اُدھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو بالکل سر حد پر پڑے ہوئے تھے حملہ کا حکم دیدیا حملہ شروع ہوا ہی تھا کہ ایک شہسوار گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور چلاتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء لاغدر یہ ایک صحابی تھے رضی اللہ عنہ) حملہ روکدیا گیا۔

تیسرے وہ ممالک غیر اسلامی جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے۔ خواہ وہ سردست برسر جنگ ہوں۔ یا اُن کے ساتھ ہر وقت جنگ کا اندیشہ لگا ہوا ہو۔ اُنکی دو حالتیں ہیں اُن میں کا کوئی ایک یا چند امن لیکر دار الاسلام میں آئیں یا مسلمان امن لیکر اُنکے ممالک میں جائیں دونوں صورتوں میں اسلام نے جان و مال کو تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ جو غیر مسلم امن لیکر دار الاسلام میں داخل ہوا اُسکے ساتھ ہمارا وہی معاملہ ہو جو معاہدہ کیساتھ۔ جب وہ حدود اسلام سے نکل جائے معاہدہ ختم ہو جاتا اور اس وقت اس کا حکم حربی کا ہو جاتا ہے۔ اور جو مسلمان امن لیکر اُن کے ممالک میں جائے اُسکو حرام ہے کہ کسی کی جان کو تکلیف پہنچائے یا اُن کے مال میں ناجائز تصرف کرے۔

یہ حال تو حکم معصیت کا ہی۔ احکام ظاہری کو دیکھئے تو دار الاسلام میں جیسا ایک مسلمان کے قاتل سے قصاص نفس (خون کا بدلہ خون)، یا قصاص اطراف یعنی اعضاء بدن کے عوض اعضاء بدن سے لیا جاتا ہے۔ ویسا ہی ذمی کے قاتل سے اور یہی حال اس مستامن کے قاتل کا ہی۔ جو غیر اسلامی ملک میں رہتا ہے۔ مگر امن لیکر اسلامی ممالک میں آکر آباد ہوا اور ذمی بنگیا۔ فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاوی میں لکھا ہے۔

ویجری القصاص بلینه و بین المسلم	مسلمانوں کے اور اُس مستامن کے درمیان جو ذمی بنگیا ہو قصاص جاری ہوگا

یعنی دونوں میں سے کوئی قاتل ہو اُس سے قصاص لیا جائیگا۔

مستامن کی حالتوں میں فرق ہی بعض حالتوں میں اُسپر معاہد کے احکام عاید ہوتے ہیں اور بالکل اُسی جیسا بن جاتا ہے اور بعض میں نہیں اسلئے ہم نے معاہد ہو جانیکی قید لگائی ہے۔ جن حالتوں میں وہ ذمی جیسا نہیں بنا اُن میں بھی اُسکی جان کی حفاظت ضروری ہی فرق اتنا ہے کہ قاتل سے خواہ مسلمان ہو

یا ذمی قصاص نہ لیا جائیگا، اور اس قسم کے فرق باعتبار حالات فی مقامات استانوں میں تاہم اور مسلمانوں ذمیوں میں بھی نکلتے ہیں اور خاص اس موقع میں تو مسلمان و ذمی کو درصورت قاتل ہونیکے مساوی رکھا گیا ہے۔

مال کی حفاظت بھی یہی حال ہے جس طرح مسلمانوں کے مال کی حفاظت دوسرے مسلمان کے ذمہ فرض ہے کسی ناجائز طور سے ظلم تعدی سے۔ حیلہ دھوکہ سے اس کا لینا جائز ہے نہ ہلاک اور تلف کرنا اگر کسی کے مال کو ناجائز طور سے لیا معصیت و گناہ کبیرہ ہونے کے علاوہ شریعت نے اس کے احکام مدون کر دیے ہیں۔ تلف کر دیا تو حسب اقتضا حالات اس پر ضمان آتا ہے۔

یہی حال اس غیر مسلم کے مال کا ہے جو مسلمانوں کے ملک میں عہد و پیمان کے ساتھ رہتا ہے یا عہد و پیمان کے ساتھ چند روز کیلئے داخل ہوا۔ اس میں یہاں تک خیال کیا ہے کہ جن اموال یا اشیاء کا مسلمانوں کو رکھنا یا استعمال کرنا حرام ہے۔ بلکہ تلف کرنا ضروری ہے اگر کوئی تلف کر دے تو اس پر ضمان نہیں آتا۔ اگر وہ ذمی کی ملک ہوں تو تلف کر دینے سے مسلمان کے ذمہ ضمان واجب ہوتا ہے۔ کوئی مسلمان اگر غیر مسلم کی خمر و خنزیر کو تلف کر دے تو حسب قواعد فقہیہ اس پر ضمان واجب ہوتا ہے۔ درمختار میں ہے۔

ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ	مسلمانوں پر ذمی کے خمر و خنزیر کی ضمان واجب ہوگی۔

حفظ ننگ و ناموس کا حال یہ ہے کہ مسلمان کی کسی قسم کی آبروریزی و اہانت و تذلیل خواہ قول سے ہو یا ضرب یا قتل سے اشارہ سے ہو یا کنایہ سے سامنے ہو یا پیٹھ پیچھے یعنی غیبت۔ قطعاً حرام ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جس طرح مسلمانوں کے ننگ و ناموس کی حفاظت شرعاً واجب ہے اسی طرح ذمیوں کی بھی۔ ان کو زبان سے ہاتھ پیر سے۔ معاملہ سے تکلیف پہنچانا۔ اذیت دینا خلاف انسانیت معاملہ کرنا سب حرام ہیں۔ یہاں تک کہ جس طرح مسلمانوں کو پیٹھ پیچھے برا کہنا حرام ہے اسی طرح ذمی کی غیبت کرنا بھی منع ہے درمختار میں ہے۔

ویجب کف الاذی عنہ وتحرم غیبتہ کما المسلم	واجب ہے ذمی سے اذیت کو روکنا اور اس کی غیبت حرام ہے جیسے کہ مسلمان کی۔

حفظ حقوق و معاملات کی یہ کیفیت ہی کہ شریعت اسلام نے اس بارہ میں میزان عمل کو ایسا صحیح قایم کیا ہے جس میں کسی جانب افراط تفریط نہیں ہی۔ حقوق انسانی باعتبار معاشرت و تمدن ہزار ہا قسم کے ہیں۔ ان حقوق کی مساوات میں۔ عربی عجمی۔ رومی۔ شامی۔ افریقی امریکی۔ علی ہذا شاہ و گدا امیر۔ فقیر۔ سلطان و رعیت۔ ضعیف و قوی میں کچھ امتیاز نہیں رکھا۔ معاملہ بیع یا شرا ہو تو بادشاہ و یا گدا کا حکم ایک ہی۔ یہ نہیں کہ احکام میں کچھ تفاوت ہو۔ حدود و قصاص ہوں۔ مثلاً زنا کی حد۔ چوری کی حد۔ شرب خمر کی حد۔ یا قتل عمد کی باداش قتل خطا کی سزا۔ یا قطع اعضا جسمانی کا قصاص یا دیت اس میں بھی سب افراد کو یکساں و مساوی رکھا گیا ہے۔ شریعت اسلام نے معاملات میں جبر کو ذرہ برابر کسی کے حق میں جائز نہیں رکھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ قبیلۂ قریش کی ایک عورت نے چوری کی اور حد سرقہ یعنی قطع ید کا حکم اس پر قایم ہوا۔ قریش کو یہ امر نہایت شاق تھا۔ ایسی شریف خاندان کی بی بی سے ایسے قبیح فعل کا سرزد ہونا ہی اُن کے لئے کچھ کم موجب عار و ننگ نہ تھا۔ اب قطع ید سے ایسا دھبّہ لگتا تھا جو کبھی نہ مٹتا۔ ادھر ان حضرات کو اپنے فضائل و شرف اسلامی کی رو سے بھی ایسے بدنما داغ کا اپنے پاک و صاف دامن پر لگنا ناگوار تھا۔ اپنی قدامت اسلام اخلاص و جان نثاری کی وجہ سے یہ رائے ہوئی کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا جائے۔ لیکن کون کرے۔ کس کی تاب و مجال تھی۔ آخر قرار پایا کہ حضرت اُسامہ بن زید جن کے ساتھ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص اُنس تھا عرض کریں۔ حضرت اسامہ نے عرض کیا تو آپ نے ناگواری سے ارشاد فرمایا۔

اتشفع فی حد من حدود اللہ	کیا تم خدا کی مقرر کردہ حدود میں سفارش کرتے ہو۔

اور اسی پر بس نہ فرمایا بلکہ کھڑے ہو کر خطبہ فرمایا اور اُس میں ارشاد فرمایا۔

انما ھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف قطعوہ و	(تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ ان میں جب کوئی شریف بڑے رتبہ کا چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور کوئی ضعیف کم رتبہ کا کرتا تو اسپر حد قطع ید جاری کرتے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر

ایم اللہ لوان فاطمۃ بنت محمدؐ سرقت لقطعت یدھا۔

فاطمہ جو محمدؐ کی بیٹی ہے (حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتی (معاذ اللہ) تو میں اُس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے پر حد جاری کر ہی دیا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت راشدہ پر متمکن ہونیکے بعد ایک خطبہ میں بعد حمد و صلوٰۃ فرمایا۔

انی ولیت علیکم ولست بخیرکم ان رائیتمونی علی حق فاعینونی وان رائیتمونی علی باطل فسددونی اطیعو ما اطعت اللہ فیکم فاذا عصیت فلا طاعۃ لی علیکم الا ان اقواکم عندی الضعیف حتی اخذ الحق لہ واضعفکم عند القوی حتی اخذ الحق منہ۔

(میں تمہارا والی و حاکم ہوا ہوں۔ حالانکہ تم میں کا افضل و بہتر نہیں ہوں اگر تم مجھکو حق کی تائید کرتے دیکھو تو میری اعانت کرو باطل پر دیکھو تو میری اصلاح کرو۔ جبتک میں تمہارے معاملات میں خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری تابعداری کرتے رہو اور جب میں نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر ضروری نہیں ہے خوب سمجھ لو کہ جو تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے میرے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہے۔ جبتک میں اُس کا حق نہ دلواؤنگا درگذر نہ کروں گا اور جو سب سے زیادہ قوی ہے وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ ضعیف ہے اُسکے ذمہ جو دوسرے کے حقوق ہیں اُن کے وصول کے بغیر نہ چھوڑونگا۔

صدیق اکبر باوصف نرمی و رحمت کے جو اُن کی طبیعت میں مرکوز تھی۔ تساوی معاملات میں اتنے سخت ہیں۔ خلافت سنبھالتے ہی سب کو متنبہ کر دیا اور فرمایا کہ میں تم میں افضل نہیں ہوں اور میری اطاعت بھی تم پر جبھی تک ہے جب تک میں خدا تعالیٰ کی اطاعت کروں لیکن حقوق و معاملات میں کسی بڑے چھوٹے قوی ضعیف کی رعایت کرنے والا نہیں ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جبلہ ابن الایہم کا واقعہ گذرا ہے۔ جبلہ غسان کا بادشاہ مسلمان ہو کر آیا تھا۔ اسکی مدارات بھی زیادہ کی جاتی تھی۔ مدینہ منورہ میں داخلہ کیوقت اس کا استقبال بھی دھوم دھام تزک و شان سے ہوا تھا۔ مگر طواف بیت اللہ کرتے ہوئے قبیلہ فزارہ کے ایک کم حیثیت شخص کے اُس نے تھپڑ مار دیا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ اُس نے جبلہ کے ازار پر پیر رکھدیا تھا تو حضرت عمرؓ

نے اُسکے بادشاہ ہونے اور اپنے معاملات احترام واکرام کا جو اُسکے ساتھ کیے تھے کچھ خیال نہ کرکے قصاص کا حکم دیدیا کہ فزاری بھی جبلہ کے تھپڑ مار لے۔

پھر مساوات محض اسی حد تک نہیں کہ ضعیف کو قوی کے ساتھ حقوق میں برابر کردیا نہیں بلکہ یہانتک رعایت کی کہ مجلس حکومت و قضا میں بھی کوئی امتیاز سلطان و رعیت امیر و غریب۔ رئیس و مرؤس میں نہیں رکھا۔ شرح شرعۃ الاسلام میں ہے۔

ویسوی بین اصناف الرعیة فی العدل ولا یقدم احدا نقد بما لا فی المجلوس ولا فی الکلام ولا فی غیرھما لشرفہ ومالہ ولیعدل القاضی بین الخصمین فی لحظۃ واشارۃ ومقعدۃ

رعیت کے تمام انواع واصناف میں مساوات کو ملحوظ رکھا جائے کسی کو کسی پر اسکے مرتبہ یا حال کی وجہ سے تقدیم و ترجیح نہ دے۔ قاضی کو چاہیئے کہ مدعی مدعا علیہ میں کسی بات کا فرق نہ کرے نہ اُن کی مجلس میں۔ نہ اُنکی طرف دیکھنے میں نہ گفتگو میں۔

تساوی حقوق و معاملات کا دائرہ اہل اسلام ہی تک محدود نہیں بلکہ غیر مسلم۔ ذمی۔ و مستامن کو بھی اسی طرح شامل ہے اور ہر نوع و محل کے مناسب احکام تبلا دیے گئے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک معاملہ پیش ہوا جس میں ایک فریق مسلمان تھا اور ایک یہودی۔ آپ کو ثابت ہو گیا کہ حق یہودی کا ہے اُسکی ڈگری فرما دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے۔ جن کے تمام ممالک اسلامیہ پر حکومت و اختیارات عام تھے۔ ایک یہودی پر آپنے اپنے قاضی شریح کے یہاں دعوی دائر کیا۔ مدعا علیہ کے برابر کھڑے ہوئے دعوے کے ثبوت کیلئے دو گواہ پیش کیے جن میں ایک گواہ بڑے صاحبزادے حضرت حسن تھے قاضی صاحب نے یہ کہکر کہ ثبوت ناکافی ہے بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے۔ دعویٰ خارج کر دیا۔ اُ عدل و انصاف تسویہ و مساوات کو بیان کرنیکے بعد اب ہم شرعی طور پر امتیاز اور اسکے احکام بیان کر دینا چاہتے ہیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ امتیاز دو قسم کے ہیں۔ ایک امتیاز تمدن و معاشرت۔ دوسرا امتیاز مذہب و دیانت۔ شریعت اسلام نے ہر ایک امتیاز کو اسکے درجہ پر رکھ کر جدا جدا احکام بیان فرمائے ہیں

مثلاً شعبہ نسب کے اندر اُسی تفاضل شرافت کی وجہ سے کفاۃ کی قید لگادی ہی کہ زوجین ہم کفو ہوں ایک کا نسب عالی ہے دوسرے کا کمتر ایک کا پیشہ اچھا سمجھا جاتا ہی۔ دوسرے کا برُا۔ تو ہم کفو برابر کی جوڑ نہیں ہی اور اس شرط کے لگانے میں اشتراک و انفراد دونوں کا خیال رکھا ہے۔ لڑکی کے اولیا کو چاہیئے کہ کفو میں نکاح کریں اگر غیر کفو میں نکاح ہو جائے تو فسخ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ شرط اس درجہ کی نہیں کہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ ولی راضی ہو جائے تو قائم رہ سکتا ہے۔

علیٰ ہذا دو شخص بالکل ایک درجہ کے ہوں کسی کو کسی پر نسباً حسباً فوقیت نہو مگر حق جوار سے ایک کو دوسرے پر فوقیت ہو جاتی ہے۔ جار کا وہ حق ہی جو غیر جار کا نہیں ہی۔ اخلاقی طور پر اسکی اتنی رعایت کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

ما زال جبرئیل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ	جبرئیل علیہ السلام نے پڑوسی کے بارے میں اسقدر وصیت کی جس سے مجھکو گمان ہو گیا کہ اسکو وارث ہی نہ بنا دیا جائے۔

اور معاملات میں بھی اسکو تفوق دیا گیا ہے۔ جائداد غیر منقولہ میں جار کا حق مقدم ہے اور شریک کا اس سے بھی زیادہ لیکن اس حق کے اندر بھی اشتراک کی حیثیت کا لحاظ رکھا گیا ہی حق شفعہ کیلئے ایسے قیود لگا دیے گئے کہ اگر شفیع ان شرائط و قیود کو کما حقہ ادا کر دے تب تو حق شفعہ ثابت ورنہ ساقط۔

والدین کی امتیاز کی اور بھی رعایت کیگئی۔ باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جاتا۔ علی ہذا کوئی شخص اگر کسی کے غلام کو قتل کر دے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اُس سے قصاص لیا جاتا ہی۔ مگر اپنے غلام کو اگرچہ وہ مسلمان ہی ہو قتل کر دے تو قصاص نہیں لیا جاتا گو ابراہیم نخعی وسفیان ثوری اس صورت میں بھی قصاص دلواتے ہیں۔

سلطان و رعیت کے حقوق کو باوجود عدل و انصاف کی میزان کے صحیح پیمانہ پر قائم کر دیئے اور باوجود رعیت پر ظلم و اہانت کسی قسم کی تعدی وجور کی سخت ممانعت وحرمت کے سلطان کے امتیاز کو خصوصیت دی گئی ہی اسکو ظل اللہ کہا گیا۔ اُس کے احکام کی اطاعت ضروری کیگئی اُسکے خلاف فتنہ پردازی کو اُس حد تک روکا گیا جس سے دین میں خلل نہ پڑے۔

زیاد بن کسیب عدوی سے روایت ہی کہ میں ابو بکر صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ ابن عامر منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے لباس اُن کا باریک کپڑے کا تھا۔ ابو بلال نے کہا دیکھو ہمارے امیر کو کہ فساق کا سا لباس پہنتا ہے۔ حضرت ابو بکرۃ نے سُنا تو فرمایا چپ رہو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے۔

من اهان سلطان الله فی الارض اهانه الله | (جو شخص سلطان کی اہانت کرتا ہی خدا اسکو ذلیل کرتا ہی)

اہانت تو ہر مسلمان کی کیا ہر ایک شخص کی منع ہے۔ مگر السلطان ظل اللہ کے الفاظ سے سلطان کا خاص امتیاز و احترام ثابت ہوتا ہے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ ابو بلال کا کہنا امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل تھا۔ اور سلطان کو امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنا افضل جہاد میں داخل ہے۔ پھر ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ کا روکنا کیونکر جائز تھا۔ اس لئے کہ لباس امیر گو باریک تھا۔ مگر ناجائز نہ تھا اور پھر یہ صورت امر بالمعروف کی نہ تھی۔ اگر کہنا تھا تو خود امیر سے کہنا تھا بلکہ ایک صورت غیبت یا توہین کی تھی جسکو حضرت ابو بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روکا۔

مرد و عورت میں اشتراک انسانیت۔ کفاءۃ۔ نسب و شرافت۔ جمال و کمال کے باوصف اس صنفی امتیاز کی وجہ سے احکام میں بھی امتیاز قائم کیا گیا۔ اول تو ایک اجمالی طریقہ پر مرد و عورت کی امتیاز کو اس طرح مطلع کیا گیا۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علی بعض و بما انفقوا من اموالهم الخ | مرد برابر اور مؤدب ہیں عورتوں کی اُس فضیلت کیوجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بعض کو بعض پر دی ہی اور اسلئے کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔

اور پھر اشتراک و انفراد کی تفصیلی احکام کی تعلیم دی گئی۔ طرفین کے حقوق کی تعلیم دی گئی۔ عورت کے حقوق مرد پر قائم کئے گئے اور مرد کے عورت پر مگر وہ نسبت قوامیت ملحوظ رہی۔

عقد نکاح تک تراضی طرفین کا لحاظ تو ضروری قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ ایک عقد ہے۔ مگر جب مرد کی قوامیت محقق ہو گئی۔ تو طلاق کا اختیار صرف مرد ہی کو دیا گیا۔ عورت مرد سے طلاق طلب

کر سکتی ہے۔ مگر خود جُدا نہیں ہو سکتی مرد کے ذمہ عورت کا نفقہ واجب کیا گیا۔ اور عورت کے ذمے تربیت اولاد۔ اطاعت خاوند وغیرہ اور باوجود ان انفرادی احکام کے مرد کو تاکید کے ساتھ عورت کی دلجوئی۔ راحت رسانی حسن معاشرت کی تاکید کیگئی۔ اس کو زبان سے ہاتھ سے معاملہ سے تکلیف پہونچانے کی سخت ممانعت کردی گئی۔

اختلاط نسب سے محفوظ رہنے کی وجہ سے عورت تو ایک وقت دو مرد سے نکاح نہیں کر سکتی مگر مرد کو تعدد نکاح میں یہ اندیشہ نہونیکی وجہ سے ملکہ بسا اوقات ضرورۃ بقا نسل یا تکثیر اولاد یا دوسرے اسباب کے لحاظ سے اسکی اجازت تو دیگئی۔ مگر عدل و مساوات کو اس پر فرض کردیا گیا مرد کی خدمات اور اُسکے ذمہ دار ہونے کو لحاظ کر کے میراث میں بھی فرق کردیا گیا۔ علی ہذا عورتوں کو بلحاظ نزاکت اعضاء و مصروفیت خدمات خاصہ انجام دہی فرائض شاقہ سے مستثنی کردیا گیا۔

جب دو شخص آپس میں ملتے ہیں تو سلام کرنا مسنون ہے۔ اور یہ حکم عام ہے۔ مگر اس میں بھی فرق مراتب و درجات امتیاز مقام و حالات کو ملحوظ رکھا گیا۔ صغیر و کبیر کی ملاقات ہو تو صغیر کو ابتدا بالسلام کرنی چاہیئے۔ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے دوسرا کا گذر اس طرف ہوا تو آنیوالے کو ابتدار کا حکم ہے۔ علی ہذا ایک سوار ہے۔ ایک پیادہ تو سوار کو چاہیئے کہ سلام کرے۔ بغرض ہر جگہ اور ہر نوع پر جہاں جسم قسم کا امتیاز موجود ہے اسی قسم کا احکام میں بھی انفراد ہے۔

اسی طرح مذہب و دیانت کی تفریق سے باوجود ہر قسم کے اشتراکات کے اور باوجود اُن مساوات حقوق انسان کے جس کو ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں احکام میں تفریق کردی اور ایسا کرنا عقل و فطرۃ کی رو سے ضروری و لازمی تھا۔

تفصیل اسکی یہ ہیکہ نوع انسانی بوجہ تفرقہ مذہب و دیانت دو حصوں پر منقسم ہو سکتی ہے ایک مومن مسلم دوسرے غیر مومن و غیر مسلم۔ اوّل قسم کے اندر باعتبار دیانت بہت سے درجات و مراتب ہیں علی ہذا دوسری قسم میں بھی درجات و مراتب ہیں۔ شریعت اسلام نے اوّل تو مسلم و غیر مسلم کے احکام میں امتیاز قائم کیا۔ پھر ان تفاوت مراتب و درجات کی وجہ سے ہر ایک نوع کے اصناف میں۔ امتیاز دہ

تفاوت بھی دو طرح کا ہے احکام آخرت میں یا احکام دنیا میں۔

جو شخص خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ اُس کے انبیاء و رسل کو نہیں مانتا احکام منزلہ کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ درحقیقت اُس نے انسانی خلقت کی غرض و غایت ہی کو مٹانا چاہا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کیلئے کارآمد بنایا اور انسان کو اُسکے لئے پیدا کیا کہ اُسکی اطاعت و شکرگذاری کرے جب نوع انسانی میں دو گروہ ہو گئے تو لامحالہ ہر ایک گروہ کی انفرادی احکام جُداگانہ ہونگے دونوں گروہ کا تمام احکام میں مساوی کر دینا ظلم عظیم سمجھا جائیگا۔ سرکش و نافرمان۔ متمرد و متعنت کو مطیع و منقاد تابع فرمان کے برابر کر دینا عقل و فطرت۔ قوانین سلطنت۔ نظام عالم کے بالکل خلاف ہے۔ خداوند عالم فرماتے ہیں۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین کیا ہم مسلم کو مجرم کی برابر کر دیں۔

مسلم کا غیر مسلم سے امتیاز کن معاملات اور کن امور میں ہے ہم اسکی چند مثالیں بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کسی مسلم عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح درست نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اور مسلمہ جب غیر مسلم کے تابع ہو گئی تو اس کے اسلام و ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے مسلم کو غیر مسلمہ سے اس صورت میں نکاح جائز ہے کہ غیر مسلمہ اہل کتاب میں سے ہو مشرک نہو۔

یا مثلاً غیر مسلم جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہتا ہے اُس سے اور مسلم دونوں سے محصول لیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ مسلم کے ہر قول و فعل میں عبادت کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جو محصول اُس سے لیا جاتا ہے اُس کا نام زکوٰۃ یا عشر رکھا گیا۔ اگر اموال تجارت سے لیا گیا تو زکوٰۃ ہے۔ محاصل زمین سے ہے تو عشر ہے اور ان کا مصرف بھی جُداگانہ مقرر کر دیا گیا۔

غیر مسلم سے جو محصول لیا جاتا ہے اس کا نام جزیہ و خراج رکھا گیا۔ اُن کے حفظ جان و مال کا معاوضہ یہ ہے کہ سال بھر میں فی کس بہت تھوڑا محصول دیکر اپنی جان و مال عزت و آبرو کو نہ صرف محفوظ کر لیں بلکہ معاملات معاشرت میں مسلم کی برابر ہو کر رہیں۔

محاصل اراضی سے جو کچھ لیا جاتا ہی اُس کا نام خراج ہے اور ان دونوں جزیہ و خراج کا مصرف جداگانہ رکھا گیا

زکوٰۃ وعشر میں تو چونکہ ایک قسم کی عبادت کو دخل ہی اس لئے اسکے مستحق اور ہیں اور جزیہ و خراج میں عبادت کا پہلو نہیں لیا گیا۔ وہ غیر مسلموں سے اس وجہ سے لیا جاتا ہے کہ اُن کو مذہب میں آزادی دیگر اُنکے طریق عبادات میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی گئی اسلئے اُنکے مستحق دوسرے ہیں۔ معہذا بعض صورتوں میں مسلم سے بھی خراج لیا جاتا ہے۔ یعنی جو زمین ایک مرتبہ خراجی ہو چکی وہ مسلم کے قبضہ میں جانیکے بعد بھی خراجی ہی رہتی ہے۔

اسی طرح کے اور بھی جزوی فرق ہیں۔ جن سے مسلم و غیر مسلم اسلام و غیر اسلام کا امتیاز قائم رہے اور اس امتیاز کو خود غیر مسلم کے انواع میں بھی ملحوظ رکھا گیا۔ غیر مسلم اہل کتاب ہیں یا مشرک۔ پھر ان میں منافق ہیں یا غیر منافق یعنی جو ظاہر مسلمان ہوں اور دل میں اسلام نہو۔ بلکہ بغض اسلام ہو منافق کہلاتے ہیں۔ پھر غیر مسلم اصلی ہوں یا اسلام سے پھرے ہوئے ہوں ان سب کے انفرادی احکام بوجہ ان امتیازات خاصہ کے جداگانہ ہیں۔ ہم تفصیل وار ہر ایک کو اس جگہ بیان کرنے سے بالکل معذور ہیں۔

یہ حال تو طبقہ غیر مسلم کا ہے جن میں اور مسلم میں حقیقتاً مذہب و دیانت کا تفرقہ ہے۔ رہا طبقہ مسلم جس میں تمام اشتراکات کیساتھ اشتراک مذہب و دیانت بھی موجود ہے اس میں بھی دیانت کے درجات متفاوت ہونیکی وجہ سے امتیازات خاصہ ہیں اور ان امتیازات کے احکام جُداگانہ۔ اس اشتراک نے جو طبقہ مسلم کے تمام افراد میں پایا جاتا ہے۔ مساوات کو بھی اس درجہ پر پہنچا دیا جو دوسرے طبقات میں نہیں تھا لیکن ان امتیازات کی وجہ سے احکام میں انفراد بھی ہے۔

مساوات کا حال تو یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو باہم بھائی قرار دیا گیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

المسلم اخو المسلم لا یظلمه و لا یُسلمه	ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کر سکتا ہی اور نہ کسی ظالم کے سپرد کر سکتا ہی۔
المسلمون تتکافی دماءهم یسعی بذمتهم ادناهم	مسلمان کے خون باہم مساوی ہیں اُنکے عہد و پیمان کیلئے ان میں کا ادنیٰ بھی سعی کر سکتا ہی۔

عام حقوق اسلامی میں مرد عورت آقا غلام کو یکساں رکھا گیا۔ ایک مسلمان مرد یا عورت۔ آزاد۔ یا غلام تمام مسلمانوں کی طرف سے عہد و پیمان کر سکتا ہے کسی کو امن دیسکتا ہے اور تمام مسلمانوں پر اسکی پابندی لازم و واجب ہے۔ امام و سلطان کو یہ بیشک اختیار رہے کہ اگر ایسا عہد کرنا یا امن دینا مصلحت مسلمین کے خلاف ہو تو اس کو رد کر دے اُن لوگوں کو اطلاع کر دے کہ ہم اس عہد و پیمان پر قائم نہیں ہیں۔ مگر یہ اختیار نہیں کہ باوجود اس عہد و پیمان کے بلا اطلاع خلاف عہد کچھ کر بیٹھے۔ جبتک عہد باقی ہے اُسکی پابندی واجب ہے۔ عہد و پیمان کو توڑے یا اسکی مدۃ شرائط میں کچھ ترمیم کرے تو بعد اطلاع کرے۔

ایک جگہ تو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فاتموا الیہم عہدھم الی مدتہم	اُن کے عہد کو اُسی مدۃ تک جو اُن سے ٹہری ہے پورا کرو

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ علیہم علی سواء	اور اگر تم کو کسی قوم سے خیانۃ و بدعہدی کا اندیشہ ہے تو عہد کو اُن کی طرف پھینکدو برابر۔

ان دونوں ارشادات سے نتیجہ نکال لیا جاوے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتوں نے بعض سخت دشمنان اسلام کو جنہوں نے حضور انور کی ذات اقدس کو گزند پہنچانے اسلام کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنے میں کسر نہ رکھی تھی۔ امن دیدیا۔ اور آپنے اسکو معتبر رکھا۔

اور باوجود اس مساوات کے تفاوت درجات دیانت کی وجہ سے امتیاز و انفراد کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری رہا جیسا کہ اوپر سے چلا آتا ہے۔ تفاوت درجات و دیانت کے بہت سے وجوہ ہیں ایک مسلمان عالم ہو دوسرا غیر عالم دونوں کا درجہ مساوی نہیں عالم کا جو احترام و اکرام ہو سکتا ہے وہ غیر عالم کا نہیں۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون	کہدو تم کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو ذی علم ہیں اور وہ جو ذی علم نہیں

ایک مسلمان صالح ہے ایک فاسق۔ صالح مسلمان کی شہادت اسلامی عدالتوں میں معتبر قابل قبول فاسق کی شہادت مردود۔

یاایھا الذین اٰمنوان جاءکم فاسق بنباءٍ فتبینوا ان تصیبوقوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔	مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لیکر آئے تو خوب دیکھ بھال کرو مبادا اسکی خبر پر اعتماد کرکے ناواقفی سے کسی قوم کو صدمہ پہنچا دو اور پھر اپنے فعل پر نادم ہو۔

ایک مسلمان مظنہ تہمت ہے دوسرا نہیں۔ دونوں کا حکم جُدا گانہ ہے۔ باوجود دونوں کے صالح ہونیکے موقع تہمت میں صالح کی شہادت معتبر نہیں رکھی جاتی۔ باپ کی شہادت بیٹے کے حق میں۔ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں ایک مسلمان متبع سنت دوسرا مبتدع دونوں کا حکم جداگانہ متبع سنت کی توقیر و احترام ضروری۔ مبتدع کی تکریم و احترام حرام حدیث شریف میں آیا ہے۔

من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام	جس نے کسی بدعتی کی توقیر کی اُس نے اسلام کے گرا دینے میں اعانت کی۔

ایک صاحب ورع و تقوی ہے۔ جو ذرا ذرا سے شبہات اور مشتبہات سے پرہیز کرتا ہے۔ دوسرا ایسا نہیں ان دونوں کا حکم جُدا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ معاملہ علیحدہ ہے

پھر علم و صلاحیت کے بھی درجات ہیں اور ہر ایک درجہ اپنا امتیاز لئے ہوئے ہے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین شرف صحبت میں برابر سب کے سب قابل اقتداء۔

اصحابی کالنجوم بایھما اقتدیتم اھتدیتم۔	میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جس کا اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے۔

مگر باینہمہ فرق مراتب کی وجہ سے ان کے اندر امتیازات کا لحاظ رہا ہے جناب باری عزاسمہ ارشاد فرماتے ہیں۔

لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئٰک اعظم درجۃ من	جن لوگوں نے تم میں سے پہلے راہ خدا میں مال خرچ کیا ہے اور قتال کیا ہے برابر نہیں ہیں یہ لوگ بڑے درجے والے ہیں

الذین انفقوا من بعد وقاتلوا و کلا وعد اللہ الحسنیٰ	اُن سے جنہوں نے بعد فتح کے مال خرچ کیا اور قتال کیا اور اللہ نے ثواب کا وعدہ سب سے کیا ہے۔

یہی وہ فرق تھا جس کی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو جبکہ ان میں اور حضرت عبدالرحمن ابن عوف میں کچھ تیز کلامی ہونے لگی یہ فرما کر

مھلا یا خالد دع عنك اصحابی	خالد ٹھہرو۔ میرے اصحاب کو چھوڑ دو۔

روکدیا۔ خالد بھی آپ کے اصحاب میں تھے مگر اس درجہ میں نہ تھے جس میں عبدالرحمن بن عوف تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دفتر عطا فرمایا۔ تو اسی فرق مراتب و درجات کو ملحوظ رکھ کر ہر ایک کیلئے اسکے درجے کے اندازہ سے سالانہ عطا مقرر فرمائی۔

علماء میں ایک وہ ہیں۔ جو راوی حدیث یا حافظ و جامع علم ہیں۔ مگر فقیہ نہیں اور پھر فقاہت کے درجات میں بھی تفاوت ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے۔

رب حامل فقه غیر فقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه	بہت سے وہ لوگ ہیں جو حامل و راوی فقہ ہیں مگر خود فقیہ نہیں اور بہت ایسے ہیں جو کو خود بھی فقیہ ہیں مگر اپنے سے زیادہ فقیہ کی طرف فقہ کو پہنچاتے ہیں۔

فقیہ کو غیر فقیہ پر ترجیح دیگئی۔

من یرد اللہ خیرا یفقھه فی الدین	جس کیلئے اللہ تعالیٰ بھلائی چاہتا ہے اسکو دین کی فقہ عطا فرماتا ہے

ایک عالم درجہ اجتہاد کو پہنچا ہوا ہے دوسرا نہیں۔

ایک ایسا شخص جو کو مسائل ضروریہ سے واقف ہی مگر درجہ فقاہت اجتہاد نہیں رکھتا کسی واقعہ میں رائے دینے اور کسی کو مسئلہ تبلادینے سے قابل مواخذہ ہوجاتا ہے۔

بلکہ ایسا شخص صحیح مسئلہ بھی تبلاوے جب بھی قابل مدح نہیں اور فقیہ و مجتہد اگر غلطی بھی کر جائے تو نہ صرف قابل درگذر ہے بلکہ اس کو اجر و ثواب ملتا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہی کہ ہم چند آدمی ایک مرتبہ سفر میں تھے ایک شخص کے سر میں پتھر لگ جانے کی وجہ سے زخم ہوگیا

شب میں احتلام ہوگیا اُس نے دریافت کیا کہ مجھے تیمم کر لینے کی اجازت ہی یا نہیں۔ اُن لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک تو جائز نہیں کیونکہ تم غسل کر سکتے ہو۔ اُس نے غسل کر لیا اور یہی سبب اُسکی وفات کا ہوگیا۔ جب ہم سفر سے واپس ہوئے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا گیا آپ نے ارشاد فرمایا۔

قتلوہ قاتلھم اللہ الا سألوا اذ لم یعلموا انما شفاء العی السوال | ان مفتیوں نے اسکو قتل کیا جب ان کو معلوم نہ تھا تو کیوں دریافت نہ کر لیا۔ ناواقفی اور عدم علم کا علاج یہی کہ دریافت کر لیا جائے۔

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب قاضی یمن بناکر بھیجا گیا۔ تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم فیصلے کیونکر اور کس اصول پر کروگے۔ عرض کیا کتاب اللہ کے موافق کرونگا۔ اور جس معاملہ میں نص کتاب اللہ نہوگی تو سنت کیموافق کرونگا۔ اور جس کے متعلق سنت میں تصریح نہوگی تو اپنی رائے و اجتہاد سے فیصلہ کرونگا۔ آپ نے سن کر ارشاد فرمایا۔

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ | خدا کا شکر ہی جس نے رسول اللہ کے رسول و نائب کو یہ توفیق دی۔

اس واقعہ میں تو یہ فرمایا کہ ان لوگوں نے اسکو قتل کیا خدا ان کو قتل کرے۔ حالانکہ وہ بھی صحابی تھے اور اس واقعہ میں حکم صریح سنت و کتاب کا معلوم نہونے کی وجہ سے اپنی رائے سے فتویٰ دینے کو کہا تھا تو اس پر شکر ادا فرمایا۔ یہ محض اس فرق کیوجہ سے تھا کہ ان مفتیوں میں ابھی مادہ فقاہت و شرائط اجتہاد پورے موجود نہ تھے۔ اور حضرت معاذؓ میں یہ امور جمع تھے۔ فقاہت فی الدین و شرائط اجتہاد اسی بناپر

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران و اذا حکم فاخطاء فلہ اجر واحد	جب حاکم حکم کرے اور اپنی پوری کوشش صرف کرلے اور صحیح حکم دیدے اُس کیلئے دوہرا اجر ہی اور خطا کرے تب بھی ایک اجر ہے۔

درصورت صواب حاکم کو دو اجر ملتے ہیں۔ایک اجتہاد کا دوسرا اصابت حق کا۔اور درصورت خطا فقط اجتہاد کا لیکن کب جبکہ اس میں شرائط اجتہاد موجود ہوں۔اور اگر شرائط موجود نہوں کسی اجر کا مستحق نہیں۔

طیبی نے شرح مشکوٰۃ میں بذیل شرح حدیث لکھا ہے۔

وھذا فیمن کان جامعاً لآلۃ الاجتھاد عارفاً بالاصول۔عالماً وجوہ القیاس فاما من لم یکن محلاً للاجتھاد فھو متکلف ولا یعذر بالخطاء بل یخاف علیہ الوزر	یہ ارشاد اُن لوگوں کے بارہ میں ہی جو شرائط اجتہاد کے جامع اور اُصول سے واقف قیاس کے عارف ہوں جو محل اجتہاد نہیں تو وہ تکلف حکم دینے والا ہی۔وہ خطا کی حالت میں معذور نہ سمجھا جائیگا۔بلکہ اس پر مواخذہ اور گناہ کا اندیشہ ہے۔

اس حدیث کے اشارہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حاکم و والی خواہ اس کی ولایت عامہ ہو یا خاص ہو ایسا ہونا چاہیے جس میں فقاہت و شرائط اجتہاد موجود ہوں۔گو یہ شرط لازمی نہیں۔

امتیاز دیانت اور اس کی انفرادی احکام کی صدہا ہزارہا مثالیں ہیں جن کو ہم بیان کرسکتے ہیں مگر اصلی مقصد کی توضیح کیلئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

جب اشتراک و انفراد کی توضیح و تفصیل معلوم ہوچکی تو اب بطور نتیجہ معروضات سابق ہم عرض کرتے ہیں کہ جو لوگ بنی آدم۔یا اُن کے کسی ایک نوع کے معاملہ میں مساوات کلی کے مدعی ہیں وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔اوّل تو عقلاً ایسا نہیں ہوسکتا۔نظام عالم اس صورت میں بالکل درہم برہم ہوجائے دوسرے خود ان مدعیوں کا عمل اُن کے قول اور دعوے کی تردید کرتا ہے۔کون نہیں جانتا کہ اس زمانہ میں جبکہ تسویہ حقوق بنی آدم کے لمبے چوڑے دعوے کئے جاتے ہیں امتیازی احکام کس قدر نمایاں ہیں۔اُن کے طرز عمل میں قوانین نظم ونسق میں۔اصول مذہب میں اس امتیاز کو برابر ملحوظ رکھا گیا ہے۔بلکہ اس میں ایک

حد تک افراط کی نوبت آگئی ہے۔ قومیت و وطنیت کے وہ امتیازات بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں جو کسی قانون عقلی۔ اور اقتضاء مذہب میں داخل نہیں۔ مگر اپنی شخصیت کو قائم رکھنے کیلئے ان کا التزام ضروری سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مذہب ایک ملت ایک قوم کے افراد ملکی لباس ملکی رسم و رواج کی پابندی کو لازم سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر سوسائٹی کے امتیازات ہیں اور جنہوں نے امتیازات کو اس حد تک پہنچا دیا کہ اشتراک و مساوات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دینا چاہا اور اپنی تشخصات کے مقابلہ میں دوسرونکی ہستی کو نابید کرنا چاہا وہ تو تفریط کی اس حد میں پہنچ گئے جس کو سخت مہلک اور نظام عالم کو برباد کرنیوالا لازمی امر ہے ایسی قوموں کے حالات سے تاریخیں بھری ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے ابنائے جنس کو تفریحی مشاغل کیلئے طعمہ سباع و بہائم بنانیکا معمول رکھا ہے اس گروہ نے صنف نساء کو اس درجہ گرایا کہ گویا وہ نسل آدم نہیں ہیں حقوق میراث وغیرہ سے ان کو محروم رکھا گیا۔ انکے تصرفات جائز نہ رکھے گئے شریعت اسلام نے دونوں پہلوؤں کو اعتدال سے سنبھالا۔ ہر ایک کی حد مقرر کر دی۔ ہر ایک کے احکام بتا دئیے اشتراک کے پہلو کا اس حد تک لحاظ کیا کہ کسی موقع پر اسکو نظر انداز نہیں کیا۔ اور امتیاز کو بقاء نظام عالم و ترتیب احکام آخرۃ کیلئے لازم و واجب قرار دیا۔ اور اسی بناء پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

لن یزال الناس بخیر ما تباینوا فاذا تساووا ھلکوا	آدمی ہمیشہ خیر کیساتھ رہینگے جبتک انمیں فرق مراتب قائم رہیگا اور جب سب برابر ہو جائیں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔

یہ ارشاد بالکل اصول فطرۃ کیموافق ہے۔ اور گو لفظ تباین میں دونوں قسم کے امتیاز تمدنی و دیانتی داخل ہو سکتے ہیں مگر ظاہر اس سے امتیاز تمدن مراد معلوم ہوتا ہے امتیاز دیانت کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

لا فضل لاحد علی احد الا بالتقوی	کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر جو فضیلت ہے وہ بربناء تقوی ہے

ظاہر ہے کہ نفی فضیلت ان حقوق و معاملات کی نہیں جنکی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں بلکہ دیانت کے اعتبار سے ہے۔ اور اس اعتبار میں تمام نوع بنی آدم مساوی ہیں جو فرق ہوتا ہے تقوی کی وجہ سے ہوتا ہے اور تقوی کی اصل بنیاد ایمان ہے اور اسکے بعد شعبہائے ایمان سے تفوق مراتب ہوتا چلا جاتا ہے۔

دلائل عقلیہ و شرعیہ۔ عرف عام و رسوم و عادات۔ تجربہ و مشاہدات سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ بقائے نظام عالم و ارتباط معاملات کے لئے اشتراک و انفراد دونوں کا وجود ضروری ہے لیکن ابھی ایک مرحلہ اور طے کرنا باقی ہے کہ معاملات معاشرت میں کسی ایک شعبہ کے اندر یا کسی خاص موقع و مقام پر مساوات کلی ممکن ہے یا نہیں۔

دلائل عقلیہ و شرعیہ۔ عرف عام و رسوم و عادات۔ تجربہ و مشاہدات سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ بقائے نظام عالم و ارتباط معاملات کیلئے اشتراک و انفراد دونوں کا وجود ضروری ہے۔ لیکن ابھی ایک مرحلہ اور طے کرنا باقی ہے کہ معاملات معاشرت میں کسی ایک شعبہ کے اندر یا کسی خاص موقع و مقام پر مساوات کلی ممکن ہے یا نہیں۔

اور جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ بعض ممالک امریکہ وغیرہ میں جو ایک خاص مقام کے اندر اسکی رعایت کی گئی ہے کہ وہاں مساوی طبقہ کے افراد آباد ہوں یہ صورت قایم رہ سکتی ہے یا نہیں سو ہم اس کو بھی طے کر دینا چاہتے ہیں۔ کسی ایک معاملہ میں مساوات حقوق و حالات و معاملات ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چند افراد میں ایسا اشتراک قرار پائے کہ کسی کو کسی پر فوقیت یا امتیاز باقی نہ رہے۔ ایسی مساوات عقلاً بھی ممکن ہے اور وقوع ہو سکتا ہے انسانی طبائع میں جہاں ہر قسم کی ترقی ذہنی و عقلی کا مادہ موجود ہے وہاں فراغت و ثروت کی وجہ سے تفنن کا شوق بھی ہوتا ہے۔ کبھی تو ضرورت اسکی داعی ہوتی ہے کہ دو یا زیادہ افراد کسی معاملہ میں مساوی شریک ہوں۔ اور کبھی تفریحی مشاغل اسکی محرک بنجاتی ہیں۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے ابھی چند سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ دو نہایت قوی انجنوں کو لڑانے کا تماشا دیکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لاکھوں روپے کا خون محض ایک تفریحی مشغلہ میں کیا گیا۔

امریکہ کے جس مقام پر ایسی مساوات جاری کی گئی ہے ہم کو اسکی پوری تفصیل معلوم نہیں کہ کن امور میں اس کا التزام کیا گیا ہے اس لئے خاص اُس کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اگر معلوم ہو جائے تو اپنا خیال عرض کر سکتے ہیں کہ وہ کہانتک اُصول فطرت۔ تمدن اور معاشرت کے مطابق ہے۔

اور آیا ایسی مساوات قیام پذیر ہوسکتی ہے یا نہیں۔

مگر شریعت نے بھی ایک خاص شعبہ میں اس مساوات کی صورت ہم کو بتلائی ہے۔ شریعت کے احکام ضرورت پر مبنی ہوتے ہیں۔ تفریح ولہو ولعب کو اسکے اندر دخل نہیں ہوتا۔ تاہم حد جواز کے اندر تفریح طبع کی بھی اجازت ہوتی ہی۔ اور کبھی تفریح خود ضرورۃ کی حد میں آ جاتی ہیں۔ اس لئے تفنن پسند طبائع بھی اس صورت سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔

تمدن و معاشرت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ چند کس میں شرکت ہو۔ شرکت کی دو قسمیں ہیں شرکت املاک۔ شرکت عقود۔ شرکت املاک یہ ہی کہ کسی مملوکہ جائداد میں شرکت ہو۔ خواہ وہ وراثتاً ملی ہو۔ یا کسی دوسرے ذریعہ سے ملک میں آئی ہو شرکت عقود اسکو کہتے ہیں کہ کسی معاملہ میں خواہ عقد بیع ہو یا اجارہ۔ صنعت ہو یا زراعت شرکت کریں۔

شرکت عقود کی چار قسمیں قرار دیگئی ہیں۔ اوّل شرکت عنان۔ دوئم شرکت صنائع۔ سوئم شرکت وجوہ۔ چہارم مفاوضہ۔ ہماری غرض اس وقت شرکت مفاوضہ سے متعلق ہی۔ اس لئے اسی کو بیان کرتے ہیں۔

مفاوضہ فوض سے مشتق ہے۔ اور اُس کے معنی مساوات کے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

لا یصلح الناس فوضی لا سراۃ لھم ولا سراۃ اذا جہالھم سادوا۔	مخلوق جبکہ مساوی درجہ خود سر ہوں کوئی ان کا افسر و سردار نہ ہو کبھی اُن کی حالت درست نہیں رہ سکتی اور اگر کسی جاہل کو سردار بنادیں تو وہ حقیقتاً نہونے کے حکم میں ہی۔

اسکی صورت یہ ہے کہ دو شخص باہم اس طرح شریک ہوجائیں کہ جو کچھ مال ہم میں سے کسی کے پاس ہو اس میں مساوی طرح شریک رہیں جو کوئی تصرف یا معاملہ ہم میں سے کوئی کرلے تو اس میں برابر کے حصہ دار رہیں گے۔ جو دین قرض کسی کے ذمہ عائد ہو اسکے ذمہ دار دونوں مساوی درجے کے ہوں گے۔

یہ شرکت چونکہ بہت سی معاملات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہی جن میں سے بہت سے ابھی مجہول ہیں اس وجہ سے امام شافعیؒ صاحب اور دوسرے آئمہ مجتہدین نے اسکو جائز نہیں رکھا مگر امام ابوحنیفہ نے

دجنکی نظر دقیق اور اصول شریعت کو زیادہ محیط و وسیع ہے۔ ضروریات و مقتضیات حوادث و واقعات کا بھی علم زیادہ ہی۔ یہی وجہ ہے کہ قبل نزول حوادث آپ نے محض احتمال وقوع پر سوالات قائم کرکے انکے احکام مدون کردیئے۔ اور یہ وہی منقبت ہی جسکو آئمہ مجتہدین نے تسلیم کرلیا ہے۔ چنانچہ امام احمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کیلئے تین چوتھائی علم کو سب تسلیم کرچکے ہیں۔ ایک ربع میں ان کا اور دوسرے آئمہ کا اختلاف ہے جسمیں کسی جانب فیصلہ یقینی نہیں ہے۔ علم کے دو حصے ہیں۔ سوال وجواب۔ نصف علم تو یوں اُن کیلئے تسلیم ہوچکا کہ سوالات انہوں نے قائم کئے۔ رہا دوسرا نصف یعنی جوابات اس میں سے ایک نصف کو ساری دنیا مانتی ہی کہ صحیح ہیں۔ ایک نصف میں اختلاف ہے)

اس شرکت کو شرعاً جائز بتلایا اور قواعد شرع پر منطبق کرکے بتلا دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو معاملات آپ میں اسوقت مجہول الحال ہیں اُنسے یہ شرکت فاسد نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس قسم کی مجہولیت کا تبعاً تحمل کرلیا جاتا ہے جیساکہ مضاربت وغیرہ میں۔

اس شرکت کے اندر چونکہ مال اور تصرفات اور دین میں مساوات ہونا شرط ہی۔ اس لئے یہ بھی ضرور ہے کہ ہر دو شریک تصرفات میں ایک درجے کے ہوں۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک تصرفات کرسکتا ہی دوسرا نہیں کرسکتا۔ یا ایک کے تصرفات کا دائرہ وسیع ہے دوسرے کا ناقص اسی وجہ سے آزاد غلام نابالغ و بالغ میں اس قسم کی شرکت نہیں ہوسکتی اور اسی طرح اُسکے بہت سے شرائط و قوانین ہیں۔ مگر ہم انکی بسط و تفصیل سے اس وقت معذور ہیں۔ صرف اسقدر بتلا دینا منظور تھا کہ شریعت نے بھی بعض ایسی مساوات کی صورتیں قایم کردی ہیں۔

نتیجہ اس شرکت کا ظاہر ہی کہ جب کوئی ہر دو شرکا میں سے کوئی معاملہ کریگا۔ دوسرا اسمیں شریک سمجھا جائیگا۔ جو مال ایک کے پاس ہے دوسرا اس میں آدھے کا شریک ہوگا۔ جو نقصان تجارت یا کسی معاملہ میں ایک کو پہنچیگا۔ دوسرا بھی اس میں شریک ہوگا۔ علی ہذا جس کسی کے ذمہ جتنا قرض ہے یا عائد ہو۔ اس میں بھی دوسرا حصہ دار ہے۔

ایسی مساوات گو عقلاً ممکن ہے۔ شرعاً جائز ہے مگر باعتبار وقوع کے سخت دشوار ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اس پر عمل کیا ہے۔ اور کیا ہے تو کہانتک اسکو نبھا سکے ہیں۔ ہمکو آجتک علم نہیں کہ کبھی ایسی شرکت ہوئی ہو۔ کتابوں میں لکھا ہوا دیکھا ہے اسکے قواعد و شرائط پڑھے ہیں۔ مگر نہ خود عمل کیا نہ کسی کو کرتے دیکھا۔ جب ایک عقد شرکت میں یہ حال ہی تو اسپر اس مساوات کو خیال کریں جو بہت معاملات میں مساوات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو مساوات کے بارہ میں ہمنے جو کچھ عرض کیا۔ اہل فہم کیلئے اسکی حقیقت اُس کے حدود اور اُسکے احکام سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ اب ہم مسئلہ حریت کو شروع کرتے ہیں واللہ الموفق۔

مسئلہ حُریّہ

مسئلہ حریّہ بھی مساوات ہی کا ایک شعبہ ہے اور اسپر متفرع ہے اسلئے ہم نے مساوات کی تحقیق کے بعد اس کا لکھنا مناسب سمجھا۔ حریت کے معنی آزادی اخلاق و ملکات معائب و رذائل سے پاکیزگی و صفائی کے ہیں اور انہیں اعتبار سے اس کا اطلاق کبھی بمقابلہ عبدیت و غلامی کے ہوتا ہے اور کبھی بمقابلہ دنائت و رذالت کے حُر بولتے ہیں اور وہ شخص مراد ہوتا ہے جسکی ذات آزاد ہو۔ غلامی کی قید میں مقید نہ ہو اور کبھی حُر بولتے ہیں اور وہ شخص مراد لیتے ہیں جو شریف النفس ہو۔ کریم الاخلاق ہو۔ اور اسی معنی کو لحاظ رکھتے ہوئے انسان کے چہرہ کو بھی حُر کہتے ہیں۔

حریت کی تین قسمیں ہیں۔ حریۃ ذات۔ حریۃ صفات۔ حریۃ معاملات۔

حریت ذات تو یہ ہی کہ انسان اصل خلقت سے آزاد پیدا کیا گیا ہی۔ ابتدا ء پیدائش سے وہ خلافت خداوندی کی حیثیت سے خود تمام مافی الارض کی ملکیت و تصرفات کا استحقاق و قابلیت رکھتا ہے کسی کو اس پر مالکیت کا حق نہیں ہی۔ وہ اپنی ذات و منافع ذات کا مالک و متصرف ہی یہ حالت اگر اسکی آخر تک یونہی موجود ہی تو حریت ذات قائم و باقی ہے۔ اگر اس کی یہ حالت باقی نہ رہی تو حریت ذات مفقود ہو کر بجاے اُسکے غلامی آگئی۔

حریتِ صفات یہ ہی کہ اس کا نفس مکارم اخلاق سے مزین ہو۔ اس میں وہ اخلاق نہوں
جو انسان کو داغدار بنا کر درِ بہیمیت تک پہنچا دیتے ہیں مکارم اخلاق میں حیا مروت شجاعت
سخاوت عدل و انصاف رحم و حلم سب ہی داخل ہیں۔ رذائل انسانی میں ان اخلاق کے ضدا
ظلم و ستم۔ بیحیائی و بیمروتی۔ بزدلی و بخل وغیرہ داخل ہیں۔

حریتِ معاملات یہ ہی کہ جو استحقاق تصرفات مالکانہ کا منجانب اللہ اس کو عطا ہوا تھا وہ
اسی حال اور اُسی طرز پر باقی ہے زائل نہیں ہوا۔

حریت کی ہر سہ اقسام کے متعلق چند امور قابل بحث و تحقیق ہیں۔
(۱) یہ حریت اس کو کہاں سے عطا ہوئی (۲) اس حریت کی حفاظت کا حق اسکو کس حد تک ہے
(۳) اسکے استعمال کے کیا طریقے اور کیا حدود ہیں (۴) اس حریت کے زوال یا نقص کی کسقدر
صورتیں ہیں (۵) عقل و عرف یا دیانت و مذہب کے اعتبار سے ان حریتوں کا سلب و زوال ممکن
ہے یا نہیں ہے تو کہاں تک اور وہ محمود ہے یا مذموم۔

امر اوّل انسان کو سہ قسم کی حریتیں اسکے خالق و مالک کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ خداوند
عالم نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ۔ جانشین و قائم مقام بنا کر بھیجا ہے۔ زمین کی حکومت اُسکی
ہر چیز میں حق ملکیت و تصرف اسکو عطا فرمایا ہے جو حق ملکیت و تصرفات خداوند عالم کو تمام
ما فی الارض پر تھا وہ ہی حق بحیثیت خلافت انسان کو حاصل ہے۔

انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ | میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانیوالا ہوں۔

اسکی دلیل شرعی موجود ہے اور انسان کے تصرفات کل مخلوقات پر اسکی عقلی و عرفی دلیل ہیں۔
انسان خود اپنے خالق کا مملوک بیشک ہی جیسے کہ اور مخلوقات ہیں۔ مگر باعتبار باقی اجزاء عالم کے
وہ آزاد حُر ہے کسی کو اس پر باعتبار اصل فطرۃ حق ملکیت نہیں ہی۔ ذات بھی اسکی آزاد ہی اور معاملات میں
بھی وہ آزاد ہے۔

انسان باعتبار اصل فطرۃ وخمیر کے مظہر صفات کمالیہ الہیتہ پیدا کیا گیا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم	انسان کو ہمنے اچھے پیمانہ صورت پر پیدا کیا

ارشاد خداوندی ہے اور

خلق اللہ آدم علی صورتہ	اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی مثال وصورت پر یا انکی صورت پر جو نوع انسان کیلئے مناسب تھی پیدا کیا۔

ارشاد جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہے اور اس اعتبار سے اس کے فطری اور روحانی اخلاق بھی تمام رذائل نفسانی سے آزاد پیدا کئے گئے لیکن چونکہ وہ دار بلا میں ابتلاء و آزمایش کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔

لیبلوکم ایکم احسن عملا	(تاکہ اللہ تعالیٰ آزمایش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا ہے)

اسلئے اس میں اس شائبہ ناری کے آثار بھی ظاہر ہوئے جسکی طرف ارشاد ذیل میں اشارہ ہے۔

ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات	پھر کیا ہم نے اسکو اہل نار سے گروہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے۔

خداوند عالم نے اپنے بالغ و محکم حکمت کی بنا پر انسان کے اصلی اخلاق کے ساتھ دوسرے اوصاف بھی رکھدئے۔ جو اُن کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اور اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنی عقل سے روحانی ونفسانی اخلاق و ملکات میں مقابلہ کیوقت روحانی اخلاق کو غالب رکھے۔ رذائل نفسانی کو زائل کرنیکی فکر کرے اور الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت کے استثنا میں داخل ہو۔

امر دویم جو حریت و آزادی انسان کو درگاہ رب العزۃ سے عطا ہوئی ہے اسکی حفاظت انسان کے ذمہ لازم و واجب قرار دیگئی ہے۔

انسان اگر اسکی حفاظت میں کمی کرے دنیا میں ذلیل و خوار سمجھا جاتا ہے اور آخرۃ میں قابل دارو گیر یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی حفاظت میں مارا جائے تو اس کو دیانۃً و مذہباً شہید کا اجر ملتا ہے اپنی آبرو کے تحفظ میں قتل ہو جائے تب بھی شہید ہے۔ اپنے مال کے بچانیکے لئے جان دیدے تب بھی۔

اگر خود اپنے جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت نکرے تو تمام دنیا اسکو بزدل بے حیا۔ بیمروت وغیرہ القاب سے یاد کرتی ہے۔ ابنائے جنس ہم وطن ہم قوم سب ہی میں ذلت و خواری کیساتھ رہتا ہے

برخلاف اسکے اگر دوسری صورت ہوئی تو اُسکی عزت وعظمت کا ڈنکہ بج جاتا ہے۔ یہ کیوں صرف اس لئے کہ اُس نے اپنا فرض ادا کیا۔ یہ حال تو عقل وعرف کے اعتبار سے ہے دیانت و مذہب نے اس کا فیصلا اس طرح کردیا ہے۔

من قتل دون نفسه فهو شهید من قتل دون عرضه فهو شهيد من قتل دون ماله فهو شهيد	جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنی آبرو کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے اسی طرح جو اپنے مال کو بچانیکے لئے قتل کیا جائے وہ بھی شہید ہے۔

انسان کو اپنی ذات و معاملات۔ حرمت و عزت کی حفاظت جیسے کہ دوسرے کی باتوں سے ضروری ہے خود اپنے اعتبار سے بھی ایسی ہے۔ اپنی جان کو ہلاک کرڈالے۔ تو گناہ کبیرہ ہے قاتل نفس مستحق عذاب جہنم ہے۔ خود ایسے افعال و اخلاق کا مرتکب ہو اور اپنی ہی ملکیت کے اندر اپنی ذات کیلئے ان اخلاق کا استعمال کرے تب بھی عرفاً عقلاً۔ شرعاً اس کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا وہ اب بھی قابل نفرین ہوتا ہے۔ جیسا کہ صورت اوّل میں۔

علی ہذا اپنے اموال و معاملات کو اپنے ہاتھ سے اپنے اختیار سے تباہ کرڈے تب بھی مجرم۔ فاسق مسرف۔ مبذر۔ اخوان شیاطین وغیرہ خطابات سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ بلکہ صورت اوّل میں جبکہ کسی دوسرے کی طرف سے جان و مال وغیرہ آبرو کو گزند پہنچ جائے۔ یہ شخص عدم حفاظت یا کوتاہی حفاظت میں معذور بھی سمجھا جاتا ہے۔ مگر صورت ثانیہ میں معذور نہیں سمجھا جاتا۔

امر سوم انسان اپنی ذات کا اور اپنی ذات کے منافع کا مالک ہے۔ اخلاق و صفات۔ تابع ذات ہیں وہ بھی اسکے اختیاری ہیں۔ اس اعتبار سے تو اختیاری نہیں کہ وہ اپنے اندر جس خلق یا جس ملکہ کو چاہے پیدا کرسکے۔ یہ تو صرف خداوند عالم کے اختیار میں ہے۔ جس طرح ذات انسانی کی خلقت اسکے اختیار میں نہیں ہے۔ اسیطرح صفات و اخلاق کی خلقت بھی اختیار میں نہیں ہے ہاں جسطرح ذات کے اندر اس کو یہ تصرف دیا گیا کہ وہ حسن جمیل بناکر خلقی قبح اور کراہت منظر کی ایک حد تک تلافی کرسکتا ہے۔ اسی طرح نفسانی رذائل کو مستور و مغلوب کرنے روحانی اخلاق کو تفوق و امتیاز دینے کا اختیار بیشک اس کو دیا گیا ہے۔ یہی مراد ہماری صفات و اخلاق کے

اختیاری ہونے سے ہے۔

معاملات میں اس کو اختیار کلی ہے۔

لیکن باوجود اس اختیار و حریتِ تامہ کے جو اس کو اپنی ذات و صفات اور معاملات میں حاصل ہے اس اختیار کیلئے حدود مقرر ہیں استعمال کے طریقے بتلا دیئے گئے ہیں عقل و عرف نے بھی اسکو مطلقاً آزاد نہیں رکھا اور دیانت و مذہب نے بھی۔

دیکھئے وہ اپنی ذات کا مالک ہے مگر اپنی جان ہلاک کرنیکا اس کو اختیار نہیں۔ اپنی جان کو کسی کے ہاتھ فروخت کرنیکا مجاز نہیں۔ علیٰ ہذا منافع ذات کا مالک ہے کسی کا اجیر۔ ملازم بنکر رہ سکتا ہے۔ اور اپنی ذات کے منافع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اختیار بھی اُس کا کلی اور مطلق نہیں کسی کی ملازمت یا اجرت ایسے مذموم افعال کیلئے کرنا جو تمام اہل دنیا کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ عقلاً و عرفاً سخت شرمناک مذموم و معیوب ہے عقل و عرف نے اُس کے حدود و طریقے معین کر دیئے ہیں۔ زنا و لواطت کی اُجرت و ملازمت کو شاید دنیا کا کوئی ذلیل ترین فرد بھی پسند نہ کرتا ہو۔ حالانکہ عورت و مرد کے تعلقات وہ ہیں کہ نسل انسانی کا مدار انہیں پر ہے اور دنیا کی تمام راحتوں سے بڑھ کر اس تعلق میں راحت ہے۔ مگر کوئی عاقل تجویز نہیں کر سکتا کہ انسان اس میں آزاد مطلق الاختیار ہے۔

دیانت و مذہب نے ذات و منافع ذات کے اختیارات کو اور بھی محدود و مقید کر دیا ہے بہت سے اجارات و ملازمتیں ایسی ہیں جن کو گو عقل و عرف نے جائز قرار دیا ہے مگر شرع نے اُسکی اجازت نہیں دی۔

اخلاق و صفات کی حدود و اختیار بھی محدود ہیں۔ آدمی میں جسقدر اخلاق محمودہ و ملکات مہذبہ ہیں ان میں بھی اسکو اختیار نہیں ہے کہ ہر موقع پر ان کا استعمال کر سکے۔ رحم۔ شفقت۔ علم۔ سخاوت۔ شجاعت وغیرہ سب اخلاق محمودہ ہیں۔ اور اختیاری ہیں۔ مگر ہر موقع میں نہ محمود ہیں اور نہ ان کے استعمال کی اجازت ہے عقل و عرف و دیانت سب کے اعتبار سے یہ امر واضح و بین ہے۔ حاجت توضیح و تفصیل نہیں ہے۔ ہاں عقلی و عرفی قواعد اور شرعی احکام و قیود میں جو فرق ہوتا ہے وہ یہاں بھی ہو گا۔

امر چہارم ہر حریت ذات و صفات و معاملات کے زوال و سلب یا نقص کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) ذات کی حریت بالکل جاتی رہی۔ اور وہ مثل دوسرے اموال منقولہ وغیر منقولہ کے قابل بیع وشراء ہوجائے۔

(۲) حریت ذات کلیۃً تو زائل نہو۔ اور نہ بالکل مثل اموال کے ہوجائے۔ مگر اُس کے ساتھ معاملہ وہی کیا جائے جو ایک مملوک شے کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے اسیران جنگ کہ گو عرف میں ان کو مثل اموال نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اُنکے عوض مال لیا جاتا ہے۔ تبادلہ کیا جاتا ہے اور اس تبادلہ کو گو اصطلاح میں بیع وشراء نہ کہیں اور نہ اُس اسیر کو غلام مگر معاملہ وہی ہوتا ہے جو مملوک اشیاء کے بیع وشراء میں۔

(۳) باوجود ذات کی کامل آزادی کے اگر انسان میں عقل نہیں ہے جنوں تک پہنچگیا ہے۔ اس صورت میں حریۃ صفات زائل ہوجاتی ہے اس کا کوئی خلق وملکہ قابل اعتبار نہیں رہتا اور نہ اس پر کوئی حکم مرتب ہوتا ہے۔ یہانتک کہ مدح وذم کا ثمرہ ہی مرتب نہیں ہوتا۔

(۴) باوجود عقل وفہم ہونیکے اخلاق ذمیمہ نے اسکے پسندیدہ اخلاق کو مغلوب کردیا۔ اُس وقت یہ شخص اخلاق ذمیمہ کے استعمال اور اخلاق حسنہ کے ترک سے قابل ملامت وطعن ہوتا ہے اور احکام بھی اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دانشمندوں اور ارباب عقول سے ناملائم اخلاق ظلم وستم بخل وبیحیائی وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اسکے لئے زیادہ امثلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۵) کبھی دوسری قوۃ قاسرۃ اس حریۃ کے استعمال میں مانع آجاتی ہے اور انسان کو یہ آزادی باقی نہیں رہتی کہ اپنے اخلاق حسنہ سے جس طرح چاہے کام لے سکے حق گوئی کرسکے جراۃ اخلاق کو استعمال میں لاسکے۔

(۶) حالت جنوں میں حریت معاملات بالکل سلب ہوجاتی ہے اس کا کوئی عقد ومعاملہ نافذ وجاری نہیں ہوتا۔

(۷) سفاہت وکم عقلی وغیرہ حالتوں میں ناقص ہوجاتی ہے اور اسی وجہ سے ایسے لوگوں کو جو بچپن سے سفیہ ہوں اور حالت بلوغ میں بھی اُنکے اندر آثار رشد ظاہر نہوں اُن کے اموال اُن کے سپرد نہیں کئے جاتے بلکہ اُن کے اولیاء کے قبضہ میں رکھے جاتے ہیں۔ اگر بعد بلوغ سفاہت ظاہر ہو تب بھی اُنکے

معاملات میں مداخلت کی جاتی ہے۔ مسرف ہو اپنے مال کو بیجا طور پر ضائع کرتا ہو یا شر فساد میں خرچ کرتا ہو تب بھی حکام وقت کو اس میں مداخلت کا حق ہوتا ہے۔ قوانین دنیا میں کورٹ آف وارڈس کا محکمہ اسی ضرورت سے قائم ہوا۔ اس میں تو عاقل بالغ ہوشیار مدبروں کی جائدادیں بھی بوجہ دیون وغیرہ کے گورنمنٹ اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے اور شریعت میں مسئلہ حجر اس کے لئے جاری ہوا ہے۔

(۸) صغر و کمسنی بھی معاملات کی آزادی میں مانع آتے ہیں۔ علی ہذا نابالغ کے معاملات میں اسی وجہ سے قاضی کو دخل کا اختیار ہے۔

مجرموں کو جیل خانہ میں ہر قسم کی اخلاقی حریت۔ و آزادی معاملات سے روک دیا جاتا ہے۔ نہ منافع ذات میں تصرف کر سکتے ہیں۔ نہ اپنے اخلاق و ملکات سے کام لے سکتے ہیں۔ نہ کوئی معاملہ کسی سے کر سکتے ہیں اس حالت میں بجز اسکے کہ اُن کی ذات کی مثل اموال کے بیع و شرا نہیں ہوتی اور سب امور منافع ذات اخلاق وصفات۔ معاملات و تصرفات میں مثل جمادات و اموال کے ہو جاتے ہیں۔ کبھی گاڑیوں میں گھوڑے بیل کی طرح لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی زراعت میں بہائم کا کام دیتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی صورتیں ہیں جنمیں انسان کی ہر سہ قسم کی حریتیں زوال پذیر یا ناقص ہو جاتی یا کر دی جاتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عقل و عرف میں ان صورتوں میں سے کونسی صورت کو ناپسند کیا جاتا ہے اور کونسی کو عقلاء زمانہ نے بلا انکار تسلیم کر لیا ہے اور پھر اسکے بعد انہیں امور کے متعلق شریعت کا فیصلہ دکھلانا۔ اور عرف و شرع میں موازنہ کر کے نتیجہ نکالنا ہے۔

جسقدر صورتیں بیان کیگئی ہیں۔ اُن میں بعض تو قدرتی ہیں۔ مثلاً انسان میں جنوں ہو ایسی صورت میں تو ظاہر ہے کہ کوئی ایک عاقل بھی اسکو معاملات کا اہل نہیں بتلا سکتا اور نہ اسکے اخلاق و ملکات قابل گرفت ہوتے ہیں۔ مگر مجنوں کی ذات پھر بھی آزاد رہتی ہے۔ اس میں فرق نہیں کیا جاتا بلکہ غیر مجنوں سے زیادہ آزاد رہتی ہے۔ اُسکے قتل کو جائز نہیں رکھا جاتا نہ وہ اسیر جنگ بنا کر مثل اموال قابل تبادلہ و معاوضہ ہوتا ہے۔ نہ اُسکے منافع سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے ایسا کیا تو کسی قانون میں اور کسی عرف میں پسندیدہ نہو گا۔

اسکے علاوہ اکثر صورتیں اختیاری ہیں اور ان میں سے اکثر صورتیں قوانین عالم میں رائج شائع اور مستحسن ہیں

فرق ہوگا تو فروعات میں ہوگا یا طرق اجرار قوانین میں۔ البتہ اس صورت کو اس زمانہ کے عرف میں بالکل مذموم سمجھا جاتا ہی کہ انسان کی ذات مثل اموال کے ہوجائے جمادات وبہائم کی طرح اُسکی بیع وشرار جائز کردیجائے اور جہانتک عقل کام کرتی ہی یہ بات ظاہرا نازیبا بھی معلوم ہوتی ہی کہ انسان جس کو قدرت نے آزاد پیدا کیا ہی اُسکی ذات کو مثل جمادات ونباتات بہائم وطیور کر دیا جائے۔ گویا قدرت کا صریح مقابلہ ہی اور اسی طرح شریعت اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔

دوسرے اس صورت کو بھی مذموم سمجھا جاتا ہی کہ انسان جرأت اخلاق سے کام نہ لے سکے وہ اپنے فطرتی اخلاق کو کام میں لانے سے محروم کردیا جائے صحیح رائے یا مفید مشورہ نہ دے سکے کسی امیر یا وزیر یا شاہ وشہنشاہ کے خلاف منشار کوئی لفظ نہ کہہ سکے۔ اخلاقی حریت بہت ہی زیادہ قابل ستایش ومدح ہے اسکے مقابلہ میں جس قدر آزادی مسلوب ہے۔ اگر وہ خود اُس شخص کی طرف سے ہی تب وہ دنیا میں قابل نفرین وملامت ہی۔ اگر کوئی دوسرا مانع ہے تو وہ شخص یا وہ قانون جوسدراہ ہی ظالم وظالمانہ سمجھا جاتا ہے۔

ان دو صورتوں کے سوا سب صورتوں کو جن میں حریت ذات سلب ہوتی ہی یا ناقص۔ حریۃ صفات میں زوال آتا ہے۔ یا نقصان پسند کیا جاتا ہے اور وہ عقلار دنیا کے معمول بہا ہیں یہانتک کہ وہ صورتیں بھی جو حقیقتاً باعتبار عقل مذموم ہیں اور عرف عام میں بھی اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ بعض اقوام یا بعض ممالک میں اچھی سمجھی جاتی رہی ہیں اور زمانہ طویل تک اُن پر عملدرآمد رہا اور اب بھی ہی۔

یہ فیصلہ تو عقل وعرف کا ہی اور اس فیصلہ کی رو سے شریعت اسلام کے بعض احکام پر نکتہ چینی کی نوبت آتی ہے اسلئے ہم کو ضرورت ہی کہ ہم اس معاملہ میں شریعت کے احکام کو ذرا وضاحت سے لکھ کر تبلا دیں کہ اسلام نے حریت ذات وصفات ومعاملات کی کس حدتک رعایت کی ہی اور مسئلہ غلامی کی حقیقت کیا ہی۔

انسان میں دو حیثیتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ ایک اُسکی ذات کی باعتبار موجود ذیحیات صاحب عقل وشعور ہونیکے۔ ایک باعتبار منافع ذات کے جسکی وجہ سے وہ اموال میں شمار ہونیکے قابل ہوجاتا ہی تفصیل اسکی یہ ہی کہ موجودات غیر ذیحیات میں تو صرف اُنکے منافع کا لحاظ ہی اور اسلئے اُن کی ذات کا تحفظ

یا اتلاف جو کچھ بھی ہی مالیت کے اعتبار سے ہی۔ تبادلہ ذات فی حد ذاتہ ملحوظ نظر نہیں ہی۔ موجود ذیحیات میں جو حصہ غیر ذوی العقول کا ہی اُس میں تحفظ ذات بھی باعتبار اُنکے ذیحیات و ذی دم ہونیکے مقصود ہے۔ اور اسی وجہ سے انسان کے ذمہ جو باعتبار نیابت و خلافت انپر مالکانہ حق رکھتا ہے۔ حفاظت و رعایت ذات ایک حد تک لازم کیگئی ہی اور باعتبار اُن کے منافع کے جہتہ مالیت بھی مقصود ہے مگر مالیت کی جہت غالب ہی اور اسیوجہ سے باجماع عقل و عرف تمام غیر ذوی العقول کی بیع و شرار جائز ہے کسی ایک کو بھی انکار نہیں ہی۔

انسان باعتبار موجود ذی حیات ہونیکے گو اوروں کے ساتھ شریک اور مساوی تھا مگر اُس کے ذوی العقول ہونے نے اُس کی ذات کو دوسری ذوات پر ترجیح دیدی اور حفاظت دم انسان سب سے زیادہ بڑھکر ضروری و لازمی ہوگئی۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ لشکر کا ہر سپاہی دشمن کے مقابلہ میں کارآمد ہوتا ہے ایک ایک سپاہی کی جان کی قدر و قیمت بہت زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ جنرل افواج گو ان امور میں مثل ایک سپاہی کے ہوتا ہے مگر فرائض خاصہ کی ذمہ داری نے اُسکی جان کو زیادہ قابل حفاظت بنا دیا ہے۔ اُسی کی حیوۃ پر کل افواج کی حیات کا مدار سمجھا جاتا ہے۔ اور چونکہ انسان کے منافع بھی تمام موجودات سے زیادہ ہیں اسلئے اُس میں جہتہ مالیت مغلوب ہے۔

انسان باعتبار ذات و منافع دونوں کے پورا پورا آزاد ہے۔ نہ اُسکی ذات پر کسی کو حق تصرف حاصل ہے نہ منافع پر البتہ اسکے اندر نقصان آجاتا ہی۔ یا اس کا مایہ الامتیاز عقل و تمیز زائل ہوجاتی ہی۔ تو اسکی حریتہ میں کلاً و جزاً نقصان و زوال آتا ہی۔ شریعت نے دونوں پہلوؤں کی اسقدر رعایت کی ہے جس سے زیادہ ممکن نہیں ہے حریت ذات تو شریعت میں کسی حال زائل ہی نہیں ہوتی۔ بجز ایک صورت غلامی کے جس کی حقیقت ہم بیان کرینگے۔ کسی حال اسکی بیع و شرار کو جائز نہیں کہا گیا۔ اور نہ اُسکی جان تلف کرنیکی کسی وقت اجازت دی گئی۔ جو رسم و رواج امم سابقہ میں اس قسم کی پڑگئی ہیں کہ لڑکیوں کو بخیال حفاظت ننگ و ناموس زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ یا لڑکیوں کے نکاح میں بھاری رقمیں لیجاتی تھیں۔ یا اب بھی لی جاتی ہیں۔ یا اس طرح نکاح کر دیا جاتا تھا کہ ایک نے اپنی لڑکی کی شادی دوسرے کے فرزند سے اس طرح

کردی کہ وہ اپنی دختر کو اسکے فرزند سے بیاہ دے اور یہی اُن کا باہم مہر تھا۔ اس صورت کو اصطلاح شرع میں نکاح شغار کہتے ہیں ان سب کو مکلفت شریعت نے حرام قرار دیدیا اور مٹا دیا۔ یا لڑکیوں کو حق وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اسکے تصرفات مالکانہ کو کالعدم سمجھا جاتا ہے۔ شریعت نے اسکو بھی مٹا دیا۔ نسوان کو کامل حریت مثل رجال عطا فرمادی۔

کسی انسان کے ہلاک کرنے کی سوا مخصوص صورتوں کے اجازت ہی نہیں دی مثلاً کسی صورت قصاص یا حدود شرعی وغیرہ مگر ان میں بھی وہ احتیاط ہوتی ہی کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں اور ذرا ذرا سے شبہ سے حدود و قصاص کو ساقط کر دیا۔

البتہ غلامی کی صورت میں حریۂ ذات سلب ہو جاتی ہے لیکن اُسکے سلب ہونیکے یہ معنی نہیں کہ اسکی ذی حیات و ذی دم ہونیسے قطع نظر کرلی گئی ہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ حیۂ مالیۃ کو غلبہ دیکر مثل اموال اسکی بیع و شرار کو جائز کر دیا گیا ہی۔ بایںہمہ اسکی جان کی حفاظت باعتبار ذی حیات و ذی دم ہونیکے اسی طرح باقی ہی سر مو فرق نہیں آیا۔

غلام کی بیع و شرار کو شرع نے مثل اموال جائز رکھا۔ مگر اسکے قتل یا اذیت و اہانت کی کسی حال اجازت نہیں دی۔ اور اس فرق کو اس حد تک ملحوظ رکھا کہ اگر کسی کا غلام اپنے ذمہ دین کا اقرار کرلے تو معتبر نہیں۔ کیونکہ یہ اقرار غیر کے حق میں ہی یعنی اس کا اثر اسکی مالیت پر پڑتا ہے اور مالیت کا تعلق مولی اور آقا سے ہے غلام کا اس میں کچھ نقصان نہیں ہی وہ اس کی ملک نہ رہیگا کسی دوسرے کی ملک ہو کر رہیگا۔

اور اپنے ذمہ کسی حد یا قصاص کا اقرار کرلے تو معتبر ہے۔ کیونکہ اس کا اثر اصالتاً و بلا واسطہ اسکی جان کو پہنچتا ہے۔ اور بالواسطہ مالیت کو اور جب غلام نے ہلاکت جان اور اذیت کو گوارا کرلیا جسکو انسان کبھی برضا و رغبت گوارا نہیں کرتا۔ تو مالک کے نقصان مالی سے قطع نظر کریگی۔

منافع کی آزادی کا لحاظ اس حد تک کیا گیا۔ کہ کسی کو اس پر جبر کا اختیار نہیں دیا گیا۔ وہ اپنی خوشی سے اپنے منافع کو فروخت کر سکتا ہی۔ مگر کسی دوسرے کو اس پر حق نہیں ہی یہانتک کہ جو لوگ تعذیراً یا حقوق عباد کی وجہ سے حبس میں رکھے جاتے ہیں۔ انکے منافع سے انتفاع کی بھی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ اسکو

جائز نہیں رکھا کہ وہ بہائم وچوپایوں کی طرح رکھے جائیں۔ شریعت نے جس کی صورت اس طرح کی ہے جیسے دیوانی کے قیدیوں کی۔

اور باوجود اجازت فروخت منافع شریعت نے اُس کے حدود مقرر کر دیے ہیں۔ آزاد مطلق نہیں چھوڑا۔ اور اسی وجہ سے اجارہ کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ اجارہ صحیحہ۔ اجارہ فاسدہ۔ اجارہ باطلہ اگر اجارہ ایسی چیز کا ہے جس کی شرعاً اجازت ہے اور کوئی ایسی شرط نہیں ہے جس سے اسکی حلت میں فرق آئے تو صحیحہ ہے۔ اور اگر اجارہ کسی امر حرام کا ہے مثلاً زنا کا یا شراب نکالنے کا یا اسکے پہنچانے کا تو باطل ہے اور اگر اصل سے اجارہ باعتبار معقود علیہ کے صحیح تھا۔ مگر شروط وقیود نے اس میں نقصان پیدا کر دیا ہے تو باطل نہیں بلکہ فاسد ہے۔

یہ حال تو ذات ومنافع ذات انسان کا تھا۔ رہی حریتہ اخلاق ومعاملات انکی کیفیت یہ ہے۔

معاملات میں ہر ایک آزاد عاقل بالغ انسان آزاد ہے۔ اسکے عقود وفسوخ بیع وشرا نکاح وطلاق وغیرہ سب صحیح ونافذ ہوتے ہیں۔ عورت ومرد اس میں یکساں ہیں۔ ہر شخص اپنے مال کو جس طرح چاہے خرچ کر سکتا ہے عورت کو بھی اپنے مال میں وہی اختیار ہے جو مرد کو۔ معاملات کی آزادی اسی وقت سلب ہوتی ہے جبکہ عقل نہ ہو جنون مطبق ہو جائے یعنی کسی وقت بھی افاقہ نہ ہوتا ہو اور اسکی اس حریت میں بچند وجوہ نقصان آجاتا ہے سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو سن بلوغ کو سفاہت وکم عقلی کی حالت میں پہنچا ہو۔ یا اپنے مال میں اسراف وتبذیر کرتا اور اسکو شر وفساد میں صرف کرتا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان امور کی وجہ سے اسکی حریت معاملات ناقص ہو جاتی ہے صبی عاقل کے معاملات بغیر اجازت ولی کے نافذ نہیں ہوتے۔ موقوف رہتے ہیں۔

علی ہذا سفیہ پر قاضی حجر کر سکتا ہے اُسکو تصرفات ومعاملات سے روک سکتا ہے۔ مگر امام اعظم رضی اللہ عنہ نے اس میں بھی اسکی حریت کے دقیق پہلو کو ملحوظ رکھ کر دو حالتوں میں فرق کر دیا ہے۔ اگر وہ حالت سفہ میں بالغ ہوا۔ تو حسب ارشاد خداوند عالم

ولا تؤتوا السفهاء اموالكم	سفیہ اور کم عقلوں کو اپنے اموال سپرد مت کرو۔

ولی کو اجازت نہیں ہی کہ اُس کا مال اُسکے سپرد کرے اور وہ اس میں جو چاہے تصرف کرے۔ بلکہ پچیس سال کی عمر تک انتظار رشد و کمال عقل کا کیا جائیگا۔ بعد پچیس سال کے امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ اب انتظار کی کوئی حد باقی نہیں رہی اب اسکے اموال کو روکنا اور اسکے تصرفات کو ناجائز رکھنا اس کے یہ معنی ہیں کہ اسکو انسانیت سے نکال کر بہائم میں داخل کردیا جائے۔ وہ مجنوں کی طرح مسلوب العقل تو ہے نہیں۔ اس میں سفاہت و کم عقلی سے نفع و نقصان میں امتیاز و ترجیح کا مادہ کم ہی لیکن اُنکے نزدیک یہ نقصان ایسا نہیں جسکی وجہ سے اسکو انسانیت سے خارج کردیا جائے اور اگر بعد بلوغ سفہ ظاہر ہوا تو باوجودیکہ دوسرے آئمہ مثل امام شافعیؒ و صاحبین کے اسکے قائل ہیں کہ قاضی اس شخص کو حجر کرے یعنی تصرفات و معاملات سے روکدے مگر امام اعظمؒ یہاں بھی یہی فرماتے ہیں کہ ایک آزاد عاقل بالغ کو قاضی حجر نہیں کرسکتا۔ ایسا کرنے میں اسکو انسانیت سے خارج کردینا ہے۔

جو آئمہ ایسی صورت میں حجر کے قائل ہوئے اس کا منشا بالکل صحیح ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنے مال کو خلاف مقتضائے عقل صرف کرتا ہی تو کیوں نہ اس کو روکدیا جائے۔ سلطان و والی قاضی و حاکم اس لئے ہیں کہ اپنی رعایا کی نگرانی کریں اور انکو مضرت کے پہلو سے بچائیں۔ ایک عاقل نابالغ پر حجر ہوسکتا ہی تو بالغ سفیہ پر بدرجہ اولی ہونا چاہیئے۔ ان حضرات نے درحقیقت اس کی حریت کو زائل کرنا نہیں چاہا۔ بلکہ جیسے بحالت جنوں مجبوراً زائل ہوجاتی ہے ایسے ہی خود اسکی حفاظت کیلئے حجر کو جائز رکھا ہے۔

امام اعظمؒ کی نظر اس جانب ہی کہ انسان میں جبتک کسی حد تک اہلیۃ باقی ہی اس کو ایسے حق سے محروم نہ کرنا چاہیئے۔ جنوں سے اہلیۃ جاتی رہتی ہے صبی نابالغ کی حالت قابل انتظار ہے۔ چندروز انتظار میں انسانیت سے خارج نہیں ہوتا اور جو بالغ ہوچکا عقل اُس میں موجود ہی۔ مگر سفاہت ہی یعنی یہ نہیں سمجھتا کہ مجھکو کہاں خرچ کرنے میں فائدہ ہی کہاں نہیں۔ اور اسی وجہ سے بیہودہ مصارف میں مال کو اُڑادیتا۔ اسراف و تبذیر کرتا ہے۔ معاملات بیع و شرا میں بھی کم عقلی کی وجہ سے نقصان اُٹھاتا ہی۔ اسکو اگر حجر کردیا جائے تو انسانیت سے بہائم میں داخل کرنا۔ اور حقوق آدمیت سی محروم کردینا ہے مال ادنیٰ شے ہی انکے خیال میں ایک ایسے اعلیٰ شرف سے محروم کردینا ہرگز صحیح نہیں ہی۔ ہاں اگر سفیہ کے افعال و معاملات سی نوع اعلیٰ میں ضرر متصور ہو تو بیشک حجر کردیا

جائے مثلاً کوئی فن طب سے جاہل پیشہ طبابت اختیار کرے اور اس طرح مخلوق کی جان خطرہ میں پڑ جائے۔

یا وہ شخص جو لوگوں سے گھوڑا اونٹ گاڑی وغیرہ کو کرایہ پر دینے کا معاملہ کرتا ہے۔ اور ہی مفلس نادار لوگ معاملہ کر کے حسب دستور کل یا بعض حصہ کرایہ کا پیشگی دیدیتے ہیں اور وقت پر بوجہ ناداری سواریاں نہیں دیسکتا۔ نہ خود اسکے پاس ہیں۔ نہ خرید کرلا سکتا ہے۔

اس قسم کے لوگونکو حجر کیا جا سکتا ہی۔ کیونکہ ان صورتوں میں چھوٹے ضرر کو بمقابلہ بھاری نقصان کے گوارا کرنا ہی۔ اور ایسا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ دنیا عام تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جائے۔

علی ہذا اگر کوئی شخص مدیون ہو جائے۔ اُسکے محبوس کرنے حجر کرنے میں بھی آئمہ دین کا اختلاف ہی۔ اور منشاء اختلاف کا یہاں بھی یہی ہی جو اوپر بیان کیا گیا۔

صورت مسئلہ یہ ہی کہ کسی شخص کے ذمہ دین ہو گیا۔ اُسکی دو حالتیں ہیں۔ یا صاحب مال نہیں مفلس ہے طاقت ادار دین نہیں رکھتا۔ یا صاحب مال ہی مگر ادا نہیں کرتا۔ صورت اول میں صاحبین تو یہ کہتے ہیں کہ اگر غرماء یعنی دائن درخواست کریں تو قاضی اسکو حبس میں رکھ سکتا ہی اور اُسپر حجر کر کے تصرفات سے منع کر سکتا ہی۔ مگر امام اعظم فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک نہ حبس کی اجازت ہی نہ منع تصرفات کی کیونکہ اس میں اسکی اہلیت کو زائل کرنا۔ اور اسکو انسانیت سے خارج کر کے بہائم میں داخل کر دینا ہی۔

صورت ثانی میں صاحبین فرماتے ہیں کہ غرما کی درخواست پر وہ محبوس بھی رکھا جا سکتا ہی۔ اور قاضی اس پر حجر بھی کر سکتا ہے اسکے ساتھ ہی مدیون سے کہا جائے کہ اپنے مال کو فروخت کر کے قرض ادا کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو قاضی کو اختیار رہے کہ خود فروخت کر کے کل قرض ادا کر دے۔ یا حصہ رسد ہر قرضخواہ کو دیدے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں ان میں سے کسی ایک امر کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اس اجازت میں ان کو انسانیت کے شرف اور حریت کی دولت سے محروم کر کے بہائم میں داخل کر دینا ہے۔ ہاں حاکم کو ایسا کرنے کا اختیار ہے کہ اُس کے تمام مال کو اس وقت تک قرق رکھے جبتک وہ خود بیع کر کے دین کو ادا نہ کر دے۔

میری غرض مجتہدین کے اختلاف مذہب بیان کرنے سے اس وقت یہ نہیں کہ میں کسی ایک مذہب کی قوۃ وضعف کو باعتبار دلائل کے بیان کروں یا یہ کہوں کہ ان میں مرجح کون ہی اور فتویٰ کس پر ہی۔ بلکہ صرف اسقدر دکھلانا ہے کہ انسانیت و حریت معاملات کو کہانتک ملحوظ رکھا گیا ہی۔

اور جن آئمہ نے جس جس مواقع میں حجر و حبس جبراً بیع اموال کی اجازت دی ہی ان کو بھی انسانیت کا لحاظ ایسا ہی ہی۔ مگر ایک عقلی و شرعی قاعدہ نے ایسی اجازت دینے پر مجبور کیا جو یہ ہی کہ ضرر خاص کو ضرر عام کے مقابلہ میں گوارا کرلیا جاتا ہی۔ اس قاعدہ میں سب آئمہ متفق ہیں اور عقل و عرف میں بھی یہ قاعدہ نہ صرف مسلم ہے بلکہ معمول بہ ہی۔ ہر قوم کے قانون عزل میں اسکے دفعات موجود ہیں۔ یہ نہو تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ باوجود اس قاعدہ کے تسلیم کے پھر جو اختلاف ہی وہ اس ضرر خاص وعام کی تشخیص وتعیین میں ہی۔ اور اس میں کہ آیا یہ ضرر اسدرجہ کا ہی کہ بمقابلہ اُس کے انسان کی انسانیت و اہلیت سے قطع نظر کرلی جائے یا نہیں۔

حریت اخلاق و صفات کو شرع نے اس حدتک قائم رکھا ہی جس سے زیادہ نہیں ہوسکتا ہر ایک انسان اپنے اخلاق حسنہ وصفات محمودہ کے استعمال میں آزاد ہے۔ کوئی چیز اسکے حق کو زایل نہیں کرسکتی۔ ہاں جنوں یا سفہ غالب آجائے تو اُسکے اقوال و افعال حرکات وسکنات سبھی ناقابل اعتبار ہوجاتے ہیں اور اسدرجہ میں ملامت ونفرین سے بچ جانے سے مواخذات بھی اُٹھ جاتے ہیں۔ مگر باینہمہ شرع نے ہر ایک صفت وملکہ کے استعمال کے طریقے اور حدود مقرر کردیے ہیں عقلی طور پر بھی حدود مقرر ہیں جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ مگر شریعت میں چونکہ مرضیات الٰہی کا اتباع پیش نظر ہوتا ہے اور اسکی اطلاع محض عقل انسانی سے بلا توسط وحی حقیقی یا حکمی نہیں ہوسکتی اس لیے شرع کے حدود و طرایق میں بھی تفصیل زیادہ ہے اور اسکے ادراک سے بسا اوقات ناقص عقلیں مقصر رہجاتی ہیں لیکن کامل عقول کو عقل شرع کے تطابق میں کبھی بھی دقت پیش نہیں آتی۔

یہ ممکن تھا کہ ہم اسکی تفصیل اس جگہ بیان کردیتے۔ مگر ایسا کرنے میں تطویل بہت زیادہ ہوجاتی۔ اسلیے اس کو چھوڑکر حریت صفات میں سے محض اس حریۃ مصطلحہ کے متعلق کچھ بحث کرنا چاہتے ہیں جس کو عرف عام میں حریت اخلاق یعنی جراۃ وآزادی کہتے ہیں۔ اور اسی حریت پر آج کل زیادہ بحث ہوتی اور اس میں افراط وتفریط کی نوبت آتی ہے۔

حریّت یعنی جرأت اخلاق کے معنی شرع میں یہ ہیں کہ آدمی حق طلب کرنے مسائل کے دریافت کرنے امر حق کے اظہار میں حیا نہ کرے کسی کا رعب و خوف مانع نہ آئے۔ اگر صاحب حق کو طلب حق سے روک دیا جائے۔ کسی کو اظہار حق سے منع کر دیا جائے۔ یا ایسا معاملہ کیا جائے جس سے لوگ رُک جائیں تو مطلقاً حرام ہے اور ظلم صریح ہے۔

اگر خود تقصیر کرے تو اُس کا ذمہ وار و جوابدہ وہ خود ہی جس درجہ کا وجوب و لزوم یا استحباب تھا اسی درجہ کی ذمہ داری ہی۔ دوسرے کی طرف سے بندش یا ممانعت ہو تو ذمہ داری اُسکے جانب اُس درجہ کی ہے جس درجہ کا نقصان اس بندش سے پیدا ہوا ہی۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

خداوند عالم حق سے حیا نہیں کرتا۔	واللہ لا یستحی من الحق

اس کا حاصل یہ ہی کہ افہام و تفہیم میں جس امر کی ضرورت ہو اس کا استعمال کرنا چاہیئے لوم لائم یا طعن و طاعن کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصار عورت کی اسی بنا پر تعریف فرمائی کہ اُنہوں نے مسائل متعلقہ نسوان کو خود آکر دریافت کر لیا۔ نمایشی حجاب و حیا کو اپنے اور اپنے ابنار جنس کے جہل کا پردہ نہ بنایا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

بھلی باتوں کا امر کر۔ بُرائیوں سے منع کر اور جو تجھکو مصیبت پہنچے اُس پر صبر کر۔ یہی بات پختہ امور میں سے ہی۔	وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔

کسی عالم کو بھی یہ جائز نہیں کہ بلا علم صحیح کسی مسئلہ میں فتویٰ دیدے۔ اسکو لا اعلم کہدینا بہتر ہے۔ بلا علم مسئلہ بتلانیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کی نسبت جنہوں نے ایک محتلم کو غسل کا فتویٰ دیا تھا۔ اسی بنا پر فرمایا۔

ان لوگوں نے اُس شخص کو قتل کیا خدا اُن کو قتل کرے جہل کا علاج تو دریافت کر لینا ہی۔	قتلوہ قتلہم اللہ انما شفاء العی السوال۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر ضروریات دین میں سے ہی اُمت محمدیہ کا نشان ہی یہ ہی۔

یامرون بالمعروف وینہون عن المنکر - ان کی تاکید وفضائل اور درصورت ترک وعید شدید سے کتب حدیث مالامال ہیں جن میں سے چند بطور نمونہ ذکر کئے جاتے ہیں - ارشاد فرمایا

وما اعمال البر والجہاد فی سبیل اللہ عند الامر بالمعروف والنہی عن المنکر الا کنفثۃ فی بحر لجی۔

تمام نیک عمل اور جہاد فی سبیل اللہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مقابلہ میں ایسی ہیں جیسے دریائے مواج میں لعاب دہن کی تری۔

عن ابی بکر الصدیق قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الناس اذا رأوا منکرا فلم یغیروہ یوشک ان یعمہم اللہ بعقابہ

ابوبکر صدیق فرماتے ہیں میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا - کہ لوگ جب بُرائی کو دیکھیں اور اُسکے دفعیہ کی کوشش کریں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان سب پر عذاب نازل کردے -

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وہم قادرون علی ان ینکروہ فان فعلوا ذلک عذب اللہ العامۃ والخاصۃ ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ خاص لوگوں کی وجہ سے عام مخلوق کو عذاب میں مبتلا نہیں فرماتا - مگر جبکہ یہ لوگ کسی بُرائی کو اپنے درمیان ہوتے دیکھیں اور باوجود قدرۃ کے نہ اسکو روکیں نہ بُرا سمجھیں بیشک حق تعالیٰ خاص خاص لوگوں کے عمل سے عام لوگوں پر عذاب نازل کرتا ہے -

امر بالمعروف نہی عن المنکر اس درجہ کے ضروری - اُنکے فضائل و مناقب اور درصورت ترک وعید اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہر شخص کو یہ منصب حاصل ہے - ایک معمولی درجہ کا آدمی اپنے سے بڑے منصب والے کو امر بالمعروف کرسکتا ہے اور منکرات کو روک سکتا ہے - اس سے بڑھکر جرأت اخلاق اور حریت کیا ہوگی - مگر شریعت نے جس طرح تمام احکام کے حدود وطرق استعمال مقرر فرمادیے ہیں - امر بالمعروف کیلئے بھی کچھ شرائط وحدود وطرق ہیں - مثلاً یہ شرط ہے کہ نیت اسکی درست وخالص ہو مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہو ریا وسمعہ - اپنی شہرت وعزت طلبی کا دخل نہو - یا یہ کہ جس معروف کا امر کرتا ہے اور جس منکر سے نہی کرنا چاہتا ہے

اُس کے معروف ومنکر ہونے کی دلیل وحجۃ بھی جانتا ہو۔ اور کم سے کم باوثوق علم اُنکے معروف ومنکر ہونیکا ہو ورنہ نفع سے زیادہ مضرت کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ جب آمر وناہی خود اپنے مدعا کی دلیل یا اسکو باوثوق ذریعہ سے بیان نکر سکے گا تو اس کی سعی رائیگان جائیگی دوسرونکی دلیری وجراۃ بڑھے گی۔

یا یہ کہ ماموربہ ومنہی عنہ کے درجات کو جاننا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر ماموربہ واجب ہے۔ امر بالمعروف بھی واجب ہے سنت یا مستحب ہے تو وہ بھی سنت یا مستحب ہے۔ منکر میں یہ دیکھنا ہے کہ جس فعل منکر سے اس شخص کو روکنا چاہتا ہے۔ آیا وہ فعل اُس سے واقع ہو چکا ہے۔ یا واقع ہونیوالا ہے۔ اگر واقع ہو چکا ہے تو اسکا روکنا نہی عن المنکر میں داخل نہو گا۔ بلکہ اب اُس کا کچھ کہنا مذمت علی المنکر میں داخل ہو گا۔ جو گو خود فی حد ذات حسن ہے مگر نہی عن المنکر نہیں ہے۔

یا یہ کہ امر بالمعروف ونہی المنکر کرنے میں اس کو اندیشہ نہو کہ میرا یہ فعل اُس شخص کیلئے اور جرأت واصرار کا سبب بن جائے گا اگر ایسا اندیشہ ہے تو سکوت بہتر ہے۔ خواہ مخواہ اپنی حق گوئی کا اظہار ضروری نہیں ہے۔

یا مثلاً ہر جگہ امر بالمعروف کا ایک ہی طریقہ نہیں ہے۔ باپ کو اگر کسی منکر میں مبتلا دیکھے تو بیٹے کو چاہیے کہ ایک دفعہ نرمی کہدے نہ ملنے تو سکوت کرے بار بار نہ کہے۔ البتہ اُسکے لئے دعا کرے۔

اسی طرح رعیۃ وامام۔ زوج زوجۃ۔ غلام آقا میں اگر ضرورت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ہو تو رعیۃ کے ذمہ امام کی زوجہ کے ذمے زوج کی غلام کے ذمے آقا کے درجات ومراتب کی رعایت ایسی ہے جیسے ولد کے ذمہ والدین کی۔ اُس کے ذمہ اظہار ضروری ہے مگر رعایت ومراتب بھی لازم ہے۔

علیٰ ہذا یہ بھی ضروری ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ رفق ملائمت۔ نرمی وملاطفت کے ساتھ ہو عنف وشدۃ نہ کرے۔ نرمی وملاطفت سے کہنے کا اثر اچھا ہوتا ہے۔ شدۃ وعنف بسا اوقات مضر ہو جاتے ہیں سننے والے میں بجائے انقیاد اصرار بڑھ جاتا ہے ہاں نرمی کام نہ دے۔ اُلٹی جراۃ بڑھائے تو شدۃ وعنف کی ضرورت ہے۔ زبان سے سختی کرے نا ملائم الفاظ استعمال کرے۔ ہاتھ سے کام لے ان سب کی اجازت ہے۔ مگر پھر بھی ایسے لفظ کہنے کی اجازت نہیں ہے جس سے اسپر کوئی فحش الزام لگتا ہو۔ جاہل۔ احمق۔ کودن۔ بیوقوف۔ نادان۔ فاسق وغیرہ الفاظ کہنے کی اجازت ہے۔

زانی۔ حرامی وغیرہ الفاظ کی اجازت نہیں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نصح وموعظہ کو کارگر نہ دیکھا اُنکی قوم کا انہماک شرک وبت پرستی میں بڑھتا گیا۔ تو شدت وعنف کو استعمال فرمایا۔

اُفٍ لکم ولما تعبدون من دون اللّٰہ افلا تعقلون۔

اُف ہی تم پر اور اللہ کے سوا جس کی تم عبادت کرتے ہو اس پر کیا تم نہیں سمجھتے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفق وملاطفت۔ شدۃ وعنف کے مواقع استعمال کا فیصلہ فرما دیا ہی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما وقعت بنو اسرائیل فی معاصی نھتھم علماءھم فلم ینتھوا فجالسوھم فی مجالسھم وواکلوھم وشاربوھم فضرب اللّٰہ بعضھم ببعض فلعنھم علی لسان داؤد وعیسی بن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون فجلس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وکان متکئا فقال لا والذی نفس محمد بیدہ حتی تاطروھم اطرا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بنی اسرائیل معاصی میں منہمک ہوگئے تو علمار نے ان کو منع کیا وہ باز نہ رہے تو علمار نے سکوت کیا انکی ہمنشینی کرتے رہے کھانے پینے میں شریک رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اُنکو باہم ٹکرادیا باہم اختلاف اور قلوب میں منافرت وعداوت پیدا ہوگئی ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے داؤد وعیسیٰ علیہما السلام کے ذریعہ سے لعنت بھیجی۔ یہ کیوں ہوا اسلئے کہ وہ نافرمانی کرتے اور حدود سے تجاوز کرتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے یہ فرماکر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا قسم ہی اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کا نفس ہی تم کبھی معذور نہ سمجھے جاؤگے جبتک ان پر زبردستی کرکے نہ روکوگے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

کلا واللّٰہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر ولتاخذن علی یدی

قسم ہے اللہ کی۔ ہرگز تم معذور نہیں ہوسکتے۔ تم کو امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنا ہوگا۔ تم کو ظالم کا ہاتھ پکڑ لینا ہوگا۔ تم اُس کو

الظالم ولتاطرنه على الحق اطرا ولتقصرنه على الحق قصرا او ليضربن الله بقلوب بعضكم على بعض ثم ليلعنهم كما لعنهم۔	حق پر قائم رکھنے کے لئے جبر و زبردستی کروگے۔ ایسا نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں اختلاف پیدا کردیگا۔ تم آپس میں لڑمروگے اور پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت ہوگی۔ جس طرح بنی اسرائیل پر۔

اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تمام نصوص کے جمع کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اول ملاطفت ونرمی ہی اور پھر شدة وعنف ہر ایک کا موقع ہی۔ ہاں ایک وقت ایسا بھی مایوسی کا آتا ہے جب نرمی ورفق۔ شدة وعنف دونوں سے کام نہیں چلتا۔ کوئی سُنتا ہی نہیں۔ کوئی ذریعہ و قوت مجبور کرنے کی نہیں ہی تب حکم ہی۔

فعلیك بخاصة نفسك	تجھکو خاص اپنے نفس کی فکر چاہیئے۔

حرّیت ذات وصفات ومعاملات کے متعلق ہم نے بہت اجمال کیساتھ بعض احکام شرع کی تفصیل بطور نمونہ بیان کی ہے۔ اسے دیکھ کر عاقل منصف کو فیصلہ شرع وفیصلہ قوانین و رسوم اہل دنیا میں موازنہ کرلینا چاہیئے انشاء اللہ تعالیٰ صاف صاف واضح ہوجائیگا کہ شرع نے جس حد تک ہر قسم کی حریتوں کو قائم رکھا ہے کسی قانون نے نہیں رکھا۔ اور نہ کسی ملک کے رسم و رواج میں ایسا ہی۔ بہت سی اُن اُمور کو جو قوانین سلطنت میں داخل ہیں اور درحقیقت اُن سے حریت میں فرق پڑتا ہے اور کوئی مجبوری عقلی یا عرفی اُن کے اختیار و پسند کرنیکی نہیں ہی شریعت نے اُن کو مٹا دیا ہے اور جہاں کہیں سخت ضرورت سے ان حریتوں کے زوال یا نقصان کے احکام صادر کئے ہیں وہ بہت ہی احتیاط کے ساتھ دوسرے ایسے قواعد پر مبنی کئے ہیں جو عقل وعرف میں مسلم ہیں۔ ہر جگہ افراط وتفریط کے پہلو سے احتراز کیا ہے۔

اس تمام عرض ومعروض کے بعد اب ہم اصل مسئلہ حریتہ کو بطور نتیجہ لکھتے ہیں عرف عام میں حریتہ کا استعمال آج کل حریتہ اخلاق پر آتا ہے اور حریتہ اخلاق کے مفہوم میں بھی تمام اخلاق حسنہ

دخل نہیں ہیں۔ کوئی شخص اپنے تمام اخلاق و ملکات حمیدہ سے کام نہ لے۔ بلکہ بجائے اُن کے ملکات ذمیمہ کو
کام میں لائے تو اس کی طرف دھیان نہیں ہوتا۔ ہاں اظہار مافی الضمیر اور اظہار رائے میں حر و آزاد ہو۔ کسی کے
لعن و طعن کی پرواہ نہ کرے کسی کا خوف و اندیشہ اُس سے مانع نہ آئے۔ جو کام کرنا چاہے سلطنت کے
حقوق کی رعایت نہ کر کے بلا دھڑک کر گذرے۔ ایسے شخص کو سراہا جاتا۔ اُسکی حریت و آزادی کی تعریف کی
جاتی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ ایسی مطلق آزادی ہرگز مفید نہیں ہے۔ بسا اوقات مضر اور
سخت مضر پڑ جاتی ہے ایک طرف خود اس آزادی و حریت کے مدعی اور اُس کے ثنا خواں ہوا خواہوں کو
دوسری جانب سلطنت و حکام کو جو رعایا کی جان و مال ننگ و ناموس کے محافظ ہیں تیسری جانب ملک و
اہل ملک کو یہ لوگ اس وجہ سے کہ اُنہوں نے حریت کے مفہوم و حدود و طرق استعمال کو نہیں سمجھا افراط و
تفریط میں مبتلا ہو گئے۔

اخلاقی حریت میں جیسے کہ تفریط نہایت معیوب و مذموم ہے۔ اگر سلطنت نے زبان بند کر دی قلم روک
دیے۔ تو اس سلطنت کی بنیاد نہایت سست و ضعیف ستونوں پر قائم ہے۔ اگر خوشامدیوں نے سلطنت
و حکام کو اس کا خوگر بنا دیا تو وہ دنیا و آخرت میں رو سیاہ قابل ہزار نفرین و ملامت ہیں ملک کے تباہ کرنیوالے
حقوق کو پامال کرنیوالے سلطنت و حکام کو گمراہ کرنے والے ہیں۔

ایسے ہی افراط بھی مہلک ترین مرض ہے اس کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ سلطان و قوانین سلطنت کے حقوق کی
حرمت قلب میں باقی نہیں رہتی۔ مواقع حریت اور اُسکی حدود کو نہیں سمجھتے۔ یہ نہیں جانتے کہ کونسا موقعہ زبان کھولنے
رائے دینے نکتہ چینی کرنیکا ہے اسکی تمیز بھی اُن کو نہیں رہتی کہ اس کا اہل کون ہے۔ کس میں مادہ اظہار رائے کا ہے
کون وہ ہے جس کو مقلد محض بنکر ارباب رائے کا اتباع کرنا چاہیئے۔ اس زمانہ کی سمی ہوا نے حریت کا ایسا عام سودا
دماغوں میں بھر دیا ہے۔ کہ بیٹے کے دل میں باپ کا احترام باقی ہے نہ شاگرد کے دل میں اُستاد کا ادب نہ رعایا کے
دلمیں حکام کی عظمت نہ قانون کی قدر و منزلت۔ نہ حقوق کی نگہداشت۔ نہ اہل حقوق کی حق شناسی ایک
عام طوفان حریت کا ہے جس نے انسان کو بہیمیت کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ حریت حقیقی وہی ہے جو افراط و تفریط سے
خالی ہو ورنہ یہ حریت جو زبان زد عام و خاص و ممدوح خلائق ہے تباہی کے کنارہ پر پہنچانیوالی ہے بہتوں کو پہنچا دیا ہے

اور پہنچا رہی ہے۔ جگہ جگہ انقلابات کی دھوم اس مفروضہ حریت کی بدولت ہے۔
ہمیں زمانہ حال کی حریت پر ایک مزیدار حکایت یاد آگئی۔ جو ہمارے مکرم و معظم مولانا محمد حسن صاحب مرادآبادی مقیم بھوپال نے چشم دید بیان کی ہے۔ مولانا موصوف چندسال ہوئے عازم حج بیت اللہ ہوئے شام سے بذریعہ جہاز ریلوے سفر کیا۔ راستہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک مسافر نے گاڑی کا تختہ اُٹھا کر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ چاہتا تو اُترکر پیشاب کرسکتا تھا۔ یا گاڑی میں جو جگہ اسکے لئے بنی ہوئی تھی اُس میں جاسکتا تھا۔ مگر سودا حریتہ و مطلق العنانی نے اتنا موقع نہ دیا۔ اس صورت میں گاڑی کا نقصان۔ اور مسافروں کے لئے خطرہ تھا۔ مگر کسی امر کی پروانہ کی۔ آخر مسافروں نے اُس سے کہا تو جوش اور مسرت کے لہجہ بولے۔ الحریت دنیا حریتہ گاہ ہے۔ سبحان اللہ کیا حریتہ ہے۔ اور کیا خوب حریتہ کے معنی کو سمجھے۔ اور اچھے موقعہ میں اُس کا استعمال کیا۔ ایسے ہی حریتہ پر آجکل فخر کیا جاتا ہے اور اسی حریتہ پر بڑے بڑے خطابات دیے جاتے ہیں۔ رئیس الاحرار فدائے ملک بننے کیلئے شہرت و عظمت حاصل کرنے کیلئے کوئی ایسا فعل کر لینا کافی ہے۔ جس سے ایک تہہ ملک بھرآوازِ حریتہ و فداکاری سے گونج جائے۔ اصل معاملہ کی تحقیق کرنیوالا۔ موقع و محل کو دیکھنے والا۔ ایسے کرنیوالوں کی حالت و معاملات اصلیت و قابلیت کو جانچنے والا کون ہے۔ اور پرکھنے والا کون۔ شریعت کے اصل اُصول شرط۔ خلوص و ہمدردی کی جانچ و پرکھ کی نوبت تو کہاں ہو آتی فاعتبروا یا اولی الابصار۔
کہاں آجکل کا طرز عمل۔ کہاں شریعت کے اصول۔ کہاں سلف صالح کا طریقہ استعمال ہمارے اصلی مضمون اشاعت اسلام میں بذیل واقعات گذشتہ اوراق میں بیان ہو چکا ہے کہ معرکہ قادسیہ میں بعذر علالت کی وجہ سے سپہ سالار اعظم حضرت سعد ابن ابی وقاص گھوڑے پر سوار ہو کر شریک معرکہ نہ ہو سکے تو ایک شخص نے اُن پر تعریض و اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا۔

فأبنا وقد آمت نساء کثیرة	ونسوة سعد لیس منهن ایم
ہم معرکہ سے اس حالت میں واپس ہوئے کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئی تھیں	مگر سعد کی عورتوں میں کوئی بیوہ نہ تھی

حضرت سعد نے سن کر فرمایا کہ الٰہی اگر اُس نے بطور ریا و سمعہ کے ایسا کہا ہے تو اُس کی زبان بند کر دے۔ دعا مقبول ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ایک تیر اُس شخص کے منہ پر لگا جس سے زبان بند ہوگئی

اب ہم اس مسئلہ حریت و مساوات کو اس جگہ ختم کرتے ہیں اگرچہ اس میں بہت سے پہلو ابھی قابل بحث تفصیل باقی ہیں۔ مگر جس قدر لکھا گیا ہے اُسکی وجہ سے بھی طول ہوگیا۔ زیادہ لکھنے میں حد سے زیادہ طول ہو جاتا۔ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوا تو ہم کبھی بسلسلہ تعلیمات اس کو مستقل رسالہ میں ذرا زیادہ تفصیل و توضیح کے ساتھ درج کرینگے۔ واللہ الموفق۔

ہم نے مسئلہ غلامی کی حقیقت کو بیان کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ناظرین ایفاء وعدہ کے منتظر ہونگے اس لئے بخیال ایفاء وعدہ چند سطروں میں مجملاً اس کو بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ تحقیق و تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی گنجایش اُس کیلئے دوسرے وقت کا انتظار کرنا چاہیئے۔

مسئلہ غلامی کی وجہ سے اسلام پر بڑے بڑے اعتراض کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ منشاء اعتراض کیا ہے اور کیوں ایسا کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تو معترضین نے کبھی غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ اگر ذرا بھی غور و فکر کرتے۔ تو بجائے اعتراض کرنیکے اسلام کی برگزیدہ خصوصیات کے اور زیادہ قائل ہو جاتے۔ ان لوگوں کو چند امور ذیل ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

(۱) انسان اصل فطرت سے باوجودیکہ آزاد و مالک و مختار پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اُس کی یہ حریت کبھی قدرتی اسباب سے اور کبھی اختیاری افعال و حرکات سے زائل یا ناقص بھی ہو جاتی ہے۔

(۲) جس قدر حریت اُسکو عطا ہوئی ہے عقلاً عرفاً شرعاً اُسکے حدود و طرق استعمال مقرر ہیں۔ گو عقل و عرف اور شرع کے حدود و طرق استعمال میں فرق و تفاوت ہو۔ مگر اتنی بات میں اتفاق ہے کہ انسان آزاد مطلق ہو کر اپنی حریت کو ہر وقت استعمال میں نہیں لا سکتا۔

(۳) کسی کی حق تلفی کے وقت اس فطری حر و آزاد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ جو ایک نہایت حقیر و ذلیل چوپایہ کے ساتھ اُس سے وہی کام لئے جاتے ہیں جو بہائم سے۔ اُس کے منافع کو اسی طرح کام میں لیا جاتا ہے۔ جیسے اموال کے منافع کو۔ اُسکی ذات کیساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو بہائم یا اموال منقولہ و غیر منقولہ کے ساتھ۔

(۴) مجرم کو سزا دینے میں جرم کی نوعیت اور مماثلت کا خیال کیا جانا عقل و عرف میں ضروری ہی اور شریعت نے تو اسکی بہت ہی رعایت کی ہی۔

(۵) پولیٹیکل مجرموں کے اور باغیوں کی سزا میں اور معمولی مجرموں کی سزا میں بہت بڑا فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے جس شخص پر جرم بغاوت یا پولیٹیکل سازش کا الزام لگتا ہی اُس کی سزا بجز سزائے موت یا عمر بھر جلا وطنی کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ اگر ایسے لوگوں کا جرم معاف بھی کیا جاتا ہی تو اُسی حالت میں جبکہ اُن کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ اور ایسا کرنا مصالح ملکی کے خلاف نہو۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ اگرچہ دونوں قسم کے مجرموں میں قانون وقت سے انحراف ضرور ہے اور اُسکی وجہ مادہ عصیان وخلاف۔ یا تمرد و سرکشی ہے۔ مگر اتنا فرق ہی کہ معمولی مجرم گو قاتل یا سارق یا دھوکہ باز یا جعل ساز ہی ہوں مگر اُن کا یہ فعل رعیت کے کسی ایک فرد یا چند افراد کے مقابلہ میں ہوتا ہے سلطان وقت سے انحراف نہیں ہوتا۔ بخلاف پولیٹیکل مجرموں اور باغیوں کے کہ اُن کا تمرد و عصیان بمقابلہ سلطان اور قانون سلطان ہوتا ہے۔ یہ شخص سلطان کے حق و تفوق و برتری۔ اُس کی قوت و شوکت کو مٹا دینا چاہتا ہے۔

(۶) خداوند عالم تمام عالم کا خالق و مالک ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے اُس کی ملک ہے جس کو جس قسم کا اختیار ہے اُس کا عطیہ ہے۔ جو حق ملکیت ہی۔ اُس کی طرف سے نیابتاً ہی حقیقۃً وہی مالک ہے اُسکے سوا سب کی ملکیت تصرفات و اختیارات مجازی ہیں۔

جب امور مذکورہ بالا ذہن نشین ہو چکے تو اب سُنئے کہ خداوند عالم نے تمام دنیا کو انسان اور جن کے فائدہ کیلئے پیدا کیا ہے اور انسان کو عقل و علم کے ساتھ حق نیابۃ و سلطنت و حکمرانی بخشے کر اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اسکی خدائی کا اعتراف کرے۔ اُس کے سامنے جبین نیاز رگڑے۔ اپنے آپکو عابد اور اُس کو معبود سمجھے۔ اُس کو خالق و رازق جانے اُس کے سوا سب کو محتاج سمجھے۔ اُس کے احکام کی اطاعت کو واجب سمجھے۔ اُس کی رحمت کا متجسس اور اُس کے عقاب سے خائف و لرزاں رہے۔

اب اگر کوئی شخص خداوند عالم کو خالق و واجب الاطاعت تو جانتا ہے۔ مگر اُس کے احکام کی اطاعت میں کوتاہی کر بیٹھتا ہی۔ تب اُس کا حکم وہی ہے جو معمولی مجرموں کا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کیلئے موافق نوعیت جرم سزا مقرر ہے اور اگر بادہ بغاوت و تمرد سے خدا کی خدائی کا منکر ہے اُس کے قانون کو قابل اتباع واجب الاطاعت نہیں سمجھتا تو یہ شخص باغی ہے اُس کی سزا وہی ہونی چاہیے جو ایک پولٹیکل مجرم اور باغی کی ہوتی ہے۔ مادہ بغاوت و تعنت سرکشی و تمرد و طغیان حد سے گذر کر خدا اور اُسکے انبیاء سے جہاداً مقابلہ کی ٹھہرا دیتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کے یہاں سے بمناسبت نوعیت جرم یہ سزا ملتی ہی کہ اُسکی ذاتی آزادی و حریت یک لخت مسلوب ہو جاتی ہے اُسکو خدا کا بندہ بننے سے انکار ہوتا ہی جس کی سزا میں بطور نیابت خداوندی بندوں کا مملوک بنا دیا جاتا اور اُسکی انسانیت کو مغلوب کر کے مثل بہائم اموال میں داخل کر کے بیع و شرا کی اجازت دیدی جاتی ہی۔ اُس کے تصرفات غیر معتبر قرار دیدیے جاتے ہیں اور یہ محض اُس حق خداوندی کی انکار اُسکی خالقیت و مالکیت سے تمرد و عصیان کی سزا ہے۔ اور یہ سزا بالکل اُسی طرح کی ہی جیسے راس المتمردین شیطان لعین کو دی گئی۔ اُس نے خداوند کے حکم تسلیم کرنے سے انکار و تمرد کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے سے کمتر سمجھ کر سجدہ کرنے سے انکار کیا جس کی سزا یہ ہی کہ بنی آدم کے ورغلانے اُن کو معاصی و کفر میں مبتلا کرنے کا ذلیل کام اُس کے سپرد ہوا۔ وہ کٹنیوں کی طرح لوگوں کو فواحش پر جمع کرتا پھرتا اور اسی کو اپنی کامیابی سمجھتا ہی ایک شاعر نے اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے ؎

تاہ علی آدم فی سجدتہ	فصار قوادً الذریتہٖ
آدم کو سجدہ کرنے میں تو نخوت کی	لیکن اُن کی اولاد کا دلال و کٹنا بنگیا

لیکن یہ سزا بھی مجبوری کے درجہ کو وہی جاتی ہی۔ اگر کسی حد تک بھی احکام خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کر کے نائبان خدا سے عہد و پیمان کر کے رہنا گوارا کرے تب بھی اُسکی آزادی برقرار رکھی جاتی ہے۔

چونکہ اُس کی مملوکیت بمقابلہ حق خداوندی ہی۔ مخلوق کو بجز اسکے کہ نائبانہ حیثیت سے اُس کے

اُس پر قبضہ کریں اور مثل وکیل اُسکی بیع و شرا کریں اور کسی قسم کی دسترس اُن پر نہیں دی گئی۔ بلکہ اُنکے ساتھ ہر قسم کی رعایت و مراعات کرنیکا حکم دیا گیا۔ شریعت نے ممالیک کی رعایت و محافظت حقوق کے جو احکام ہمکو تبلائے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اُس غلامی پر آجکل کی ہزار آزادی قربان ہے۔ سزای مملوکیت برائے نام ہے۔ اوّل تو غلاموں کے آزاد کرنیکے اجر و ثواب اسقدر تبلائے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا محض تنبیہ و تادیب الیقاظ و تندیم کیلئے ہے۔ اُن کو دواماً ربقۂ غلامی میں رکھنا مطلوب نہیں ہے۔ ورنہ اعتاق کے اتنے فضائل بیان نہ کئے جاتے ظاہر ہے کہ ہر مسلمان سے جس قدر بھی ممکن ہوگا۔ ان فضائل کو دیکھتے ہوئے اس عمل صالح کی طرف رغبت کریگا۔ کفارہ صوم کفارۂ ظہار وغیرہ میں سب سے اوّل تحریر رقبہ کو رکھا گیا اسی بنا پر صلحائے اُمت نے بیش از بیش اس عمل صالح کی طرف رغبت کی۔ ہزاروں غلام محض آزاد کرنے کیلئے خریدے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر سب مسلمان اسی طرح راغب ہوں تو دنیا میں ایک شخص بھی کسی کا مملوک بن کر نہ رہے۔

اس کے علاوہ جبتک وہ رقبۂ غلامی میں ہیں۔ اُن کے ساتھ معاشرت میں مساوات کے احکام جاری فرمائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے آخری خطبہ میں جو وصیتیں فرمائیں اُن میں نماز کی محافظت کیساتھ حق ممالیک کی رعایت کو بھی ارشاد فرمایا۔

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم — حفاظت کرو نماز کی اور اپنے ممالیک کی۔

شریعت کا حکم ہے کہ جو ہم کھائیں وہی اُن کو کھلائیں۔ جو خود پہنیں وہی اُن کو پہنائیں اُن سے ایسی خدمت نہ لیں جس سے اُن کو کلفت و مشقت پہنچے۔ اُن کی خطاؤں و لغزشوں میں درگذر کریں۔ ضرب و شتم سے احتراز کریں۔ اگر مارنیکی ضرورت پیش آوے تو جیسے اولاد کو تادیباً سزا دیجاتی ہے اس سے زیادہ نہ ہو۔ اگر غلام کو تعدی سے ضرب و شتم کرے گا۔ قیامت کے دن اُس سے قصاص لیا جائے گا۔

سلف صالح اسی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے غلام کا کان اینٹھ دیا۔ فوراً ندامت ہوئی اور غلام سے فرمایا تو بھی میرا کان اینٹھ دے

غلام نے انکار کیا تو آپ نے اُس کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔
اس قسم کے احکامات ہیں جن سے کتب اہلِ اسلام مالامال ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اس عرض کو سمجھنے کے بعد سمجھ لیجیے کہ اسلام کی غلامی کیا ہے اور اُس پر کونسی وجہ اعتراض کرنے کی ہی ہم کو اپنے حقوق کے مقابلہ میں آزادی کو سلب کرنا مثل بہائم اُن کا تبادلہ و تقید کرنا تو جائز ہو اور بمقابلہ حق خداوندی اجازت نہو۔

اور پھر یہ بھی خیال کر لیجیے کہ شریعت اسلام نے اُن کے حقوق کی نگہداشت کہانتک کی ہے باوجود مملوکیت اُن کی جان کی حفاظت احرار کی برابر رکھی ہے۔ اس معاملہ کی اجازت نہیں دی۔ جو بعض متمدن ممالک میں کالے رنگ کی رعایا کیساتھ کیا جاتا ہے۔

ہم مسئلہ غلامی میں اسقدر لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ زیادہ لکھنے کیلئے مستقل تحریر کی ضرورت ہے اہلِ انصاف کیلئے اتنا بھی کافی ہے۔ واللہ الموفق والهادی۔

مسئلہ حریت و مساوات کا تذکرہ بذیل حالات سیف اللہ آ گیا اور جس قدر اس موقع پر تفصیل و توضیح کر دی گئی اس سے زیادہ کبھی اُس وقت لکھا جائیگا جبکہ اس مسئلہ کو مستقلاً کسی رسالہ کی صورت میں شائع کیا جائیگا۔ یہاں پر تو اسکو ختم کر کے اصل مقصود کی طرف عود کرتے ہیں۔

حضرت سیف اللہ کے حالات میں سے چار فوائد ہم بیان کر چکے ہیں۔ اُن کے طویل الذیل حالات میں سے اور بھی بہت سے فوائد مستنبط ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہم اُس کے درپے ہوں تو یہ مضمون جواب بھی بہت زیادہ طویل ہو گیا ہے بہت زیادہ مبسوط ہو کر اصلی غرض سے دور ہو جائیگا۔ اس لئے صرف ایک فائدہ خامسہ کے بیان پر قناعت کر کے تذکرہ حالات سیف اللہ کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

فائدہ خامسہ۔ فتوحات شام و عراق میں حصہ لینے والے عساکر اسلامیہ کی تعداد ساٹھ ستر ہزار سے کم نہ تھی اس اسلامی فاتح و جرار عسکر میں ہر طبقہ کے مسلمان موجود تھے۔ مہاجرین اولین۔ انصار قدیم الاسلام و متاخر الاسلام صحابہ۔ قبائل عرب کے جدید الاسلام۔ ابناء مہاجرین و انصار جن کو

درجۂ صحابیت حاصل ہوا اور بہت سے وہ بھی جو فتنۂ ارتداد میں شریک ہو کر مسلمانوں سے نبرد آزما ہوئے
اسلام کی صریح مخالفت و بیکنی کر چکنے کے بعد پختہ کار مسلمان ہوتے اور ان معرکوں میں حصہ دار
بنے ایک بڑی جماعت تابعین کی تھی جن کو صحابہ کا فیض صحبت نصیب ہوا تھا غرض مختلف اقسام
مختلف قبائل۔ مختلف سن و سال مختلف طبائع و امزجہ سے مرکب یہ اسلامی لشکر تھا۔ ایک ایسے
مجمع میں ناممکن ہے کہ طبائع کا اصلی رنگ ظاہر نہ ہو کیسا ہی کچھ مزاج کو بنا لیا جائے۔ تہذیب و اخلاق کا
پابند کر لیا جائے مگر طبعی اخلاق و ملکات کا ظہور نہ ہو۔ ممکن نہیں۔

ہم اس اسلامی لشکر پر جو مختلف عناصر سے مرکب تھا اول سے آخر تک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم
ہوتا ہے کہ جتنے مہذب اخلاق تھے اُن کی طبیعت بن گئے تھے اسلامی تعلیم نے اُن کے ملکات
کی اس قدر اصلاح کر دی تھی کہ بال بال اُن کا شریعت میں بندھا ہوا تھا حدود شریعت سے ایک
قدم ادھر اُدھر نکالنا ناممکن تھا۔ اخلاق و معاملات کا یہ حال کہ عرب کے خشک ریگستان کے رہنے والے
ایسے جنت نظیر ممالک کو فتح کر کے اپنا قدم جماتے چلے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے سامان راحت و عزت
اُن کو میسر آتے ہیں اُن ممالک کے سکان بطور رعیت اُنکے سامنے آتے ہیں یا بحیثیت مفتوح و مقہور
قوم کے لیکن تاریخ میں کہیں اس کا ثبوت نہیں کہ مسلمانوں نے شریعت سے قدم باہر نکالا ہو کسی پر
کسی معاملہ میں ذرا بھی جبر و تشدد کیا ہو۔ کسی پر دباؤ ڈال کر کوئی چیز حاصل کی ہو کسی کے مال و متاع
پر نظر کی ہو وہ سب کے سب ایک تعلیم گاہ کے شاگرد۔ ایک خانقاہ کے مستفید تھے اُسی ایک طریقہ
غراشریعت پر قائم و مستقیم تھے قواعد شرعیہ سے جس قدر اُن کو اجازت تھی اُتنے ہی پر عملدر آمد
تھا اور پھر اس جرار عساکر اسلامی کے قواد و امراء کون تھے امین الامۃ ابو عبیدہ سیف اللہ خالد بن الولید مثنیٰ ابن
حارثہ جن کے حالات ابھی ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان سے اوپر مسند خلافت پر کون متمکن تھے صدیق اکبر
فاروق اعظم جنکی شان کا اندازہ ابھی ابھی آپ کو ہمارے بیانات سے ہو چکا ہے جو احکام ظاہری شریعت سے
سر مو تجاوز کو کیا گوارا کرتے باطنی حالات و معاملات میں بھی کسی قسم کی تغیر یا انقلاب کو جو فی الحال پیش آئے
یا مآلاً اسکو بھی روا نہ رکھتے تھے جن کی شانِ صلابت نے اس کی اجازت نہ دی کہ سپہ سالار اعظم سیف اللہ

کے معاملہ میں ذرا بھی نرمی برتی جائے۔ اب ذرا انصاف سے دیکھئے۔ ایسی قوم ایسے فاتح لشکر ایسے نفوس مقدس ایسے مہذب و مؤدب ایسے پابند احکام شرع و مطیع امراء و قواد ایسے باہمہ و بے ہمہ افراد جنکی شان

ملوک فی النہار و رہبان باللیل ہو | (دن میں بادشاہ رات میں راہب و عابد)

اُن کی تسخیر اخلاق کس درجہ پر ہوگی کیا دنیا میں کوئی سنگدل ناحق پژوہ ایسا بھی ہی جو اس برگزیدہ قوم اور فاتح عسکر کے شبانہ روز حالات دیکھے اور اس کا دل متاثر نہو۔ اس جماعت کی محبت اُس کے دل میں نہ آئے۔ ناممکن ہے۔

محسن کی محبت صاحب کمال کے کمال کا اعتراف اُن اُموریں سی ہے جو بے اختیار دل میں جاگزین ہوتے ہیں آدمی خود بھی اُن کو دفع کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی تدبیر کرتا ہے کہ دل تک یہ اثر نہ پہنچے مگر پچکر رہتا ہے اور وہی دل جو کسی وقت عداوت سے لبریز بغض و نفرت کا مرکز تھا اُنس و محبت عشق و ولولہ کا مظہر بن جاتا ہے۔ اُس کے جوارح و اعضاء سے عجبانہ افعال و حرکات بے اختیارانہ صادر ہونے لگتے ہیں

تلوار کا زور حکومت کا رعب آدمی کو مطیع بنا سکتا ہے لیکن محب و جانباز والہ و شیدا نہیں بنا سکتا۔ جوارح کو منقاد کرسکتا ہی لیکن قلوب کو مسخر نہیں کرسکتا۔ یہ کرامت صرف اخلاق و معاملات کی ہو کہ دل مسخر ہوتا ہے۔ اعضا و جوارح کو جو سرکش بنے ہوئے تھے رفتہ رفتہ رام ہو کر بے درم خریدہ غلام بن جاتے ہیں۔

دیکھئے فتح مکہ کیوقت جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ میں داخل ہونے کیلئے عثمان بن طلحہ ابن عبد الدار سے مفتاح بیت اللہ کو لینا چاہا تو اُس نے بوجہ سخت بغض و عداوت کے جو ذات مقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھتا تھا انکار کر دیا اور نہایت مستعدی و تمرد سے کہدیا کہ ہرگز کسی کو میں کنجی ندوں گا البتہ اگر میں جانتا کہ رسول اللہ ہیں تو بے تامل کنجیاں دیدیتا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُس کا یہ انکار کیا اثر رکھتا تھا۔ اشراف قریش کی مجتمع قوت تو آپکے مقابلہ میں کچھ کام دے ہی نہ سکی یہ بیچارہ تنہا کیا کرتا۔ مگر بغض قلبی سے مجبور تھا۔ اُسکی عداوت کا سبب فقط اختلاف ملت ہی نہ تھا بلکہ اعزہ و اقارب کا جنگ بدر میں مقتول ہونا ایسا اسباب تھے جن کو کبھی دل سے مٹا ہی نہ سکتا تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دیکھا کہ نرمی

و ملاطفت سے کنجیاں نہیں دیتا تو آپنے اُس کے ہاتھ کو مروڑ کر چھین لیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اُسی وقت آیہ شریفہ۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا | خدا تعالیٰ تم کو حکم کرتا ہی کہ تم امانتوں کو اُن کے مستحقوں کے حوالے کر دو۔

نازل ہو گئی آپنے اُسی وقت یہ ارشاد فرما کر کہ "یہ کنجیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم کو دیجاتی ہیں" کنجیاں اُس کے حوالے کر دیں۔ اسی ارشاد کا یہ اثر ہے کہ مکہ مکرمہ میں اُس وقت سے اس وقت تک ہزاروں انقلاب ہوئے سینکڑوں حکومتیں بدلیں۔ کل مروانیوں کی حکومت تھی اور اُن کے نائب حرمین میں رہتے تھے تو آج عباسیوں کی حکومت ہی کبھی عبیدی حکمران تھے تو کبھی ایوبی۔ کبھی سلجوقی دودمان کا خطبہ پڑھا جاتا تھا تو کبھی خاندان زنگی کا۔ اسی طرح کبھی بنی حسن کی اولاد میں سے کسی ایک خاندان میں نقابت و شرافت تھی تو کبھی دوسرے میں۔ غرض اسی طرح کے گوناں گوں انقلاب ہوتے رہے مگر بنی شیبہ کی کلید برداری و حجابت بیت اللہ میں کچھ انقلاب و تغیر نہوا۔ ہر زمانہ میں یہی کلید بردار و حاجب بیت اللہ رہے اور اب بھی وہی ہیں۔ چنانچہ اسی اختصاص و امتیاز کی وجہ سے کلید بردار بیت اللہ کا مختص لقب شیبی ہو گیا ہے۔ اس طرح کے تمرد و عصیان سرکشی و طغیان کے بعد اس ملاطفت سے کنجیاں عطا فرمانا اور وہ بھی بحکم خداوندی ایسا نہ تھا کہ دل پر اثر نہ کرتا۔ فوراً اُس کے قلب پر ایمان کا اثر پہنچ گیا۔ دل میں محبت آئی تو زبان نے فوراً اُس کا ساتھ دیا اور بے اختیار بول اُٹھا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور اُسی وقت ایک سچا اور پکا جاں باز و جاں نثار مسلمان بنگیا اللہ اکبر کہاں وہ بغض و عداوت جس کے اسقدر اسباب تھے کہ جن سے کبھی بھی قطع نظر نہیں کر سکتا تھا کہاں یہ محبت و فریفتگی فرمایئے تو سہی یہ تلوار کا اثر تھا۔ حکومت کا زور تھا۔ یا اخلاق کی تسخیر اور معاملات و حالات کی تاثیر۔ زور تو اتنا ہی تھا کہ بجبر اُس کے ہاتھ سے کنجیاں لے لیں لیکن انصاف سے کہئے کہ اس کا اثر اُس پر کیا ہوا تھا۔ محبت پیدا ہوئی تھی یا دیرینہ عداوت میں ترقی ہوئی تھی پھر دفعتہ یہ کایا کیسے پلٹ گئی۔ اسی وجہ سے کہ وہی فاتح جو ابھی ابھی بزور کنجیاں لے چکے تھے بامر خداوندی اُس کو کنجیاں واپس ہی نہیں دیتے۔ بلکہ خالداً

خالداً کی بشارت بھی دیتے ہیں یعنی اب تمہارے خاندان سے یہ خدمت کبھی منتقل نہ ہوگی۔ کسی قوم کو حلقہ بگوش اسلام بنانے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ترغیب و ترہیب کا حال تو ابھی معلوم ہو چکا کہ اُس کا نام ونشان نہ تھا کسی قسم کا دباؤ یا زور نہیں دکھلایا گیا اور نہ اُس مفتوح و مقہور کیلئے قانون کی صورت میں جبر و تشدد کو نافذ کیا گیا۔ جو حقوق ایک مسلمان کے تھے وہی اُس مفتوح رعایا کے تھے۔ ترغیب کا حال یہ تھا کہ اُن کو اسلام لانیکے لئے کسی طرح کا لالچ یا طمع دنیاوی کا کوئی معمول نہ تھا نہ اُنکے لئے وظائف مقرر کئے گئے۔ نہ اسلامی مشن اور مدارس کھولے گئے کہ نوعمروں عورتوں بیکسوں اور مفلسوں کو داخل کر کے اسلام کا خوگر بنایا جائے۔ ہاں ترغیب تھی تو اسقدر کہ اُن کو جنت اور نعیم آخرت کی طرف عام توجہ دلائی جاتی تھی۔ اسلام کی برکات سے اُن کو مطلع کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی کسی خاص انداز و پیرایہ میں نہیں۔ بلکہ عام نذار کے ذریعے سے جس سے کلام الٰہی بھرا ہوا ہے۔ ترہیب تھی تو یہ کہ دوزخ اور اُس کی تکالیف سے اُن کو ڈرایا جاتا تھا۔ عذاب آخرت دائمی مصائب سے متنبہ کیا جاتا جس کو سن کر کوئی فہیم و عاقبت اندیش اسلام کی طرف مائل ہو جائے۔ اُس کی خوش قسمتی مسلمانوں کی طرف سے منوالنے اور بجبر سمجھانے کا کوئی پہلو اختیار نہ کیا جاتا تھا۔

ان حالات کے ساتھ اسلام کا اثر بسرعت پھیلتا چلا گیا۔ وہی اقوام جو برسر پیکار تھیں ان معاملات کو دیکھ کر نہ صرف مسلمان ہو گئیں بلکہ دین کو ثریا پر سے اُتار لانے کی قایل بن گئیں۔ تو اس کو اسلام کی کھلی کرامت اور اخلاق کی واضح و بین تسخیر کیوں نہ سمجھا جائے۔ ہاں اگر ایک دو مثال سے معلوم ہوتا کہ اس اسلامی کثیر التعداد فاتح مظفر و منصور و مقبول لشکر کے طرز عمل سے کسی ایک دو پر جبر و تشدد سے اسلام کی بنیاد جمائی تو پھر یہ قیاس آگے بھی چلتا۔ یہاں تو حال یہ تھا جو پہلے بیان کیا کہ حد شریعت سے قدم نکالنا ممکن نہ تھا۔ نرمی و ملاطفت تھی تو احاطہ شرع کے اندر سختی و شدۃ تھی تو اُس کی حد میں اور پھر اُس سختی ذمی میں مسلم و غیر مسلم شریک بلکہ مسلم کی ذرا سی لغزش پر زیادہ گرفت ہوتی تھی۔ اس کے بعد بھی کوئی سنگدل ناانصاف اسلام کے اعجاز و کرامت کا قائل نہ ہو تو اُس کا علاج کچھ نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ فتوحات اسلام اور تبلیغ دین کی یہ ابتدا تھی جو اس مہذب اور با اخلاق قوم کے ہاتھوں پڑی۔ اور تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مشہور

مشہور اور با وقعت ممالک و اقالیم کی تسخیر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے وقت میں اُن کے ہاتھوں سے پر چکی۔ اُس کے بعد جس قدر فتوحات ہوئیں وہ تکمیل کا درجہ رکھتی ہیں اور یہی قاعدہ ہے کہ نظر اصول و بدایت پر ہوتی ہے۔

مابعد کے قرون میں بھی یہی طریقہ صحابہ میں اصل مقصد قرار دیا گیا۔ پھر کسی کا کیا حوصلہ ہے۔ اور اُسکے پاس کیا حجت ہے کہ ان حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد یہ کہہ سکے کہ اسلام بزور تلوار پھیلایا گیا ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو عقل و دانش دین و ایمان انصاف و حق پسندی سے ہاتھ اُٹھائے اور بلا دلیل و حجت اپنی ہی بات پر اصرار کئے جائے لیکن اس کا نتیجہ اُس کے حق میں سوائے ندامت و پشیمانی کے کچھ نہیں حجۃ و برہان کے موقع پر نہ اُسکی بات قابل شنوائی رہتی ہے اور نہ وہ اس قابل رہ سکتا ہے کہ عقلاء با فراست اُسکی بات پر کان دھریں۔ واللہ العاصم من الضلال وھو الملھم للصدق والسداد والیہ المرجع والمعاد و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ وصحبہ اجمعین۔

خاتمہ حصّہ دوم

ہمنے اِس مضمون اشاعت اسلام کی تمہید میں لکھا تھا اس مضمون کو تین حصوں پر منقسم کیا جائیگا حصہ اول حالات زمانہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حصہ دوم حالات زمانہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حصہ سویم حالات زمانہ مابعد صحابہ۔ حصہ اوّل کو دو حصوں پر منقسم کیا تھا۔ ایک حالات قبل ہجرت اور دوسرا مابعد ہجرت حصہ اوّل کے بیان میں اختصار ہوگیا اور بہت سے ضروری حالات لکھنے سے رہ گئے جس کی وجہ یہ بھی کہ جس وقت ہمنے اس مضمون پر قلم اُٹھایا۔ تو خیال اتنی بسط و تفصیل کا نہ تھا لیکن جب یہ مضمون لکھا گیا اور مسلمانوں کے ہر طبقہ بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ مقبولیت و پسندیدگی سے دیکھا گیا اور ہمکو معلوم ہوگیا کہ اسکی ضرورت تھی بہت سے ناواقف مسلمان بھی اس اعتراض (اسلام بزور شمشیر پھیلا) سے متاثر ہیں یا کم از کم اُن کی حاجت ہے کہ واقعات و دلائل سے اسکی حقیقت اُن پر آشکار کردی جائے تو حصّہ دویم میں ہمنے اختصار سے کام نہ لیا۔ اور الحمدللہ واقعات سے اشاعت اسلام کی حقیقت دکھلادی۔

اگرچہ حصہ دویم میں بھی ابھی اور بہت سے واقعات لکھنے اور اُن کے نتائج بتلانے کی گنجائش تھی مگر اوّل تو اسقدر بیان کو دفعہ شبہات کیلئے ہمنے کافی سمجھا۔ اس کے علاوہ بدیں خیال کہ شاید کوئی یہ خیال کرے کہ یہ زمانہ تو صحابہ کا تھا قرب فیض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ تو کوئی امر خلاف حقیقی تعلیم اسلام کے نہ کرسکتے تھے مگر زمانہ مابعد میں جبکہ مسلمانوں میں تغیر ہونے لگا اور وہ حقیقی تعلیم سے باعتبار امتداد زمانہ و نیز باعتبار اختلاط تاثرات ملک گیری یہ حالات باقی نہ رہے اور مسلمانوں نے بجائے اشاعت اسلام قومیت و عصبیت کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہا اور اس طرح یہ طریقہ بھی بدل گیا ہو اس لئے ہم کو ضرورت محسوس ہوئی کہ حصہ دویم کو ختم کرکے حصہ سویم شروع کردیں اور دکھلادیں کہ جس طریقہ کی بنیاد زمانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑی تھی جس کی تکمیل صحابہ نے کی تھی قرون مابعد میں بھی وہی رفتار

رہی ایک طرف فتوحات ملکی کا سلسلہ قائم رہا تو دوسری جانب اسلام اپنی اُسی خاموش رفتار سے سکہ جماتا رہا جو عجیب و غریب حالات ہم حصۂ سویم میں بیان کرینگے ناظرین اُس سے حیران و متعجب ہوں گے اور ہمارے اس دعوے کی پوری پوری تصدیق ہو جائیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

رہا حصۂ اول جس میں بہت اختصار ہو گیا ہے اور اُن اظہار کا بالتفصیل معہ اظہار نتائج ضبط ہونا نہایت ضروری ہے اُسکی نسبت ہمارا خیال ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد رسالہ سے علیحدہ مرتب کرکے مسلمانوں کے سامنے پیش کرینگے یہ وہ حالات ہیں کہ جن کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ایمان تازہ ہوتا ہے اور کسی معترض یا متعصب کے اعتراض و تعصب کے قلب تک رسائی یا تاثیر کی گنجایش نہیں رہتی۔ ناظرین کچھ عرصہ اس کا انتظار کریں اور دعا کریں کہ حق تعالیٰ مجھ کو اُسکی تسوید و تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان +

صد حسرت و افسوس کہ حضرت مولف رحمۃ اللہ علیہ حصۂ سویم کی تالیف سے قبل ہی داعی اجل کو لبیک کہکر عالم آخرت کو تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کسی دوسرے باہمت عالم سے اس حصہ کو پورا کرادے، ناظرین کرام کا اخلاقی فرض ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے ساتھ حضرت مولف رحمۃ اللہ علیہ کیلئے دعاء رحمت و مغفرت فرمائیں۔

نیازمند

(ناظم کتب خانہ مطبع قاسمی دیوبند)